قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ

کہئے: پس حجت پوری اللہ کی ہی

رَحْمَةُ اللّٰهِ الْوَاسِعَةُ

شرح

حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَةُ

جلدِ سوم

تصنیف

امام اکبر، مجددِ ملت، حکیم الاسلام

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ

(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ - ۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء)

شارح

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

استاذ دار العلوم دیوبند

زمزم پبلشرز

جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ
کہیئے: پس حجت پوری اللہ کی رہی

رَحْمَةُ اللّٰهِ الْوَاسِعَة

شرح

حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَة

جلدِ سوم

تصنیف

امام اکبر، مجددِ ملت، حکیم الاسلام

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ

(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ—۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء)

شارح

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

استاذ دار العلوم دیوبند

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اردو بازار، کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

"رَحْمَۃُ اللّٰہِ الْوَاسِعَۃ" شرح "حُجَّۃُ اللّٰہِ الْبَالِغَۃ" کے جملہ حقوق اشاعت وطباعت پاکستان میں مولانا محمد رفیق بن عبدالمجید زمزم پبلشرز کراچی کو حاصل ہیں لہٰذا اب پاکستان میں کوئی شخص یا ادارہ اس کی طباعت کا مجاز نہیں بصورت دیگر زمزم پبلشرز کو قانونی چارہ جوئی کا مکمل اختیار ہے۔

از
مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

اس کتاب کا کوئی حصہ بھی زمزم پبلشرز کی اجازت کے بغیر کسی بھی ذریعے بشمول فوٹو کاپی برقیاتی یا میکانیکی یا کسی اور ذریعے سے نقل نہیں کیا جاسکتا۔

زمزم پبلشرز کراچی

کتاب کا نام ——— رَحْمَۃُ اللّٰہِ الْوَاسِعَۃ جلد سوم
(جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

تاریخ اشاعت ——— اپریل ۲۰۱۰ء

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-32760374-021-32725673

فیکس: 021-32725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: www.zamzampublishers.com

ملنے کے دیگر پتے

- مکتبہ بیت العلم کراچی۔ فون 32726509
- دارالھدیٰ اردو بازار کراچی۔
- دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel 00(27)114132786

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone 020-8911-9797

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road Bolton BL1 3NE
U.K
Tel/Fax 01204-389080

فہرست مضامین

فہرست مضامین ۳-۲۶
سخن ہائے گفتنی ۲۷
رحمۃ اللہ الواسعہ کی وجہ تسمیہ ۲۸
اختلافی مسائل کی شرح میں دو باتوں کا التزام ۳۰
حجۃ اللہ البالغہ کے تین امتیازات ۳۰
دقتِ فہم کی دو وجہیں ۳۲

قسم ثانی

تفصیل وار احادیثِ مرفوعہ کے اسرار و حِکم کا بیان

باب (۱) ایمان کے سلسلہ کی اصولی باتیں: ایمان کی دو قسمیں: ظاہری انقیاد اور کامل یقین ۳۸
اعمالِ اسلام کے دو درجے: ارکانِ اسلام اور دیگر فرائض ۴۵
اقسام ایمان کے متقابلات: کفر، اعتقادی نفاق، فسق اور عملی نفاق ۴۶
نفاقِ عمل تین طرح سے پیدا ہوتا ہے ۴۷
ایمان کے دو اور معنی: تصدیق اور سکینتِ قلبی ۴۸
خلاصہ کلام: ایمان کے کل چار معنی ۵۰
نفاقِ عمل اور اخلاص کی علامتیں ۵۱
نجاتِ اوّلی کے لئے ارکانِ خمسہ کی ادائیگی ضروری ہے ۵۷
ارکانِ خمسہ کی تخصیص کی وجہ ۵۹
فرائض اسلام ارکانِ خمسہ میں منحصر نہیں ہیں ۶۰
شریعت کی نظر میں گناہ کی دو قسمیں ہیں: کبائر اور صغائر۔ اور دونوں کی تحدید ۶۳
کبائر کی تعداد متعین نہیں ۶۴
فصل: ایمانیات سے تعلق رکھنے والی روایات ۶۶
وہ روایات جن میں کبائر و کفریات کا تذکرہ ہے ۶۶

ایک جامع تعلیم اور اسلام کا عطر ۶۹
مومن ناجی ہے، ناری نہیں ۷۰
ابلیس کا پانی پر تخت بچھانا اور دربار لگانا حقیقت ہے ۷۴
شیطان کی وسوسہ اندازی ۷۵
شیطانی وساوس اور فرشتوں کے الہام کی صورتیں ۷۸
شیطانی وساوس اور پریشان خوابوں کا علاج ۸۰
آدم وموسیٰ علیہما السلام میں ایک مناظرہ: اور اس واقعہ کا باطنی پہلو ۸۱
ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر ماحول اس کو بگاڑ دیتا ہے ۸۶
نابالغ بچوں کے احکام (مفصل بحث) ۸۹
''اللہ کے ہاتھ میں ترازو'' کا مطلب ۹۲
انسان کا اختیار ایک حد تک ہے، کامل اختیار اللہ کا ہے ۹۴
مجازات کے لئے فی الجملہ اختیار کیوں ضروری ہے؟ ۹۵
تقدیر ازلی ہے، اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ۹۸
آدمی وہاں ضرور پہنچتا ہے جہاں موت مقدر ہوئی ہے ۱۰۰
تخلیق کائنات سے پچاس ہزار سال پہلے تقدیر لکھنے کا مطلب ۱۰۱
آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے ذریت کو نکالنے کا بیان ۱۰۴
مراحل تخلیق اور فرشتہ کا چار باتیں لکھنا ۱۰۶
ہر شخص کا ٹھکانا جنت میں بھی ہے اور جہنم میں بھی ۱۰۷
رفع تخالف: ذریت: آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالی گئی تھی یا اولادِ آدم کی پشت سے؟ ۱۰۸
اس اعتراض کا جواب کہ جب نیکیاں اور برائیاں کر چکا تو اب راہیں آسان کرنے کا کیا مطلب؟ ۱۰۹
نیکوکاری اور بدکاری الہام کرنے کا مطلب ۱۱۰

باب (۲) کتاب وسنت کو مضبوط پکڑنے کے سلسلہ میں اصولی باتیں: ۱۱۲
تحریف سے دین کا تحفظ ضروری ہے ۱۱۲
فصل: روایات باب کی شرح ۱۱۷
اتباعِ نبوی کا وجوب اور محسوس مثال سے اس کی تفہیم ۱۱۷
کچھ اعمال فی نفسہ بھی موجبِ عذاب ہیں ۱۱۸

آپؐ کے لائے ہوئے دین کے تعلق سے لوگوں کی تین قسمیں ۱۱۹
خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کیوں ضروری ہے؟ ۱۲۱
فرقۂ ناجیہ اور فرقِ غیر ناجیہ کی تمثیل ۱۲۲
مجدّد دین کی ضرورت اور ان کے کارنامے ۱۲۵
علماء: انبیاء کے وارث ہیں ۱۲۸
محدثین کے لئے تر وتازگی کی دعا ۱۲۹
حدیث میں کذب بیانی کبیرہ گناہ ہے ۱۳۰
اسرائیلی روایات کے احکام ۱۳۱
دنیوی اغراض کے لئے علم دین سیکھنا اور سکھلانا حرام ہے ۱۳۲
بوقت حاجت علم دین کو چھپانا حرام ہے ۱۳۳
فرض کفایہ علوم اور ان کی تعیین وتفصیل ۱۳۴
دین کو چیستاں بنا کر پیش نہ کیا جائے ۱۳۷
تفسیر بالرائے حرام ہے، اور رائے کا مطلب ۱۳۹
قرآن میں جھگڑا کفر ہے، اور جھگڑا کرنے کا مطلب ۱۴۱
قرآن وحدیث کو باہم ٹکرانا حرام ہے، اور اس کی صورت ۱۴۱
آیات کا ظاہر وباطن، اور ہر ایک کی جائے اطلاع ۱۴۳
محکم ومتشابہ کا مطلب ۱۴۶
نیت اصل ہے، اعمال اس کے پیکر ہیں ۱۴۸
کسی چیز کا قطعی حکم معلوم نہ ہو تو احتیاط چاہئے ۱۵۰
قرآن کی پانچ قسمیں، اور ان پر عمل کا طریقہ ۱۵۳

كتاب الطهارة

باب (۱) طہارت کے سلسلہ کی اصولی باتیں ۱۵۷
طہارت کی اقسام: حدث وخبث کی طہارت اور جسم کے میل کی صفائی ۱۵۷
حدث وطہارت کی پہچان ۱۵۷
طہارت کی شکلوں اور موجبات طہارت کی پہچان ۱۵۷
حدث کیا ہے؟ ۱۵۸

طہارتیں کیا ہیں؟ ۱۵۹
موجباتِ وضوء وغسل ۱۵۹
باب (۲) فضیلت وضو: ۱۶۴
پاکی آدھا ایمان ہے ۱۶۴
وضوء سے گناہ معاف ہوتے ہیں ۱۶۵
قیامت کے دن اعضائے وضوء روشن ہوں گے ۱۶۵
ہمیشہ باوضوء رہنا ایمان کی نشانی ہے ۱۶۶
باب (۳) وضوء کا طریقہ ۱۶۷
پیروں کے دھونے کا انکار اَجلی بدیہیات کا انکار ہے ۱۶۸
کلی، ناک کی صفائی اور ترتیب کی اہمیت ۱۶۹
مضمضہ اور استنشاق دراصل دو مستقل طہارتیں ہیں ۱۶۹
مضمضہ اور استنشاق میں فصل اَولیٰ ہے یا وصل؟ ۱۶۹
باب (۴) آداب وضوء ۱۷۲
چار باتیں پیشِ نظر رکھ کر آدابِ وضوء تجویز کئے گئے ہیں ۱۷۲
وضوء میں تسمیہ کی بحث ۱۷۴
نیند سے اٹھنے کے بعد برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ان کو دھونے کی وجہ ۱۷۷
بانسے پر شیطان کی شب باشی کا مطلب ۱۷۸
وضوء کے بعد کی دعا سے جنت کے سب دروازے کھل جانے کی وجہ ۱۷۸
خشک رہنے والی ایڑیوں کے لئے عذاب الیم کی وعید ۱۸۰
باب (۵) نواقض وضوء کا بیان ۱۸۱
نماز کے لئے پاکی کیوں شرط ہے؟ ۱۸۱
نواقضِ وضوء تین طرح کے ہیں: متفق علیہ، مختلف فیہ اور منسوخ ۱۸۳
نواقضِ وضوء کی پہلی قسم: متفق علیہ نواقض ۱۸۳
نیند ناقضِ وضوء کیوں ہے؟ ۱۸۳
مذی نکلنے سے وضوء کیوں واجب ہوتی ہے؟ ۱۸۳
جب حدث کا یقین ہو جائے تبھی وضوء ٹوٹتی ہے ۱۸۴

نواقضِ وضوء کی دوسری قسم: مختلف فیہ نواقض: ۱۸۵
۱- پیشاب کے عضو کو چھونا ۱۸۶
۲- عورت کو ہاتھ لگانا ۱۸۶
حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کے استدلال کا جواب ۱۸۷
حضرت ابن عمر کے مسلک کی حقیقت ۱۸۷
حضرت ابراہیم نخعی کا مسلک اور امام اعظم کا اس سے گریز ۱۸۸
۳-۵ بہنے والا خوں، کافی مقدار میں قئے اور نماز میں کھل کھلا کر ہنسنا ۱۸۸
امور مذکورہ ناقض وضوء کیوں ہیں؟ ۱۸۹
نواقضِ وضوء کی تیسری قسم: منسوخ نواقض ۱۹۱
۱- مامستِ النار کا ناقض وضوء ہونا، اور اس سے وضوء کرنے کی وجہ ۱۹۲
۲- اونٹ کے گوشت کا ناقض وضوء ہونا ۱۹۲
اونٹ کے گوشت سے وضوء واجب ہونے میں راز ۱۹۲
باب (۶) خفین (چمڑے کے موزوں) پر مسح کا راز ۱۹۵
مشروعیت کی وجہ ۱۹۵
موزوں پر مسح کے لئے تین شرطیں، اور اشتراط کا راز ۱۹۵
موزوں کے اوپر مسح استحسانی ہے، اور نیچے قیاسی ۱۹۸
باب (۷) غسل کا طریقہ ۱۹۹
غسل شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھونے کی وجہ ۱۹۹
غسل شروع کرنے سے پہلے شرمگاہ کو دھونے کی وجہ ۲۰۰
غسل کے شروع میں وضوء کی حکمتیں ۲۰۰
پیروں کو بعد میں دھونے کی حکمت ۲۰۰
مستحباتِ غسل چار ہیں ۲۰۰
حیاداری اور پردہ پوشی ۲۰۲
غسلِ حیض میں خصوصی اہتمام کی وجہ ۲۰۳
وضوء و غسل کے لئے پانی کی مقدار ۲۰۴
غسل جنابت میں اہتمام کی وجہ ۲۰۵

باب (۸) غسل واجب کرنے والی چیزوں کا بیان ۲۰۷
صحبت سے غسل کب واجب ہوتا ہے؟ ۲۰۷
بدخوابی سے اس وقت غسل واجب ہوتا ہے جب تَری پائے ۲۱۰
حیض وطہر کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت ۲۱۱
مستحاضہ: اپنے حیض کو کس طرح جدا کرے؟ ۲۱۲
باب (۹) جنبی اور بے وضوء کے لئے کیا کام جائز ہیں اور کیا ناجائز؟ ۲۱۶
باب کے سلسلہ کی اصولی بات ۲۱۶
جہاں تصویر، کتا یا جنبی ہو وہاں فرشتے نہیں آتے ۲۱۸
جنابت میں عضو دھوکر، وضوء کر کے سونے کی حکمت ۲۱۹
باب (۱۰) تیمّم کا بیان ۲۲۰
مشروعیت کی وجہ۔ بدل کیوں تجویز کیا۔ تیمم اس امت کا امتیاز ہے ۲۲۰
مٹی سے تیمم کیوں تجویز کیا گیا؟ غسل اور وضوء کے تیمم میں فرق کیوں نہیں؟ ۲۲۱
سخت سردی: بیماری کی طرح ہے۔ تیمم سفر کے ساتھ خاص نہیں۔ تیمم میں پیر کیوں شامل نہیں؟ ۲۲۲
تیمم کا طریقہ (روایات میں اختلاف اور ان میں تطبیق) ۲۲۴
جنابت میں بھی تیمّم جائز ہے ۲۲۷
فقہ شافعی کے چند مسائل جو منصوص نہیں ۲۲۷
زخمی کا غسل اور تیمم کو جمع کرنا ۲۲۹
تیمّم کامل طہارت ہے، دل میں کچھ وسوسہ نہ لائے ۲۳۱
باب (۱۱) قضائے حاجت کے آداب ۲۳۲
قضائے حاجت کے آداب کا تعلق سات باتوں میں سے کسی ایک بات سے ہے ۲۳۲
۱- بیت اللہ کی تعظیم ۲۳۲
قضاء حاجت کے وقت بیت اللہ کی طرف منہ یا پیٹھ نہ کرنے کی وجہ ۲۳۲
احادیث میں تعارض اور اس کا حل ۲۳۳
۲- خوب صفائی کرنا ۳- ضرر رساں چیزوں سے بچنا ۲۳۴
۴- اچھی عادتیں اپنانا ۵- پردے کا اہتمام کرنا ۲۳۵

۶-بدن اور کپڑوں کو نجاست سے بچانا ۷-وساوس سے بچنا ۲۳۵
کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی ممانعت کی وجہ ۲۳۸
بیت الخلاء میں جانے اور نکلنے کی دعائیں اور ان کی حکمت ۲۳۹
پیشاب سے نہ بچنا اور آپس میں بگاڑ پھیلانا عذابِ قبر کا سبب ہے ۲۴۰
باب (۱۲) فطرت کی باتیں اور ان سے لگتی چیزیں ۲۴۲
فطرت کی باتیں بابِ طہارت سے ہیں اور ملت ابراہیمی کا شعار ہیں ۲۴۲
شعار کیسی بات ہونی چاہئے؟ ۲۴۳
امور فطرت کے سلسلہ میں جامع گفتگو ۲۴۳
بال ناخن کا بڑھنا نجاستِ حکمی کا کام کرتا ہے ۲۴۳
ڈاڑھی بڑھانے کی حکمتیں ۲۴۴
مونچھیں کم کرانے کی حکمت ۲۴۴
ختنہ کرانے کی حکمت ۲۴۴
چار اور سنتیں جو باب طہارت سے ہیں: حیاء، خوشبودار ہونا، مسواک کرنا اور نکاح کرنا ۲۴۷
مسواک کو تنگی کے خیال سے ضروری قرار نہیں دیا ۲۴۹
منہ کے آخری حصہ تک مسواک کرنے کی حکمت ۲۵۰
ہفتہ میں ایک بار نہانے دھونے کی حکمت ۲۵۰
پچھنے لگوانے سے اور میت کو نہلانے سے غسل کرنے کی حکمت ۲۵۱
اسلام قبول کرنے پر نہانے کی حکمت ۲۵۳
باب (۱۳) پانی کے احکام ۲۵۴
رُکے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے اور نہانے کی ممانعت کی وجہ ۲۵۴
مائے مستعمل پاک ہے، مگر پاک کرنے والا نہیں ۲۵۶
حدیث قلّتین کی بحث (مالکیہ کے نزدیک حدث قلّتین ضعیف ہے۔ احناف کے نزدیک حَسَن ہے۔
احناف: مائے قلیل وکثیر کی درجہ بندی میں صرف پانی کے پھیلاؤ کا اعتبار کرتے ہیں، مقدار کا لحاظ نہیں
کرتے اور شوافع دونوں کا اعتبار کرتے ہیں۔ احناف نے قلیل وکثیر کی تحدید: غدیر کی روایت سے کی
ہے اور شوافع نے قلّتین کی حدیث سے۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک قلّتین کی حدیث مائے جاری پر
محمول ہے۔ اور شوافع اور حنابلہ نے قلّتین کی روایت کو حدِ فاصل قرار دیا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ
نے اسی کو ترجیح دی ہے ۲۵۷-۲۶۲

حدیث بیر بُضاعہ کا مطلب۔ (مالکیہ اور ظاہریہ کا اس سے استدلال اور اس کا جواب) ۲۶۳
مائے مقید سے حدث زائل نہیں ہوتا، خبث زائل ہوتا ہے ۲۶۷
فقہ حنفی کے تین مسائل جو منصوص نہیں ۲۶۸

باب (۱۴) نجاستوں کو پاک کرنے کا بیان ۲۷۱
نجاست کی تعریف۔ لید کا حکم۔ مأکول اللحم جانور کا پیشاب۔ شراب کیوں ناپاک ہے؟ ۲۷۱
کتّے کا جھوٹا ناپاک کیوں ہے؟ ۲۷۳
ناپاک زمین پر بہت پانی ڈالنے سے پاک ہو جاتی ہے ۲۷۵
نجاست کا اثر زائل ہونے سے پاکی حاصل ہوتی ہے ۲۷۶
منی ناپاک ہے، مگر خشک منی کھرچ دینے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے ۲۷۷
شیر خوار بچے اور بچی کے پیشاب کا حکم ۲۷۸
دباغت سے چمڑا پاک ہونے کی وجہ ۲۸۰
جوتے موزے مٹی میں رگڑ جانے سے پاک ہو جاتے ہیں ۲۸۰
"بلّی ناپاک نہیں" کا مطلب ۲۸۱

کتاب الصلاۃ

باب (۱) نماز کے سلسلہ کی ایک اصولی بات (باقی اصولی باتیں ہر باب کے شروع میں بیان کی جائیں گی) ۲۸۵
سات سال کی عمر میں نماز کا حکم اور دس سال کی عمر میں سختی کرنے کی وجہ ۲۸۷

باب (۲) نماز کی فضیلت کا بیان ۲۹۰
نماز گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے ۲۹۰
ترک نماز: ایمان کے منافی اور کافرانہ عمل ہے ۲۹۳

باب (۳) نماز کے اوقات ۲۹۴
وقفہ وقفہ سے نمازیں رکھنے کی حکمت ۲۹۴
نمازوں کے لئے مناسب اوقات ۲۹۶
نمازوں کے اوقات کی تشکیل ۲۹۷
نمازوں کے تین خاص اوقات ۳۰۱

انبیائے سابقین کی نمازوں کے اوقات کا لحاظ ۳۰۳
نمازوں کے اوقات موسّع کیوں ہیں؟ ۳۰۵
اسباب میں تزاحم اور نمازوں کے چار اوقات: ۳۰۶
پہلا وقت: وقتِ مختار (پسندیدہ وقت) ۳۰۷
روایتوں میں دو باتوں میں اختلاف ہے: مغرب کا وقت کب تک ہے اور عصر کا آخری وقت کب تک ہے؟ ۳۰۷
دوسرا وقت: وقتِ مستحب ۳۱۰
نمازیں اوائلِ اوقات میں مستحب ہیں، مگر دو نمازیں اس سے مستثنیٰ ہیں: عشاء کی اور گرمیوں میں ظہر کی نماز ۳۰۱
اس سوال کا جواب کہ فجر کی نماز کا استثناء کیوں نہیں کیا؟ وہ بھی تو اسفار میں مستحب ہے ۳۱۳
تیسرا وقت: وقتِ ضرورت (جس تک بغیر عذر کے نماز موخر کرنا جائز نہیں) ۳۱۶
چوتھا وقت: وقتِ قضاء ۳۱۷
نماز قضاء کی جارہی ہو اور آدمی بے بس ہو تو کیا کرے؟ ۳۱۸
اختیار کی صورت میں نماز مکروہ وقت میں پڑھنا کیسا ہے؟ ۳۱۹
تین نمازوں کی نگہداشت کا حکم کیوں دیا؟ ۳۱۹
اسلامی اصطلاحات کی حفاظت ضروری ہے ۳۲۰

باب (۴) اذان کا بیان ۳۲۲
اذان کی تاریخ، اہمیت اور معنویت ۳۲۲
اذان واقامت کے کلمات کی تعداد ۳۲۵
فجر کی اذان میں اضافہ کی وجہ ۳۲۸
اقامت: اذان کہنے والے کا حق کیوں ہے؟ ۳۲۸
فضائل اذان کی بنیادیں ۳۲۹
مؤذن کی گردن فرازی اور آواز کی درازی تک بخشش اور گواہی کی وجہ ۳۳۱
سات سال اذان دینے پر پروانۂ براءت ملنے کی وجہ ۳۳۲
اخلاص سے اذان دینا اور نماز کا اہتمام کرنا مغفرت کا سبب ہے ۳۳۲
اذان کے جواب کی حکمت ۳۳۳
حیعلتین کا جواب حوقلہ سے کیوں ہے؟ ۳۳۴
جوابِ اذان کی فضیلت اور اس کی وجہ ۳۳۵

اذان کے بعد دعا کی حکمت ۳۳۵
اذان واقامت کے درمیان دعا قبول ہونے کا راز ۳۳۶
سحری اور تہجد کے لئے مستقل اذان ۳۳۶
نماز میں ہَولے ہَولے آئے، بھاگتا ہوا نہ آئے ۳۳۷
باب (۵) مساجد کا بیان ۳۳۸
مسجد بنانے، اس سے لگے رہنے اور اس میں نماز کا انتظار کرنے کی فضیلت کی بنیادیں ۳۳۸
مسجد کی حاضری ملکیت کو بہیمیت پر غالب کرتی ہے ۳۴۱
مسجد بنانے کا ثواب جنت کی حویلی! ۳۴۱
مسجد میں حدث کرنے سے نماز کے انتظار کا ثواب ختم ہوجاتا ہے ۳۴۱
مسجد حرام اور مسجد نبوی میں ثواب کی زیادتی کی وجہ ۳۴۲
مساجد ثلاثہ کے علاوہ مقامات کے لئے سفر ممنوع ہونے کی وجہ ۳۴۴
فصل: آدابِ مسجد کی بنیادیں ۳۴۶
چند امور (چار باتیں) جو مسجد میں ممنوع ہیں ۳۴۸
جنبی اور حائضہ مسجد میں کیوں داخل نہیں ہوسکتے؟ ۳۵۱
بدبودار چیزوں سے مسجد کو بچانے کی حکمت ۳۵۱
مسجد میں داخلے کے وقت دعا میں رحمت اور نکلتے وقت فضل کی تخصیص کی وجہ ۳۵۲
تحیۃ المسجد کی حکمت ۳۵۳
سات جگہوں میں نماز ممنوع ہونے کی وجہ ۳۵۵
باب (۶) نمازی کا لباس ۳۵۸
نماز میں لباس پہننا کیوں ضروری ہے؟ ۳۵۸
لباس کی دو حدیں: واجب اور مستحب ۳۵۹
لباس کی حدِّ واجب کے دلائل ۳۵۹
لباس کی حدِ مستحب کے دلائل ۳۶۰
نماز کے لئے کتنے کپڑے ضروری ہیں؟ (جوابِ نبوی اور جوابِ عمرؓ میں اختلاف اور اس کی توجیہات) ۳۶۲
نماز میں تزئین میں کمی مکروہ ہے ۳۶۴

تزئین اتنی بھی نہ ہو کہ نماز کھودے ۳۶۴
چپل موزے تزئین میں داخل ہیں یا نہیں؟ ۳۶۶
سَدل کی ممانعت کی وجہ ۳۶۷
باب (۷) قبلہ کا بیان ۳۶۸
نماز میں قبلہ کی ضرورت۔ ہر قوم کا قبلہ اس کے اکابر کا قبلہ ہے ۳۶۹
پہلی بار تحویل قبلہ کی وجہ ۳۶۹
دوسری اور آخری بار تحویل قبلہ کی وجہ ۳۷۰
استقبالِ قبلہ شرط ہے تو تحری میں غیر قبلہ کی طرف نماز کیوں ہو جاتی ہے؟ ۳۷۴
باب (۸) سُترہ کا بیان ۳۷۵
نمازی کے سامنے سے گذرنا کیوں منع ہے؟ ۳۷۵
عورت، گدھے اور کالے کتے کے گذرنے سے نماز فاسد ہوتی ہے؟ ۳۷۶
سُترہ کی حکمت ۳۷۸
باب (۹) نماز میں ضروری امور ۳۷۹
نماز میں بنیادی چیزیں تین ہیں: خضوع، ذکر اور تعظیم ۳۷۹
نماز دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے: ضروری اور مستحب ۳۸۰
نماز میں ضروری امور تین قسم کی چیزیں ہیں ۳۸۰
وہ قرائن جن سے ضروری امور کی تعیین کی جا سکتی ہے ۳۸۱
وہ نماز جو متوارث چلی آ رہی ہے ۳۸۵
خضوع کا انضباط: استقبالِ قبلہ اور تکبیر تحریمہ کے ذریعہ ۳۸۸
استقبالِ قبلہ کی حکمتیں ۳۸۸
تکبیر تحریمہ کی حکمتیں ۳۸۹
تعظیم جسمانی کا انضباط: قیام، رکوع اور سجود کے ذریعہ ۳۹۱
ذکر اللہ کا انضباط: فاتحہ اور ضم سورت کے ذریعہ ۳۹۲
فاتحہ کی تعیین کی اور ضم سورت کی حکمت ۳۹۲
رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ کا انضباط اور ان میں طمانینت کی حکمت ۳۹۴

رکوع کی ہیئتِ کذائی کا انضباط ۳۹۴

رکوع وسجود میں طمانیت کیوں ضروری ہے؟ ۳۹۴

سجدہ کی ہیئتِ کذائی کا انضباط۔قومہ کیوں ضروری ہے؟ جلسہ کیوں ضروری ہے ۳۹۵

قومہ اور جلسہ میں طمانینت کیوں ضروری ہے؟ ۳۹۵

سلام کے ذریعہ نماز سے نکلنے کی حکمت ۳۹۷

تشہد کی تجویز اور اس کے اجزاء کی معنویت ۳۹۷

دعا اور دعا سے پہلے درود شریف کی حکمت ۳۹۹

قعدۂ اخیرہ کی حکمت ۴۰۰

نماز درحقیقت ایک رکعت ہے، مگر دو سے کم پڑھنا جائز نہیں ۴۰۱

مغرب کے علاوہ نمازیں دو دو رکعتیں فرض کی گئی تھیں، پھر اضافہ عمل میں آیا ۴۰۴

پانچوں نمازوں پر رکعتوں کی تقسیم کی بنیاد ۴۰۴

باب (۱۰) نماز کے اذکار اور مستحب ہیئتیں ۴۰۷

نماز سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لئے بطور استحباب نماز کی کیت وکیفیت میں اضافہ کیا گیا ہے ۴۰۷

کیفیت کا بیان۔کمیت کا بیان۔اذکار کی بنیاد۔ارکان کی ہیئتوں کی بنیاد ۴۰۸

ہیئتوں میں ملحوظ چار باتیں ۴۱۰

اذکار میں ملحوظ تین باتیں ۴۱۱

تکبیر تحریمہ میں رفع یدین کی حکمت ۴۱۲

ہاتھ باندھنے، پیر برابر رکھنے اور نظر سجدہ کی جگہ میں روکنے کی حکمت ۴۱۳

استفتاح کے اذکار اور اس کی حکمت ۴۱۳

قراءت سے پہلے استعاذہ کی حکمت ۴۱۶

فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی حکمت ۴۱۷

بسم اللہ جہراً پڑھی جائے یا سراً؟ ۴۱۸

اذکار کی تعلیم خواص کو دی جاتی تھی ۴۱۸

مقتدی کے لئے قراءت کی ممانعت اور سرّی اور جہری نمازوں کی حکمت ۴۲۰

ملائکہ کے آمین کہنے کی اور امام کے ساتھ آمین کہنے کی حکمت ۴۲۴

ہر رکعت میں دو سکتوں کی حکمت ۴۲۶

فجر میں لمبی قراءت کی حکمت ۴۲۷
عشاء میں ہلکی قراءت کی حکمت ۴۲۸
ظہر، عصر اور مغرب میں قراءت کی مقدار اور اس کی حکمت ۴۲۸
قراءت میں معمول نبوی اور لوگوں کے لئے ہدایت ۴۲۹
بعض نمازوں میں بعض سورتوں کی تخصیص کی وجہ ۴۲۹
عیدین میں معمول اور اس کی وجہ۔ جمعہ میں معمول اور اس کی وجہ ۴۲۹
جمعہ کے دن فجر کی نماز میں معمول اور اس کی وجہ ۴۲۹
جواب طلب آیات کا جواب اور اس کی حکمت ۴۳۰
رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے رفع یدین کی حکمت ۴۳۲
ابن مسعودؓ نے جو رفع یدین نہیں کیا تو اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں ۴۳۴
رفع یدین کے بارے میں دو مختلف نقطۂ نظر ہیں ۴۳۵
رکوع کا طریقہ اور اس کے اذکار ۴۳۸
قومہ کا طریقہ اور اس کے اذکار ۴۳۹
قنوت: نازلہ اور راتبہ ۴۴۱
سجدہ کا طریقہ اور اس کے اذکار ۴۴۳
فضائل سجود ۴۴۵
جلسہ اور قعدہ میں بیٹھنے کا طریقہ اور ان کے اذکار ۴۴۷
قعدۂ اخیرہ میں درود اور دعائیں ۴۵۰
سلام کے بعد ذکر و دعا ۴۵۱
سلام کے بعد اذکار کی اور گھر میں سنتیں ادا کرنے کی حکمت ۴۵۴
باب (۱۱) وہ امور جو نماز میں جائز نہیں، اور سجدۂ سہو و تلاوت ۴۵۶
وہ امور جن سے نماز ناقص ہوتی ہے، باطل نہیں ہوتی۔ ایسے امور آٹھ ہیں ۴۵۸
وہ امور جن سے نماز باطل ہو جاتی ہے ۴۵۹
فصل اول: سجدۂ سہو کی حکمت ۴۶۲
بھول کی چار صورتیں اور ان کے احکام ۴۶۵
اگر پہلا قعدہ بھول کر کھڑا ہونے لگے تو کیا حکم ہے؟ ۴۶۶

فصل دوم: سجود تلاوت کا بیان ۴۶۸
سجدۂ تلاوت کی حکمت ۴۶۸
سجدوں کی آیات میں پانچ طرح کے مضامین ہیں ۴۶۸
سجدوں کی تعداد ۴۶۹
سجدۂ تلاوت واجب ہے یا سنت؟ ۴۷۰
سجدۂ تلاوت کے سنت ہونے کی دلیلیں ۴۷۰
کیا بے وضوء سجدۂ تلاوت جائز ہے؟ ۴۷۰
سجدۂ تلاوت کے اذکار ۴۷۱
باب (۱۲) نوافل کا بیان ۴۷۳
نوافل کی مشروعیت کی حکمت ۴۷۳
سنن مؤکدہ اور ان کی تعداد کی حکمت ۴۷۴
سننِ مؤکدہ کی فضیلت: جنت کا گھر ۴۷۶
فجر کی سنتوں کی خاص فضیلت ۴۷۶
نماز اشراق کی فضیلت ۴۷۷
ظہر سے پہلے چار سنتوں کی فضیلت ۴۷۸
جمعہ کے بعد مسجد میں چار سنتوں کی حکمت ۴۷۸
عصر سے پہلے اور مغرب کے بعد سنن غیر مؤکدہ ۴۷۹
عصر اور فجر کے بعد سنتیں نہ رکھنے کی وجہ ۴۷۹
تہجد کی مشروعیت کی وجہ ۴۸۱
نیند سے بیدار ہونے کا مسنون طریقہ ۴۸۳
تہجد کا وقت نزولِ رحمت کا وقت ہے ۴۸۵
باوضوء ذکر کرتے ہوئے سونے کی فضیلت ۴۸۸
تہجد کے لئے اٹھتے وقت مختلف اذکار ۴۸۹
تہجد کے مستحبات ۴۹۱
تہجد اور وتر ایک نماز ہیں یا دو؟ اور وتر واجب ہے یا سنت؟ ۴۹۲
تہجد کی گیارہ رکعتوں کی حکمت ۴۹۷

وتر کے اذکار (دعائے قنوت) ۴۹۹
وتر میں مسنون قراءت ۵۰۱
تراویح کی مشروعیت کی وجہ ۵۰۲
دورِ نبوی میں تراویح: جماعت سے کیوں نہیں پڑھی گئی؟ ۵۰۳
تراویح مغفرت کا سبب کس طرح ہوتی ہے؟ ۵۰۵
باجماعت بیس رکعت تراویح پڑھنے کی حکمتیں ۵۰۶
نماز چاشت کی حکمت ۵۱۰
نماز چاشت کی مقدار اور اس کی فضیلت ۵۱۱
نماز استخارہ کی حکمت ۵۱۳
استخارہ کا طریقہ اور اس کی دعا ۵۱۵
نماز حاجت کا طریقہ اور اس کی حکمت ۵۱۷
نماز توبہ کی حکمت ۵۱۹
تحیۃ الوضوء کی فضیلت ۵۲۰
بلالؓ آنحضرت ﷺ کو خواب میں جنت میں آگے نظر آئے تھے: اس کی وجہ ۵۲۱
صلاۃ التسبیح کی حکمت ۵۲۴
قدرت کی نشانیاں ظاہر ہونے پر نماز کی حکمت ۵۲۵
نماز کسوف کا بیان ۵۲۸
بارش طلبی کی نماز کی حکمت ۵۲۹
سجدۂ شکر کی حکمت سجدۂ مناجات جائز نہیں ۵۳۲
مسنون نمازیں مقرب بندوں کے لئے ہیں ۵۳۲
طلوع وغروب اور استواء کے وقت نماز ممنوع ہونے کی وجہ ۵۳۳
فجر اور عصر کے بعد نوافل ممنوع ہونے کی وجہ ۵۳۳
جمعہ کے دن بوقت استواء، اور مسجد حرام میں پانچوں اوقات میں نماز مکروہ نہ ہونے کی وجہ ۵۳۴
باب (۱۳) عبادت میں میانہ روی کا بیان ۵۳۶
عبادت میں بے اعتدالی کی پانچ خرابیاں ۵۳۷
عمل پر مداومت اللہ کو پسند کیوں ہے؟ ۵۴۲

اعمال میں حد سے بڑھنا ملالت کا باعث ہے ۵۴۳
اونگھتے ہوئے عبادت کرنا بے فائدہ ہے ۵۴۳
میانہ روی سے عبادت کرنے کے خاص اوقات ۵۴۴
اوراد و وظائف کی قضاء میں حکمت ۵۴۴

باب (۱۴) معذوروں کی نماز کا بیان ۵۴۷
قانون مکمل وہ ہے جس میں سہولتیں بھی ہوں۔ ترخیص: شارع کی طرف مفوض ہے ۵۴۷
سہولت اصل عبادت میں نہیں، بلکہ حدود و ضوابط میں دی جاتی ہے ۵۴۷
مسافر کے لئے پانچ سہولتیں ۵۴۸
پہلی سہولت: نماز قصر کرنا ۵۴۹
مسافر کی نماز قصر ہے یا پوری؟ قرآن و حدیث کے اشاروں میں اختلاف اور ان میں تطبیق ۵۴۹
مسافت قصر کا بیان (مسافتِ قصر منصوص نہ ہونے کی وجہ۔ مسافت قصر کی تحدید و تعیین کا طریقہ) ۵۵۴
سفر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کب پورا ہوتا ہے؟ ۵۵۸
دوسری سہولت: جمع بین الصلاتین ۵۶۰
تیسری سہولت: سنتیں نہ پڑھنا ۵۶۱
چوتھی سہولت: سواری پر نفل پڑھنا (افطار کی سہولت کا بیان کتاب الصوم میں آئے گا) ۵۶۱
نمازِ خوف کا بیان (خوف میں نماز کی صورتیں اور ان کی حکمتیں) ۵۶۳
بیمار کی نماز کا بیان ۵۶۷
بیمار کو قیام اور رکوع و سجود میں سہولت دینے کی حکمت ۵۶۷
قیام پر قدرت کے باوجود نفل نماز بیٹھ کر پڑھنے کی حکمت ۵۶۷
طالب و مطلوب، اور کیچ اور بارش میں نماز کی حکمت ۵۶۸
طلب سہولت کی درخواستیں اور ان کی قبولیت کا معیار ۵۶۹
ایک جامع ارشاد: جو رخصتوں کی بنیاد ہے ۵۶۹

باب (۱۵) جماعت کا بیان ۵۷۱
باجماعت نماز کے پانچ فائدے ۵۷۱
فضیلتِ جماعت کی وجہ ۵۷۵
مل کر نماز نہ پڑھنے والوں پر شیطان کا قبضہ ۵۷۷

جماعت سے پیچھے رہنے والوں کے لئے سخت وعید ۵۷۷
ترکِ جماعت کے چار اعذار ۵۷۹
کھانا سامنے آنے پر نماز کا حکم (دو متعارض حدیثوں میں تطبیق) ۵۸۰
خواتین کہاں نماز پڑھیں؟ (حدیث اور صحابہ کے فیصلہ میں تعارض کا جواب) ۵۸۰
ایک نابینا صحابی کو آنحضرت ﷺ نے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت کیوں نہیں دی؟ ۵۸۱
باجماعت نماز کے سلسلہ میں چار باتوں کی وضاحت ۵۸۳
(۱) امامت کا زیادہ حقدار کون اور کیوں؟ ۵۸۳
قاری کی تقدیم کی وجوہ ۵۸۳
(۲) جماعت کی نماز میں ہلکی قراءت کرنے کی حکمت ۵۸۶
(۳) امام کی پیروی ضروری ہے ۵۸۷
امام معذوری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی کیا کریں؟ ۵۸۸
امام کے قریب دانشمند رہیں، اور لوگ مسجد میں شور نہ کریں ۵۹۰
(۴) ملائکہ کی صفوں میں خلل نہ ہونے کی وجہ ۵۹۲
شیطان کا صف کے شگافوں میں گھسنا ۵۹۲
صفوں کی درستی اور امام کی پیروی میں کوتاہی پر سخت وعید ۵۹۴
رکوع پانے سے رکعت ملنے کی اور سجدہ پانے سے رکعت نہ ملنے کی وجہ ۵۹۶
تنہا نماز پڑھنے کے بعد، دوبارہ جماعت سے نماز پڑھنے کی حکمت ۵۹۷

باب (۱۶) جمعہ کا بیان ۵۹۸
اجتماعی عبادت کے لئے دن کی تعیین کا مسئلہ ۵۹۸
جمعہ کی تعیین صحابہ نے کی تھی، پھر آپ کو اس کا علم عطا فرمایا گیا تھا ۵۹۹
قبولیت کی گھڑی اور اس کی دو احتمالی جگہیں ۶۰۵
جمعہ کے تعلق سے پانچ باتوں کی وضاحت ۶۰۶
پہلی بات: نماز جمعہ کا وجوب اور ترکِ جمعہ کے اعذار ۶۰۷
دوسری بات: تنظیف کا استحباب اور اس کی تین حکمتیں ۶۰۹
تیسری بات: جمعہ کے لئے پیدل جانے اور اہتمام سے خطبہ سننے کی حکمت ۶۱۱
چوتھی بات: خطبہ سے پہلے سنتوں کی حکمت ۶۱۲

اگر کوئی دروان خطبہ آئے تو سنتیں پڑھے یا نہیں؟ ۶۱۲

حدیث کے صحیح الفاظ وقد خرج الإمام ہیں والإمام یخطب راوی کا وہم ہے ۶۱۲

پانچویں بات: گردنیں پھاندنے کی ممانعت کی وجہ ۶۱۳

نماز جمعہ کا ثواب اور اس کی وجہ ۶۱۴

دوگانۂ جمعہ، جہری قراءت اور خطبہ کی حکمتیں ۶۱۶

دو خطبوں کی اور خطبہ کے مضامین کی حکمت ۶۱۶

خطبہ غیر عربی میں کیوں جائز نہیں؟ ۶۱۷

جمعہ کے لئے تمدن اور جماعت کے اشتراط کی وجہ ۶۱۹

صحتِ جمعہ کے لئے کیسی بستی اور کتنی جماعت ضروری ہے؟ ۶۱۹

باب (۱۷) عیدین: عید الفطر اور عید الاضحیٰ ۶۲۲

مشروعیت کی حکمت ۶۲۲

دنوں کی تعیین میں حکمت ۶۲۴

عیدین کے اجتماع کا ایک مقصد شوکت کی نمائش بھی ہے ۶۲۶

نماز عیدین کے مسائل اور ان کی حکمتیں ۶۲۸

عیدین میں زائد تکبیریں کتنی ہیں؟ ۶۲۸

عید الفطر کے دو مخصوص مسائل ۶۲۸

عید الاضحی کے دو مخصوص مسائل ۶۲۹

قربانی کے جانور: احوال اور حکمتیں ۶۳۰

وہ جانور جن کی قربانی جائز یا ناجائز ہے۔ قربانی کے جانور کی عمریں ۶۳۰

چھ ماہہ بھیڑ کی قربانی جائز ہے۔ نابالغ اولاد کی قربانی باپ پر واجب نہیں۔ ۶۳۱

بڑے جانور میں سات حصے ہو سکتے ہیں۔ عمدہ جانور کی قربانی مستحب ہے اور عیب دار کی جائز نہیں ۶۳۱

عیب دار جانور ۶۳۲

سینگ دار خصی مینڈھے کی قربانی۔ ذبح کی دعا ۶۳۳

باب (۱۸) جنائز کا بیان ۶۳۴

مرضِ موت، موت اور موت کے بعد کی اصولی باتیں ۶۳۴

مریض کی دنیوی اور اخروی مصلحتیں ۶۳۵

میت کے ساتھ حسن سلوک کی دوصورتیں.... ۶۳۵
میت کے پسماندگان کی دنیوی مصلحتیں ۶۳۶
ملت کی مصلحت ۶۳۷
فصل: جنائز سے متعلق احادیث کی شرح ۶۴۱
بیماری اور بلیات کا ثواب (بیماری سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ مؤمن آفات میں زیادہ مبتلا ہوتا ہے) ۶۴۱
کبھی عمل کے بغیر بھی ثواب جاری رہتا ہے ۶۴۲
کسی ناگہانی حادثہ سے موت ہوجائے تو شہادت کا درجہ ملتا ہے ۶۴۲
عیادت کا بیان ۶۴۴
عیادت کرنا بڑا ثواب کا کام ہے ۶۴۴
بیمار کی بیمار پرسی اللہ تعالیٰ کی بیمار پرسی ہے ۶۴۵
مریض پر دَم کرنے کی دعائیں: اور اس کی حکمت ۶۵۱
دوسرے پر دَم کرنے کی دعائیں ۶۵۲
اپنے اوپر دَم کرنے کی دعائیں ۶۵۲
موت کی تمنا کیوں ممنوع ہے؟ ۶۵۴
شوقِ لقاء سے عقلی شوق مراد ہے ۶۵۵
موت کے وقت امیدوار رحمت رہنے کی حکمت ۶۵۹
موت کو بکثرت یاد کرنے کا فائدہ ۶۶۲
کلمہ پر مرنے کی فضیلت اور اس کی وجہ ۶۶۲
جاں بہ لب کے پاس کلمہ پڑھنے کی اور اس کو یٰس سنانے کی حکمت ۶۶۲
موت پر ترجیع کی حکمت ۶۶۴
میت کے پاس کلماتِ خیر کہنے کی حکمت ۶۶۵
غسل وکفن کے سات مسائل اور ان کی حکمتیں ۶۶۶
پہلا مسئلہ: میت کو نہلانے میں حکمت اور نہلانے کا طریقہ ۶۶۶
دوسرا مسئلہ: بیری کے پتوں سے نہلانے کی حکمت ۶۶۷
تیسرا مسئلہ: آخری مرتبہ دھونے میں کافور ملانے کے فوائد ۶۶۷
چوتھا مسئلہ: داہنی جانب سے غسل شروع کرنے کی حکمت ۶۶۷
پانچواں مسئلہ: شہید کو غسل وکفن نہ دینے کی وجہ ۶۶۷

چھٹا مسئلہ: حالت احرام میں موت ہو جائے تو اس کا حکم ۶۶۸
ساتواں مسئلہ: میت کو کس طرح نہلایا جائے؟ ۶۶۹
کفن میں اعتدال کا حکم ۶۷۱
تدفین میں جلدی کرنے کی حکمت ۶۷۱
جنازہ واقعی گفتگو کرتا ہے ۶۷۲
جنازہ کے ساتھ جانے کی حکمت ۶۷۳
جنازہ دیکھ کر پہلے کھڑے ہونے کی، پھر کھڑے نہ ہونے کی حکمت ۶۷۴
نماز جنازہ کا طریقہ اور دعائیں ۶۷۶
بزرگ شخصیت کا یا بڑی جماعت کا جنازہ پڑھنا باعث بخشش ہے ۶۷۹
نیک لوگوں کی گواہی جنت یا جہنم کو واجب کرتی ہے ۶۸۱
مُردوں کو برا کہنا ممنوع کیوں ہے؟ ۶۸۲
تین مسائل میں ہر طرح عمل کی گنجائش ہے (جنازہ کے آگے چلیں یا پیچھے؟ جنازہ چار آدمی اٹھائیں یا دو؟ میت قبر میں قبلہ کی جانب سے لی جائے یا پیروں کی جانب سے؟) ۶۸۳
بغلی قبر کیوں بہتر ہے؟ ۶۸۴
قبروں کی بے حد تعظیم یا توہین ممنوع کیوں ہے؟ ۶۸۴
میت پر آنسو بہانا کیوں جائز ہے؟ ۶۸۷
میت پر نوحہ ماتم کرنا کیوں ممنوع ہے؟ ۶۸۷
نوحہ کرنے والی عورت کی سزا اور اس کا راز ۶۸۹
جاہلیت کی چار باتوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے (حَسَب پر فخر کرنا۔ نسب میں طعن کرنا۔ ستاروں سے بارش کی توقع رکھنا۔ میت پر واویلا کرنا) ۶۸۹
عورتوں کا جنازہ کے ساتھ جانا ممنوع کیوں ہے؟ ۶۹۰
تین بچے فوت ہونے کا ثواب اور اس کی وجہ ۶۹۲
تسلی دینے والے کو مصیبت زدہ کے مانند اجر ملنے کی وجہ ۶۹۲
پسماندگان کو یک شبانہ روز کھانا دینے کی حکمت ۶۹۳
پہلے زیارت قبور کی ممانعت پھر اجازت کی وجہ ۶۹۴
زیارت قبور کی دعائیں ۶۹۴

☆ ☆ ☆

فہرست فوائد

- حجۃ اللہ اور رحمۃ اللہ میں حدیثوں کی تخریج کا طریقہ ۳۷
- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت: زمان ومکان یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں ۳۸
- آپؐ کی بعثت کی ایک غرض یہ ہے کہ آپ اللہ کے دین کو غالب کردیں ۳۹
- بعثتِ نبوی کے بعد لوگوں کی دو قسمیں ۳۹
- اُمرتُ ان اُقاتل میں جنگ بندی کا بیان ہے۔ جنگ چھیڑنے کا نہیں ۴۰
- ایمان بمعنی سکینت. ایک وجدانی کیفیت ہے جو مقربین کو حاصل ہوتی ہے۔ اور وہی احسان ہے ۴۸
- مسجد کی نماز میں حاضری اور غیر حاضری: ایمان ونفاق کی علامتیں ہیں ۵۳
- خلفائے راشدین سے محبت ایمان ہے اور ان سے بغض کفر ہے: اشخاص کے بارے میں اس قسم کے ارشادات کی وجوہ ۵۴
- انصار سے محبت ایمان ہے اور ان سے بغض نفاق ہے: اقوام، قبائل اور جماعتوں کے بارے میں اس قسم کے ارشادات کی وجہ ۵۵
- ارکانِ خمسہ میں وہ خوبیاں ہیں کہ وہ ان کے علاوہ طاعات سے مستغنی کردیتے ہیں ۶۰
- ارکانِ خمسہ سے نجات اُولی کے لئے کبائر سے بچنا شرط ہے ۶۳
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی ۶۷
- جو سچے دل سے توحید ورسالت کی گواہی دے اس کو اللہ تعالیٰ دوزخ پر حرام کردیں گے: اس انداز کلام سے کفر وشرک کی سنگینی ظاہر کرنا مقصود ہے ۷۲
- شیطان کی وسوسہ اندازی استعداد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے ۷۶
- نوشتۂ تقدیر کو تاہی کا عذر نہیں بن سکتا، مگر اس سے الزام رفع کیا جاسکتا ہے ۸۲
- آدم علیہ السلام کی لغزش میں دو پہلو: ایک: ان کی ذات سے متعلق دوسرا: نظام عالم سے متعلق ۸۳
- ائمہ نے ذراری مشرکین میں توقف کیا ہے اور توقف کے معنی ۹۱
- جزاء وسزا کے لئے کامل اختیار ضروری نہیں، ایک حد تک اختیار کافی ہے ۹۵
- نصوص فہمی کیلئے دو باتیں ضروری ہیں: ایک: نص کا مقصد متعین کرنا دوم: ضمنی باتوں کا موقع اور مصداق متعین کرنا ۹۸
- حدیث اور سنت میں عام خاص من وجہ کی نسبت ہے ۱۱۲
- تحریف کے پانچ اسباب: تہاون، تشدد، تعمق، خلطِ ملت اور استحسان ۱۱۲
- اہل حق میں اختلاف: فروعات میں ہے۔ اصول میں نہیں ۱۲۳

- فریضۂ عادلہ کا علم: کونسا علم ہے؟ ۱۳۵
- تفسیر بالرائے کی تفسیر از حضرت نانوتوی قدس سرہ ۱۳۹
- مراعاتِ اختلاف سے مذہب کا مکروہ لازم نہ آئے تو احتیاط اَولیٰ ہے ۱۵۱
- جَر کی قراءت کی توجیہ کہ مسح کے دو معنی ہیں الی آخرہ ۱۶۸
- جو کام دونوں ہاتھوں یا دونوں پیروں سے کئے جاتے ہیں ان میں دائیں کو ترجیح دینی چاہئے ۱۷۲
- اس سوال کا جواب کہ قرآن کی طرح نبی بھی شعائر اللہ میں سے ہے، پھر ان کی ہم نشینی کے لئے طہارت کیوں شرط نہیں؟ ۲۱۷
- کھجور کی ٹہنی چیر کر قبروں پر گاڑنے کی وجہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم شریف کی روایت میں بیان کی ہے کہ آپؐ نے اہل قبور کے لئے سفارش کی تھی جو موقت طور پر قبول ہوئی تھی ۲۴۱
- عشاء کی نماز اس امت کی خاص نماز ہے یا پہلے بھی یہ نماز تھی؟ ۳۰۳
- جنت و جہنم اُن چیزوں کا مرکز و منبع ہیں جن کا اس عالم میں فیضان ہوتا ہے ۳۱۱
- غیر نبی بھی خواب یا الہام کے ذریعہ اللہ کی مراد سے واقف ہوسکتا ہے، مگر وہ شرعاً حجت نہیں، جب تک اس کو تائید نبوی حاصل نہ ہو ۳۲۳
- یوتر الإقامة میں ایتار صوتی مراد ہے، ایتار کلماتی مراد نہیں ۳۲۶
- چار ہی مساجد بالیقین نبیوں کی بنائی ہوئی ہیں ۳۴۳
- اولیاء کی قبروں کی زیارت کے لئے سفر کر کے جانا جائز ہے یا نہیں؟ ۳۴۴
- قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز ہے. ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا اختلاف اور اس کا جواب ۳۴۵
- حمام: نہانے کے ہوٹل ہوتے تھے ۳۵۶
- یہ خیال کہ کھلے سر نماز پڑھنا سنت یا مستحب ہے صحیح نہیں ۳۶۰
- نمازی کے سامنے سے گذرنے کی حدیث میں قطع وصلہ مراد ہے اور عورت سے مرغوبات، گدھے سے مستقذرات اور کالے کتے سے مخوفات مراد ہیں ۳۷۷
- فرائض سے عبادت کا قوام ہوتا ہے۔ واجبات سے صورت کی اور سنتوں سے حقیقت کی تکمیل ہوتی ہے ۳۸۲
- ہر جزء سے کل مراد نہیں لیا جاتا۔ اہم جزء ہی سے کل مراد لیا جاتا ہے ۳۸۴
- حیوانات و نباتات میں قانونِ قدرت یہ ہے کہ ہر چیز کی دو جانب ہوں جو مل کر ایک چیز بنیں ۴۰۲
- فرض کی آخری دو رکعتیں خالی اس لئے ہیں کہ وہ اضافہ شدہ رکعتیں ہیں ۴۰۵
- تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں؟ ۴۱۳
- تحیۃ کی فرضیت یا وجوب کا مسئلہ یہ طے کرنے پر موقوف ہے کہ نماز کی حقیقت کیا ہے؟ ۴۲۲

- آمین کہنے میں فرشتوں کے ساتھ موافقت کی دو تفسیریں ۴۲۴
- رفع یدین کے بارے میں دو نقطۂ نظر: تعظیم عملی اور تحزم ۴۳۵
- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کوئی حکم منسوخ ہوتا تھا تو اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا جاتا تھا ۴۳۶
- نماز میں کلام کی مطلق گنجائش نہیں۔ البتہ عمل قلیل کی گنجائش ہے۔ ۴۶۰
- سجدۂ تلاوت کا حکم طے کرنے میں خود آیات سجدہ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۴۷۰
- سورۃ النجم کے سجدہ میں مشرکین کیوں شریک ہوئے تھے؟ ۴۷۱
- فجر کی سنتیں دنیا و مافیہا سے بہتر کیوں ہیں؟ ۴۷۶
- ''چاہے گھوڑے روند ڈالیں فجر کی سنتیں نہ چھوڑو'' کا مطلب ۴۷۷
- اشراق تک مسجد میں رکنا یومیہ اعتکاف ہے ۴۷۷
- شیطان کا سونے والے کی گدی پر تین گرہیں لگانا حقیقت ہے ۴۸۴
- وتر اور صلاۃ اللیل الگ الگ نمازیں ہیں یا ایک؟ احناف کے نزدیک الگ الگ نمازیں ہیں: ایک واجب ہے اور ایک سنت اور شوافع کے نزدیک دونوں ایک ہی نماز ہیں۔ فرق برائے نام ہے اور سنت ہیں۔ شاہ صاحب کی رائے شوافع کے موافق ہے۔ ۴۹۳
- ثبوت اور دلالت کی قطعیت وظنیت کے اعتبار سے ادلہ کی چار قسمیں (حاشیہ) ۴۹۴
- وتر کا وجوب: روایات مع قرائن منضمہ سے ثابت ہے ۴۹۵
- وتر کے وجوب وسنیت کا اختلاف محض لفظی اختلاف ہے ۴۹۶
- تہجد کی رکعتوں کی کمی بیشی کی وجہ ۴۹۸
- **کان یوتر بر کعۃ اور أوتر بر کعۃ کا مطلب** ۵۰۱
- تشریع احکام کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ نبی اور امت دونوں کسی حکم کو چاہیں ۵۰۴
- حضرت عمرؓ کا تراویح کو ''نہایت عمدہ نئی بات'' کہنے کی وجہ ۵۰۸
- تراویح اور تہجد دو الگ الگ نمازیں ہیں ۵۰۸
- ترجمہ شیخ الہند میں ﴿ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ کے حاشیہ پر نوٹ لکھنا ضروری ہے (حاشیہ) ۵۱۸
- اس اشکال کا مفصل جواب کہ خواب میں بھی امتی نبی سے آگے کیسے ہو گیا؟ ۵۲۱
- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صلاۃ استسقاء نہیں ہے یعنی جائز نہیں ہے، یہ ان کے قول کی صحیح تعبیر نہیں ۵۳۰
- عبادات میں بے اعتدالی سے طبیعت میں ملال پیدا ہوتا ہے۔ معاشی معاملات درہم برہم ہوتے ہیں، دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ عبادت کی لذت محسوس نہیں ہوتی، دین میں غلو کا راستہ کھلتا ہے اور آدمی کے تصورات اس کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں ۵۳۷

- مسافر کی نماز میں دو اعتبار ہیں: ایک اعتبار سے قصر ہے جس کا قرآن میں تذکرہ ہے اور دوسرے اعتبار سے پوری نماز ہے جس کا حدیثوں میں تذکرہ ہے .. ۵۴۹
- مسافر کے لئے اتمام جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف دو باتوں پر مبنی ہے ۵۵۱
- کتاب الحجة علی أهل المدينة میں اہل مدینہ سے صرف امام مالکؒ مراد نہیں۔ بلکہ حجازی مکتب فکر مراد ہے ۵۵۶
- حجازی اور عراقی مکاتب فکر کے اختلافات کی تاریخ یہ ہے کہ بعض مسائل میں رفتہ رفتہ اختلاف مضمحل ہوگیا۔ جیسے مسافت قصر کا مسئلہ۔ اور بعض میں سخت ہوگیا، جیسے جہری نماز میں مقتدی پر فاتحہ کی فرضیت کا مسئلہ ۵۵۷
- جمع بین الصلاتین کا جواز صحیح اور صریح نص ہی سے ہوسکتا ہے، عقلی دلائل سے نہیں ہوسکتا ۵۶۰
- علماء اور قراء کو ہر اہم دینی معاملہ میں مقدم رکھنا چاہئے ۵۸۴
- یوم جمعہ کی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں چار اہم واقعات زمانہ ماضی میں پیش آچکے ہیں۔ ایک آئندہ پیش آنے والا ہے اور ایک مزیت ہر جمعہ میں بالفعل ہے۔ یعنی اس میں ساعت مرجوہ ہے ۶۰۰
- حیوانات پر جمعہ کے دن قیامت بپا ہونے کا علم ملأ سافل سے نازل ہوتا ہے ۶۰۱
- یہود نے بارکا اور نصاریٰ نے اتوار کا جو انتخاب کیا تھا: وہ ان کے حق میں برحق تھا ۶۰۲
- اجتہادی مسائل میں نفس الامر کے اعتبار سے حق ایک ہوتا ہے، مگر عمل کے اعتبار سے حق متعدد ہوتے ہیں ۶۰۲
- خواتین کو عید کی نماز میں پند و موعظت سے استفادہ کے لئے شریک کیا جاتا تھا..... .. ۶۲۷
- قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں کے احوال کو اپنی طرف کیوں منسوب کریں گے؟ ۶۴۵
- تراویح کا نظام قائم کرنے کا مشورہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ دیا تھا ۶۴۵
- نوع انسانی کی ماہیت کا وجود روح اعظم اور انسان اکبر کہلاتا ہے ۶۴۶
- اگر کوئی اللہ تعالیٰ کو خواب میں مناسب یا نامناسب حالت میں دیکھے تو وہ دیکھنے والے کے احوال کا عکس ہوتا ہے ۶۴۶
- عمرانی زندگی کو سنوارنے والے کام اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں .. ۶۴۷
- حتی اکون احبّ إليه میں محبت عقلی مراد ہے ۶۵۷
- مریض کو یٰسٓ ایسے وقت سنانی چاہئے، جب اسے کچھ ہوش ہو ۶۶۳
- ترجیع: (إنا لله وإنا إليه راجعون) چار مضامین پر مشتمل ہے ۶۶۵
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے استسقاء میں جو حضرت عباسؓ کا توسل کیا تھا، اس سے معروف توسل مراد نہیں۔ بلکہ ان سے بارش کی دعا کروائی تھی۔ عمدۃ القاری میں واقعہ کی پوری تفصیل ہے ۶۸۰
- زیارت قبور کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ ۶۸۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُخن ہائے گفتنی

اگر روید از تن صد زبانم چوسوسن، شکرِ لطفش کے توانم[1]

رحمۃ اللہ الواسعہ جلد دوم کے پیش لفظ میں عرض کیا تھا کہ آگے شرح کا مسودہ تیار نہیں۔ قارئین کرام کو کم از کم دو سال کا انتظار کرنا پڑے گا۔ مگر فضلِ خداوندی سے جلد سوم صرف تین ماہ میں تیار ہوگئی۔ رمضان میں لندن میں قیام رہا۔ وہاں سے واپسی پر ۱۵ شوال سے کام شروع کیا۔ اور ۱۳ محرم ۱۴۲۳ ہجری میں یہ جلد تکمیل پذیر ہوئی۔ اور اس کی طباعت کا فیصلہ کیا گیا۔ اب یہ قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔

اس جلد میں مشکوٰۃ شریف کی کتاب الایمان، باب الکبائر وعلامات النفاق، باب الوسوسہ، باب الایمان بالقدر، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب العلم، کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلاۃ مع باب الجنائز کی احادیث کی شرح کی گئی ہے۔ اور ان احادیث میں مذکورہ احکام شرعیہ کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس جلد میں بہت سے اہم مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اور شاہ صاحب قدس سرہ چونکہ غایتِ ایجاز سے کام لیتے ہیں، بلکہ کہیں تو صرف اشارہ کرتے ہیں، اس لئے شرح میں تفصیل ناگزیر ہوگئی۔ بہرحال:

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

☆ ☆ ☆

رحمۃ اللہ الواسعہ کی جلد سوم سے حجۃ اللہ البالغہ کی قسم دوم شروع ہو رہی ہے۔ قسم اول میں وہ قواعد کلیہ اور ضوابط عامہ بیان کئے گئے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر شریعت اسلامیہ میں ملحوظ اسرار ورموز اور حِکَم ومصالح کو مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ یعنی راسخین فی العلم یہ کام خود انجام دے سکتے ہیں۔ اور قسم ثانی میں تفصیل سے شریعت کے اسرار وحکم بیان کئے ہیں۔ اور

[1] سوسن آسمانی رنگ کا ایک پھول ہے، جسے شعراء زبان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ترجمہ: اگر میرے جسم میں سوسن کی طرح سو زبانیں نمودار ہوں، تو بھی میں ان کی عنایات کا شکر کب ادا کر سکتا ہوں!

احادیث کو بنیاد بنا کر یہ کام انجام دیا ہے۔ جس سے "ہم خرما ہم ثواب" والی بات صادق آ گئی ہے۔ غرض دونوں قسموں کے مندرجات کا فرق ایک مثال سے واضح ہوگا:

ایک باکمال باورچی پلاؤ قورمہ پکانے کی ترکیب لوگوں کو بتائے، پھر دیگ اتارے اور کھانا پکا کر پیش کر دے۔ تو ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ہر شخص مطلوبہ کھانا تیار نہیں کر سکتا، اور دوسری صورت میں صرف کھانے کی دیر رہتی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی قسم اول میں اسرار و حِکَم جاننے کا فارمولہ پیش کیا ہے۔ مگر فارمولہ چونکہ نظری ہوتا ہے، اس لئے اس کے فہم میں دقت پیش آتی ہے۔ اور کبھی اس کو عملی جامہ پہنانا دشوار ہوتا ہے۔ اور قسم دوم میں مائدہ بچھا دیا ہے۔ اب بڑھیں بھوکے خواہش مند، اور بھریں دامن مراد!

البتہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دیگ تیار کر کے اس پر بھاری ڈھکن رکھ دیا تھا۔ جس کو ہر شخص سرکا نہیں سکتا تھا۔ کوئی موسیٰ ہی کنویں کے اس پتھر کو ہٹا سکتا تھا۔ شارح نے راغبین کی سہولت کے لئے اس ڈھکن کو سرکا دیا ہے۔ بلکہ کھانا برتنوں میں نکال کر دسترخوان سجا دیا ہے۔ اب یہ فیصلہ قارئین کرام کو کرنا ہے کہ شارح نے یہ خدمت بخوبی انجام دی ہے یا نہیں؟ میاں مٹھو بننا ٹھیک نہیں!

☆ ☆ ☆

رحمۃ اللہ الواسعہ کی پہلی دو جلدوں کی قارئین کرام اور ارباب نظر نے توقع سے زیادہ پذیرائی کی۔ مکرم و محترم جناب مولانا واصف حسین ندیم الواجدی صاحب نے ماہنامہ ترجمان دیوبند (جلد ۳ شمارہ ۲ بابت ماہ ذی قعدہ سن ۱۴۲۲ ہجری) میں اور شیخوپورہ (اعظم گڈھ) کے حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نے، جو شارح کے خواجہ تاش ہیں، ماہنامہ ضیاء الاسلام (جلد ۲ شمارہ ۵ بابت صفر سن ۱۴۲۳ ہجری) میں اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی اعظمی نے رسالہ دار العلوم (جلد ۸۶ شمارہ ۵ و ۶ بابت صفر سن ۱۴۲۳ ہجری) میں، اور حضرت مولانا زین العابدین صاحب اعظمی نے رسالہ مظاہر علوم میں، اور برادر مکرم مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری نے رسالہ ندائے شاہی میں ایسے وقیع تبصرے فرمائے کہ کلاہ دہقاں بہ آفتاب رسید! اور زبانی ذرہ نوازی کرنے والے قارئین اور اہل علم کا تو شمار ہی نہیں۔ شارح ان سب بزرگوں، دوستوں اور قارئین کی تشجیع کا ممنون و مشکور ہے۔ ان کے تاثرات سے شارح کو حوصلہ ملا ہے، اور کام تیز تر ہو گیا ہے **فالحمد للہ!**

☆ ☆ ☆

ایک خاص بات. جسے لوگوں نے بہت سراہا ہے. وہ شرح کا نام ہے۔ مگر عام طور پر ایسا خیال کیا گیا ہے کہ یہ نام بس اتفاقاً ہاتھ آ گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جہاں سے حضرت شاہ صاحب نے اپنی کتاب کا نام رکھا ہے اور جس مناسبت سے رکھا ہے، اسی جگہ سے اور اسی وجہ سے شرح کا نام بھی اخذ کیا گیا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے سورۃ الانعام آیت ۱۴۹ سے اپنی کتاب کا نام لیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے: ﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ اس آیت میں تین باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ (۱) انسانوں کو مکلف کیوں بنایا گیا ہے، دیگر حیوانات کی طرح اسے بھی ''مہمل'' کیوں نہیں چھوڑا گیا؟ (۲) انسانوں کے لئے جزاؤ سزا کیوں ہے؟ دیگر حیوانات کی طرح وہ بھی مرفوع القلم کیوں نہیں؟ (۳) شریعت: حکم ومصالح پر مشتمل ہے۔ اور چونکہ حجۃ اللہ البالغہ میں بھی یہی تین باتیں بیان کی گئی ہیں، اس لئے آپ نے کتاب کا یہ نام رکھا ہے۔

مذکورہ آیت سے ایک آیت پہلے ہے: ﴿فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ﴾ اس آیت میں بھی مذکورہ تینوں باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ مضمون یہ چل رہا ہے کہ یہود پر بعض عارضی مصالح سے یا ان کی شرارتوں کی وجہ سے بعض چیزیں حرام کی گئی تھیں۔ جیسے اونٹ کا گوشت اور چربی ان پر حرام تھی۔ اور ان کا یہ دعوی سراسر غلط تھا کہ یہ چیزیں ابراہیم ونوح علیہما السلام کے زمانہ ہی سے حرام چلی آرہی ہیں۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ اگر شریعت اسلامیہ برحق ہوتی تو وہ سابقہ شرائع سے مختلف کیسے ہوتی! اس آیت میں ان کو جواب دیا گیا ہے کہ تمام شرائع میں اصل محرمات یہ ہیں: (۱) مردار (۲) بہنے والا خون (۳) سور کا گوشت (۴) اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور۔ اونٹ اور چربی کی حرمت اصل شرائع میں نہیں تھی۔ اس کے بعد فرمایا: ''اگر وہ (یہود) آپ کو جھٹلائیں تو آپ کہہ دیں: تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے'' یعنی تمہاری سزا ٹل نہیں گئی۔ بس رحمت کی سمائی سے اب تک تم بچے ہوئے ہو۔ ورنہ اللہ کا عذاب مجرموں سے پھیرا نہیں جاتا۔ وہ ضرور پہنچ کر رہے گا۔

غرض اس آیت میں بھی مذکورہ بالا تین باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جب شرائع میں بعض عارضی مصالح کا اعتبار کیا جاتا ہے، تو دائمی اور مستقل مصالح کا تو بدرجۂ اولی اعتبار کیا جائے گا۔ اور جس ملت کو جو آئین ملا ہے وہ اس پر عمل کی پابند ہے۔ یہی تکلیف شرعی ہے۔ اور جو تکذیب پر اڑا رہے گا وہ سزا پائے گا۔ یہ مجازات ہے۔ پس شاہ صاحب رحمہ اللہ کی کتاب کی جو وجہ تسمیہ ہے، وہی اس کی شرح کی بھی وجہ تسمیہ ہے۔ یہ بات جلد اول کے پیش لفظ میں آنی چاہئے تھی۔ مگر رہ گئی تھی اس لئے اس کی یہاں وضاحت ضروری خیال کی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس جلد میں چند ایسے مسائل آئے ہیں: جن میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف اختیار کیا ہے۔ جیسے نماز میں فاتحہ کی فرضیت کا مسئلہ یعنی فاتحہ نماز میں فرض ہے یا واجب؟ مقتدی کی قراءت کا مسئلہ مراد نہیں۔ اس میں شاہ صاحب نے شوافع کے مسلک کو ترجیح نہیں دی۔ اور رکوع میں جاتے اور اٹھتے رفع یدین کی سنیت کا مسئلہ۔ اور

قلتین کی حدیث سے مائے کثیر وقلیل کی حد بندی کا مسئلہ۔ اور بعض جگہ امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک کی طرف میلان پایا جاتا ہے، جیسے حیض کی اقل واکثر مدت کا مسئلہ۔ اور بعض جگہ امام احمد رحمہ اللہ کے مسلک کو پسند کیا ہے۔ جیسے نماز میں کلام قلیل کی گنجائش کا مسئلہ۔ ایسی تمام جگہوں میں اور ان کے علاوہ دیگر اختلافی مسائل میں شرح میں دو باتوں کا التزام کیا گیا ہے:

پہلی بات: امانتِ علمی کے حق کی ادائیگی کے لئے شارح کے نزدیک جو بات حق تھی، اُسے ادب واحترام کے تقاضوں کا پورا لحاظ رکھ کر، پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ قاری کے سامنے مسئلہ کے دونوں پہلو آجائیں۔ اور وہ علی وجہ البصیرت فیصلہ کر سکے۔

دوسری بات: اہم اختلافی مسائل میں مدارکِ اجتہاد بیان کئے گئے ہیں یعنی وہ نقطہ ابھارا گیا ہے جو اختلاف کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اختلافِ ادلّہ کی صورت میں مؤثر نقطۂ نظر ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح نصوص فہمی پر بھی نقطۂ نظر کا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً رفع یدین کی سنیت وعدم سنیت میں اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ رفع یدین: تکبیر فعلی یعنی تعظیم عملی ہے یا اس کا مقصد تحرم ہے اور وہ محض ایک حرکت ہے جو نماز کے منافی ہے؟ پہلا نقطۂ نظر: حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد رحمہما اللہ کا ہے، چنانچہ وہ سنیتِ رفع کے قائل ہوئے۔ اور دوسرا نقطۂ نظر امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا ہے۔ چنانچہ وہ نماز میں کسی بھی جگہ رفع یدین کی سنیت کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ کراہیت کے قائل ہیں (اور تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین نماز سے باہر ہے۔ نماز کا آغاز تکبیر سے ہوتا ہے) اور جب نقطۂ نظر مختلف ہو جاتا ہے تو دلائل میں الجھنا بے کار ہو جاتا ہے۔ جب تک نقطۂ نظر نہ بدلے: فیصلہ اور ترجیح کا رخ نہیں بدل سکتا۔

☆ ☆ ☆

خیر یہ باتیں تو موضوع سے ہٹی ہوئی ہیں یعنی ضمناً یہ باتیں کتاب میں زیر بحث آئی ہیں۔ مگر جو کتاب کا اصل موضوع ہے یعنی شریعت کے اسرار وحکم کا بیان. اس میں یہ کتاب لاجواب ہے۔ اسلامی کتب خانہ میں اس کی نہ کوئی مثال ہے نہ مثیل۔ موضوع کے تعلق سے حجۃ اللہ البالغہ کے ـــــ بطور مثال ـــــ تین امتیازات ہیں.

پہلا امتیاز: حکمتِ شرعیہ کے موضوع پر حجۃ اللہ سے پہلے بھی کتابیں لکھی گئی ہیں اور بعد میں بھی۔ بعد کی کتابیں یہ ہیں: علامہ حسین جسر طرابلسی کی الرسالة الحميدية في حقيقة الديانة الإسلامية اور حکیم الامت حضرت تھانوی کی المصالح العقلية للأحكام النقلية یعنی احکام اسلام عقل کی روشنی میں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے وہ تشفی حاصل نہیں ہوتی جو حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب قدس سرہ نصوص (قرآن

وحدیث) کو بنیاد بنا کر حکمتیں بیان کرتے ہیں۔اور بہت سی مصلحتوں کی طرف خود نصوص میں اشارے آئے ہیں۔اس لئے آدمی جب نص پڑھ کر اس کی روشنی میں حکم کی مصلحت پڑھتا ہے تو اسے شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جو حدیثیں مختصر لکھی ہیں: شرح میں وہ پوری مع حوالہ لکھی گئی ہیں، جس سے کتاب طویل تو ہوگئی ہے، مگر حکمت کے سمجھنے میں وہ بہت مددگار ثابت ہوگی۔

دوسرا امتیاز: حکمت شرعیہ کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں پوری شریعت کے اسرار وحکم کو بیان کرنے کا التزام نہیں کیا گیا۔اہم احکام کی حکمتیں بیان کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ جبکہ حجۃ اللہ میں ایک ایک جزئیہ کی وجہ بیان کی گئی ہے۔اور پوری شریعت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ایک مربوط ومنظم سلسلہ نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے اسلام کو ایک مکمل نظام اور مرتبط الاجزاء نظام حیات کی حیثیت سے اسی کتاب سے جانا ہے''

تیسرا امتیاز: حکمت شرعیہ: احکام اسلام کو عقل کی روشنی میں پیش کرنے کا نام ہے۔اور عقل سے مراد: عقل اکتسابی نہیں ہے، جو مناطقہ، دانشوران قوم اور زیرک وذہین لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ عام انسانی عقل مراد ہے۔ جو سبھی لوگوں کو کم وبیش حاصل ہوتی ہے۔مگر اس کا قدر مشترک کیا ہے؟ یہ بات دیگر مصنفین نے منقح نہیں کی۔شاہ صاحب قدس سرہ نے قدر مشترک منتزع کیا ہے۔اور اس کی روشنی میں احکام اسلام کو پیش کیا ہے۔اور عقل مشترک کی تنقیح شاہ صاحب نے کس طرح کی ہے، اس کی وضاحت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی اعظمی زید مجدہٗ (مدیر رسالہ دارالعلوم) نے رحمۃ اللہ الواسعہ پر اپنے تبصرہ میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی حکمت آفریں طبیعت کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی عالمگیر روح کو بے نقاب کیا۔اس اہم ترین اور بے نظیر کارنامہ کو انجام دینے کی غرض سے انھوں نے مجموعۂ انسانیت کو اپنی فکر کا محور بنایا۔ کل نوع کے خواص کیا ہیں۔انسانیت کے بہ حیثیت مجموعی تقاضے کیا ہیں۔ انسان اپنی زندگی کو کس طرح منظم کرتے ہیں۔ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح باہمی رشتے قائم ہوتے ہیں۔اور حالات کے ساتھ ان میں کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ بہ الفاظِ واضح انسانیت کیا ہے؟ اس کے جسمانی مطالبے کیا ہیں؟ اس کا دماغ کیا سوچتا ہے؟ اور اس کی روح کیا چاہتی ہے؟ کائنات سے اسے کیا نسبت ہے؟ اور کائنات کے خالق اور اس کے درمیان کیا علاقہ ہے؟ الدور السازغة، الخير الكثير، ألطاف القدس وغیرہ اپنی یادگار زمانہ تصانیف میں ان مباحث پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔اور پھر اپنی سب سے اہم، یگانۂ روزگار اور معرکۃ الآراء تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے انسانی حکمت کے اصولوں اور اسلامی شریعت کے درمیان مطابقت کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ

انسانیت کے عمومی تصور اور اس کی عملی شکل یعنی اسلامی شریعت میں کوئی تضاد نہیں۔ بلکہ ایک تصور ہے اور ایک اس کا عملی نمونہ (رسالہ دارالعلوم ص ۷ ۱ مئی جون ۲۰۰۲ عیسوی)

سوال: جب شاہ صاحب رحمہ اللہ عام انسانی عقل کے معیار سے حکمتیں بیان کرتے ہیں، تو پھر ان کی باتیں عام لوگوں کے فہم سے بالاتر کیوں ہیں؟

جواب: اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: آپ کے ذہن کی بلند پروازی ہے۔ حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی زید مجدہ نے رحمۃ اللہ الواسعہ پر اپنے تبصرہ میں ارواح ثلاثہ (ص ۲۸۵) سے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا یہ مقولہ نقل کیا ہے:

''مشاہیر امت میں تین قسم کے افراد گذرے ہیں: (۱) بعض ایسے ہیں کہ حقائقِ شرعیہ میں ان کا ذہن طول وعرض میں چلتا ہے۔ جیسے امام رازی کہ ہر مسئلہ میں پھیلتے زیادہ ہیں۔ اور ترتیب وتفصیل وتہذیب مواد میں زیادہ مستعد ہیں (۲) بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذہن علو کی طرف زیادہ چلتا ہے۔ جیسے شاہ صاحب رحمہ اللہ کہ حقائق میں اس قدر بلند پرواز ہیں کہ اصحاب ذوق کو بھی ان کے مدرک تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے (۳) اور بعض ایسے ہیں جن کا ذہن عمق کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہ ہر مسئلہ کی تہ اور اصلیت کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ اور ایسی اصل قائم فرما دیتے ہیں کہ سیکڑوں تفریعات اس سے ممکن ہو جاتی ہیں'' (رسالہ ضیاء الاسلام ص ۳۲ جلد ۲ شمارہ ۶ بابت صفر سن ۱۴۲۳ ہجری)

احقر عرض کرتا ہے کہ خود حضرت نانوتوی قدس سرہ کا شمار دوسری قسم کے افراد میں ہے۔ میں نے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ سے یہ واقعہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ جلالین کے مدرس کو کوئی اشکال پیش آیا۔ اس نے احباب سے ذکر کیا۔ کسی سے حل نہ ہوا۔ تو چند اساتذہ مل کر مسجد چھتہ میں حضرت نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اشکال پیش کیا۔ آپ نے جواب دیا، مگر اساتذہ کے پلے کچھ نہ پڑا۔ ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت ذرا نزول فرما کر بیان فرمائیں۔ قدرے توقف کے بعد دوبارہ تقریر فرمائی۔ اس بار الفاظ تو پلے پڑے، مگر مطلب اب بھی سمجھ میں نہ آیا۔ عرض کیا گیا کہ حضرت کچھ اور نزول فرما کر ارشاد فرمائیں۔ فرمایا کہ اس وقت تو اتنا ہی ممکن ہے۔ کسی دوسرے وقت آپ حضرات تشریف لائیں —— اسی علو اور بلند پروازی کی وجہ سے آپ کی باتیں بھی عام لوگوں کے فہم سے بالاتر ہیں۔

غرض: شاہ صاحب کے کلام میں جہاں ایسی نوبت آئی ہے، وہاں ان کی بات کو سمجھانے کی پوری کوشش کرنے کے بعد شارح نے متبادل حکمت بیان کی ہے یا اشکال کا آسان جواب دیا ہے، تاکہ بات عام لوگوں کے لئے بھی قابل فہم ہو جائے۔

دوسری وجہ: مخصوص اصطلاحات، انوکھی تعبیرات اور کلام میں غایت درجہ ایجاز ہے۔ کبھی تو آدھی بات پر اکتفا

کرتے ہیں۔اور کبھی العاقل تکفیہ الإشارۃ پر عمل کرتے ہیں۔اس لئے فہم میں دشواری پیش آتی ہے۔چنانچہ شرح میں اصطلاحات کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے۔عام فہم انداز اختیار کیا ہے اور بات کھول کر بیان کی ہے۔جس سے شرح طویل تو ہوگئی، مگر مضمون فہمی میں ان شاء اللہ کوئی پریشانی پیش نہیں آئے گی۔

☆ ☆ ☆

مذکورہ بالا امتیازات کی وجہ سے اور دیگر بہت سی خوبیوں کی وجہ سے ہر ذی علم کو خاص طور پر حدیث شریف کے اساتذہ اور طلبہ کو اس جلد سے کتاب کا مطالعہ شروع کرنا چاہئے۔اساتذہ کی تدریس میں اس سے چار چاند لگ جائیں گے۔اور طلبہ کے علم میں گہرائی اور فہم میں گیرائی پیدا ہوگی۔اور دو فائدے مزید حاصل ہوں گے:

پہلا فائدہ: ذہانت سے بہرہ ور ہوں گے۔ذہن میں تیزی پیدا ہوگی اور جلد بات سمجھنے کا ملکہ حاصل ہوگا۔حضرت استاذ الاستاذ: شیخ الہند قدس سرہ نے اپنے استاذ امام اکبر حضرت نانوتوی قدس سرہ کا مقولہ نقل فرمایا ہے کہ: ''امت میں تین شخصیتیں ایسی ہیں، جن کی کتابوں سے ربط رکھا جائے، تو آدمی خواہ کتنا بھی غبی ہو. ذہین ہو جاتا ہے ایک: شاہ ولی اللہ صاحب۔دوسرے: حضرت مجدد الف ثانی۔تیسرے شیخ محی الدین ابن عربی'' پھر شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ایک شخصیت کا میں اضافہ کرتا ہوں۔اور وہ ہیں حضرت الاستاذ'' یعنی حضرت نانوتوی قدس سرہ۔

دوسرا فائدہ: حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ سے آہستہ آہستہ مزاج بنے گا۔اور لوگوں کے سامنے حکمت سے دین پیش کرنے کا سلیقہ پیدا ہوگا۔زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔عقلیت پسندی کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔اور یوروپ وامریکہ میں تو ہو چکا ہے۔وہاں ہر شخص: ہر حکم شرعی کی وجہ پوچھتا ہے۔اور وہی عالم. دین کے افہام وتفہیم میں کامیاب ہے جو حقائق ومعارف سے آگاہ ہے۔اور یہ متاع گرانمایہ ان شاء اللہ اس کتاب سے حاصل ہوگی۔

تنبیہ: مغربی دنیا کا یہ مزاج ایک حد تک خطرناک ہے۔عام لوگ نہ احکام کے مصالح کا ادراک کر سکتے ہیں، نہ ہر عالم ان کی وضاحت پر قادر ہوتا ہے۔ثبوت احکام کا اصل مدار نصوص شرعیہ پر ہے۔جب کوئی حکم قرآن وحدیث سے ثابت ہو جائے تو اس کے قبول وامتثال میں حکمت ومصلحت کے معلوم ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔کتاب کے آغاز میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے بھی اس پر تنبیہ کی ہے۔رحمۃ اللہ الواسعہ جلد اول (ص ۱۰۹) عنوان: ''احکام پر عمل پیرا ہونا حکمتوں کے جاننے پر موقوف نہیں'' ملاحظہ فرمائیں۔شارع اور مکلفین کی مثال: حاذق حکیم اور بیمار انسانوں جیسی ہے۔جب حکیم نسخہ تجویز کرتا ہے تو مریض اس پر اعتماد کرتا ہے۔مفردات کے خواص اور مرکبات کے فوائد جاننے تک. نسخہ کے استعمال میں توقف نہیں کرتا۔

غرض اس ذہنیت کو بڑھاوا نہیں دینا چاہئے۔ اور عام لوگوں کے سامنے بے ضرورت احکام کی حکمتیں بیان نہیں کرنی چاہئیں۔ مجھ سے یوروپ وامریکہ میں لوگ ایک سوال کرتے ہیں کہ دونمازیں (ظہر اور عصر) خاموش کیوں پڑھی جاتی ہیں؟ میں جواب دیتا ہوں کہ یہی سوال حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے کیا گیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: **فی کل صلاۃ نقرأ، فما أسمعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أسمعناکم، وما أخفی علینا أخفینا منکم** (رواہ النسائی وابوداؤد جامع الاصول حدیث ۳۴۷۳) یعنی قراءت تو سب نمازوں میں ہے۔ البتہ جونمازیں آپؐ نے جہراً پڑھائی ہیں: ہم بھی جہراً پڑھاتے ہیں۔ اور جو سراً پڑھائی ہیں: ہم بھی سراً پڑھاتے ہیں۔ یہ روایت سنا کر میں سائل سے سوال کرتا ہوں کہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کو وجہ معلوم تھی یا نہیں کہ دونمازیں سری کیوں ہیں؟ اگر ان کو وجہ معلوم نہیں تھی تو میں ان سے زیادہ علم نہیں رکھتا۔ اور معلوم تھی تو کیوں بیان نہیں کی؟ اس لئے بیان نہیں کی کہ مخاطبین کما حقہ اس کا ادراک نہیں کرسکتے تھے۔ تو کیا آپ حضرات کی استعداد اُن تابعین سے زیادہ ہے! ہمارے اور آپ کے لئے اچھا راستہ وہی ہے جس کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نشان دہی کی ہے کہ نص کی پیروی کی جائے۔ اس سے زیادہ کی فکر میں نہ پڑا جائے۔

☆ ☆ ☆

اس جلد میں دو فہرستیں شامل کی گئی ہیں: ایک: فہرستِ مضامین ہے۔ جس میں کتاب کے مرکزی عناوین لئے گئے ہیں۔ ضمنی باتوں اور دیگر فوائد کے لئے ''فہرست فوائد'' مرتب کی گئی ہے۔ اس کے مضامین زیادہ تر شرح میں بیان ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ اس سے بھی قارئین کو فائدہ ہوگا۔ **واللہ الموفق والحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین، وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.**

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
خادم دارالعلوم دیوبند
جمعہ یکم جمادی الاولی ۱۴۲۳ ہجری
مطابق ۱۲ جولائی ۲۰۰۲ عیسوی

دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حِکم کا بیان

کتاب الایمان

و

کتاب الاعتصام

کتاب الایمان میں باب الکبائر وعلامات النفاق، باب الوسوسة اور باب الإیمان بالقدر کی احادیث کی بھی شرح کی گئی ہے ـــــ اور باب الاعتصام بالکتاب والسنَّة میں باب العلم کی احادیث کی بھی شرح کی گئی ہے

(اور)

من أبواب کذا سے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی مراد اس باب کی ''اصولی باتیں'' ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسمِ ثانی

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حِکم کا بیان

پہلی قسم میں ''قواعد کلیہ'' کا بیان تھا۔ یعنی اس میں وہ اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں، جن کا تعلق بالا جمال تمام نصوص سے ہے۔ اُن مباحث کا تعلق کسی خاص باب یا خاص مسئلہ یا خاص آیت وحدیث سے نہیں ہے۔ اب قسم ثانی میں ابواب وار احادیث مرفوعہ کی اچھی خاصی مقدار کی شرح کرتے ہیں یعنی تمام احادیث کی شرح نہیں کی گئی۔ اور اُن نصوص میں مذکور احکام شرعیہ کے رموز و اسرار بیان کرتے ہیں۔

یہاں دو باتیں ذہن نشیں کر لی جائیں:

پہلی بات: حجۃ اللہ میں حدیثوں کے حوالے نہیں دیئے گئے۔ کیونکہ یہ سب معروف حدیثیں ہیں۔ اور حدیث شریف کی چار بنیادی کتابوں: بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی شریف سے لی گئی ہیں۔ دیگر کتابوں سے شاذ و نادر ہی کوئی حدیث لی ہے۔ البتہ تبعاً اور ضمناً دوسری کتابوں کی حدیثیں بھی آئی ہیں (اور شرح میں بھی احادیث کی مفصل تخریج نہیں کی گئی، کیونکہ اس سے کتاب طویل ہو جاتی۔ جو حدیثیں مشکوٰۃ شریف میں مل گئیں، ان میں عموماً مشکوٰۃ شریف ہی کا حوالہ دیا گیا ہے، ورنہ اصل کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے)

دوسری بات: حجۃ اللہ میں سب حدیثیں بتمامہ اور بلفظہ نہیں لی گئیں۔ کہیں الفاظ بدل گئے ہیں، اور کہیں حدیث کا خلاصہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ قارئین کرام مذکورہ کتابوں کی طرف مراجعت کر کے پوری حدیث کا پتہ چلا سکتے ہیں (اور شرح میں ہر حدیث بلفظہ اور مفصل درج کی گئی ہے تاکہ قارئین کو مراجعت کی زحمت نہ اٹھانی پڑے مگر صرف ترجمہ کیا گیا ہے)

نوٹ: پہلے مبحث ہفتم کے باب اول میں یہ بات گذر چکی ہے کہ قسم دوم میں صرف اُن احادیث کی شرح کی گئی ہے جو احکام شرعیہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ سننِ زوائد سے تعلق رکھنے والی روایات کی شرح نہیں کی گئی۔

القسم الثانی

﴿فی بیانِ أسرارِ ماجاء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم تفصیلا﴾

والمقصودُ ههنا ذكرُ جُملةٍ صالحةٍ من الأحاديث المعروفةِ عند أهلها، السائرةِ بين حَمَلة العلم، المرويَّةِ في صحيحي البخاري ومسلمٍ،وكتابَيْ أبي داود والترمذي. وقلَّما أوردتُ عن غيرها، إلا استطرادًا، ولذلك لم أتعرَّضْ لنسبةِ كلِّ حديثٍ لمُخْرِجه، وربما ذكرتُ حاصل المعنى، أو طائفةً من الحديث، فإن هذه الكتبَ تيسِّر مراجعتُها وتتبُّعُها على الطالب.

ترجمہ: قسم دوم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیث کے رموز (حکمتوں) کے تفصیلی بیان میں: یہاں مقصود اُن احادیث کی معتد بہ مقدار کا تذکرہ کرنا ہے جو محدثین کے نزدیک مشہور ہیں، جو اہل علم کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں، جو بخاری و مسلم کی صحیحین میں اور ابوداؤد و ترمذی کی کتابوں میں مروی ہیں، اور بہت کم لایا ہوں میں ان کے علاوہ کتابوں سے۔ البتہ ضمناً لانا مستثنیٰ ہے۔ اور اسی وجہ سے ہر حدیث کی اس کی تخریج کرنے والے کی طرف نسبت کرنے سے میں نے تعرض نہیں کیا۔ اور کبھی میں نے حدیث کا خلاصہ یا حدیث کا ایک ٹکڑا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اُن کتابوں کی مراجعت اور ان کی تفتیش خواہش مند کے لئے آسان ہے۔

لغات: جملة صالحة أی مقدارًا کافیا. حَمَلَة جمع ہے حَامِل کی... اسْتَطْرَدَ له: ضمناً لانا یعنی کلام کو اس طرح چلانا کہ اس سے دوسرا کلام لازم آئے۔ یعنی کسی حدیث کی شرح میں ضمناً کوئی حدیث مذکورہ چار کتابوں کے علاوہ کتابوں سے بھی لائی گئی ہے۔ مُخرِج (اسم فاعل) نکالنے والا۔ مراد وہ محدثین ہیں جو اپنی کتابوں میں سند کے ساتھ حدیثیں روایت کرتے ہیں۔

باب ـــــ ۱

ایمان کے سلسلہ کی اصولی باتیں

ایمان کی دو قسمیں: ظاہری انقیاد اور کامل یقین

پہلے تین باتیں سمجھ لیں:

پہلی بات: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت زمان و مکان یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ آپ تمام جن و انس کی

طرف قیامت تک کے لئے مبعوث فرمائے گئے ہیں۔سورۂ سبا آیت ۲۸ میں اس کی صراحت ہے۔ارشاد پاک ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ، بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ

اورنہیں بھیجا ہم نے آپؐ کومگر سبھی لوگوں کے لئے،خوش خبری اورڈراسنانے والا بنا کر،مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں!

دوسری بات: آپؐ کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ آپؐ اللہ کے دین کو تمام ادیان پر غالب کردیں۔سورۃ الصف آیت ۹ میں ہے:

هُو الَّذِیْٓ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

اللہ وہی ہیں جنھوں نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا،تا کہ وہ اس کو سب ادیان پر غالب کردیں،اگرچہ کیسے ہی ناخوش ہوں مشرک!

یہی مضمون سورۃ التوبہ آیت ۳۳ وسورۃ الفتح آیت ۲۸ میں بھی آیا ہے۔

تیسری بات: آخری دین کے نازل ہونے کے بعد لوگوں کی صورت حال یہ ہوگی کہ جس کو عزت پیاری ہے وہ تو آپؐ کا لایا ہوا دین قبول کرلے گا اور عزت پائے گا۔اور جس کی قسمت برگشتہ ہے وہ انکار کر کے ذلیل وخوار ہوگا۔مسند احمد (۱۰۳:۴) میں روایت ہے کہ:

لَيَبْلُغَنَّ هٰذَا الْأَمْرُ مَا بَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ، وَلَايَتْرُكُ اللّٰهُ بَيْتَ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ هٰذَا الدِّيْنَ، بِعِزِّ عَزِيْزٍ أَوْ بِذُلِّ ذَلِيْلٍ، عِزًّا يُعِزُّ اللّٰهُ بِهِ الْإِسْلَامَ، وَذُلًّا يُذِلُّ اللّٰهُ بِهِ الْكُفْرَ

یہ دین ضرور وہاں تک پہنچ کر رہے گا جہاں تک شب وروز پہنچے ہیں (یعنی چاردانگ عالم میں پھیل کر رہے گا) اور اللہ تعالیٰ کوئی کچا پکا گھر ایسا نہیں چھوڑیں گے جس میں اس دین کو داخل نہ کردیں،معزز کی عزت کے ساتھ یا ذلیل کی رسوائی کے ساتھ۔ایسی عزت جس سے اللہ تعالیٰ اسلام کو قوی کریں گے۔ اور ایسی ذلت جس سے اللہ تعالیٰ کفر کو ذلیل کریں گے۔

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کر کے فرمایا:

''میں نے اپنے خاندان میں اس حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے۔جو لوگ ایمان لائے انھوں نے بھلائی،بزرگی اور عزت پائی۔اور جنھوں نے انکار کیا ان کے حصہ میں ذلت،رسوائی اور جزیہ آیا''

جب آپؐ کے لائے ہوئے دین کی صورت حال یہ ہوگی تو ضروری ہے کہ آپؐ کی امت میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوں۔مؤمن بھی اور غیر مؤمن بھی[1]۔ایسے مخلص بھی جنھوں نے آپؐ کی لائی ہوئی ہدایت سے راہ نمائی حاصل کی،اور ایسے منافق بھی جن کے دلوں میں ایمان کی بشاشت داخل نہیں ہوئی۔پس ضروری ہے کہ ان مختلف قسم کے لوگوں

[1] تمام جن وانس آپ ﷺ کی امت ہیں۔پھر جو ایمان لائے وہ ''امت اجابہ'' ہیں،اور جو ایمان نہیں لائے وہ ''امت دعوت'' ہیں ۱۲

کے درمیان امتیاز قائم کیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے انقیاد ظاہری اور تصدیق قلبی کے لحاظ سے ایمان کی دو قسمیں قرار دیں:

پہلی قسم. وہ ایمان ہے جس کے ساتھ دنیوی احکام متعلق ہوتے ہیں یعنی اس سے جان و مال کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ مجاہدین ان کی جانوں اور مالوں سے تعرض نہیں کرتے۔ ایمان کی اس قسم کو آنحضور ﷺ نے چند ایسے امور کے ساتھ منضبط کیا ہے جن سے اطاعت وانقیاد کا صاف طور پر پتہ چل جاتا ہے اور ان اعمال سے مسلمان اور غیر مسلمان میں امتیاز قائم ہو جاتا ہے۔ درج ذیل احادیث ایمان کی اسی قسم سے متعلق ہیں:

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے جنگ جاری رکھوں کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں۔ پس جب وہ یہ کام کرنے لگیں تو انھوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کر لیا۔ مگر حق اسلام کی وجہ سے، اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے[1]''

تشریح: اس حدیث میں جنگ چھیڑنے کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ جنگ بندی کی حد بیان کی گئی ہے کہ جب لوگ توحید ورسالت کو مان لیں اور نماز وزکات کا اہتمام کرنے لگیں تو اب جنگ بند کر دینا ضروری ہے۔ اب جنگ جاری رکھنا جائز نہیں۔ لیکن مسلمان ہونے کے لئے صرف نماز وزکات کافی نہیں، تمام اعمال اسلام ضروری ہیں۔ اور اس حدیث میں صرف ان دو کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ان سے اطاعت وانقیاد کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور ''حق اسلام'' سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کوئی ایسا جرم کرے جو جانی یا مالی سزا کو واجب کرتا ہو تو وہ سزا دی جا سکے گی۔ اسلام اس قانون سزا سے مانع نہیں بنے گا۔ اور ''اس کا حساب اللہ پر ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر دل میں کھوٹ ہے تو اس کا حساب آخرت میں ہوگا۔ دنیا میں احکام ظاہر پر جاری ہوں گے۔

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس نے ہماری (طرح) نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، تو یہ وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے پس تم اللہ کی ذمہ داری میں رخنہ اندازی نہ کرو[2]''

تشریح: حدیث شریف کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص میں تم اسلام کی یہ ظاہری علامتیں دیکھو اس کو مسلمان سمجھو، اور اس کے جان و مال سے تعرض نہ کرو، کیونکہ یہ اللہ کی ذمہ داری میں رخنہ اندازی ہے۔ حدیث شریف کا یہ مقصد نہیں ہے کہ جس میں بھی یہ ظاہری علامتیں پائی جائیں وہ بہر حال مسلمان ہے۔ خواہ وہ کیسے ہی خلافِ اسلام عقائد وخیالات رکھتا

---

[1] متفق علیہ، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۱۲

[2] رواہ البخاری، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، فصل اول، حدیث نمبر ۱۳

ہو، ایسا سمجھنا پرلے درجہ کی جہالت ہے۔

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں: (۱) اس شخص سے باز آنا جس نے لا إلٰـه إلا اللّٰـه کہا، کسی بھی گناہ کی وجہ سے آپ اس کی تکفیر نہ کریں اور کسی بھی بدعملی کی وجہ سے آپ اس کو اسلام سے خارج نہ کریں (۲) جہاد۔ وہ اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اور وہ اس وقت تک جاری رہے گا جب اس امت کا آخری طبقہ دجال سے جنگ کرے گا۔ کسی ظالم (حکمراں) کا ظلم اور کسی عادل (حکمراں) کا عدل اس کو ختم نہیں کرے گا (۳) تقدیر پر ایمان لانا[1]'' (اس حدیث کے بیان سے مقصود صرف پہلی بات ہے، اس لئے شاہ صاحب نے حدیث مختصر کردی ہے)

دوسری قسم: وہ ایمان ہے جس پر اخروی احکام کا مدار ہے یعنی جہنم سے رستگاری اور جنت کے درجات حاصل کرنے میں کامیابی۔ یہ ایمان اس وقت متحقق ہوتا ہے جب آدمی تمام برحق باتوں کا اعتقاد رکھے، تمام پسندیدہ اعمال پر کاربند ہو اور تمام اعلیٰ اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرلے۔ یہی کامل اور اعلیٰ درجہ کا ایمان ہے۔ یہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے۔ قرآن کریم میں جو ایمان میں زیادتی کا تذکرہ آیا ہے اس کا تعلق ایمان کی اسی قسم سے ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ سے جو مروی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی، اس کا تعلق نفس ایمان سے ہے، کامل ایمان سے نہیں ہے۔

اور آنحضرت ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ایمان کی اس قسم میں شامل تمام چیزوں پر لفظ ایمان کا اطلاق فرماتے تھے۔ جیسے حُبُّ الأنصار من الإیمان۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الایمان میں اس سلسلہ میں متعدد ابواب قائم کئے ہیں۔ اور اعمال اسلام پر ایمان کے اطلاق سے آنحضرت ﷺ کا مقصد اس بات پر مؤثر انداز میں تنبیہ کرنا ہے کہ یہ اعمال، ایمان کامل کا جزء ہیں، ان کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا، درج ذیل احادیث کا تعلق ایمان کی اسی قسم سے ہے:

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''جس میں امانت داری نہیں، اس میں ایمان نہیں۔ اور جس میں عہد و پیمان کی پاسداری نہیں، اس میں دین نہیں''[2]

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مؤمن وہ ہے جس کی طرف سے لوگوں کو اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں کوئی خطرہ نہ ہو''[3]

تشریح: پہلی حدیث میں مثبت پہلو سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ امانت داری اور عہد و پیمان کی پاسداری ایمانیات

---

[1] رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الکبائر، فصل ثانی، حدیث نمبر ۵۹

[2] مسند احمد (۳ ۱۳۵ و ۱۵۴ و ۲۱۰ و ۲۵۱) سنن کبریٰ بیہقی (۲۸۸.۶) مشکوٰۃ، کتاب الایمان، فصل ثانی، حدیث نمبر ۳۵

[3] رواہ الترمذی والنسائی، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، فصل ثانی، حدیث نمبر ۳۳

میں شامل ہیں۔اور دوسری حدیث میں منفی پہلو سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ مسلمانوں کی ایذا رسانی اور لوگوں کو ستانا ایمان کے منافی ہے۔

غرض ایمان کی اس قسم کی بہت سی شاخیں ہیں۔ایک متفق علیہ روایت میں ایمان کی ستر سے زائد شاخوں کا تذکرہ آیا ہے، وہ سب اعمال اسلام ہیں اور ایمان کی اسی قسم میں شامل ہیں، کیونکہ تمام اعمال خیر یہ، اخلاق حسنہ اور احوال صادقہ ایمان کے شعبے ہیں۔جب دل میں ایمان جم جاتا ہے اور یقین جڑ پکڑ لیتا ہے تو یہ اعمال اس شخص سے نتیجہ اور ثمرہ کے طور پر ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔

مثال سے وضاحت: ایمان کی اس دوسری قسم کی مثال یہ ہے کہ درخت: تنا، شاخوں، پتوں، پھلوں اور پھولوں کے مجموعہ کا نام ہے۔سرسبز وشاداب درخت میں برگ وبار نکلتے ہیں اور یہی کامل اور شاندار درخت ہے۔ثمر بار بھی ہے اور سایہ فگن بھی اور ہر اعتبار سے قیمتی اور قابل قدر ہے۔اور اگر اس درخت کی شاخیں کاٹ دی جائیں، پتے جھاڑ دیئے جائیں اور پھل توڑ لئے جائیں تو بھی درخت، درخت ہے مگر ناقص درخت ہے۔یہی حال اعمال واخلاق کا ہے کہ اگر وہ نہ بھی ہوں تب بھی مؤمن، مؤمن ہے مگر ناقص مؤمن ہے۔اور اگر تنا ہی اکھاڑ دیا جائے تو درخت ہی نابود ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر تصدیق باقی نہ رہے تو ایمان ہی باقی نہیں رہے گا۔

اور ایمان کی اس قسم کے بارے میں اللہ پاک کا یہ ارشاد ہے کہ:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ، وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيْمَانًا، وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ، الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ، وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ، أُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا، لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ

(الانفال ۲-۴)

ایمان والے تو بس ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور جب ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کر دیتی ہیں، اور وہ لوگ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، وہ لوگ جو کہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے بڑے درجات ہیں اور مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔

﴿من أبواب الإيمان﴾

اعلم: أن النبی صلی اللہ علیه وسلم لما كان مبعوثا إلى الخلق بعثا عاما، لِيُغَلِّبَ دِيْنَهُ على الأديان كلِّها بِعِزٍّ عَزِيْزٍ أو ذُلٍّ ذليلٍ، حصل فی دينه أنواع من الناس، فوجب التمييز بين الذين

يدِينون بدينِ الإسلام وبين غيرهم، ثم بين الذين اهْتَدَوْا بالهداية التي بُعث بها، وبين غيرهم ممن لم تَدْخُلْ بَشَاشةُ الإيمان قلوبَهم؛ فجعل الإيمان على ضربين:

أحدهما : الإيمان الذى يَدُور عليه أحكامُ الدنيا: من عصْمَةِ الدماء والأموال؛ وَضَبَطَهُ بأمور ظاهرةفى الانقياد، وهو:

قوله : صلى الله عليه وسلم:" أُمرتُ ان أُقاتِلَ الناسَ حتى يشهدوا أن لا إلٰه إلا اللّٰه، وأن محمدًا رسول الله، ويُقيموا الصلاة، ويؤتوا الزكاة، فإذا فعلوا ذلك عصموا منى دماءَ هم وأموالَهم، إلا بحق الإسلام، وحسابُهُمْ على الله"

وقوله صلى الله عليه وسلم:" من صلّى صلاتَنا، واستقبل قبلتَنا، وأكل ذبيحتَنا، فذلك المسلم الذى له ذِمَّةُ اللّٰه وذمةُ رسولِهِ، فلاتُخْفِرُوْا اللّٰهَ فى ذمته"

وقوله صلى الله عليه وسلم:" ثلاث من أصل الإيمان: الكفُّ عمن قال: لا إلٰه إلا اللّٰه، لا تُكَفِّرْهُ بذنب، ولا تُخْرِجْه من الإسلام بعملٍ" الحديث.

وثانيهما : الإيمان الذى يَدُور عليه أحكامُ الآخرة: من النجاة، والفوز بالدرجات؛ وهو متناوِلٌ لكل اعْتِقَادٍ حقٍّ، وعملٍ مَرْضِيٍّ، ومَلَكَةٍ فاضلةٍ، وهو يزيد وينْقُص؛ وسنّةُ الشارع: أن يُسَمِّيَ كلَّ شيءٍ منها إيمانًا، ليكون تنبيها بليغًا على جزئيَّتِهِ، وهو:

قوله صلى الله عليه وسلم:" لا إيمانَ لمن لا أمانةَ له، ولا دينَ لمن لا عَهْدَ له"

وقوله صلى الله عليه وسلم:" المسلم من سَلِمَ المسلمون من لسانه ويده" الحديث.

وله شُعَبٌ كثيرة؛ ومَثَلُه كَمَثَلِ الشجرة، يقال للدّوحة، والأغصان، والأوراق، والثّمار، والأزهار جميعًا: إنها شجرة؛ فإذا قُطع أغصانُها، وخُبِطَ أوراقُها، وخُرِفَ ثمارُها، قيل: شجرة ناقصة؛ فإذا قُلِعت الدّوحةُ بطل الأصل، وهو قوله تعالى: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ الآية.

ترجمہ: ایمان سے تعلق رکھنے والی اصولی باتیں: جان لیں کہ جب آنحضرت ﷺ کے بعثت ساری مخلوق کی طرف عام تھی، تاکہ آپؐ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کریں، معزز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی خواری کے ساتھ (تو) آپؐ کے دین میں مختلف قسم کے لوگ پیدا ہو گئے۔ پس ضروری ہوا امتیاز کرنا ان لوگوں کے درمیان جو اسلام کو دین بنانے والے ہیں اور ان کے علاوہ کے درمیان (یعنی مؤمن وغیر مؤمن کے درمیان) پھر ان لوگوں کے درمیان جنھوں نے اُس ہدایت سے راہ نمائی حاصل کی، جس کے ساتھ آپ ﷺ مبعوث کیے گئے ہیں، اور ان کے علاوہ کے درمیان

جن کے دلوں میں ایمان کی خوشی داخل نہیں ہوئی (یعنی مخلص مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان) پس آپؐ نے ایمان کی دو قسمیں قرار دیں:

ایک: وہ ایمان جس پر دنیوی احکام کا مدار ہے یعنی جان و مال کا تحفظ۔ اور آپ ﷺ نے (ایمان کی) اس قسم کو ایسے امور کے ذریعہ منضبط کیا جن سے اتقیاء و اطاعت صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ.

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''میں حکم دیا گیا ہوں کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں۔ پس جب وہ یہ کام کرنے لگیں تو انھوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کرلیا، بجز حق اسلام کے، اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے''

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جس نے ہماری طرح نماز پڑھی اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، تو یہ وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے، پس نہ رخنہ اندازی کرو تم اللہ کی ذمہ داری میں''

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''تین باتیں اصول اسلام میں سے ہیں: اس شخص سے باز رہنا جو لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو، کسی بھی گناہ کی وجہ سے تو اس کی تکفیر نہ کر، اور کسی بھی عمل کی وجہ سے تو اس کو اسلام سے خارج نہ کر'' حدیث آخر تک پڑھیے۔

دوسری قسم: وہ ایمان ہے جس پر اُخروی احکام کا مدار ہے یعنی نجات پانا اور جنت کے درجات حاصل کرنے میں کامیاب ہونا۔ اور یہ قسم برحق اعتقاد، پسندیدہ عمل اور اعلیٰ درجہ کی اخلاقی صلاحیتوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ ایمان بڑھتا گھٹتا ہے۔ اور شارع علیہ السلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان (عقائد و اعمال و اخلاق) میں سے ہر چیز کو ایمان کا نام دیتے ہیں، تاکہ وہ مؤثر تنبیہ ہو اس کے جز ایمان ہونے پر، اور یہی:

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جس میں امانت داری نہیں، اس میں ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں، اس میں دین نہیں''

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں'' حدیث آخر تک پڑھیں۔

اور ایمان کی اس قسم کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور اس ایمان کی مثال درخت کی سی ہے کہ تنے، ٹہنیاں، پتے، پھل اور پھول سبھی کو ''درخت'' کہتے ہیں۔ پھر جب درخت کی شاخیں کاٹ دی جائیں، اور اس کے پتے جھاڑ دیئے جائیں اور اس کے پھل چُن لئے جائیں تو اس کو ''ناقص درخت'' کہتے ہیں۔ پھر جب تنا اکھاڑ دیا جائے تو درخت ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور اسی قسم کے بارے میں اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ: ''ایمان والے تو بس ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے

اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب سہم جاتے ہیں'' آخر آیت تک پڑھیں (یہ آیت ایمان بالمعنی الثانی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں اعمال کا بھی تذکرہ ہے اور اعمال، ایمان کامل ہی کا جزء ہیں)

لغات: عَزَّ (ض) عزًّا وعِزَّةً: عزیز وقوی ہونا۔ العزیز: شریف، قوی، معزز ذلَّ (ض) ذُلًّا وذِلَّةً: ذلیل وخوار ہونا، صفت ذلیلٌ: خوار دان (ض) دِینًا ودیانةً به: دین اختیار کرنا، دین بنانا بشّ (س) بشًّا وبشاشةً: خوش ہونا، کشادہ رو ہونا، ہنس مکھ ہونا دارَ (ن) دَوْرًا ودَوَرانًا: گھومنا، چکر کھانا دار علیه: گرد گھومنا أخفر العهد: عہد توڑنا، بے وفائی کرنا۔ الذِمّة: امان، عہد وپیمان، ذمہ داری الأمانة: امانت، فریضہ، ذمہ داری .. المعهد: میثاق، وفا، ذمہ۔ الدَّوْحة: بڑا پھیلا ہوا درخت۔ خَرَفَ (ن) حرْفًا الثمرَ: میوہ چننا خبط (ض) خَبْطًا الشجرةَ: پتے جھاڑنا۔ **فائدہ:** عنوان میں من کے اضافہ سے شاہ صاحب نے ''اصولی باتیں'' مراد لی ہیں۔ آگے بھی یہی معنی ہیں۔

☆ ☆ ☆

اعمالِ اسلام کے دو درجے

ایمان بمعنی یقین کامل میں جو اعمال شامل ہیں، وہ سب ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دو درجے قرار دیئے ہیں۔

پہلا درجہ: ارکان اسلام کا ہے۔ اعمال اسلام میں یہ سب سے عمدہ اعمال ہیں۔ درج ذیل حدیث میں انہی اعمال کا تذکرہ ہے:

حدیث ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور نماز کا اہتمام کرنا، اور زکوٰۃ دینا، اور حج کرنا، اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا''[1]

تشریح: اور یہ بات ابھی آگے بیان کی جائے گی کہ ایمان کی دوسری قسم میں شامل اعمال کے لئے ''ایمان'' کے بجائے لفظ ''اسلام'' زیادہ موزون ہے۔ چنانچہ مذکورہ حدیث میں ارکان خمسہ پر اسلام کی بنا بتائی گئی ہے۔ اور توحید ورسالت کی شہادت ایک عمل ہے، بلکہ بہترین عمل ہے۔ گواہی ہمیشہ منکر کے سامنے دی جاتی ہے۔ پس غیر مسلموں تک یہ دعوت لے جانا اسلام کا بنیادی عمل ہے۔

دوسرا درجہ: ارکان خمسہ کے علاوہ دیگر اعمال اسلام کا ہے۔ درج ذیل حدیث میں ان کا تذکرہ ہے:

حدیث ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

---

[1] متفق علیہ، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۴

''ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں۔جن میں بہترین شاخ لا إلٰہ إلا اللّٰہ کہنا ہے اور معمولی شاخ راستہ سے تکلیف دِہ چیز کو ہٹانا ہے اور حیا ایمان کی اہم شاخ ہے''[1]

تشریح: ستر کا عدد تحدید کے لئے نہیں ہے، بلکہ زیادتی بیان کرنے کے لئے ہے یعنی ایمان کی بہت شاخیں ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے شُعَبُ الإیمان میں ایمان کی ان سب شاخوں کو بیان کیا ہے۔

ولَمَّا لم یکن جمیعُ تلك الأشیاء علی حدٍ واحدٍ، جعلَها النبی صلی اللہ علیه وسلم علی مرتبتین:

منها: الأرکان التی هی عمدةُ أجزانها، وهو:

قوله: صلی اللہ علیه وسلم:" بُنِی الإسلامُ علی خمس: شهادة أن لا إله إلا اللّٰه، وأن محمدًا عبده ورسوله، وإقام الصلاة، وإیتاء الزکاة، والحج، وصوم رمضان"

ومنها: سائِرُ الشُّعَبِ، وهو:

قوله: صلی اللہ علیه وسلم:" الإیمان بِضْع وسبعون شُعبةً، فأفضلُها: قولُ لا إلٰه إلا اللّٰه، وأدناها: إماطةُ الأذی عن الطریق، والحیاء شعبةٌ من الإیمان"

ترجمہ: اور جبکہ نہیں تھیں وہ تمام چیزیں ایک درجہ کی، تو قرار دیئے ان کے رسول اللہ ﷺ نے دو درجے:

ان میں سے ایک: ان ارکان کا درجہ ہے، جو کہ وہ ان اجزاء میں بہترین ہیں۔اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے الی آخرہ۔

اور ان میں سے ایک: ایمان کی دیگر شاخیں ہیں۔اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

اقسام ایمان کے متقابلات

ایمان کی پہلی قسم یعنی ظاہری انقیاد جس کے ساتھ دنیوی احکام متعلق ہوتے ہیں، اس کا مقابل ''کفر'' ہے۔اور دوسری قسم یعنی یقین کامل جس پر اُخروی احکام کا مدار ہے، اس کے مقابل کی تین صورتیں ہیں، اور تینوں کے الگ الگ نام ہیں:

پہلی صورت: اگر تصدیق قلبی بالکل ہی فوت ہو اور ظاہری انقیاد و اطاعت صرف تلوار کے خوف سے ہو، تو وہ اصلی اور ''اعتقادی نفاق'' ہے۔اور اُخروی احکام میں اِس منافق اور کافر مجاہر کے درمیان کچھ فرق نہیں، بلکہ یہ منافق کافر سے

[1] متفق علیہ، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۵

بدتر ہے۔ وہ جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوگا، جیسا کہ سورۃ النساء آیت ۱۴۵ میں اس کی صراحت ہے۔

دوسری صورت: اور اگر دل میں تصدیق تو موجود ہو مگر عمل بالجوارح فوت ہو یعنی فرائض کا تارک اور کبائر کا مرتکب ہو تو وہ "فاسق" کہلاتا ہے۔

تیسری صورت: اور اگر دل میں تصدیق تو ہو مگر وہ دل کا وظیفہ فوت کرنے والا ہو یعنی ایمان میں یقین کی دولت سے محروم ہو، تو وہ ایک اور قسم کا نفاق ہے۔ بعض سلف نے اس کا نام "نفاق عمل" رکھا ہے۔

اور نفاق عمل تین طرح سے پیدا ہوتا ہے:

① —— آدمی پر نفس کا یا دنیا کا یا جہالت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ مال کی، خاندان کی اور اولاد کی محبت میں بری طرح پھنس جاتا ہے، اس لئے وہ جزاء وسزا کو مستبعد سمجھنے لگتا ہے اور گناہوں پر بے باک ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیزیں اس طرح سے اس کے دل میں سرایت کر جاتی ہیں کہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا، اگر چہ عقل و برہان سے وہ اُن باتوں کو مانتا ہو جن کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے (اور حجابِ نفس، حجاب دنیا اور حجاب بدعقیدگی کی تفصیل مبحث چہارم کے باب ششم میں گذر چکی ہے)

② —— یا وہ اسلام میں سختیاں دیکھتا ہے یعنی مسلمان ہونے کے بعد وہ آلام ومصائب سے دوچار ہوتا ہے یا وہ آبائی مسلمان ہے اور اس کو یہ صورت پیش آتی ہے تو وہ اسلام کو ناپسند کرنے لگتا ہے۔

③ —— یا کچھ خاص کافروں سے اس کو محبت ہوتی ہے، جو اس کو اللہ کا بول بالا کرنے سے روک دیتی ہے (اسی وجہ سے کفار سے مودّت یعنی قلبی تعلق رکھنے کی قرآن میں سخت ممانعت آئی ہے)

ويُسمى مقابلُ الإيمان الأول بالكفر؛ وأما مقابل الإيمان الثاني:

[۱-] فإن كان تَفْوِيتًا للتصديق، وإنما يكون الانقيادُ بغلبة السيف، فهو النفاق الأصلي؛ والمنافق بهذا المعنى لا فرق بينه وبين الكافر في الآخرة، بل المنافقون: ﴿فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾

[۲-] وإن كان مصدِّقًا، مفوِّتًا لوظيفة الجوارح، سُمي فاسقًا.

[۳-] أو مفوِّتًا لوظيفة الجِنان، فهو المنافق بنفاق آخر؛ وقد سمَّاه بعضُ السلف نفاق العمل.

وذلك:

[۱-] أن يغلب عليه حجابُ الطبع، أو الرسم، أو سوء المعرفة، فيكون مُمْعِنًا في محبة الدنيا والعشائر والأولاد، فَيَدِبُّ في قلبه استبعادُ المجازاة، والاجتراءُ على المعاصي من حيث لا يدري، وإن كان معترفا بالنظر البرهاني بما ينبغي الاعتراف به.

[۲-] أو رأى الشدائدَ في الإسلام فكرهه.

[۳-] أو أحبَّ الكفار بأعيانهم، فصدّ ذلك من إعلاء كلمة الله.

ترجمہ: اور ایمان کی پہلی قسم کا مقابل ''کفر'' کہلاتا ہے۔ اور رہا ایمان کی دوسری قسم کا مقابل (۱) پس اگر ہے وہ تصدیق قلبی کو فوت کرنے والا، اور انقیاد و اطاعت صرف تلوار کے خوف سے ہے تو وہ ''نفاق اصلی'' ہے، اور منافق بایں معنی: کوئی فرق نہیں ہے آخرت میں اس کے درمیان اور کافر کے درمیان، بلکہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے (۲) اور اگر وہ شخص تصدیق کرنے والا ہے، اعضاء کے وظیفہ کو فوت کرنے والا ہے تو وہ ''فاسق'' کہلاتا ہے (۳) یا وہ دل کے وظیفہ کو فوت کرنے والا ہے تو وہ ایک دوسری قسم کا منافق ہے۔ اور بعض سلف نے اس قسم کے نفاق کو ''نفاق عملی'' سے تعبیر کیا ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ (۱) آدمی پر طبیعت (نفس) یا ریت رواج (دنیا) یا اللہ کے معاملہ میں بدعقیدگی چھا جاتی ہے۔ پس وہ دور تک چلا جاتا ہے دنیا (مال) کی اور خاندان کی اور اولاد کی محبت میں، پس رینگتا ہے اس کے دل میں جزاء وسزا کا استبعاد اور گناہوں پر بے باکی، ایسی جگہ سے کہ وہ نہیں جانتا، اگرچہ ہوتا ہے وہ اقرار کرنے والا دلیل برہانی کے ذریعہ ان باتوں کا جن کا اقرار کرنا مناسب ہے (۲) یا دیکھتا ہے وہ اسلام میں سختیوں کو، پس وہ اس کو ناپسند کرتا ہے (۳) یا مخصوص کافروں سے اس کو محبت ہوتی ہے، پس روک دیتی ہے وہ محبت اللہ کا بول بالا کرنے سے۔

☆ ☆ ☆

ایمان کے دو اور معنی: تصدیق اور سکینت قلبی

ایمان کے، مذکورہ بالا دو قسموں کے علاوہ، دو اور معنی بھی ہیں:

ایک: تصدیق قلبی یعنی دل سے ان باتوں کی تصدیق کرنا جن کی تصدیق ایمان کے لئے ضروری ہے۔ درج ذیل حدیث میں اسی کا تذکرہ ہے:

حدیث —— حضرت جبرئیل نے سوال کیا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ:

''ایمان یہ ہے کہ آپ دل سے اللہ تعالیٰ کو، اس کے فرشتوں کو، اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو اور آخرت کے دن کو مانیں۔ اور اچھی بری تقدیر کو (بھی) مانیں''[۱]

دوم: دل کی سکینت واطمینان۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جو مقربین کو حاصل ہوتی ہے۔ درج ذیل احادیث میں

---

[۱] رواہ مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۲

اس کا تذکرہ ہے:

حدیث ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''پاکی آدھا ایمان ہے''[1] یعنی طہارت و پاکیزگی ایمان کا خاص جزء اور اس کا اہم شعبہ اور حصہ ہے، جو شخص طہارت کا اہتمام کرتا ہے اس کو دل جمعی کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

حدیث ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''جب کوئی بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے۔ اور وہ اس کے سر پر سائبان کی طرح ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اس گناہ سے نکل جاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے''[2] یعنی گناہ کی حالت میں ایمانی جمعیت خاطر باقی نہیں رہتی۔

حدیث ـــــ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ: ''آؤ، ہم ایک گھڑی ایمان لائیں''[3] یعنی کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر ایمان کی باتیں کریں، تاکہ ایمان تازہ ہو اور دل کو تسکین حاصل ہو۔

وللإيمان معنيان آخران:

أحدهما: تصديقُ الجنان بمالابد من تصديقه، وهو:

قوله صلى الله عليه وسلم في جواب جبريل:" الإيمان: أن تؤمن بالله وملائكته" الحديث.

والثاني: السكينة، والهيئة الوِجْدانية التي تحصل للمقرَّبين، وهو:

قوله صلى الله عليه وسلم:" الطُّهور شَطْرُ الإيمان"

وقوله صلى الله عليه وسلم:" إذا زنى العبدُ خرج منه الإيمانُ، فكان فوق رأسه كالظُّلَّة، فإذا خرج من ذلك العمل رجع إليه الإيمان"

وقول مُعَاذ رضي الله عنه:" تَعَالَ نؤمنْ ساعةً"

ترجمہ: اور ایمان کے دو معنی اور ہیں:

ایک: دل سے تصدیق کرنا ان باتوں کی جن کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔ اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے حضرت جبرئیل کے سوال کے جواب میں کہ ایمان یہ ہے کہ دل سے مانے تو اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو۔ حدیث آخر تک پڑھیے۔

دوم: وہ سکینت اور ہیئتِ وجدانیہ (کیفیت قلبیہ) ہے جو مقربین کو نصیب ہوتی ہے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

[1] رواہ مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الطہارۃ، حدیث نمبر ۲۸۱

[2] رواہ الترمذی وابوداؤد، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الکبائر، حدیث نمبر ۶۰

[3] رواہ البخاری، کتاب الایمان، باب اول رواہ فی ترجمۃ الباب، ورواہ احمد مسندا عن عبداللہ بن رواحۃ رضی اللہ عنہ (۳/۲۶۵)

ارشاد ہے کہ: ''پاکی آدھا ایمان ہے'' اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب کوئی بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان اس میں سے نکل جاتا ہے۔ اور وہ اس کے سر پر سائبان کی طرح ہوتا ہے، پھر جب وہ اس برے کام سے نکل جاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے'' اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ: ''آؤ، ایمان لائیں ہم ایک گھڑی''

☆ ☆ ☆

خلاصۂ مرام

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ ایمان کے چار معنی ہیں یعنی لفظ ایمان شریعت میں چاروں معنی میں مستعمل ہے۔ اور وہ معانی یہ ہیں:

۱- وہ ایمان جس پر دنیوی احکام جاری ہوتے ہیں یعنی جان و مال کا تحفظ ہو جاتا ہے اور جس سے ظاہری انقیاد و اطاعت کا پتہ چلتا ہے۔

۲- وہ ایمان جس پر احکام آخرت کا دارومدار ہے، جو حقیقی اور کامل ایمان ہے۔

۳- اُن امور کی تصدیق کرنا جن کی تصدیق لازمی اور ضروری ہے۔

۴- سکون قلبی اور وجدانی کیفیت جو متقین کو حاصل ہوتی ہے۔

اگر آپ باب الایمان کی متعارض روایات میں سے ہر ایک کو اس کے صحیح محمل پر اتار دیں تو آپ کے تمام شبہے و شبہات دور ہو جائیں گے۔

اسلام اور احسان:

اور ایمان سے پہلے مرتبے کے لیے ایمان سے زیادہ واضح لفظ ''اسلام'' ہے۔ چنانچہ سورۃ الحجرات میں اللہ پاک کا ارشاد ہے۔

''اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے، البتہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''

تشریح: اس آیت سے ایمان و اسلام کا فرق ظاہر ہوتا ہے کہ ظاہری اطاعت و انقیاد کا نام اسلام ہے اور دل سے پختہ یقین کا نام ایمان ہے۔ اعراب (دیہاتیوں) کے دل میں ایمان و اعتقاد پوری طرح پیوست نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے صرف اطاعت قبول کی تھی، اس لئے بتایا گیا کہ ابھی ایمان کی منزل دور ہے، ابھی تو تم سرحد اطاعت پر ہو اور بس۔

حدیث ـــــ متفق علیہ روایت میں ہے کہ ایک بار آنحضرت ﷺ لوگوں کے درمیان کچھ مال بانٹ رہے تھے،

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک شخص کو جو میرے نزدیک اچھا تھا چھوڑ دیا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے فلاں آدمی کو نہیں دیا حالانکہ قسم بخدا میں اس کو مؤمن پاتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یا مسلمان'' (پاتا ہوں)[1] یعنی یقین کے ساتھ مؤمن نہ کہو۔ ایمان تو دل کے عقیدہ کا نام ہے، اس کا پتہ دوسرے کو نہیں چل سکتا۔ ہاں تردید کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ مؤمن یا مسلمان پاتا ہوں۔ اس حدیث سے بھی ایمان اور اسلام کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

اور ایمان کے چوتھے معنی پر یعنی سکون خاطر اور وجدان قلبی پر ایمان کے بجائے لفظ ''احسان'' کا اطلاق زیادہ واضح اور موزون ہے (اور دوسرے معنی کو ''ایمان کامل'' کہنا چاہئے، اور تیسرے معنی پر ''محض ایمان'' کا اطلاق ہونا چاہئے)

فللايمان أربعة معان مستعملة في الشرع، إن حملت كلّ حديث من الأحاديث المتعارضة في الباب، على محمله، اندفعتْ عنك الشكوكُ والشبهات

والإسلام أوضحُ من الإيمان في المعنى الأول، ولذلك قال الله تعالى. ﴿قُلْ: لَمْ تُؤْمِنُوا، ولكن قُولُوا أسلمنا﴾. وقال النبي صلى الله عليه وسلم لسعد: ''أو مسلما''. والاحسانُ أوضح منه في المعنى الرابع.

ترجمہ: پس ایمان کے چار معنی ہیں، جو شریعت میں مستعمل ہیں، اگر تم کہیں تو آپ ہر حدیث و باب میں متعارض حدیثوں میں سے اس کے محمل پر تو دور ہو جائیں گے آپ سے شکوک و شبہات۔

اور اسلام زیادہ واضح ہے ایمان سے پہلے معنی میں، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''کہہ دیں آپ کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ کہو کہ ہم نے اطاعت کی ہے۔ اور فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہ: ''یا مسلمان'' اور ''احسان'' زیادہ واضح ہے ایمان سے چوتھے معنی میں۔

☆ ☆ ☆

نفاق عمل اور اخلاص کی علامتیں

نفاق عمل اور اس کا مقابل اخلاص دونوں پوشیدہ چیزیں ہیں۔ دونوں دل کی کیفیات ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ دونوں کی ایسی علامتیں بیان کی جائیں، جن کے ذریعہ ان کو پہچانا جا سکے۔ اور ہر شخص اپنا جائزہ لے سکے کہ وہ کس حال

[1] بخاری کتاب الایمان باب ۱۹ کتاب الزکوۃ باب نمبر ۵۳ حدیث نمبر ۱۴۷۸ مسلم شریف کتاب الایمان و کتاب الزکاۃ ۱۲

میں ہے۔ اگر اس میں ایمان کامل کی علامتیں پائی جاتی ہیں تو شکر خداوندی بجالائے کہ شکر سے نعمت بڑھتی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ دوسری صورت ہے تو اپنی اصلاح کرے کہ وقت ابھی ہاتھ سے نہیں گیا۔

یہاں کچھ لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے دوسروں کے عیوب کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور تبصرے کرتے ہیں کہ فلاں میں نفاق کی یہ علامت پائی جاتی ہے، وہ علامت پائی جاتی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایک پنہاں بیماری اور اخلاقی کمزوری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائیں۔

درج ذیل احادیث میں اخلاص ونفاق عمل کی علامتیں بیان کی گئی ہیں:

حدیث ـــــ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''جس شخص میں چار باتیں پائی جائیں وہ خالص (پکا) منافق ہے۔ اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات پائی جائے، اس میں نفاق کی ایک بات ہے، یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے (اسی وقت وہ نفاق سے پاک ہوسکتا ہے)(۱) جب اس کو امین بنایا جائے تو خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۳) جب پیمان باندھے تو عہد شکنی کرے (۴) اور جب جھگڑا کرے تو بدکاری کرے (گالیاں بکے یا حد سے تجاوز کرے)''[1]

تشریح: مذکورہ چار باتیں نفاق عمل یعنی ایمان میں کھوٹ کی علامتیں ہیں۔ اور ان کے متقابلات کمال ایمان کی علامتیں ہیں۔ یعنی امانت داری، سچائی، عہد کی پاسداری اور نزاع میں میانہ روی اور خوش کلامی ایمان میں اخلاص کے ثمرات ہیں۔

حدیث ـــــ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''جس شخص میں تین باتیں پائی جاتی ہیں، وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت (چاشنی) پاتا ہے (۱) اس کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں (۲) وہ جس سے محبت کرے اللہ ہی کے لئے کرے (۳) اور کفر کی طرف پلٹنے کو وہ ایسا ناپسند کرے جیسا آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے''[2]

تشریح: مذکورہ تین باتیں کمال ایمان کی علامتیں ہیں۔ اور ان کے متقابلات نفاق عمل کی دلیل ہیں یعنی دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، اور غرض سے محبت کرنا اور کفر کے حق میں نرم گوشہ رکھنا ایمان کی کمزوری کی علامات ہیں۔ ایسے شخص کو ایمان کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔

حدیث ـــــ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ مسجد کی نماز کا پابند ہے، تو اس کے لئے ایمان کی گواہی دو، کیونکہ اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ اللہ

---

[1] متفق علیہ، مشکوٰۃ شریف، حدیث نمبر ۵۶

[2] متفق علیہ، مشکوٰۃ شریف، حدیث نمبر ۸

کی مسجدوں کو بس وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں''[1]

تشریح. پابندی سے مسجد کی نماز میں حاضر ہونا کمال ایمان کی علامت ہے۔ اور ایسی مضبوط دلیل ہے کہ اس کی بنیاد پر کسی کے مؤمن ہونے کی شہادت دی جاسکتی ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے یہ مضمون سورۃ التوبہ کی آیت ۱۸ سے اخذ فرمایا ہے۔ اس ارشاد نبوی سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آیت پاک میں مسجد کی صرف ظاہری تعمیر مراد نہیں ہے۔ بلکہ معنوی تعمیر یعنی عبادت سے آباد کرنا بھی مراد ہے۔

اور مسجد کی نماز سے غیر حاضری نفاق عمل کی علامت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ زمانہ نبوت میں کھلا منافق یا بیمار ہی مسجد کی نماز سے پیچھے رہتا تھا[2]۔ اور حضرت اُبیّ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ فجر کی نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا کہ فلاں موجود ہے؟ صحابہ نے جواب دیا نہیں۔ آپ نے دوسرے شخص کے بارے میں دریافت کیا وہ بھی موجود نہیں تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ دو نمازیں (عشاء اور فجر) منافقین پر سب سے زیادہ بھاری ہیں''[3]

حدیث ـــــ مسلم شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد مروی ہے کہ.

''اس ذات کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا (اور غلہ اور درختوں کو اگایا) اور ذی روح (مخلوقات) کو پیدا کیا! بیشک نبی امّی ﷺ نے مجھ سے یہ عہد کیا ہے کہ مجھ کو مؤمن ہی دوست رکھے گا، اور مجھ سے منافق ہی بغض رکھے گا''[4]

اور ترمذی اور مسند احمد میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''منافق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوست نہیں رکھتا، اور مؤمن آپؓ سے بغض نہیں رکھتا''[5] پس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشروع محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے، اور آپؓ سے عداوت اور دشمنی رکھنا نفاق کی نشانی ہے۔

اس قسم کا مضمون دیگر صحابہ کے بارے میں بھی مروی ہے۔ ابن عدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی

---

[1] مشکوٰۃ شریف حدیث نمبر ۷۲۳ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس میں ایک راوی درّاج ابو السمح ہے، وہ ابو الھیثم سے روایت کرتا ہے۔ اور درّاج کی ابوالہیثم سے روایتیں ضعیف ہوتی ہیں۔ ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی میں یعتاد المسجد ہے یعنی مسجد کا خوگر ہے اور مستدرک حاکم (۳۳۲:۲) میں یلزم المسجد ہے یعنی مسجد سے چپکا رہتا ہے۔

[2] رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۰۷۲

[3] رواہ ابوداؤد والنسائی۔ مشکوٰۃ باب الجماعۃ، حدیث نمبر ۱۰۶۶

[4] مشکوٰۃ، باب مناقب علیؓ، حدیث نمبر ۶۰۷۹ اصل حدیث یہ ہے۔ اور شاہ صاحب نے حدیث کے جو الفاظ لکھے ہیں وہ کسی کتاب میں مروی نہیں ہیں۔ غالباً شاہ صاحب نے روایت بالمعنی لکھی ہے۔

[5] مشکوٰۃ شریف حدیث نمبر ۶۰۹۱

ہے کہ: ''حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم سے محبت ایمان ہے، اوران سے بغض کفر ہے'' اور ابن عساکر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت بیان کی ہے، اس میں ہے کہ: ''حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے محبت ایمان ہے، اوران سے بغض کفر ہے'' [1]

تشریح: اشخاص کے بارے میں اس قسم کے ارشادات کی مختلف وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: بڑوں کے مقام ومرتبہ کی معرفت اوران کی قدر شناسی انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو حسد اور خود پسندی سے مبرا ہوں، جن کے نفسانی تقاضے ختم ہو گئے ہوں یعنی ان میں نفسانیت کا شائبہ تک نہ رہا ہو۔ اوران کی عقل خواہش پر غالب آگئی ہو یعنی وہ ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات سے اوپر اٹھ کر معاملات کو سوچنے اور فیصلہ کرنے کے عادی ہو چکے ہوں۔ یہی حضرات بڑی ہستیوں کے بارے میں متوازن فیصلہ کرتے ہیں، اوران کا مقام ومرتبہ پہچانتے ہیں۔ برخود غلط قسم کے لوگ تو طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ قرابت کا شوشہ چھوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابوبکر وعمر تو خسر تھے اور عثمان وعلی داماد تھے۔ اسی قرابت داری کی بناء پر ان کو اسلام میں برتر مقام حاصل ہوا ہے۔ حالانکہ وہ غور نہیں کرتے کہ خسر تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی تھے اور داماد تو حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مگر ان کو یہ مقام کہاں نصیب ہوا؟

دوسری وجہ: حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دین کے معاملہ میں سخت تھے۔ ایسے اکابر کی سختی کو وہی شخص برداشت کرتا ہے جو خود غرضی اور نفسانیت سے پاک ہو، جو مفاد کلی کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنے کا عادی ہو۔ جس کے ایمان میں کھوٹ ہوتی ہے وہ تو بجا سختی سے بھی برگشتہ ہو جاتا ہے اور ان اکابر کے خلاف بکواس کرنے لگتا ہے۔

تیسری وجہ: صاحبزادگی بایں اعتبار مفید ہے کہ بے استحقاق بڑا مرتبہ مل جاتا ہے۔ مگر اس اعتبار سے غیر مفید ہے کہ صاحبزادوں کی واقعی خوبیوں کا بھی بعض لوگ اعتراف نہیں کرتے۔ وہ یہی رٹ لگاتے رہتے ہیں کہ یہ مقام صاحبزادگی کے طفیل میں مل گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے تھے، آپؐ نے ہی ان کو پالا پوسا تھا۔ آپؐ کے کمالات کے اعتراف میں پچھلوں کے لئے یہی چیز مانع بن گئی تھی۔ اس لئے آپؐ کے بارے میں مذکورہ بالا ارشاد اور من کنت مولاہ فعلیٌ مولاہ [2] (میں جس کا محبوب ہوں، پس علی بھی اس کے محبوب ہیں یعنی مجھ سے محبت اور علی سے نفرت کیا معنی رکھتی ہے!) اور من سب علیا فقد سبنی [3] (جو علی کو برا بھلا کہتا ہے وہ مجھ کو برا کہتا ہے) وغیرہ ارشادات وارد ہوئے ہیں۔

---

[1] یہ دونوں روایتیں مظاہر حق قدیم جلد رابع صفحہ ۴۱ میں ہیں

[2] رواہ احمد والترمذی، مشکوۃ حدیث نمبر ۶۰۹۴

[3] رواہ احمد، مشکوۃ حدیث ۶۰۹۲

حدیث ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''انصار سے محبت ایمان کی نشانی ہے، اوران سے بغض نفاق کی نشانی ہے''[1] اور ابن عساکر کی مذکورہ بالا روایت میں ہے کہ ''عربوں سے محبت ایمان سے ہے، اوران سے دشمنی کفر ہے''

تشریح: اقوام، قبائل اور جماعتوں کے بارے میں اس قسم کے ارشادات کی وجہ یہ ہے کہ مختلف اسباب سے قوموں اور نسلوں میں تشتت وافتراق پیدا ہوجاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ وہ عداوت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ عدنان کی اولاد میں بھی اسی قسم کا اختلاف ہوا تھا۔ اور وہ یہاں تک بڑھا تھا کہ خاندان کا کچھ حصہ یمن منتقل ہوگیا تھا۔ اور معد کی اولاد ہی حجاز میں رہ گئی تھی پھر ارم کا باندھ ٹوٹنے کے بعد اوس وخزرج مدینہ میں آبسے تھے۔ یہی قبیلے اسلام کے انصار بنے۔ اور معد کی اولاد بھی ہجرت کرکے مدینہ میں آگئی تو یہ حضرات مہاجر کہلائے۔ ان معدی اور یمنی عربوں میں پرانی عداوت تھی۔ اسی طرح عرب وعجم میں منافرت بھی دلوں میں جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو یہ سب حضرات اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ پس ضروری ہوا کہ دلوں کی پرانی کدورتیں دور کردی جائیں۔ چنانچہ مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ انصار سے محبت کریں اور پرانی باتیں دلوں سے نکال دیں۔ اسی طرح عجمیوں کو حکم دیا کہ وہ عربوں سے محبت کریں، اور دلوں سے ان کی نفرت دور کردیں۔ اب جو شخص ہمہ تن اسلام کا بول بالا کرنے کی طرف متوجہ ہوگا، وہ تو دل سے کینہ دور کردے گا۔ اور انصار سے اور عربوں سے محبت کرے گا اور سب ایک متحد امت بن کر اسلام کی گاڑی کھینچیں گے۔ اور جو اپنی پوری توجہ اسلام کی سربلندی پر مرکوز کئے ہوئے نہیں ہے، اس کی فطرت میں نزاع باقی رہے گا، جو اسلام کے کاز کو نقصان پہنچائے گا۔ اس لئے انصار کی محبت اور عربوں کی محبت کو ایمان کی علامت اوران سے بغض ونفرت کو کفر ونفاق کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

ولما كان نفاقُ العمل وما يقابله من الإخلاص أمرًا خفيا، وجب بيانُ علاماتِ كلِّ واحد منهما، وهو:

قوله: صلى الله عليه وسلم: " أربع من كُنَّ فيه كان منافقا خالصا، ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها: إذا اؤتمن خان، وإذا حدّث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجر"

وقوله: صلى الله عليه وسلم: "ثلاثٌ من كنّ فيه وجدبهنّ حلاوة الإيمان: أن يكون اللّٰهُ ورسولُه أحبّ إليه مما سواهما، وأن يحب المرء لا يحبُّه إلا للّٰه، وأن يَكْره أن يعود في الكفر كما يكره أن يُقْذفَ في النار"

[1] متفق علیہ، مشکوۃ، باب جامع المناقب، حدیث ۶۲۰۶

وقوله: صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم العبدَ يُلازم المسجدَ فاشْهَدوا له بالإيمان"
وكذا قوله عليه السلام: " حبُّ عليٍّ آيةُ الإيمان، وبُغض عليٍّ آية النفاق" والفقه فيه: أنه رضى الله عنه كان شديدًا في أمر الله، فلايتحمَّل شدَّته إلا من ركدتْ طبيعتُه، وغلب عقلُه على هواه.
وقوله: صلى الله عليه وسلم. " حُبُّ الأنصار آية الإيمان" والفقه فيه: أن العرب المعدِّيَة واليَمَنِيَّةَ ما زالوا يتنازعون بينهم، حتى جَمعهم الإيمان، فمن كان جامع الهمّة على إعلاء الكلمة زال عنه الحِقْد، ومن لم يكن جامعا بقي فيه النزاع.

ترجمہ: اور جب نفاق عمل اور وہ اخلاص جو اس کے بالمقابل ہے مخفی چیز تھے، تو ضروری ہوا ان میں سے ہر ایک کی علامتیں بیان کرنا، اور وہ:

آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "چار باتیں جس میں ہوتی ہیں وہ خالص منافق ہوتا ہے۔ اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہوتی ہے اس میں نفاق کی ایک بات ہوتی ہے، تا آنکہ وہ اس کو چھوڑ دے: جب وہ امین بنایا جائے تو خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب پیمان باندھے تو عہد شکنی کرے اور جب جھگڑا کرے تو بدکاری کرے"

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "تین باتیں جس میں پائی جاتی ہیں، وہ ان کی وجہ سے ایمان کی چاشنی پاتا ہے: یہ بات کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس کے نزدیک زیادہ محبوب ہوں ان کے ماسوا سے۔ اور یہ کہ محبت کرے وہ کسی شخص سے، نہ محبت کرے وہ اس سے مگر اللہ کے لئے، اور یہ کہ ناپسند کرے وہ کہ لوٹے وہ کفر میں، جیسا ناپسند کرتا ہے وہ کہ پھینکا جائے آگ میں"

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ وہ مسجد سے چمٹا رہتا ہے تو اس کے لئے ایمان کی گواہی دو"

اور اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت ایمان کی نشانی ہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی نفاق کی علامت ہے" (یہ روایت کا ماحصل ہے) اور سمجھنے کی بات اس میں یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ اللہ کے معاملہ میں سخت تھے، پس آپؓ کی سختی کو برداشت نہیں کرتا مگر وہ شخص جس کی طبیعت تھم گئی ہو، اور اس کی عقل اس کی خواہش پر غالب آگئی ہو۔

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "انصار سے محبت ایمان کی نشانی ہے" اور سمجھنے کی بات اس میں یہ ہے کہ معدّی اور یمنی عرب برابر آپس میں جھگڑتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایمان نے ان کو اکٹھا کیا۔ پس جو شخص اللہ کا بول بالا کرنے پر پوری توجہ اکٹھا کرنے والا ہے اس سے کینہ دور ہو جائے گا۔ اور جو شخص جامع الہمت نہیں ہے اس میں نزاع باقی رہے گا۔

لغات: رکدت أی سکنت غلیانُها المعدّیة. هم المهاجرون والیمنیة: هم الأنصار (سندیؒ) ائتمنَ فلانا علی کذا: کسی کو کسی چیز کا امین بنانا .. الفقه: السرّ مَعَدّ بن عدنان: ابوالعرب ہیں ... الهِمّة: خاص توجہ۔

☆ ☆ ☆

نجاتِ اوّلی کے لئے ارکان خمسہ کی ادائیگی ضروری ہے

جس طرح مختلف روایات میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ وضوء کی صحت کے لئے اعضائے مغسولہ کو کم از کم ایک بار بالاستیعاب دھونا اور کم از کم چوتھائی سر کا مسح ضروری ہے، اور نماز کی صحت کے لئے چھ فرائض کی ادائیگی ضروری ہے، اسی طرح آنحضرت ﷺ نے متعدد روایات میں یہ بات بیان فرمائی ہے کہ آخرت میں نجات کے لئے اسلام کے ارکان خمسہ کی ادائیگی ضروری ہے۔ جو شخص گناہوں سے بچتے ہوئے ان اعمال اسلام پر عمل پیرا ہوگا، وہ اگر دیگر طاعات نہ بھی بجالائے گا تو بھی اس کی نجات ہوگی۔ وہ عذاب جہنم سے بچ جائے گا، اور جنت کا حقدار بن جائے گا۔ اور وہ احادیث جن میں یہ بات بیان کی گئی ہے، درج ذیل ہیں:

پہلے یہ حدیث گذر چکی ہے کہ: ''اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے: (۱) اس بات کی گواہی دینا یعنی اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں (۲) اور نماز کا اہتمام کرنا (۳) اور زکوٰۃ دینا (۴) اور حج کرنا (۵) اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا۔

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اسلام کو ایک ایسی عمارت سے تشبیہ دی ہے جو چند ستونوں پر قائم ہو۔ اور بتلایا ہے کہ اسلام کی عمارت ان پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کے لئے اس کی گنجائش نہیں کہ وہ ان ارکان کے ادا کرنے اور قائم کرنے میں غفلت برتے، کیونکہ یہ اسلام کے بنیادی ستون ہیں (معارف الحدیث ۱:۷۳)

حدیث ـــــ قبیلہ بنو سعد بن بکر کے ایک صحابی حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ اپنی قوم کی طرف سے نمائندہ بن کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ اور چند باتوں کی تحقیق کی جو ان کو رسول اللہ ﷺ کے قاصد کے ذریعہ پہنچ چکی تھیں۔ اس طویل روایت کا ضروری حصہ درج ذیل ہے:

''انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے رسالت کی تصدیق کرنے کے بعد پوچھا کہ آپؐ کے قاصد نے ہم سے بیان کیا ہے کہ ہم پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اس نے تم سے ٹھیک کہا'' اس دیہاتی صحابی نے قسم دیکر پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان نمازوں کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں یہ اللہ ہی کا حکم ہے'' پھر بدوی نے کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی بیان کیا کہ ہمارے مالوں میں زکوٰۃ بھی مقرر کی گئی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ بھی اس نے تم سے سچ کہا'' بدوی نے قسم دیکر پوچھا: کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں! یہ بھی اللہ ہی کا

حکم ہے" پھر اس نے کہا: آپ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی بیان کیا کہ سال میں ماہ رمضان کے روزے بھی ہم پر فرض کئے گئے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "یہ بھی اس نے سچ کہا" بدوی نے قسم دیکر پوچھا: کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "ہاں! یہ بھی اللہ ہی کا حکم ہے"۔ پھر اعرابی نے کہا: آپ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی بیان کیا کہ ہم میں سے جو حج کے لئے مکہ مکرمہ پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، اس پر بیت اللہ کا حج بھی فرض ہے؟ آپ نے فرمایا: "یہ بھی اس نے سچ کہا" ـــــ یہ سوال و جواب کے بعد اعرابی چل دیا، اور چلتے ہوئے اس نے کہا: "اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! میں ان میں نہ کوئی زیادتی کروں گا اور نہ کوئی کمی" (یعنی آپ کے جوابات جوں کے توں اپنی قوم کو پہنچاؤں گا) اس کے جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اگر یہ صادق ہے تو ضرور جنت میں جائے گا" (متفق علیہ)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"میری کسی ایسے عمل کی طرف راہنمائی کیجئے کہ جب میں اس کو کروں تو جنت میں پہنچ جاؤں؟ آپ نے فرمایا: تو اللہ کی عبادت کر، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر، اور فرض نمازوں کا اہتمام کر اور فرض زکوٰۃ ادا کر اور ماہ رمضان کے روزے رکھ"۔ اس دیہاتی نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! نہ میں اس میں کچھ بڑھاؤں گا، نہ اس میں کمی کروں گا۔ پھر جب وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: "جس کو خوشی ہو کہ وہ کسی جنتی آدمی کو دیکھے تو وہ اس شخص کو دیکھ لے" (متفق علیہ)

انہی ارکان خمسہ کا تذکرہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی آیا ہے۔ انھوں نے دریافت کیا تھا کہ مجھے ایسا عمل بتادیں جو مجھے جنت میں پہنچا دے اور جہنم سے دور کردے؟ آپ نے فرمایا: "تم نے بہت بڑی بات پوچھی ہے اور وہ اس شخص پر آسان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کردیں۔ تم اللہ کی بندگی کرو، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور نماز کا اہتمام کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو"[1]

وقد بيّن النبيُّ صلى الله عليه وسلم في حديث: "بُني الإسلام على خمس" وحديث ضمام بن ثعلبة، وحديث أعرابي، قال "دُلّني على عمل إذا عملته دخلتُ الجنة": أن هذه الأشياء الخمسة أركان الإسلام، وأن من فعلها، ولم يفعل غيرها من الطاعات قد خلّص رقبته من العذاب، واستوجب الجنة، كما بيّن أن أدنى الصلاة ماذا؟ وأدنى الوضوء ماذا؟

ترجمہ: اور تحقیق نبی ﷺ نے بیان فرمایا حدیث بُني الإسلام على خمس میں، اور ضمام بن ثعلبہ کی حدیث

[1] رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۹

میں اور اس دیہاتی کی حدیث میں جس نے پوچھا تھا کہ "میری راہنمائی کیجئے کسی ایسے عمل کی طرف کہ جب میں اس کو کروں تو جنت میں پہنچ جاؤں" (آپ نے بیان فرمایا) کہ یہ پانچ چیزیں اسلام کے ارکان (بنیادی اعمال) ہیں۔ اور یہ کہ جس نے کیا ان کو، اور نہ کی اس نے ان کے علاوہ طاعتیں، تو یقیناً اس نے چھڑا لی عذاب سے اپنی گردن، اور واجب و لازم جانا اس نے جنت کو، جیسا کہ بیان فرمایا (آپ نے) کہ نماز کا کم از کم درجہ کیا ہے؟ اور وضو کا کم از کم درجہ کیا ہے؟

لغات: دُلَّ فعل امر ہے دل (ن) دلالۃ سے جس کے معنی ہیں راہنمائی کرنا حلص من کذا: نجات دینا، چھڑانا..... اِستَوْجَبَ الشیٔ: مستحق ہونا، واجب ولازم جاننا۔

☆ ☆ ☆

ارکان خمسہ کی تخصیص کی وجہ

ارکان خمسہ یعنی توحید ورسالت کا اقرار، نماز، زکوۃ، روزے اور حج کو اعمال اسلامی میں رئیت کا درجہ دو وجہ سے دیا گیا ہے:

پہلی وجہ یہ پانچ اعمال لوگوں کی مشہور ترین عبادتیں ہیں۔ تمام ملتوں نے ان امور کو اختیار کیا ہے اور ان کا التزام کیا ہے۔ یہود ہوں یا عیسائی، مجوس ہوں یا عرب کے سمجھ دار لوگ جو دین ابراہیمی پر کسی درجہ میں قائم تھے، سب ان طاعات کو اپنائے ہوئے تھے، اگرچہ ان عبادتوں کی ادائیگی کے طریقوں میں ان میں اختلاف تھا۔ یہود کی نماز کا طریقہ اور تھا اور عیسائیوں کا اور۔ مگر سب نماز ادا کرتے تھے۔ یہی حال زکوۃ وغیرہ کا تھا۔ سب ملتوں کے ماننے والے غریبوں پر خرچ کرتے تھے۔ پس یہ متفق علیہ امور ہیں، اس لئے ان کو رکنیت کے لئے خاص کیا گیا ہے۔

دوسری وجہ: ان طاعات خمسہ میں وہ خوبیاں ہیں کہ وہ ان کے علاوہ طاعات سے مستغنی کر دیتی ہیں اور دیگر طاعات میں وہ بات نہیں ہے کہ وہ ان طاعات سے مستغنی کر دیں۔ اس وجہ سے انہی کو رکنیت کے لئے خاص کیا گیا ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

۱ ——— نیکی کی بنیادی باتیں تین ہیں: توحید کا اقرار، رسالت محمدی کی تصدیق اور پوری شریعت کو تسلیم کرنا۔ اور بعثت نبوی عام ہے۔ زمان ومکان یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں۔ چنانچہ لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونے لگے، تو کوئی ایسی کھلی علامت مقرر کرنی ضروری تھی، جس کے ذریعہ موافق ومخالف کے درمیان امتیاز کیا جا سکے، اور اس کی بنیاد پر کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے اور جس میں کوتاہی کرنے پر باز پرس کی جا سکے۔ اگر ایسی کوئی واضح علامت مقرر نہیں کی جائے گی تو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز عرصۂ دراز کے تجربہ کے بعد ہی کیا جا سکے گا۔ اور وہ فرق بھی ظنی ہوگا۔ کیونکہ وہ قرائن کی بنیاد پر ہوگا۔ نیز لوگوں میں کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کرنے میں اختلاف بھی

ہوگا۔اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس صورت حال میں احکام میں بڑا اختلال رونما ہوگا ——— اور ایسی علامت برضاء ورغبت توحید ورسالت کا اقرار ہی ہے۔اس اقرار ہی سے اس اعتقاد وتصدیق کا پتہ چلتا ہے جو دل میں مکنون ہے۔اس لئے اسلام کا سب سے اہم رکن توحید ورسالت کے اقرار کو قرار دیا گیا ہے۔

② ——— پہلے (مبحث ۴ باب ۴ میں) یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ نوع بشری کی نیک بختی کا مدار اور نجات اخروی کا سرمایہ اخلاق اربعہ ہیں۔یعنی اِخبات (بارگاہ خداوندی میں نیازمندی) طہارت (پاکی) سماحت (فیاضی اور سہل گیری) اور عدل وانصاف اور نماز کے ذریعہ دو اخلاق بدست آتے ہیں: اخبات اور نظافت۔کیونکہ نماز کے لئے پاکی شرط ہے اور نماز بارگاہ خداوندی میں اعلی درجہ کی نیازمندی ہے۔اور زکوٰۃ دوسری دو خصلتوں کی تحصیل کے لئے مقرر کی گئی ہے۔کیونکہ شرائط کا لحاظ کر کے زکوٰۃ کی رقم اس کے مصارف میں خرچ کرنا اعلی درجہ کی فیاضی ہے اور یہی انصاف کی بات بھی ہے کہ مالدار اللہ کی بخشی ہوئی دولت میں سے غریبوں کا حق ادا کرے۔پس زکوٰۃ کے ذریعہ سماحت وعدالت کو بدست لایا جاسکتا ہے۔

③ ——— پہلے (مبحث ۵ باب ۱۱ میں) یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ انسانوں کے لئے کوئی ایسی عبادت ضروری ہے جو اس کی خواہشات پر قہرمان ہو، تاکہ اس کے ذریعہ نفسانی خواہشات کو دبایا جاسکے۔اور ایسی عبادت روزہ ہی ہے، اس مقصد کے لئے اس سے بہتر کوئی عبادت نہیں ہے، اس لئے روزہ کو چوتھا رکن قرار دیا گیا ہے۔

④ ——— پہلے (مبحث ۵ باب ۷ میں) یہ بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ منزّل من اللہ شریعتوں میں ایک بنیادی حکم یہ بھی رہا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کی جائے۔اور اہم شعائر اللہ چار ہیں: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز۔حج کی عبادت کعبہ شریف کی تعظیم کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

اور مبحث خامس کے مختلف ابواب میں مذکورہ چاروں عبادتوں کے فوائد کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ چار عبادتیں دوسری عبادتوں سے مستغنی کرنے والی ہیں۔اور دوسری عبادتیں ان چار سے مستغنی نہیں کرتیں، اس لئے ارکان اسلام کی تعیین کے لئے انہی چار کی تخصیص کی گئی ہے۔

فائدہ: واضح رہے کہ اسلام کے فرائض اِن ارکان خمسہ ہی میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ ان کے علاوہ اور بھی امور فرض ہیں۔مثلاً جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ۔لیکن جو اہمیت اور جو خصوصیت ان پانچ کو حاصل ہے، وہ چونکہ اَوروں کو حاصل نہیں، اس لئے اسلام کا رکن صرف انہی کو قرار دیا گیا ہے۔اور وہ خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ یہ ارکان خمسہ دین اسلام کے لئے بمنزلۂ پیکر محسوس کے ہیں۔نیز یہی وہ خاص تعبدی امور ہیں جو بالذات مطلوب ومقصود ہیں۔اور ان کی فرضیت کسی عارض کی وجہ سے، اور کسی خاص حالت سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ یہ مستقل اور دوامی فرائض ہیں۔بخلاف جہاد اور امر بالمعروف کے، کہ اُن کی یہ حیثیت نہیں ہے اور وہ خاص حالات میں اور خاص موقعوں پر فرض ہوتے ہیں (ماخوذ از معارف الحدیث ۱:۳۷۳و۴۷۴)

وإنماخَصَّ الخمسةَ بالركنية:

[١-] لأنها أشهرُ عبادات البشر، وليست ملّةٌ من الملل إلا قد أخذت بها، والتزمتها، كاليهود، والنصارى، والمجوس، وبقية العرب، على اختلافهم فى أوضاع أدائها.

[٢-] ولأن فيها ما يَكفى عن غيرها، وليس فى غيرها ما يَكفى عنها.

وذلك:

[١-] لأن أصل أصول البرّ: التوحيدُ، وتصديقُ النبى، والتسليمُ للشرائع الإلهية، ولمَّا كانت البعثة عامَّةً، وكان الناس يدخلون فى دين الله أفواجًا، لم يكن بُدٌّ من علامة ظاهرة، بها يُمَيَّزُ بين الموافق والمخالِف، وعليها يُدار حكمُ الإسلام، وبها يُؤاخَذ الناسُ. ولولا ذلك لم يُفَرَّق بينهما إلا بعد طول الممارسة، إلا تفريقًا ظنيًّا، معتمِدًا على قرائنَ، ولاختلف الناس فى الحكم بالإسلام، وفى ذلك اختلالٌ كثير من الأحكام، كما لايخفى. وليس شيء كالإقرار طوعًا ورغبةً كاشفًا عن حقيقة ما فى القلب من الاعتقاد والتصديق.

[٢-] ولمّا ذكرنا من قبلُ: من أن مدارَ السعادة النوعية، وملاكَ النجاة الأخروية، هى الأخلاقُ الأربعةُ، فَجُعلت الصلاة المقرونة بالطهارة شبحًا ومظنّةً لخُلُقي الإخبات والنظافة، وجُعلت الزكاة المقرونةُ بشروطها، المصروفةُ إلى مصارفها، مظنّةً للسَّماحة والعدالة.

[٣-] ولمّا ذكرنا: أنه لابد من طاعة قاهرة على النفس، ليدفع بها الحُجُب الطبيعيّةَ، ولا شيء فى ذلك كالصوم.

[٤-] ولمّا ذكرنا أيضًا: من أن أصل أصول الشرائع هو تعظيم شعائر الله؛ وهى أربعة، منها الكعبة وتعظيمُها الحجُّ.

وقد ذكرنا فيما سبق من فوائد هذه الطاعات ما يُعلم به: أنها تَكفى عن غيرها، وأن غيرها لا تَكفى عنها.

ترجمہ: اور پانچ چیزوں کو رکن ہونے کے ساتھ اسی وجہ سے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے) خاص کیا ہے:

(۱) اس لئے کہ وہ امور انسانوں کی مشہور ترین عبادتیں ہیں۔ اور نہیں ہے ملتوں میں سے کوئی ملت مگر تحقیق اس نے اختیار کیا ہے اُن امور کو، اور اس نے ان کا التزام کیا ہے۔ جیسے یہود، نصاری، مجوس اور باقی ماندہ عرب۔ ان کے اختلاف کے ساتھ ان امور کی ادائیگی کے احوال میں۔

(۲) اور اس لئے کہ ان امور میں وہ بات ہے جو کافی ہو جاتی ہے ان کے علاوہ سے۔ اور نہیں ہے ان کے علاوہ میں

وہ بات جو کافی ہو جائے ان امور کی طرف سے۔

اور یہ بات:

(۱) اس لئے ہے کہ نیکیوں کی بنیادی باتوں کی اساس: توحید و رسالت کی تصدیق اور احکام الٰہیہ کو تسلیم کرنا ہے۔ اور جبکہ (آنحضرت ﷺ کی) بعثت عام تھی۔ اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے تھے (تو) کوئی چارہ نہیں تھا کسی ظاہری علامت کے بغیر، جس کے ذریعہ امتیاز کیا جائے موافق و مخالف کے درمیان۔ اور جس پر حکم اسلام کا مدار رکھا جائے۔ اور اس کے ذریعہ لوگوں سے باز پرس کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ جدائی کی جا سکتی موافق و مخالف کے درمیان مگر عرصۂ دراز کی ممارست کے بعد، مگر ظنی جدائی کرنا، قرائن پر اعتماد کرتے ہوئے۔ اور ضرور لوگ اختلاف کرتے اسلام کا حکم لگانے میں۔ اور اس میں بہت بڑا اختلال تھا احکام میں، جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے۔ اور نہیں ہے کوئی چیز برضاء و رغبت اقرار کی طرح اس اعتقاد و تصدیق کی حقیقت کھولنے میں جو دل میں ہے۔

(۲) اور اس وجہ سے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نوع بشری کی نیک بختی کا مدار، اور اخروی نجات کا سرمایہ اخلاق اربعہ ہیں۔ پس گردانی گئی وہ نماز جو پاکی کے ساتھ مقرون ہو اخبات و نظافت کی دو خصلتوں کا پیکر محسوس اور احتمالی جگہ۔ اور گردانی گئی وہ زکوٰۃ جو اس کی شرطوں کے ساتھ مقرون ہو۔ اور جو اس کے مصارف میں خرچ کی گئی ہو سماحت و عدالت کے لئے احتمالی جگہ۔

(۳) اور اس وجہ سے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ضروری ہے کوئی ایسی عبادت جو نفس پر غالب ہو، تاکہ آدمی دور کرے اس کے ذریعہ فطری حجابات کو۔ اور نہیں ہے کوئی چیز اس میں روزہ کی طرح۔

(۴) اور اس وجہ سے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خدائی شریعتوں کی اصل اصول شعائر اللہ کی تعظیم ہے۔ اور شعائر اللہ چار ہیں۔ ان میں سے ایک کعبہ ہے۔ اور اس کی تعظیم اس کا حج کرنا ہے۔

اور تحقیق ذکر کئے ہیں ہم نے مدتہ ابواب میں ان عبادات کے فوائد میں سے وہ جن کے ذریعہ جانا جاتا ہے کہ یہ عبادتیں کفایت کرتی ہیں ان کے علاوہ سے۔ اور یہ کہ ان کے ماسواء کفایت نہیں کرتیں ان سے۔

لغات: الزم العمل أو المال اپنے اوپر واجب کر لینا أوضاع جمع ہے وضع کی، جو عرض کے نو مقولوں میں سے ایک مقولہ ہے، پس یہ نیم منطقی اصطلاحی لفظ ہے کفی یکفی کفایۃ کافی ہونا، دوسرے سے مستغنی کرنا ..... ملاک الأمر سہارا، سرمایہ شح پر چھائیں۔ یہاں پیکر محسوس مراد ہے مظنۃ کسی چیز کے ملنے کی احتمالی جگہ..... حجاب طبعی سے حجاب نفس مراد ہے۔ دیکھئے مبحث ۴ باب ۶

ترکیب: لم یکن بد جزاء ہے لما کانت البعثۃ کی ولاختلف کا عطف لم یفرق پر ہے کاشفاً ہے لیس کی۔

تصحیح: الا بعد میں الا تینوں مخطوطوں سے بڑھایا ہے۔ اور وہ سارا الا استثناء در استثناء ہے۔ استثناء ثانی نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

گناہ: کبائر وصغائر

اوپر جو بیان کیا گیا ہے کہ نجات کے لئے کم از کم اسلام کے ارکان خمسہ پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ آدمی بڑے گناہوں سے بچا رہے۔ سورۃ النساء آیت ۳۱ میں ارشاد ربانی ہے

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ. وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا

جن کاموں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اُن میں جو بھاری بھاری کام ہیں اگر تم ان سے بچتے رہو تو ہم تمہاری خفیف برائیاں تم سے دور فرما دیں گے، اور ہم تم کو ایک معزز جگہ میں داخل کریں گے۔

شریعت کی نظر میں گناہ کی دو قسمیں ہیں: کبائر اور صغائر:

۱ ـــــ کبائر (بڑے گناہ) وہ ہیں جو آدمی سے اس وقت صادر ہوتے ہیں جب اس پر بہیمیت، درندگی یا شیطنت (شرارت وخباثت) کا بھاری پردہ پڑ جاتا ہے یعنی غلبہ ہو جاتا ہے اور جس کے ارتکاب سے راہِ حق مسدود ہو جاتی ہے یعنی آدمی دین سے دور جا پڑتا ہے اور جس سے شعائر اللہ کی عظمت برباد ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مہلک حرکات ہوتے ہیں، اور ان سے لوگوں کو ضرر عظیم پہنچتا ہے۔ اور مع ہذا ان کاموں کا مرتکب خیر وبہبود سے پشت دکھا دیتا ہے۔ یہ وہ شریعت نے ان کاموں سے نہایت سختی کے ساتھ روکا ہے اور ان کے ارتکاب پر نہایت سخت تہدید فرمائی ہے، اور اس کو ایسے خطرناک کام قرار دیا ہے کہ گویا اس کا مرتکب ملت سے خارج ہے۔

۲ ـــــ صغائر (چھوٹے گناہ) برائی کے وہ اسباب ووسائل ہیں جو مذکورہ گناہوں سے فروتر ہیں، شریعت نے ان سے بھی قطعی طور پر روکا ہے، لیکن ان پر ایسی سخت تہدید نہیں فرمائی جیسی مذکورہ گناہوں کے بارے میں فرمائی ہے۔

تشریح: کبیرہ کی تعریف میں بہت اختلاف ہے، اور صغیرہ چونکہ اس کا مقابل ہے اس لئے اس کی تعریف میں بھی اختلاف ناگزیر ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم ہی درست نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ہر گناہ جس سے قرآن وحدیث میں روکا گیا ہے کبیرہ ہے۔ ان کے خیال میں یہ بات مناسب نہیں ہے کہ جس کام سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اس کو صغیرہ (معمولی گناہ) کہہ دیا جائے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں، مذکورہ آیت میں تقسیم کی طرف صاف اشارہ موجود ہے۔

روح المعانی (۵:۱۷۰) میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں کبیرہ کی تعریف میں سات آٹھ قول ذکر کئے گئے ہیں، مگر یہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ ہر ایک نے ایک پہلو ظاہر کیا ہے۔ اور بعض حضرات نے سب اقوال کو جمع کیا ہے۔ شیخ الاسلام

بارزی فرماتے ہیں:

''جس گناہ پر کوئی وعید آئی ہو یا اس پر کوئی حد (سزا) مقرر کی گئی ہو، یا اس پر قرآن وحدیث میں لعنت وارد ہوئی ہو، یا اس میں خرابی کسی ایسے گناہ کے برابر یا زیادہ ہو جس پر وعید یا حد یا لعنت آئی ہو، یا اس کے مرتکب کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوتا ہو کہ وہ دین میں متہاون ہے، تو وہ کبیرہ ہے اور اس کا مقابل صغیرہ ہے'' (روح المعانی)

اور شاہ صاحب قدس سرہ نے اس سلسلہ میں قول جامع یہ بیان کیا ہے کہ ایسے کام جو آدمی سے اس وقت صادر ہوتے ہیں جب اس پر بہیمیت یا سَبُعیت یا شیطنت کا سخت حملہ ہوتا ہے۔ جیسے زنا، ناحق قتل اور مال غنیمت لوٹنا۔ جب آدمی اس قسم کی حرکتیں کرتا ہے تو وہ دین سے دور جا پڑتا ہے۔ جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے یعنی وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اور ان کاموں کے ارتکاب سے شعائر اللہ کی عظمت پر بھی حرف آتا ہے گویا اس گنہگار کے نزدیک قرآن وحدیث کے احکام کی کوئی حیثیت ہی نہیں! ——— یا اُن کاموں میں ارتفاقات کی خلاف ورزی ہوتی ہے، جیسے زنا، حالت حیض میں صحبت اور اغلام وغیرہ کہ ان سے نکاح اور توالد وتناسل کی راہ مسدود ہو جاتی ہے، اور لوگوں کو ضرر عظیم پہنچتا ہے۔

علاوہ ازیں ان کاموں کا مرتکب شریعت کو پس پشت بھی ڈال دیتا ہے۔ وہ شریعت کی ممانعت اور تہدیدات کی کچھ پرواہ نہیں کرتا، حالانکہ شریعت نے ان کو ایسا خطرناک کام قرار دیا ہے کہ گویا ان کا مرتکب ملت سے خارج ہے۔ اس کے حق میں **فقد کفر** اور **فقد بریٔ مما أنزل علی محمد** جیسے سخت کلمات وارد ہوئے ہیں۔

اور صغائر: بڑے گناہوں کے اسباب ودواعی ہیں۔ جیسے بدنظری: زنا کا سبب اور اس تک مُفضی ہے۔ مگر یہ گناہ زنا سے فروتر ہے، پس زنا کی بہ نسبت یہ صغیرہ ہے۔ شریعت نے ان گناہوں سے بھی روکا ہے، مگر ان پر کبائر جیسی سخت وعید وارد نہیں ہوئی۔ غرض صغائر سے بھی بچنا ضروری ہے۔ صغیرہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں۔ چھوٹی چنگاری بھی آگ ہے، وہ بھی ایک جہاں کو پھونک سکتی ہے۔

کبائر کی تعداد متعین نہیں

کبائر کی تعداد روایات میں مختلف آئی ہے۔ ایک متفق علیہ روایت میں ہے کہ: ''سات مہلک گناہوں سے بچو'' الخ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ایک روایت میں ان کی تعداد نو آئی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے دس کی تعداد مروی ہے، بلکہ عبدالرزاق نے ایک روایت ذکر کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ کیا کبائر سات ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''وہ قریب ستر ہیں'' اور سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کی روایت میں ابن عباسؓ کا یہ جواب مروی ہے کہ: ''وہ قریب سات سو ہیں''۔ شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں:

'حق بات یہ ہے کہ کبائر کی تعداد متعین نہیں۔ان کو حد (تعریف) ہی سے پہچانا جا سکتا ہے کہ جس کام پر قرآن کریم میں اور احادیث صحیحہ میں جہنم کی وعید آئی ہے یا اس پر سزا مقرر کی گئی ہے یا نصوص میں اس کو کبیرہ کہا گیا ہے یا اس کے مرتکب کو ملت سے خارج قرار دیا گیا ہے یا اس کی خرابی اُن گناہوں سے بڑھی ہوئی ہے یا ان کے برابر ہے جن کے کبیرہ ہونے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت فرمائی ہے''

اور واحدی رحمہ اللہ نے تعداد متعین نہ ہونے کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ اگر کبائر کی تعداد متعین کر دی جاتی تو لوگ صغائر کا ارتکاب شروع کر دیتے، اور ان کو جائز سمجھ لیتے کہ یہ تو معمولی گناہ ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں سے کبائر کی تعداد مخفی رکھی تا کہ لوگ ہر منہی عنہ سے بچیں، یہ خیال کر کے کہ کہیں وہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ جیسے صلوٰۃ وُسطیٰ کا، شب قدر کا اور جمعہ کے دن قبولیت کی گھڑی کا علم مخفی کر دیا گیا ہے، تا کہ لوگ ہر نماز کو درمیانی نماز خیال کر کے اس کا اہتمام کریں اور رمضان کی ہر رات میں شب قدر کو تلاش کریں اور جمعہ کے دن بوقت نماز بھی، عصر کے بعد بھی اور دیگر ساعات میں بھی دعا کریں (روح المعانی ۱۷:۵)

والآثام: باعتبار الملّة على قسمين: صغائر وكبائر:

والكبائر: مالايصدُر إلا بغاشية عظيمة من البهيمية، أو السَّبُعية، أو الشيطنة، وفيه انسداد سبيل الحق، وهَتْكُ حُرْمةِ شعائرِ الله، أو مخالفاتُ الارتفاقات الضرورية، والضررُ العظيم بالناس، ويكون مع ذلك منابذًا للشرع، لأن الشرع نهى عنه أشدّ نهي، وغلّظ التهديدَ على فاعله، وجعله كأنه خروج من الملة.

والصغائر: ماكان دون ذلك من دواعي الشرومُفضياتِ إليه، وقد طهر نهيُ الشرع عنه حتما، ولكن لم يُغَلِّظْ فيه ذلك التغليظَ.

والحقُّ: أن الكبائر ليست محصورةً في عدد، وأنها تُعرف بإيعاد النار في الكتاب والسنة الصحيحة، وشَرْعِ الحدِّ عليه، وتسميته كبيرةً، وجعله خروجا عن الدين، وكونِ الشيء أكثرَ مفسدةً مما نصَّ النبي صلى الله عليه وسلم على كونه كبيرةً، أو مثلَها في المفسدة.

ترجمہ: اور گناہ ملت کے اعتبار سے یعنی شریعت کی نظر میں دو قسموں پر ہیں: صغائر اور کبائر:

اور کبائر: وہ کام ہیں جو نہیں صادر ہوتے مگر بہیمیت یا درندگی یا شیطنت کا بڑا پردہ پڑ جانے کی وجہ سے، اور اس میں راہ حق کو مسدود کرنا ہے اور عظمتِ شعائر اللہ کی ہتک ہے۔ یا ضروری تدبیرات نافعہ کی خلاف ورزی ہے اور لوگوں کو ضرر عظیم پہنچانا ہے اور ہوتا ہے گنہگار اُن (خرابیوں) کے ساتھ شریعت کو پس پشت ڈالنے والا۔ اس لئے کہ شریعت نے روکا ہے اس

سے تاکید کے ساتھ روکنا۔ اور گاڑھا کیا ہے دھمکی کو اس کے مرتکب پر۔ اور گردانا ہے اس کو گویا وہ ملت سے نکل جاتا ہے۔

اور صغائر: وہ کام ہیں جو اس سے فروتر ہیں، برائی کے اسباب میں سے اور برائی تک مفضی امور میں سے۔ اور تحقیق ظاہر ہوا ہے شریعت کا روکنا اس سے قطعی طور پر، مگر نہیں گاڑھا کیا ہے اس میں اس دھمکی کو۔

اور حق بات یہ ہے کہ کبائر کسی عدد میں محصور نہیں ہیں۔ اور (حق بات) یہ ہے کہ وہ (کبائر) پہچانے جاتے ہیں جہنم کی دھمکی دینے سے قرآن اور احادیث صحیحہ میں، اور اس پر سزا مقرر کرنے سے، اور اس کا کبیرہ نام رکھنے سے، اور اس کو ملت سے نکلنا گردانتے سے، اور کسی چیز کے ہونے سے خرابی میں بڑھا ہوا اُن گناہوں سے جن کے کبیرہ ہونے کی رسول اللہ ﷺ نے صراحت کی ہے، یا خرابی میں اس کے برابر ہونے سے۔

لغات: الغاشية: مؤنث غاشی: پردہ، دل کا پردہ، جمع غواشٍ.

☆ ☆ ☆

فصل

ایمانیات سے تعلق رکھنے والی روایات

وہ روایات جن میں کبائر و کفریات کا تذکرہ ہے

حدیث ـــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"نہیں زنا کرتا کوئی زنا کار، جب وہ زنا کرتا ہے درانحالیکہ وہ مؤمن ہو۔ اور نہیں چوری کرتا کوئی چور، جب وہ چوری کرتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو۔ اور نہیں شراب پیتا کوئی شرابی، جب وہ شراب پیتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو۔ اور نہیں لوٹتا (لشکرا) کوئی لوٹ ـــ کہ لوگ اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھتے ہیں ـــ جب وہ لوٹتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو۔ اور نہیں خیانت کرتا مالِ غنیمت میں کوئی خائن، جب وہ خیانت کرتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو، پس بچو! بچو!!" (متفق علیہ)

اور ایک دوسری متفق علیہ روایت میں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے مذکورہ امور کے ساتھ ناحق قتل کا بھی ذکر ہے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ زنا، چوری، شراب نوشی، لوٹ مار، مالِ غنیمت میں خیانت اور قتل ناحق یہ سب ایسی حرکتیں ہیں جو آدمی سے اسی وقت صادر ہوتی ہیں جب اس پر بہیمیت یا درندگی کا بڑا پردہ پڑ جاتا ہے۔ اس وقت ملکیت (ایمان کا نور) گویا بالکل ختم ہو جاتی ہے، اور ایمان کافور ہو جاتا ہے۔ اس ارشاد پاک کے ذریعہ یہ سمجھانا مقصود ہے کہ یہ سب افعال کبیرہ گناہ ہیں (یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اسلام کے دائرہ سے بالکل نکل جاتا ہے اور کافروں میں شامل ہو جاتا ہے)

فائدہ: اس قسم کی حدیثیں جن میں خاص خاص بداعمالیوں اور بداخلاقیوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان میں ایمان نہیں، یا وہ مؤمن نہیں۔ اور اسی طرح وہ حدیثیں جن میں بعض اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ان کا تارک ہے وہ ایمان سے خالی اور بے نصیب ہے یا یہ کہ وہ مؤمن نہیں ہے۔ ان کا مقصد ومنشا یہ نہیں ہوتا کہ وہ شخص دائرۂ اسلام سے بالکل نکل گیا۔ اور اب اس پر اسلام کے بجائے کفر کے احکام جاری ہوں گے اور آخرت میں اس کے ساتھ ٹھیٹ کافروں والا معاملہ ہوگا۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اس حقیقی ایمان سے محروم اور بے نصیب ہے جو مسلمانوں کی اصلی شان ہے، اور جو اللہ کو محبوب ہے۔

اور اس کے لئے نحوی ترکیب میں کاملاً یا تاماً جیسے الفاظ مقدر ماننے کی بالکل ضرورت نہیں، بلکہ ایسا کرنا ایک قسم کی بدذوقی ہے۔ ہر زبان کا یہ عام محاورہ ہے کہ اگر کسی میں کوئی صفت بہت ناقص اور کمزور درجہ کی ہو، تو اس کو کالعدم قرار دے کر اس کی مطلق نفی کر دی جاتی ہے۔ خاص کر دعوت وخطابت اور ترغیب وترہیب میں یہی طرز بیان زیادہ موزوں اور زیادہ مفید مطلب ہوتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے دیکھیں معارف الحدیث (۱:۱۵۵)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے اس امت کا (یعنی اس دور کا) کوئی بھی ـــــ خواہ یہودی یا عیسائی ہی کیوں نہ ہو ـــــ میری خبر سن لے گا (یعنی اس کو میری نبوت کی دعوت پہنچ جائے گی) پھر وہ مجھ پر اور میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مرے گا، تو وہ ضرور دوزخ میں جائے گا'' (رواہ مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی دعوت پہنچ جائے، پھر وہ آپؐ پر ایمان نہ لائے، انکار پر اڑا رہے، اور اسی حال میں مر جائے تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ اگرچہ وہ کسی سابق پیغمبر کو، اس کے دین کو اور اس کی کتاب وشریعت کو ماننے والا یہودی یا عیسائی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دور محمدی میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوا ہے، اور قیامت تک جاری رہے گا اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بندوں کی اصلاح کے لئے جو نظم وانتظام کیا ہے، وہ شخص اس کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کی اور مقرب فرشتوں کی پھٹکار کا مورد بنا ہے۔ اور اس نے نجات کی راہ خود ہی گم کر دی ہے۔ الغرض خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپؐ پر ایمان لائے بغیر اور آپ کی شریعت کو قبول کئے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اور یہ مسئلہ دین اسلام کے قطعیات وبدیہیات میں سے ہے، جس میں شک وشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی حیثیت کو نہ سمجھنے ہی سے ہو سکتا ہے (معارف الحدیث ۱:۸۹)

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشات میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہو جائیں''

تشریح: ایمان کا کمال یہ ہے کہ عقل طبیعت پر غالب آجائے یعنی عقل کا مقتضی واضح طور پر اسکے نزدیک طبیعت کے مقتضی

سے افضل ہو۔ اور یہ بات دین کے ہر معاملہ میں ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ سے، اسلام سے، قرآن سے اور رسول اللہ ﷺ سے محبت ہر چیز کی محبت سے زیادہ ہونی چاہئے۔ جبھی ایمان کی تکمیل ہو سکتی ہے اور اسی وقت ایمان کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔

اور یہ بات اپنے اندر پیدا کرنا یا اس حقیقت کو سمجھنا کچھ دشوار نہیں، کیونکہ اللہ و رسول کے ساتھ اہل ایمان کو جو محبت ہوتی ہے وہ ماں باپ اور بیوی بچوں کی محبت کی طرح خونی رشتوں یا دوسرے طبعی اسباب کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ وہ روحانی اور عقلی وجوہ سے ہوتی ہے۔ اور جب وہ کامل ہو جاتی ہے تو اس کے سوا دوسری تمام وہ محبتیں جو طبعی یا نفسانی اسباب سے ہوتی ہیں دب جاتی ہیں، اور مغلوب ہو جاتی ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''میری زندگی کی قسم! (یعنی میری زندگی کے تجربات، گواہ ہیں کہ) یہ چیز کامل ایمان والوں میں مشاہدہ کی ہوئی ہے'' یعنی وہ وقت آنے پر ہر تعلق کو اپنے حبیب ﷺ سے تعلق پر قربان کر دیتے ہیں۔

فائدہ: لایؤمن کی تعبیر سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے ہر چیز سے زیادہ محبت کرنا اور ھَوی (خواہشات نفس) کو ھُدی (اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی تعلیمات) کے تابع کرنا واجب ہے اور اس کی جانب مخالف حرام ہے۔ پس یہی گناہ کبیرہ ہے۔

[۱] وقوله: صلى الله عليه وسلم: " لايزنى الزانى حين يزنى وهو مؤمن" الحديث، معناه: أن هذه الأفعال لا تصدُر إلا بغاشية عظيمة من البهيمية، أو السبعية، فتصير حينئذ الملكيةُ كأن لم تكن، والإيمانُ كأنه زائل؛ ودلّ بذلك على كونها كبائر

[۲] قال النبى صلى الله عليه وسلم: " والذى نفسُ محمدٍ بيده! لا يسمع بى أحدٌ من هذه الأمة: يهوديٌّ ولانصرانى، ثم يموت، ولم يؤمن بالذى أُرسلتُ به، إلا كان من أصحاب النار"

أقول: يعنى من بلَغتْه الدعوةُ، ثم أصرَّ على الكفر حتى مات دخل النار، لأنه ناقَض تدبير الله تعالى لعباده، ومَكَّن من نفسه لعنة الله والملائكة المقرَّبين، وأخطأ الطريقَ الكاسب للنجاة.

[۳] وقال صلى الله عليه وسلم: " لايؤمن أحدُكم حتى أكون أحبَّ إليه من والده وولده والناس أجمعين" وقال: " حتى يكون هواه تبعاً لما جئتُ به"

أقول: كمالُ الإيمان أن يغلب العقل على الطبع، بحيث يكون مقتضى العقل أمْثل بين عينيه من مقتضى الطبع بادى الأمر، وكذلك الحال فى حب الرسول، ولعمْرِىْ! هذا مشهودٌ فى الكاملين.

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''نہیں زنا کرتا زنا کرنے والا، جب وہ زنا کرتا ہے، درانحالیکہ وہ مؤمن ہو'' حدیث آخر تک پڑھیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ افعال نہیں صادر ہوتے مگر بہیمیت یا سَبُعیت کے بڑے پردے کی

وجہ سے۔ پس اس وقت ملکیت ہو جاتی ہے گویا تھی ہی نہیں۔ اور ایمان گویا وہ ختم ہو جانے والا ہے۔ راہ نمائی کی ہے آپ نے اس ارشاد سے ان افعال کے کبیرہ ہونے کی طرف۔

(۲) فرمایا نبی ﷺ نے: ''قسم ہے الخ'' میں کہتا ہوں مراد لے رہے ہیں آپ ﷺ اس شخص کو جس کو دعوت پہنچی، پھر اڑا رہا وہ انکار پر، یہاں تک کہ مر گیا، تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ کیونکہ اس نے مخالفت کی اللہ تعالیٰ کے انتظام کی اپنے بندوں کے لئے۔ اور موقع دیا اس نے اپنے اندر اللہ کی اور مقرب فرشتوں کی پھٹکار کو۔ اور چوک گیا وہ اس راہ کو جو نجات کو کمانے والی ہے۔

(۳) اور فرمایا آپ ﷺ نے: ''نہیں ایمان لاتا الخ'' اور فرمایا: ''یہاں تک کہ الخ'' میں کہتا ہوں: ایمان کا کمال یہ ہے کہ عقل طبیعت پر غالب آ جائے، بایں طور کہ عقل کا مقتضی اس کی آنکھوں کے سامنے ہو طبیعت کے مقتضی سے واضح طور پر۔ اور اسی طرح حالت ہے حب رسول کی۔ اور میری زندگی کی قسم! یہ چیز کاملین میں مشاہدہ کی ہوئی ہے۔

☆ ☆ ☆

ایک جامع تعلیم اور اسلام کا عطر

حدیث ـــــ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اسلام کے بارے میں مجھے کوئی ایسی جامع اور شافی بات بتلایئے کہ آپ کے بعد ـــــ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے علاوہ ـــــ پھر میں کسی سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھوں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہو: ایمان لایا میں اللہ پر، پھر اس پر جم جاؤ'' (رواہ مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کو الٰہ اور رب مان کر اپنے کو بس اس کا بندہ بنا دو، انقیاد و اطاعت کو اور اللہ کے احکام کے سامنے سرافگندگی کو اپنا شیوہ بنا لو۔ اعمال اسلام پر عمل پیرا ہو جاؤ اور اسلام میں ممنوع اعمال سے بالکلیہ کنارہ کش ہو جاؤ یہی جامع تعلیم اور اسلام کا عطر ہے۔ اس تعلیم کے بعد کسی اور سبق کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سورہ حٰمٓ السجدۃ آیت ۳۰ میں ارشاد پاک ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا: رَبُّنَا اللّٰهُ، ثُمَّ اسْتَقَامُوْا، تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ.

بیشک جن لوگوں نے دل سے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس پر مستقیم رہے تو ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) کہ تم اندیشہ نہ کرو، اور نہ رنج کرو، اور تم اس جنت کی خوش خبری سن لو جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔

الغرض یہ ایک جامع ارشاد اور کلی بات ہے۔ اس سے مؤمن کو تمام احکاماتِ شرعیہ کے سلسلہ میں بصیرت حاصل ہو جاتی ہے کہ تمام اوامر و نواہی اور جملہ احکام خداوندی کی پیروی ضروری ہے۔ اور یہ اجمالی علم بھی انسان کو دین میں اور

خیرات (اعمال صالحہ) میں آگے بڑھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

[٤] قيل: يارسولَ اللّٰه! قل لى فى الإسلام قولاً لاأسألُ عنه أحدًا بعدك، وفى رواية: غيرَك، قال: " قل: آمنتُ باللّٰه، ثم استَقِمْ"

أقول: معناه أن يُحضر الإنسانُ بين عينيه حالةَ الانقياد والإسلام، ثم يعمل بمايناسبه، ويترك ما يخالفه، وهذا قولٌ كلىٌّ يصير به الإنسانُ على بصيرة من الشرائع، وإن لم يكن تفصيلاً، فلايخلو عن علم أجمالى، يجعلُ الإنسان سابقًا.

ترجمہ: (۴) پوچھا گیا الخ میں کہتا ہوں: اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر کرے فرمانبرداری اور سرافگندگی کی حالت کو، پھر کرے وہ کام جو اس کے مناسب ہیں، اور چھوڑے وہ کام جو اس کے برخلاف ہیں (جیسے کسی کو استاذ مان لیا جائے تو اب اس کے تقاضے پورے کرنے ضروری ہیں) اور یہ ایک جامع ارشاد ہے اس کے ذریعہ انسان بابصیرت ہو جاتا ہے احکام شرعیہ میں۔ اگرچہ یہ بات تفصیلی نہیں ہے مگر خالی نہیں ہے ایسے اجمالی علم سے جو انسان کو آگے بڑھنے والا بنا دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

مؤمن ناجی ہے ناری نہیں

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''جو کوئی سچے دل سے شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ پر حرام کر دیں گے'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کیا میں لوگوں کو اس کی خبر نہ کر دوں کہ وہ خوش ہو جائیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''پھر وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے!'' پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری وقت میں کتمانِ علم کے خوف سے یہ حدیث لوگوں سے بیان کی'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۵)

حدیث ـــــ آنحضرت ﷺ نے ایک بار حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''جو بھی بندہ لا إله إلا الله کہے، اور پھر اس پر اس کو موت آجائے، تو وہ جنت میں ضرور جائے گا'' حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو، اور اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ''اگرچہ اس نے زنا کیا ہو، اور اگرچہ اس نے چوری کی ہو!'' دوسری مرتبہ ابوذرؓ نے استعجاب سے یہی دریافت کیا، تو بھی آپؐ نے یہی

جواب دیا۔ تیسری بار جب حضرت ابوذرؓ نے یہی بات تعجب سے عرض کی تو آپؐ نے فرمایا: ''اگر چہ اس نے زنا کیا ہو، اور اگر چہ اس نے چوری کی ہو، وہ ابوذرؓ کی ناگواری کے باوجود جنت میں جائے گا'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث نمبر ۲۵)

حدیث ـــــ حضرت عُبادۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو بے ہمہ ہے، جس کا کوئی ساجھی نہیں، اور یہ گواہی دے کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور یہ گواہی دے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور ان کی بندی کے بیٹے ہیں، اور اللہ کا بول ہیں جس کو اللہ نے مریم کی طرف ڈالا ہے اور اللہ کی پیاری روح ہیں اور جنت اور جہنم برحق ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے، خواہ اس نے کچھ بھی عمل کیا ہو (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث نمبر ۲۷)

حدیث ـــــ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو کوئی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دیتے ہیں'' (مشکوۃ، حدیث نمبر ۳۶)

حدیث ـــــ اور مسلم شریف ہی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

''دو باتیں واجب کرنے والی ہیں'' ایک شخص نے پوچھا وہ دو واجب کرنے والی باتیں کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''جس کی اس حال میں موت آئے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہراتا تھا تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ اور جس کی اس حال میں موت آئے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگا'' (مشکوۃ حدیث ۳۸)

تشریح: ان تمام روایات کا مطلب یہ ہے کہ جس نے ایمان و اسلام کی دعوت قبول کی، اور توحید و رسالت کی شہادت دی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نجات کا حتمی وعدہ ہے۔ اور اگر وہ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی کرتا رہا اور کبائر سے بچتا بھی رہا تو وہ نجاتِ اوّلی کا حقدار ہے۔ اور اگر بہ تقاضائے بشریت اعمال میں کوتاہیاں ہوئیں یا کبائر کا ارتکاب کیا، تو دو صورتیں ہونگی: اگر مغفرت خداوندی اس کے شامل حال ہو جائے گی تو وہ بھی بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوگا۔ اور اگر اس کا نصیب ایسا نہیں تو وہ کوتاہیوں اور گناہوں کی پاداش میں جہنم میں داخل کیا جائے گا، اور سزا یابی کے بعد جنت میں پہنچایا جائے گا۔ تا ابد وہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ جہنم کی ابدی سزا کفار ہی کے لئے ہے۔ مؤمن کے لئے اگر چہ اس نے کبائر کا ارتکاب کیا ہو جہنم کی ابدی سزا نہیں ہے۔

ان روایات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ توحید و رسالت کا اقرار کرنے کے بعد آدمی خواہ کیسا ہی بدعقیدہ اور بدعمل رہا ہو، بہر حال وہ اللہ کے عذاب سے مامون و محفوظ رہے گا، دوزخ کی آگ اس کو چھو ہی نہیں سکتی۔ ایسا سمجھنا ان بشارتی ارشادات کا صحیح مفہوم و مدعا سمجھنے سے محرومی ہے۔

سوال: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان روایات کا یہی مطلب ہے جو اوپر بیان کیا گیا، تو پھر یہ تعبیرات کہ: ''اس کو دوزخ پر حرام کردیں گے'' اور ''وہ ضرور جنت میں جائے گا'' اور ''اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے خواہ اس نے کچھ بھی عمل کیا ہو'' اور ''اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کردیتے ہیں'' اور ''توحید خالص دخول جنت کو واجب کرنے والی ہے'' یہ تعبیرات کیوں اختیار کی گئی ہیں؟ اُس صورت میں تو صاف اور سیدھا انداز بیان یہ ہونا چاہئے تھا کہ: ''ایمان کی بہ دولت مؤمن کسی نہ کسی دن جنت میں ضرور جائے گا''۔ یہ تعبیرات تو ذہن کو اس طرف لے جاتی ہیں کہ ایمان کے ساتھ عملی کوتاہیاں اور کبائر کا ارتکاب کچھ مضر نہیں، جیسا کہ مُرجیہ فرقہ کہتا ہے۔

جواب: کلام کو اس انداز پر چلانے میں نکتہ یہ ہے کہ ان تعبیرات سے مؤمن کو بشارت سنانے کے ساتھ، کفر وشرک کی سنگینی بھی ظاہر کرنی ہے یعنی یہ بتلانا بھی مقصود ہے کہ کفر وشرک کی بہ نسبت کبائر بے حیثیت ہیں۔ گویا وہ گناہ ہی نہیں۔ اس لئے مؤمن ضرور جنت میں جائے گا۔ خواہ اس نے کچھ بھی عمل کیا ہو۔ ہاں البتہ کفر وشرک کی معافی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ نہایت سنگین گناہ ہیں۔ جیسے بغاوت: حکومت کے نزدیک نہایت سخت گناہ ہے، اس کی معافی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور بغاوت کی بہ نسبت دیگر اخلاقی اور عملی جرائم معمولی گناہ ہیں۔ اس لئے مجرم کو بغیر سزا کے بھی چھوڑا جاسکتا ہے، اور سزا دی جائے تو بھی وہ دیر سویر جیل سے نکل آتا ہے۔ اور اس کی نظیر اُمرت ان اقاتل الخ ہے۔ اس حدیث کا مقصد جنگ چھیڑنا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں جنگ بندی کی حد بیان کی گئی ہے۔ مگر تعبیر اُمرت ان اقاتل الناس اختیار کی گئی ہے تاکہ اس طرف بھی اشارہ ہوجائے کہ فتنہ ختم کرنے کے لئے اقدامی جہاد بھی مشروع ہے۔

اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے انداز پر اس کی تفصیل یہ ہے کہ گناہ کے مراتب میں واضح تفاوت ہے، اگرچہ سب گناہ ''گناہ'' ہیں، مگر تمام گناہ ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ مثلاً کبائر کا کفر سے موازنہ کیا جائے تو ان کی کوئی محسوس حیثیت نہ ہوگی۔ وہ پہاڑ کے سامنے رائی کا دانہ نظر آئیں گے اور ان میں دخول نار کی سیئت کی شان بہت ہی مضمحل نظر آئے گی۔ یہی حال صغائر کا ہے جب ان کا کبائر سے موازنہ کیا جائے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ان تعبیرات سے کفر اور کبائر کے درمیان نہایت واضح فرق سمجھایا ہے کہ کفر وشرک تو ایسے سنگین گناہ ہیں کہ ان کی معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور کبائر چونکہ کفر وشرک کی بہ نسبت بے قدر ہیں۔ اس لئے ان کی معافی ابتداءً بھی ہوسکتی ہے اور بالآخر (یعنی سزایابی کے بعد) بھی ہوسکتی ہے۔ بلکہ ضرور ہوگی۔ مرتکب کبیرہ بھی کسی نہ کسی دن جنت میں ضرور پہنچ کر رہے گا۔

مثال سے وضاحت: معمولی بیماریاں جیسے زکام اور تکان وغیرہ جب ان کا مزمن بیماریوں سے جیسے جُذام، اور سل دق وغیرہ سے موازنہ کیا جائے جو فساد مزاج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، جب کہ وہ بگاڑ جسم انسانی میں جگہ بنالیتا ہے تو وہ معمولی بیماریاں صحت وتندرستی نظر آئیں گی، وہ کوئی علت وعارضہ ہی نہیں سمجھی جائیں گی۔ کیونکہ کبھی بھاری مصیبت چھوٹی مصیبت کو بھلا دیتی ہے۔ پیر میں کانٹا چبھ جائے، پھر آل یا مال پر کوئی آفت آن پڑے تو آدمی کانٹا چبھنے کی تکلیف

بھول جاتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس نئی آنے والی آفت سے پہلے مجھے کوئی تکلیف پہنچی ہی نہیں۔اسی طرح کبائر: کفروشرک کے مقابلہ میں کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں۔

[٥] وقال صلى الله عليه وسلم:" مامن أحدٍ يَشْهَد أن لا إله إلا الله، وأن محمدا رَّسول الله، صِدْقا من قلبه، إلا حَرَّمه الله على النار" وقوله صلى الله عليه وسلم:" وإن زنى وإن سرق" وقوله صلى الله عليه وسلم:" على ما كان من عملٍ"

أقول: معناه: حَرَّمه الله على النار الشديدة المؤَبَّدةِ التى أعدَّها للكافرين، وإن عمل الكبائر.

والنكتة فى سَوق الكلام هذا السياق: أن مراتب الإثم بينها تفاوتٌ بَيِّنٌ، وإن كان يجمَعُها كلُّها اسمُ الإثم، فالكبائر إذا قيست بالكفر لم يكن لهاقدرٌ محسوسٌ، ولا تأثيرٌ يُعتد به، ولاسببيةٌ لدخول النار تُسمى سببيةً، وكذلك الصغائر بالنسبة إلى الكبائر، فبيَّن النبيُّ صلى الله عليه وسلم الفرق بينها على آكد وجهٍ، بمنزلة الصحة والسُّقم: فإن الأعراض البادية، كالزكام والنَّصَب، إذا قيست إلى سوء المزاج المتمكِّن، كالجُذام والسِّلّ والاستسقاء، يُحكم عليها بأنها صحةٌ، وأن صاحبها ليس بمريض، وأن ليس به قَلَبَةٌ، ورُبَّ داهيةٍ تُنسى داهيةً، كمن أصابه شوكةٌ، ثم وُتر أهلَه ومالَه،قال: لم يكن بى مصيبة قبلُ أصلاً.

ترجمہ:(۵)اورآنحضرت ﷺ نے فرمایا:''نہیں ہے کوئی شخص جوگواہی دے'' الخ۔

میں کہتا ہوں:اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اس کواللہ تعالیٰ حرام کردیں گے سخت دائمی آگ پر،جس کواللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے تیار کیا ہے،اگرچہ اس نے کبائر کاارتکاب کیا ہو۔

اورکلام کواس انداز پر چلانے میں نکتہ یہ ہے کہ گناہ کے مراتب،ان کے درمیان واضح تفاوت ہے،اگرچہ سب مراتب کولفظ''گناہ'' شامل ہے۔بس کبائر جب موازنہ کئے جائیں کفر کے ساتھ تونہیں ہوگی ان کے لئے کوئی محسوس حیثیت اورنہ قابل لحاظ قدر۔اورنہ آگ میں جانے کے لئے ایسی سببیت جس کوسببیت کہا جاسکے۔اوراسی طرح صغائر (کا حال ہے) کبائر کی بہ نسبت۔پس بیان فرمایا آنحضرت ﷺ نے ان کے درمیان فرق نہایت مؤکدطور پر(یعنی نتائج کا تفاوت دکھلاکر) جیسے تندرستی اور بیماری (کا حال ہے) پس معمولی بیماریاں جیسے زکام اورتکان،جب وہ موازنہ کی جائیں (جسم میں) جگہ پکڑنے والے فسادمزاج کے ساتھ،جیسے جُذام (کوڑھ،فسادخون کی ایک بیماری) اورسل دق (ایک بیماری جس سے پھیپھڑوں میں زخم ہوجاتے ہیں،اورمنہ سے خون آنے لگتا ہے۔ٹی بی) اوراستقاء(ایک بیماری جس سے پیٹ بڑھ جاتا ہےاور پیاس بہت لگتی ہے،جلندرکاروگ) توحکم لگایا جائے گا اُن (معمولی بیماریوں) پر

کہ وہ تندرستی ہیں۔ اور یہ کہ وہ ہلکی بیماریوں والا بیمار ہی نہیں ہے۔ اور یہ کہ نہیں ہے اسے کوئی سخت عارضہ اور کبھی ایک مصیبت دوسری مصیبت کو بھلا دیتی ہے، جیسے وہ شخص جسے کانٹا چبھا ہو، پھر آفت آن پڑے اس کے خاندان اور مال پر تو وہ کہتا ہے کہ نہیں پہنچی تھی مجھے کوئی مصیبت اس سے پہلے بالکل ہی۔

لغات: الأعراض البادية: معمولی بیماریاں نَصَب: تھکن المتمكن: جگہ پکڑنے والا . قلبة: وہ بیماری جس سے بیمار بچھونے پر تڑپے، کوئی سخت عارضہ۔ وَتَر: گھبرا دینا، ستانا، تکلیف پہنچانا وُتر (مجہول) آفت کا آنا حادثہ پڑنا۔

☆ ☆ ☆

ابلیس کا پانی پر تخت بچھانا اور دربار لگانا حقیقت ہے

حدیث ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بیشک ابلیس پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے، پھر وہ اپنے لشکروں کو بھیجتا ہے، جو لوگوں کو بہکاتے پھرتے ہیں۔ پس ان میں سے ابلیس سے مرتبہ میں قریب تر وہ ہے جو ان میں سب سے بڑا فتنہ انگیز ہے۔ ان میں سے ایک (ابلیس کے دربار میں) آتا ہے، پس کہتا ہے: ''میں نے یہ کیا اور یہ کیا'' (یعنی کسی کو زنا میں مبتلا کیا اور کسی کو چوری میں) پس ابلیس کہتا ہے: ''تو نے کچھ نہیں کیا!'' پھر ان میں سے ایک اور آتا ہے اور کہتا ہے: ''میں ایک شخص کے پیچھے پڑا رہا، تا آنکہ میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی کردی'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس ابلیس اس کو اپنے قریب کرتا ہے، اور کہتا ہے: ''تو بہت اچھا (پٹھا) ہے!'' اعمش راوی کہتے ہیں: میرا گمان یہ ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''پس وہ اس کو سینے سے لگاتا ہے'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۱۷ باب الوسوسۃ)

تشریح: اللہ تعالیٰ نے شیاطین کی تخلیق ہی کچھ اس طرح فرمائی ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔ جیسے کیڑے وہ کام کرتے رہتے ہیں جو ان کے مزاج کا تقاضا ہوتا ہے، جیسے گُبریلا پاخانہ لڑھکا کر اپنے بل میں لے جاتا ہے۔ اور یہی اس کی فطرت ہے۔ اسی طرح شیاطین بھی اپنی فطرت کے تقاضے سے لوگوں کو بہکاتے رہتے ہیں۔

اور اللہ کا طریقہ مخلوقات کی ہر نوع اور ہر صنف میں یہ ہے کہ ان کا ایک سردار ہوتا ہے، جو اپنے ماتحتوں کو کام سپرد کرتا ہے، پھر ان کی کارکردگی کا جائزہ بھی لیتا ہے۔ اور جو شاندار کام کرتا ہے اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ اسی طرح شیاطین کا سردار ابلیس ہے، جو شقاوت میں ناپ اور گمراہی میں طاق ہے، وہ پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے۔ کیونکہ تخلیق ارض وسماء کے وقت اللہ کا تخت پانی پر تھا۔ پس شیطان بھی پانی پر اپنا تخت بچھا کر اپنی خدائی کا تاثر دیتا ہے۔ اور وہ اپنے کارندوں کو اپنا پروگرام سپرد کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کس نے شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک سب سے شاندار کارنامہ میاں بیوی میں تفرق کراتا ہے۔ وہ اس حرکت کے کرنے والے کو گلے

لگاتا ہے اور شاباسی دیتا ہے۔

غرض اس حدیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بالکل حقیقت ہے، مجاز یا تمثیل (پیرایۂ بیان) ہرگز نہیں اور مجھے اس کا یقین ہے جیسا آنکھ سے دیکھی بھالی چیز کا ہوتا ہے۔

[٦] وقوله صلى الله عليه وسلم: إن أبليس يضع عرشه على الماء، ثم يبعث سَرَاياه يَفتنون الناس" الحديث. اعلم أن الله تعالىٰ خلَق الشياطين وجبلهم على الإغواء، بمنزلة الدود التي تفعلُ أفعالاً بمقتضى مزاجها، كالجُعل يُدهدهُ الخَرْأَةَ، وأن لهم رئيسا يضع عرشه على الماء ويدعوهم لتكميل ما هم قِبَلَهُ، قد استوجب أتمَّ الشقاوة وأوفر الضلال؛ وهذه سنة الله في كل نوع وفي كل صِنفٍ، وليس في هذا مَجَازٌ. وقد تحقَّقْتُ من ذلك مايكون بمنزلة الرؤية بالعَيْن.

ترجمہ: (٦) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "بیشک ابلیس پانی پر الخ" جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو پیدا فرمایا ہے اور ان کی تخلیق فرمائی ہے گمراہ کرنے پر، جیسے وہ کیڑے جو کرتے ہیں کچھ کام ان کے مزاج کے تقاضے سے، جیسے گبریلا لڑھکاتا ہے پاخانے کو۔

اور یہ (بات بھی جان لیں) کہ شیاطین کا ایک سردار ہے، جو پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے۔ اور بلاتا ہے وہ شیاطین کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے جو اس کا ہے۔ تحقیق واجب ولازم جانا ہے اس سردار نے اعلیٰ درجہ کی بدبختی کو اور کامل درجہ کی گمراہی کو۔ اور یہ اللہ کا طریقہ ہے ہر نوع میں اور ہر صنف میں اور نہیں ہے اس میں کچھ مجاز (بلکہ سراسر حقیقت ہے) اور تحقیق یقین کیا ہے میں نے اس سلسلہ میں وہ جو ہوتا ہے آنکھ سے دیکھنے جیسا۔

☆ ☆ ☆

شیطان کی وسوسہ اندازی

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ: کبھی میرے دل میں ایسے برے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں اُن کو زبان پر لاؤں! آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اللہ کا شکر ہے جس نے شیطان کے معاملہ کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا" (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۷۳)

حدیث ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بیشک شیطان اس سے تو ناامید ہو گیا ہے کہ نمازی بندے جزیرۃ العرب میں اس کی عبادت کریں۔ البتہ وہ ایک کو دوسرے کے خلاف

بھڑکانے میں مشغول ہے'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۷۲)

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے دلوں میں ایسے برے خیالات اور وسوسے پاتے ہیں کہ ان کو زبان سے ادا کرنا بہت برا اور بہت بھاری معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: ''کیا واقعی تمہاری یہ حالت ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: ہاں، یہی حال ہے، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''یہ تو خالص ایمان ہے!'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۶۳)

تشریح: شیطان کی وسوسہ اندازی، جس کے دل میں وہ وسوسہ ڈالتا ہے، اس کی استعداد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ سب سے خطرناک اثر اندازی یہ ہے کہ آدمی کفر میں مبتلا ہو جائے اور ملت سے نکل جائے۔ اگر اس سے اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں ـــــ ایمان قوی ہونے کی وجہ سے ـــــ تو پھر اس کی وسوسہ اندازی دوسری صورت اختیار کرتی ہے۔ وہ آپس میں خونریزی کراتا ہے، گھریلو زندگی بگاڑتا ہے اور اہل خانہ اور اہل بستی کے درمیان آگ بھڑکاتا ہے۔ اور اس سے بھی اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں تو پھر شیطان کے وسوسے خیالات کی شکل اختیار کرتے ہیں، جو آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ وساوس اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ وہ نفس کو کسی عمل پر نہیں ابھارتے۔ یہ وساوس ضرر رساں نہیں ہیں۔ اور اگر یہ خیالات ان کی برائی کے اعتقاد کے ساتھ مقارن ہوں تو پھر وہ واضح ایمان کی دلیل ہیں۔

پہلی اور تیسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا ہے کہ یہ فکرمند ہونے کی بات نہیں ہے، کیونکہ ان خیالات کو آدمی برا سمجھ رہا ہے۔ پس وہ واضح ایمان کی دلیل ہیں۔ بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہئے کہ اس کی دستگیری نے بات وسوسہ کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دی۔ اور دوسری حدیث میں شیطان کی وسوسہ اندازی کی دوسری صورت کا بیان ہے۔

ہاں جو نفوس قدسیہ ہیں ان کو اس قسم کی کوئی بات پیش نہیں آتی۔ درج ذیل حدیث میں اسی کا بیان ہے:

حدیث ـــــ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی نہیں، مگر اس کے ساتھ مسلط کیا گیا ہے اس کا ایک ساتھی جنات میں سے، اور ایک ساتھی ملائکہ میں سے'' صحابہ نے دریافت کیا. اور آپؐ کے ساتھ بھی، یا رسول اللہ؟ آپؐ نے فرمایا: ''میرے ساتھ بھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی ہے، پس میں محفوظ رہتا ہوں، پس وہ مجھے بھلائی ہی کا حکم دیتا ہے'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۹۷)

اور شیطان کے وساوس کی تاثیرات کا حال آفتاب کی شعاعوں کی تاثیرات جیسا ہے۔ لوہے اور دیگر دھاتوں پر ان کا اثر سب سے زیادہ پڑتا ہے۔ پھر صیقل شدہ یعنی مانجھے ہوئے اجسام پر جو زنگ اور میل سے صاف ہوتے ہیں اول سے کم

اثر پڑتا ہے پھر درجہ بہ درجہ اجسام ان شعاعوں کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ حتی کہ سنگ سفید کی ایک قسم تو ایسی بھی ہے جو مطلق ان شعاعوں کا اثر قبول نہیں کرتی۔ وہ چل چلاتی دھوپ میں بھی ٹھنڈا محسوس ہوتا ہے۔ یہ نفوس قدسیہ کی مثال ہے۔

[۷] قوله صلى الله عليه وسلم:" الحمد لله الذى رَدَّ أمره إلى الوسوسة"، وقوله صلى الله عليه وسلم:" إن الشيطانَ قد أيِسَ من أن يَّعْبُدَه المصلُّون في جزيرة العرب، ولكن في التَّحريش بينهم" وقوله صلى الله عليه وسلم:" ذاك صريحُ الإيمان"

اعلم ان تأثير وسوسة الشياطين يكون مختلِفا، بحسب استعداد المُوسْوَسِ إليه: فأعظمُ تأثيرِهِ الكفرُ والخروجُ من الملة؛ فإذا عَصَمَ اللّٰهُ من ذلك بقوة اليقين انْقلَبَ تأثيرُه في صورة أخرى، وهي المقاتَلاتُ، وفسادُ تدبير المنزل، والتحريش بين أهل البيت وأهل المدينة؛ ثم إذا عَصَمَ اللّٰه من ذلك أيضًا صار خاطرًا يجيئ ويذهب، ولايبعثُ النفسَ إلى عملٍ، لضعفِ أثره؛ وهذا لايضرُّ، بل إذا اقترن باعتقاد قبحِ ذلك كان دليلاً على صراحة الإيمان.

نعم أصحابُ النفوس القدسية لايجدون شيئًا من ذلك، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إلاَّ إنَّ اللّٰه أعانني عليه فأَسْلَمُ، فلايأمرني إلا بخير"

وإنما مَثَلُ هذه التأثيرات مَثَل شعاعِ الشمس، يؤثر في الحديد والأجسام الصقيلة مالايؤثر في غيرها، ثم وثم.

ترجمہ: (۷) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''تمام ستائشیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے شیطان کے معاملہ کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا'' اور آپؐ کا ارشاد: ''بیشک شیطان یقیناً ناامید ہوگیا ہے اس بات سے کہ نمازی بندے اس کی عبادت کریں جزیرۃ العرب میں، البتہ (مشغول ہے وہ) ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے میں'' اور آپؐ کا ارشاد: ''یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے''

جان لیں کہ شیاطین کے وسوسہ کی تاثیر مختلف ہوتی ہے اس شخص کی استعداد کے اعتبار سے جس کی طرف وسوسہ ڈالا گیا ہے۔ پس اس کی بڑی اثر اندازی کفر اور ملت سے نکلنا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ بچالیتے ہیں اُس سے، یقین کی قوت کی وجہ سے تو پلٹ جاتی ہے اس کی اثر اندازی دوسری صورت میں۔ اور وہ باہم کشت وخوں اور گھریلو زندگی کو بگاڑنا اور اہل خانہ اور اہل بستی کے درمیان آگ بھڑکانا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ بچالیتے ہیں اس سے بھی تو ہو جاتا ہے وسوسہ دل کے ایسے خیالات جو آتے ہیں اور جاتے ہیں، اور نہیں ابھارتے وہ نفس کو کسی عمل کی طرف، اس کے اثر کے کمزور ہونے کی وجہ سے۔ اور یہ خیالات ضرر رساں نہیں ہیں۔ بلکہ جب وہ ملے ہوئے ہوں اس کی برائی کے اعتقاد کے ساتھ تو وہ کھلے ایمان کی دلیل ہوتے ہیں۔

ہاں نفوس قدسیہ والے اس میں سے کچھ بھی نہیں پاتے، اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''مگر بیشک اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی ہے، پس میں محفوظ رہتا ہوں۔ پس نہیں حکم دیتا وہ مجھ کو مگر بھلائی کا''

اور ان تاثیرات کا حال آفتاب کی شعاعوں کی تاثیرات جیسا ہی ہے۔ اثر انداز ہوتی ہیں وہ لوہے میں اور صیقل شدہ اجسام میں، وہ جو نہیں اثر ڈالتیں وہ ان کے علاوہ میں، پھر اور پھر۔

فائدہ: جزیرۃ العرب کی تخصیص اس لئے فرمائی ہے کہ اس ارشاد کے وقت اسلام جزیرۃ العرب کے اندر محدود تھا۔ بعد میں اسلام چار دانگ عالم پھیل گیا۔ اب مسلمان خواہ کہیں ہو وہ غیر اللہ کی عبادت نہیں کرسکتا، بشرطیکہ وہ نمازی اور دین دار ہو۔

لغات: مُوَسْوَس: اسم مفعول وسوسہ ڈالا ہوا إلیہ. اس کا ظرف ہے صریح: صیغۂ صفت: صاف، واضح، خالص صَرَاحة: مصدر، باب کرم سے صاف ہونا، خالص ہونا، واضح ہونا اور باب فتح سے: ظاہر کرنا، واضح کرنا صقلَ (ن) صَقْلاً الشیءَ: صاف کرنا، چمکانا کرنا، زنگ دور کرنا الأجسام الصقیلة: تمام دھاتیں جن پر پالش کی جاتی ہے۔

تصحیح: دوسری حدیث میں یعبده المصلُّون اصل میں اور تینوں مخطوطوں میں یعبده المسلمون تھا۔ مگر یہ سبقتِ قلم ہے تصحیح مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف سے کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

شیطانی وساوس اور فرشتوں کے الہام کی صورتیں

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بیشک شیطان کے لئے انسان سے ایک نزدیکی ہے، اور فرشتے کے لئے بھی ایک نزدیکی ہے (یعنی شیطان انسان سے نزدیک ہوکر وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور فرشتہ بھی اترتا ہے اور خیر کا الہام کرتا ہے) پس رہی شیطان کی قربت تو وہ برائی کا وعدہ کرنا ہے اور دین حق کو جھٹلانا ہے۔ اور رہی فرشتہ کی قربت تو وہ خیر کا وعدہ کرنا ہے، اور دین حق کی تصدیق کرنا ہے۔ پس جو شخص اس کو پائے، پس وہ جان لے کہ یہ بات اللہ کی طرف سے ہے، پس چاہئے کہ وہ اللہ کی تعریف کرے۔ اور جو پائے دوسری صورت، پس چاہئے کہ وہ پناہ مانگے اللہ کی مردود شیطان سے۔ پھر آپ نے سورۃ البقرہ کی آیت ۲۶۸ تلاوت فرمائی کہ: ''شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات کا مشورہ دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتے ہیں اپنی طرف سے بخشش کا اور مزید دینے کا۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والے، خوب جاننے والے ہیں''[1]

---

[1] رواہ الترمذی ۲:۱۲۳ کتاب التفسیر وقال ہذا حدیث حسن صحیح غریب مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۷۴ ونقل عن الترمذی أنه قال: هذا حدیث غریب، فلعل نسخ السنن مختلفة ۱۲

حدیث شریف کا خلاصہ: یہ ہے کہ ملائکہ کی اثر اندازی کی صورتیں یہ بنتی ہیں کہ آدمی کے دل میں نیک کاموں سے انس ومحبت اور رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اور شیاطین کی اثر اندازی سے نیک کاموں سے وحشت ونفرت پیدا ہوتی ہے، دل بے چین ہوتا ہے اور آدمی میں برے کاموں کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔

تشریح: رسول اللہ ﷺ نے یہ مضمون آیت پاک سے اخذ فرمایا ہے۔ آیت کریمہ انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے ذیل میں آئی ہے۔ ارشاد پاک ہے کہ شیطان تم کو محتاجگی سے ڈراتا ہے کہ اگر راہ خدا میں خرچ کرو گے تو محتاج ہو جاؤ گے، اور بے حیائی کے کاموں کا حکم دیتا ہے۔ عیش میں، رنگ رلیوں میں خرچ کرنے کا خوب مشورہ دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں کہ اگر تم راہ خدا میں خرچ کرو گے تو تم کو مغفرت نصیب ہوگی۔ اور وہ زیادہ دینے کا بھی وعدہ فرماتے ہیں یعنی وہ تم کو بے حد وحساب فضل واحسان سے نہال کر دیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ وسعت والے، خوب جاننے والے ہیں۔ ان کے یہاں کمی کس بات کی ہے اور وہ جانتے بھی ہیں کہ کون عطا کا مستحق ہے۔

یہ آیت پاک اگرچہ انفاق فی سبیل اللہ کے تعلق سے وارد ہوئی ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے مذکورہ ارشاد سے واضح ہوا کہ یہ آیت اسی موقع کے لئے خاص نہیں ہے، بلکہ ہر معاملہ کو عام ہے۔ پس اگر دل میں کسی بھی نیک کام کا خیال پیدا ہو تو جان لے کہ یہ مضمون اللہ تعالیٰ کی طرف سے، فرشتہ کے ذریعہ الہام کیا گیا ہے۔ پس خدا کا شکر بجالائے اور پہلی فرصت میں وہ نیک کام کر ڈالے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خیال بدل جائے۔ اور اگر کسی کے دل میں کسی برائی کا خیال آئے تو اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ یہ مضمون شیطان کی طرف سے آیا ہے۔ یہ نہ سوچے کہ شیطان کی تو ہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی۔ شیطان ایک حقیقت واقعیہ ہے۔ پس اس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔ اللہ ضرور اس کی حفاظت فرمائیں گے۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن للشيطان لَمَّةً، وللملك لمَّةً" الحديث.
الحاصل: أن صورةَ تأثير الملائكة في نشأة الخواطر الأُنْسَ والرغبةُ في الخير، وتأثيرِ الشياطين فيها الوحشةُ وقَلَقُ الخاطر والرغبةُ في الشر.

ترجمہ: (۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد " بیشک شیطان کے لئے ایک نزدیکی ہے، اور فرشتہ کے لئے بھی ایک نزدیکی ہے" آخر حدیث تک۔

ماحصل: یہ ہے کہ فرشتوں کی اثر اندازی کی صورت خیالات کے پیدا ہونے میں (نیک کاموں سے) اُنس اور خیر کی رغبت ہے۔ اور شیاطین کی اثر اندازی خیالات (کے پیدا ہونے) میں (نیک کاموں سے) وحشت (ونفرت) دل کی بے چینی اور برے کاموں کی رغبت ہے۔

لغات: اللمّة: لَمَّ کا اسم مرّۃ: اثر، نزول، قربت لَمَّ فلان: کسی کے پاس آکر نازل ہونا نَشْأ (ف) نَشْأة: نیا پیدا

ہونا ... الخواطر جمع ہے الخاطر کی: خیال، وہ امر یا تدبیر جو دل میں گزرے۔ خَطر (ن ض) خُطُورًا الأمرُ له: سوجھنا۔

☆ ☆ ☆

شیطانی وساوس اور پریشان خوابوں کا علاج

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لوگوں میں سوال وجواب کا سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ سوال کیا جائے گا: اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا، پس اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ پس جو شخص اس قسم کا وسوسہ پائے تو چاہئے کہ کہے: ''ایمان لایا میں اللہ پر اور اس کے رسول پر'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۶)

حدیث ـــــ احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص پریشان کن خواب دیکھے تو اللہ کی پناہ طلب کرے، اور بائیں جانب تین بار تھتکار دے[1]۔

تشریح: ان حدیثوں میں شیطانی وساوس کا اور پریشان کن خوابوں کا ـــــ کہ وہ بھی حقیقت میں وساوس ہیں ـــــ جو علاج تجویز کیا گیا ہے اس میں راز یہ ہے کہ شیطان کی وسوسہ اندازی کے وقت اللہ کی پناہ لے لینا، اللہ کو فوراً یاد کرنا، شیطان کی حرکت پر تھوتھو کرنا اور اس کی تذلیل وتحقیر کرنا دل کے رُخ کو دوسری طرف پھیر دیتا ہے، اور قلب شیاطین کا اثر قبول کرنے سے رُک جاتا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۲۰۱ میں ارشاد پاک ہے کہ:

''جو لوگ خدا ترس ہیں، جب ان کو کوئی خیال شیطان کی طرف سے آجاتا ہے، تو وہ (فوراً) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، پس یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں''

[۹] قوله صلى الله عليه وسلم: " من وَجدَ من ذلك شيئًا فليقل: آمنتُ بالله ورسوله" وقوله صلى الله عليه وسلم: " فَلْيَسْتعذْ بالله، وليتفُل عن يساره"

سِرُّه: أن الالتجاء إلى الله، وتذكُرَهُ، وتقبيحَ حالِ الشياطين، وإهانةَ أمرهم: يَصْرف وجه النفس عنهم، ويصدعن قبول أثرهم، وهو قوله تعالىٰ: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾

ترجمہ: (۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''جو پائے اس قسم کا کچھ وسوسہ۔ پس چاہئے کہ وہ کہے: ''ایمان لایا میں اللہ پر اور اس کے رسول پر'' (یہ تجدید ایمان نہیں ہے، بلکہ اس وسوسہ کو دفع کرنے کا طریقہ ہے) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

[1] یہ روایتیں مشکوٰۃ شریف میں کتاب الرؤیا میں ہیں۔

ارشاد: ''پس چاہئے کہ پناہ طلب کرے اللہ کی اور چاہئے کہ بائیں جانب تھوک دے'' (یہ بھی پریشان خواب کے اثر کو زائل کرنے کا طریقہ بتایا ہے)

اس کا راز: یہ ہے کہ اللہ کی طرف پناہ لینا، اور اللہ کو یاد کرنا اور شیاطین کی حالت کی قباحت بیان کرنا اور ان کے معاملہ کی توہین کرنا، نفس کے رخ کو ان سے پھیر دیتا ہے۔ اور ان کے اثر کو قبول کرنے سے روک دیتا ہے، اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''یقیناً جو لوگ متقی ہیں، جب ان کو کوئی شیطانی خیال آجاتا ہے، تو وہ (اللہ کو) یاد کرتے ہیں۔ پس یکا یک اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں''

لغات. اَلتِجاء: مصدر ہے۔ اَلتجا إلی کذا .پناہ لینا . تذکّرَ الشیئ: یاد کرنا .. تقبیح: کسی کے عمل کے خلاف ناراضی کا اظہار کرنا۔

☆ ☆ ☆

آدم وموسیٰ علیہما السلام میں ایک مناظرہ

(در)

اس واقعہ کا باطنی پہلو

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام میں ان کے رب کے پاس مناظرہ ہوا، تو آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آئے (وہ مناظرہ اس طرح ہوا تھا:)

موسیٰ علیہ السلام نے کہا ـــــ آپ وہی آدم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے بنایا، اور آپ میں اپنی خاص روح پھونکی، اور آپ کے سامنے اپنے فرشتوں کو سجدہ ریز کیا، اور آپ کو اپنی (عیش بھری) جنت میں بسایا، پھر آپ نے اپنی چوک سے لوگوں کو زمین پر اتارا؟ (یعنی آپ نے بایں ہمہ منزلت یہ خطا کیوں کی؟ آپ پامردی سے کام لیتے اور شجر ممنوعہ نہ کھاتے تو آپ کی اولاد جنت میں عیش کرتی!)

آدم علیہ السلام نے کہا ـــــ : آپ وہی موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی پیام رسانی اور ہم کلامی کا شرف بخشا، اور آپ کو الواح تورات عنایت فرمائیں، جن میں ہر چیز کی وضاحت تھی۔ اور آپ کو نزدیک کر کے سرگوشی کی، آپ بتلائیں: اللہ نے تورات مجھے پیدا کرنے سے کتنا عرصہ پہلے لکھی تھی؟

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا ـــــ : چالیس سال پہلے۔

آدم علیہ السلام نے پوچھا—— :کیا آپ نے تورات میں یہ بات نہیں پائی کہ: ''آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا، پس وہ غلطی میں پڑ گیا؟''

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا—— :ہاں (یہ بات تورات میں ہے)

آدم علیہ السلام نے فرمایا—— :تو کیا آپ مجھے اس کام پر ملامت کرتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے لکھ دیا تھا کہ میں اسے کرونگا؟!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا—— :پس آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آئے (اور موسیٰ علیہ السلام لاجواب ہو گئے[1])

تشریح: اس حدیث میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''ان کے رب کے پاس'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ وفات کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام کی روح بارگاہ خداوندی میں پہنچی، تو وہاں آپ کی حضرت آدم کی روح سے ملاقات ہوئی، اور آپس میں یہ سوال و جواب ہوئے، جیسے خواب میں کسی فرشتہ سے یا کسی نیک آدمی سے ملاقات ہوتی ہے اور باہم بات چیت ہوتی ہے۔ اور بارگاہ خداوندی میں ارواح کے سمٹنے کا مطلب مبحث دوم کے باب چہارم میں گذر چکا ہے[2]

دوسرا سوال: یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے نوشتۂ تقدیر کا سہارا لے کر الزام رفع فرمایا ہے۔ حالانکہ تقدیر کو بہانہ بنانا درست نہیں۔

جواب: یہ ہے کہ نوشتۂ تقدیر کوتاہی کا عذر تو نہیں بن سکتا، مگر اس کے ذریعہ الزام کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ آدم علیہ السلام سے جب لغزش ہوئی تھی اور کتاب خداوندی نازل ہوا تھا، تو آپ نے فوراً توبہ کی تھی، تقدیر کا عذر پیش نہیں کیا تھا۔ مگر جب اس لغزش کو موسیٰ علیہ السلام نے انسانوں کی پریشانی کا باعث قرار دیا تو آپ نے اس لغزش کا یہ پہلو سامنے رکھا کہ یہ تو نوشتۂ تقدیر تھا، اس کے مطابق واقعات کو رونما ہونا ہی تھا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام لاجواب ہو گئے۔ اب یہ جواب شاہ صاحب رحمہ اللہ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

اس واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ ایک علم منکشف کیا، بالکل اسی طرح جس طرح آدمی خواب میں کسی فرشتہ کو یا کسی نیک آدمی کو دیکھتا ہے، اور اس سے سوال کرتا ہے اور اس سے باتیں کرتا ہے۔ پھر جب آنکھ کھلتی ہے تو اس کو ایک ایسا علم حاصل ہو چکا ہوتا ہے، جو پہلے حاصل نہیں

[1] رواہ مسلم، مشکوٰۃ، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۸۱ بخاری میں بھی یہ حدیث اختصار کے ساتھ پانچ جگہ آئی ہے۔ سب سے پہلے کتاب الانبیاء، باب وفاۃ موسیٰ میں آئی ہے، حدیث نمبر ۳۴۰۹ نیز ابوداؤد میں بھی ہے، حدیث نمبر ۴۷۰۱ و ۴۷۰۲

[2] رحمۃ اللہ الواسعہ ۱:۳۰۵ وہاں یہ حدیث احمع کے لفظ سے آئی ہے، مگر روایات میں احتج آیا ہے۔

تھا۔اسی طرح اس واقعہ میں ایک بال سے باریک علم تھا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مخفی تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اس واقعہ کی صورت میں منکشف کیا۔

اور وہ علم یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش میں دو پہلو ہیں:

ایک پہلو: وہ ہے جس کا تعلق خاص آدم علیہ السلام کی ذات سے ہے۔اور وہ یہ ہے کہ جب تک آپ نے شجرۂ ممنوعہ نہیں کھایا تھا، جنت کی ہمہ قسم کی نعمتیں اور راحتیں حاصل تھیں: نہ پیاس ستاتی تھی، نہ بھوک لگتی تھی۔نہ برہنہ ہوتے تھے، نہ دھوپ لگتی تھی۔یہی انسان کی بڑی ضرورتیں ہیں، جو سب وہاں پوری ہو رہی تھیں۔اس وقت آپ کی حالت بالکل فرشتوں جیسی تھی، جن کو کوئی کلفت پیش نہیں آتی۔ پھر جب آپ نے وہ درخت کھالیا تو صورت حال بدل گئی۔ ملکیت چھپ گئی اور بہیمیت نے سر ابھارا۔پس اس پہلو سے درخت کا کھانا ایک ایسا گناہ تھا جس سے استغفار ضروری تھا۔چنانچہ آپ نے استغفار کیا، اور خوب گڑگڑا کر توبہ کی، جو بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئی۔

دوسرا پہلو: وہ ہے جس کا تعلق نظام عالم سے ہے۔جو اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم سے پہلے ہی فرشتوں پر ظاہر کر دیا تھا۔جس کا تذکرہ سورۃ البقرہ آیت ۳۰ میں آیا ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تخلیق آدم کی غرض نوع انسانی کو زمین میں خلیفہ بنانا ہے یعنی ایک ایسی مخلوق وجود میں لانا منظور ہے جس میں خیر و شر کی صلاحیتیں مجتمع ہوں، جو گناہ کرے اور توبہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائیں، جس کو احکام شرعیہ کا مکلف بنایا جائے، ان میں رسولوں کو بھیجا جائے، ان کے اعمال پر جزاء و سزا مرتب ہو، اور جو ان میں باکمال ہوں وہ مختلف درجات پر فائز ہوں، اور جو گمراہ ہوں وہ بھی مختلف طبقات کے ہوں۔اور یہ تخلیق آدم کا ایک مستقل اہم مقصد ہے۔مسند احمد (۳۰۹۲) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر تم گناہ نہ کرو، تو اللہ تعالیٰ تم کو ہٹا دیں، اور ایسی قوم لے آئیں جو گناہ کرے اور توبہ کرے، پس اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرمائیں"

پس اس پہلو سے آدم علیہ السلام کا شجر ممنوعہ کھانا، اللہ کی مراد کے مطابق اور ان کی حکمت کے موافق تھا۔

اور جب آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو ابتداء آپ پر یہ دوسرا پہلو مخفی تھا۔پہلا ہی پہلو پیش نظر تھا، چنانچہ آپ پر سخت عتاب نازل ہوا، پھر آپ کے غم کا مداوا کیا گیا، اور آپ پر معاملہ کا دوسرا پہلو کسی قدر روشن ہوا، تو ڈھارس بندھی۔ پھر جب آپ بارگاہ خداوندی میں منتقل ہوئے تو واقعہ کا دوسرا پہلو پوری طرح واضح ہو کر سامنے آیا۔اور موسیٰ علیہ السلام کا خیال بھی ابتداء میں وہی تھا جو شروع میں آدم علیہ السلام کا تھا، مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر آدم علیہ السلام کے ذریعہ معاملہ کا دوسرا پہلو واضح کیا، تو وہ خاموش ہو گئے، اور بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

اور پہلے مبحث دوم کے باب رابع میں یہ بات تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے کہ خارج میں پیش آنے والے

واقعات کی بھی ویسی ہی تعبیر ہوتی ہے جیسی خواب کی تعبیر ہوتی ہے۔ پس آدم علیہ السلام کے واقعہ کی پہلی جہت ایک خارجی واقعہ ہے، اور دوسری جہت اس واقعہ کی تعبیر ہے۔

نیز پہلے یہ بات بھی ذکر کی جا چکی ہے کہ شریعت کے اوامر و نواہی اٹکل پچو کے تیر نہیں ہوتے بلکہ دونوں کے لئے ایک استعداد ہوتی ہے جو ان کو واجب کرتی ہے۔ شجرۂ ممنوعہ کا کھانا اگرچہ مقدر تھا، تاہم آدم علیہ السلام کو اس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا کیونکہ ان میں جو تکلیف شرعی کی صلاحیت ودیعت کی گئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ ان کو ایسا حکم دیا جائے۔

مثال سے مزید وضاحت: ایک ذہین طالب علم کا کسی معمولی بات پر ایک مدرسہ سے اخراج ہو گیا تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس نے داخلہ کی بحالی کے لئے ہر ممکن تدبیر کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ مجبور ہو کر اس نے ایک بڑے ادارہ میں داخلہ لیا، وہاں محنت سے پڑھا اور اول نمبر سے کامیاب ہوا، پھر وہ وہاں مدرس رکھ لیا گیا اور رفتہ رفتہ شیخ الحدیث بن گیا۔ اس واقعہ میں غور کریں: اگر اس طالب علم سے وہ معمولی کوتاہی نہ ہوتی، اور اس چھوٹے ادارہ سے اس کا اخراج نہ ہوتا، تو اس بڑے ادارہ میں اس کو شیخ الحدیث کا مرتبہ کہاں نصیب ہوتا! مگر جس وقت اس کا اخراج ہوتا ہے، یہ انجام اس کو معلوم نہیں ہوتا، اس لئے اس کو افسوس ہوتا ہے۔ مگر جب اس کا اچھا انجام سامنے آتا ہے تو وہ اس اخراج کو نعمت عظمیٰ سمجھتا ہے۔

[۱۰] وقوله صلى الله عليه وسلم. " احتجَّ آدمُ وموسى عند ربهما"

أقول: معنى قوله:" عند ربهما" أن روح موسى عليه السلام انْجَذَبَتْ إلى حظيرة القدس، فَوَافَتْ هنالك آدم.

وبطن هذه الواقعة وسرُّها. ان الله فتح على موسى علمًا على لسان آدم عليهما السلام شبْه مايرى النائمُ فى منامه ملكا، أو رجلاً من الصالحين، يسأله ويُراجعه الكلام، حتى يفيئ عنه بعلم لم يكن عنده.

وههنا علْم دقيق كان قد خفى على موسى عليه السلام، حتى كشفه الله عليه فى هذه الواقعة، وهو: أنه اجتمع فى قصة آدم عليه السلام وجهان.

أحدهما: مما يَلِىْ خُوَيْصَة نفس آدم عليه السلام؛ وهو: أنه كان مالم يأكل الشجرة لا يطْمأُ ولايَضْحى، ولايجوع ولا يعْرى، وكان بمنزلة الملائكة، فلما أكل علت البهيمية، وكمنت الملكية، فلا جرم أن أكل الشجرة إثم يجب الاستغفار عنه.

وثانيهما: مما يلى التدبير الكلىّ الذى قصده الله تعالى فى خلق العالم، وأوحاه إلى الملائكة قبل أن يَخْلُقَ آدم؛ وهو: أن الله تعالى أراد بخلقه: أن يكون نوعُ الإنسان خليفة فى الأرض يُذْنِبُ ويستغفر، فيغفرله، ويتحقق فيهم التكليف، وبعثُ الرسل، والثواب والعذاب،

ومراتب الكمال والضلال؛ وهذه نشأة عظيمة على حِدَتها.

وكان أكل الشجرة حسب مراد الحق، ووفقَ حكمته، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" لو لم تُذنبوا لذهب اللّٰه بكم،وجاء بقوم آخرين،يُذنبون ويستغفرون، فيغفرلهم"

وكان آدم أولَ ما غلبت عليه بهيميته استتر عليه العلم الثانى، وأحاط به الوجه الأول، وعوتب عتابا شديدًا فى نفسه، ثم سُرِّى عنه، ولمع عليه بارق من العلم الثانى، ثم لما انتقل إلى حظيرة القدس علم الحالَ أصرح مايكون، وكان موسى عليه السلام يظنّ ماكان يظن آدم عليه السلام، حتى فتح الله عليه العلمَ الثانى.

وقد ذكرنا: أن الوقائع الخارجية يكون لها تعبير كتعبير المنام، وأن الأمر والنهى لايكونان جُزَافًا، بل لهما استعداد يوجبهما.

ترجمہ:(۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:'' آدم وموسیٰ علیہما السلام کے درمیان ان کے رب کے پاس مناظرہ ہوا'' میں کہتا ہوں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد:'' ان کے رب کے پاس'' کے معنی یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی روح کھنچ گئی مقدس بارگاہ کی طرف،اور وہاں وہ آدم علیہ السلام سے ملی۔

اور اس واقعہ کا باطن اور اس کا راز: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر آدم علیہ السلام کے ذریعہ ایک علم کھولا،ایسے جیسے سونے والا خواب میں کسی فرشتہ یا کسی نیک آدمی کو دیکھتا ہے۔وہ اس سے دریافت کرتا ہے اور اس سے باتیں کرتا ہے۔ یہاں تک کہ لوٹتا ہے وہ اس سے ایک ایسے علم کے ساتھ جو اس کو حاصل نہیں تھا۔

اور یہاں ایک باریک علم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مخفی تھا یہاں تک کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اس واقعہ میں کھولا۔اور وہ علم یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے واقعہ میں دو جہتیں ہیں:

ان میں سے ایک جہت: وہ ہے جو متصل ہے آدم علیہ السلام کی خاص ذات سے،اور وہ یہ ہے کہ آپ نے جب تک نہیں کھایا تھا درخت تو نہ آپ کو پیاس لگتی تھی اور نہ دھوپ،اور نہ آپ کو بھوک لگتی تھی اور نہ آپ برہنہ ہوتے تھے۔اور آپ فرشتوں جیسے تھے۔پھر جب درخت کھایا تو غالب آگئی بہیمیت اور چھپ گئی ملکیت۔پس یقیناً درخت کا کھانا ایک ایسا گناہ ہے جس سے استغفار واجب ہے۔

اور ان میں سے دوسری جہت: وہ ہے جو متصل ہے اس کلی انتظام سے جس کا اللہ تعالیٰ نے قصد فرمایا ہے تخلیق عالم سے،اور جس کی وحی فرمائی ہے فرشتوں کی طرف آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے سے پہلے۔اور وہ (تدبیر کلی) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے سے کہ نوع انسانی زمین میں نائب ہو،گناہ کرے اور توبہ کرے،پس اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائیں اور متحقق ہو ان میں مکلف ہونا۔اور رسولوں کا بھیجنا،اور ثواب وعذاب اور کمال وضلال کے

مراتب۔اور یہ (تخلیق آدم کا) مستقل ایک بڑا مقصد ہے۔

اور (آدم علیہ السلام کا) درخت کو کھانا اللہ کی مراد کے مطابق اور ان کی حکمت کے موافق تھا، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو ختم کردیں، اور لائیں ایک دوسری قوم جو گناہ کرے اور توبہ کرے، پس اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائیں''

اور آدم علیہ السلام پر ابتداءً جب بہیمیت غالب آئی، اس وقت ان پر دوسرا علم مخفی تھا، اور ان کو پہلی جہت نے گھیر رکھا تھا، اور وہ اپنے معاملہ میں سخت سرزنش کئے گئے پھر ان کے دل سے غم دور کیا گیا اور ان پر علم ثانی کی بجلی چمکی۔ پھر جب وہ منتقل ہوگئے بارگاہ مقدس کی طرف تو انھوں نے صورت حال کو جانا زیادہ سے زیادہ واضح طور پر جاننا جو ممکن تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام خیال کرتے تھے وہ جو آدم علیہ السلام خیال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے دوسرا علم کھولا۔

اور ہم ذکر کرچکے ہیں کہ خارجی واقعات کے لئے بھی ویسی ہی تعبیر ہوتی ہے جیسی خواب کے لئے تعبیر ہوتی ہیں اور یہ کہ امر و نہی انکل پچو نہیں ہوتے بلکہ دونوں کے لئے ایک استعداد ہوتی ہے جو ان کو واجب کرتی ہے۔

لغات: اِنجذب: کھنچ جانا وافی الرحل: کسی کے پاس اچانک آنا، ملنا فاء یفیئ فینا به: کوئی چیز لے کر لوٹنا۔ خُوَیصَۃ: مخصوص نَشأۃ: (مصدر) نو پید ہونا، زندہ ہونا۔ یہاں بمعنی نیا مقصد آیا ہے سُرّی عنه: غم یا غصہ کا زائل ہونا۔

☆ ☆ ☆

ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر ماحول اس کو بگاڑ دیتا ہے

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ہر بچہ فطرتِ اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جیسے چوپایہ صحیح وسالم جنا جاتا ہے، کیا تم ان میں کوئی کان کٹا دیکھتے ہو؟!''[1]

تشریح: جاننا چاہئے کہ سنت الٰہی اس طرح چل رہی ہے کہ حیوانات اور نباتات وغیرہ کی ہر نوع کی ایک مخصوص شکل ہے، مثلاً انسان کھلی کھال والا، سیدھے قد والا، چوڑے ناخن والا، ناطق وضاحک ہے۔ اور انہی خصوصیات سے پہچان لیا جاتا ہے کہ وہ انسان ہے۔ البتہ اگر کسی نادر فرد میں خرق عادت ہوجائے، جیسے بعض بچے سونڈ یا کھر والے پیدا ہوتے ہیں، تو وہ دوسری بات ہے۔

اسی طرح اللہ کی سنت یہ بھی چل رہی ہے کہ ہر نوع میں علم وادراک کا ایک مخصوص حصہ ہوتا ہے۔ جو اس نوع کے

[1] متفق علیہ، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۹۰ باب الایمان بالقدر ۱۲

ساتھ خاص ہوتا ہے۔ دوسری انواع میں وہ نہیں پایا جاتا، اور اس نوع کے تمام افراد میں وہ حصہ پایا جاتا ہے۔ جیسے شہد کی مکھیوں کو یہ ادراک عطا فرمایا گیا ہے کہ وہ ان درختوں کو پہچان لیتی ہیں جو ان کے مناسب ہیں، وہ ہر درخت کا رس نہیں چوستیں۔ پھر مُہال بنانا اور اس میں شہد جمع کرنے کا طریقہ ان کو سکھلا دیا گیا ہے۔ اسی طرح کبوتر کو گٹکری نکالنا، آشیانہ بنانا اور اپنے چوزوں کو چگانے کا علم دیدیا گیا ہے۔

اسی سنت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک زائد ادراک کے ساتھ اور وافر عقل کے ساتھ خاص کیا ہے، اور اس کی فطرت میں خالق کی پہچان، اس کی بندگی کا جذبہ اور معاشی تدبیرات نافعہ کا علم نہاں رکھا ہے۔ اور اسی کا نام فطرت ہے۔ پس اگر کوئی مانع پیش نہ آئے تو بچہ اسی فطرت پر بڑا ہوگا۔ مگر کبھی عوارض پیش آتے ہیں۔ بچہ جن ہاتھوں میں اور جس ماحول میں پلتا بڑھتا ہے وہ ماحول اس کو خراب کر دیتا ہے اس وقت وہ فطری علم جہالت سے تبدیل ہو جاتا ہے جیسے گرجاؤں کے گوشہ نشین اور سنیاسی مختلف تدبیروں سے جنسی شہوت اور بھوک کی خواہش ختم کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں انسان کی فطرت میں شامل ہیں۔

فائدہ: بکریوں وغیرہ کی پہچان کے لئے ان کے کان کاٹے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کاٹتے ہیں۔ کوئی چوپایہ کان کٹا پیدا نہیں ہوتا۔ ہر جانور صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے۔ یہ مثال دیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ اسی طرح ہر انسانی بچہ فطرت اسلام پر جنا جاتا ہے، بعد میں اس کو گمراہ کر دیا جاتا ہے۔

[۱۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " كُلُّ مولودٍ يولد على الفطرة، ثم أبواه يُهَوِّدَانِهِ، أو يُنَصِّرانِهِ، أويُمجِّسَانِه، كما تُنْتَجُ البهيمةُ بهيمةً جمْعاء، هل تُحسُّوْن فيها من جَدْعَاءَ؟!"

أقول: اعلم أن الله تعالى أجرى سُنَّته بأن يخلق كلَّ نوع من الحيوانات والنباتات وغيرهما على شكل خاصٍّ به: فخَصَّ الإنسانَ — مثلاً - بكونه بادى البَشَرةِ، مستوى القامة، عريضَ الأظفار، ناطقًا، ضاحكًا؛ وبتلك الخواص يُعرف أنه إنسان؛ اللّٰهم إلا أن تُخرق العادةُ فى فرد نادر، كما ترى أن بعض المولودات يكون له خُرطوم أو حافر.

فكذلك أجرى سنَّتَه أن يخلق فى كل نوع قسطًا من العلم والإدراك، محدودًا بحدٍّ، مخصوصا به، لايوجد فى غيره، مُطَّرِدًا فى أفراده:

فَخَصَّ النحل بإدراك الأشجار المناسبة لها، ثم اتِّخاذِ الأكنان وجمعِ العسل فيها، فلن ترى فردًا من أفراد النحل إلا وهو يُدرك ذلك: فخصَّ الحمام بأنه كيف يهْدِرُ؟ وكيف يُعَشِّشُ؟ وكيف يَزِقُّ فِرَاخَه؟

وكذلك خَصَّ اللّٰه تعالى الإنسان بإدراك زائد، وعقلٍ مستوفىً، ودَسَّ فيه معرفة

بارئه،والعبادةَ له، وأنواع ما يرتفقون به في معاشهم، وهو الفطرة، فلو أنهم لم يمنعهم مانع لَكبَرُوْا عليها، لكنه قد تعترض العوارضُ، كإضلال الأبوين، فينقلب العلم جهلاً، كمثل الرُهبان يتمسكون بأنواع الحيلِ، فيقطعون شهوه النساء والجوع، مع أنهما مدسوسان في فطرة الإنسان.

ترجمہ:(۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''ہر بچہ فطرت اسلامی پر جنا جاتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح چوپایہ جنا جاتا ہے صحیح وسالم، کیا تم ان میں سے کسی کو ناک کان کٹا ہوا دیکھتے ہو؟''

میں کہتا ہوں: جان لیں کہ اللہ تعالی نے اپنا طریقہ اس طرح چلایا ہے کہ حیوانات اور نباتات وغیرہ کی ہر نوع کو پیدا کریں ایک ایسی شکل پر جو اس کے ساتھ خاص ہو۔ چنانچہ خاص کیا انسان کو۔ مثال کے طور پر۔ کھلی کھال والا، سیدھے قد والا، چوڑے ناخن والا، بولنے والا اور ہنسنے والا ہونے کے ساتھ۔ اور انہی خصوصیات سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ انسان ہے۔ اے اللہ! مگر یہ کہ کسی نادر فرد میں عادت الٰہی خرق ہو جائے، جیسا کہ آپ بعض بچوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کی سونڈ یا پر ہوتا ہے۔

پس اسی طرح اللہ تعالی نے اپنی سنت جاری کی ہے کہ ہر نوع میں علم وادراک کا ایک ایسا حصہ پیدا کریں جو ایک حد کے ساتھ محدود ہو (یعنی اس کی مقدار متعین ہو) جو اس کے ساتھ مخصوص ہو، وہ نہ پایا جائے اس کے علاوہ میں، عام ہو وہ اس کے تمام افراد میں:

چنانچہ خاص کیا شہد کی مکھی کو ان درختوں کے ادراک کے ساتھ جو ان کے مناسب ہیں، پھر چھتہ بنانے کے ساتھ، اور اس میں شہد جمع کرنے کے ساتھ۔ پس نہیں دیکھیں گے آپ شہد کی مکھیوں کے کسی فرد کو، مگر وہ اس کا ادراک رکھتا ہوگا۔ اسی طرح خاص کیا کبوتر کو اس بات کے ساتھ کہ وہ کس طرح گٹکری لے؟ اور کس طرح آشیانہ بنائے؟ اور کس طرح چوزوں کو چوگا دے؟

اور اسی طرح خاص کیا اللہ تعالی نے انسان کو ایک زائد ادراک کے ساتھ، اور وافر عقل کے ساتھ، اور چھپا دی اس میں اپنے خالق کی پہچان، اور اس کے لئے بندگی کرنا، اور ان تدبیرات نافعہ کی انواع جن کے ذریعہ وہ فائدہ اٹھائیں اپنی معیشت میں، اور اسی کا نام فطرت ہے۔ پس اگر بچوں کو نہ روکے کوئی مانع تو وہ اس فطرت پر بڑے ہوں گے۔ مگر کبھی عوارض پیش آتے ہیں، جیسے والدین کا گمراہ کرنا، تو یہ فطری علم جہالت سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے تارک الدنیا عیسائی مختلف قسم کی تدبیریں اختیار کرتے ہیں، پس وہ ختم کر لیتے ہیں عورتوں کی اور بھوک کی خواہش کو، حالانکہ یہ دونوں چیزیں انسان کی فطرت میں چھپائی ہوئی ہیں۔

لغات: هَوَّدَ تَهْوِيدًا: یہودی بنانا۔ نَصَّرَه: عیسائی بنانا مَجَّسَه: آتش پرست بنانا..... نَتَجَتْ ولدًا: جننا نُتِجَ الولدُ: جنا جانا جَمْعَاء مؤنث أجمع أَحَسَّ الشيء: معلوم کرنا جَدْعَاء مؤنث أَجْدَع: ناک کان کٹا ہوا اَلْكِنَان: جمع سِكَنٌ کی بمعنی منزل، گھر۔ هَدَرَ الحمام: کبوتر کا کوکو کرنا۔ گٹکری لینا، گلے میں آواز گھما کر گانا، کبوتر کا غٹرغوں کرنا۔ عَشَّشَ الطائرُ: گھونسلا بنانا۔ زَقَّ الطائر فرخه: چوزہ کو چوگا (غذا) دینا۔ دَسَّ الشيءَ تحت التراب: دھنسانا، چھپانا۔

☆ ☆ ☆

نابالغ بچوں کے احکام

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو انصار کے کسی بچے کا جنازہ پڑھانے کے لئے بلایا گیا، تو میں نے کہا: یارسول اللہ! یہ بچہ قابل رشک ہے، جنت کی ایک چڑیا ہے، اس نے نہ تو کوئی برائی کی ہے اور نہ ہی اس کا زمانہ پایا ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: ''یا اس کے علاوہ، اے عائشہ! (یعنی یقین سے نہ کہو کہ بہشتی ہے) بیشک اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے جنت کے لائق لوگوں کو، پیدا کیا ہے ان کو جنت کے لئے درانحالیکہ وہ اپنے آباء کی پشت میں تھے۔ اور پیدا کیا ہے دوزخ کے لائق لوگوں کو۔ پیدا کیا ہے ان کو دوزخ کے لئے درانحالیکہ وہ اپنے آباء کی پشت میں تھے''[1]

فائدہ: یہ حدیث اطفال مسلمین کے بارے میں ہے، اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اطفال مسلمین کا بھی جنتی ہونا یقینی نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت و دوزخ میں داخل ہونا نیک و بد عمل پر موقوف نہیں، بلکہ تقدیر الٰہی سے اس کا تعلق ہے۔ جس کو بہشت کے لئے پیدا کیا ہے وہ بہشتی ہے، خواہ کچھ بھی عمل کرے۔ اور جسے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے وہ دوزخی ہے خواہ وہ کچھ بھی عمل کرے۔

حدیث ـــــ حضرت صَعْب بن جَثَّامہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ ہمارے (فوجی) گھوڑے رات میں (جب شب خون مارتے ہیں تو) مشرکین کے بچوں کو (بھی) روند ڈالتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''وہ اپنے آباء سے ہیں'' (مسند احمد ۴:۷۱)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے مشرکین کے بچوں کے بارے میں دریافت کیا گیا؟ آپ نے فرمایا: ''وہ جو کچھ کرنے والے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ باخبر ہیں''[2]

---

[1] رواہ مسلم، مشکوٰۃ، باب الایمان بالقدر، حدیث ۸۳

[2] متفق علیہ، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۹۳ یہ حدیث اس باب کی سب سے قوی حدیث ہے

حدیث ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک طویل خواب بیان فرمایا ہے جو بخاری شریف میں مروی ہے۔ اس میں ہے کہ: ''پھر ہم چلے، یہاں تک کہ ہم ایک سرسبز باغ میں پہنچے، اس میں ایک بڑا درخت تھا، اور اس کے تنے کے پاس ایک بڑے حضرت اور کچھ بچے تھے'' بعد میں ساتھ والے دو فرشتوں نے وضاحت کی کہ: ''وہ بڑے حضرت جن کو آپؐ نے درخت کے تنے کے پاس دیکھا ہے وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں، اور ان کے اردگرد جو بچے ہیں وہ لوگوں کی اولاد ہیں''[1]

تشریح: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اولاد (نابالغ بچوں) کے احکام تفصیل سے بیان نہیں کئے۔ نہ روایات کا تعارض رفع کیا ہے۔ صرف پہلی تین حدیثوں کی مختصر شرح کی ہے جو درج ذیل ہے:

(۱) ـــــ بچے فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتے ہیں، جیسا کہ ابھی گذرا، تاہم کچھ بچے اس طرح بھی پیدا ہوتے ہیں کہ وہ کسی عمل کے بغیر لعنت کے مستوجب ہوتے ہیں، جیسے وہ لڑکا جس کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کر ڈالا تھا، کافر پیدا کیا گیا تھا۔ یعنی اس کی سرشت میں کفر و سرکشی تھی (پس کسی بچے کے مؤمن کی اولاد ہونے سے جنتی ہونے کا جزم نہیں کرنا چاہئے۔ یہ پہلی حدیث کی شرح ہے)

(۲) ـــــ حضرت صعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو فرمایا گیا ہے کہ: ''وہ اپنے آباء سے ہیں'' یہ مشرکین کے بچوں کا دنیوی حکم ہے یعنی اگر بے خبری میں فوج کے ہاتھوں ان کا قتل ہو جائے تو وہ کوئی قابل مؤاخذہ بات نہیں (یہ دوسری حدیث کی شرح ہے)

(۳) ـــــ اور یہ جو آپؐ نے فرمایا کہ وہ جو کچھ کرنے والے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ باخبر ہیں، یہ مسئلہ میں توقف پر دال ہے۔ اور احکام شرعیہ میں توقف کی وجہ صرف یہی نہیں ہوتی کہ اس کے بارے میں وحی نازل نہیں ہوئی۔ بلکہ توقف کی اور بھی وجوہ ہوتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) ـــــ کسی حکم کا کوئی واضح قرینہ موجود نہیں ہوتا، اس لئے توقف کیا جاتا ہے۔

(۲) ـــــ کسی حکم کی وضاحت ضروری نہیں ہوتی، اس لئے بات مبہم رکھی جاتی ہے۔

(۳) ـــــ کوئی حکم دقیق ہوتا ہے، مخاطبین میں اس کے فہم کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس لئے توقف کیا جاتا ہے۔

یہ تیسری حدیث کی شرح ہوئی۔ اور چوتھی حدیث کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ اس میں سب بچوں کے جنتی ہونے کا اشارہ ہے۔

اطفال کا حکم:

ذراری کا حکم دو طرح کا ہے: دنیوی اور اخروی:

---

[1] مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۴۶۲۱ کتاب الرؤیا ۱۲

①——نابالغ بچوں کا دنیوی حکم یہ ہے کہ وہ خیر الابوین کے تابع ہوتے ہیں: اگر ماں باپ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک مسلمان ہو تو بچہ بھی مسلمان تصور کیا جائے گا۔ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور اس کی میراث مسلمان ورثاء کو ملے گی۔ اور اگر بچہ کے والدین غیر مسلم ہوں تو اس کو مسلمان تصور نہیں کیا جائے گا۔

②——اور نابالغ بچوں کا اُخروی حکم یہ ہے کہ جو بچہ نابالغ ہونے کی حالت میں مر گیا ہے، وہ اگر مسلمان کا بچہ ہے تو اس کے بارے میں تقریباً اتفاق ہے کہ وہ جنتی ہوگا۔ اور اطفال مشرکین کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ پانچ چھ قول ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

(الف) وہ دوزخی ہوں گے تبعاً لآبائہم۔ یہ مذہب بیّن البطلان ہے، کیونکہ سلف کا اجماع ہے کہ عمل بد کے بغیر عذاب نہیں ہوگا۔

(ب) وہ اعراف میں ہوں گے، وہاں ان کو نہ عذاب ہوگا، نہ راحت پہنچے گی۔ یہ قول بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ اعراف ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔

(ج) ان کا آخرت میں امتحان ہوگا جیسے اصحاب فترت اور پاگلوں کا امتحان ہوگا، جو کامیاب ہوں گے جنت میں جائیں گے اور جو ناکام ہوں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔ یہ قول بھی صحیح نہیں، کیونکہ آخرت دار جزاء ہے، دار تکلیف نہیں۔

(د) ایک رائے یہ ہے کہ وہ اہل جنت کے خدام ہوں گے۔ مگر اس قول کی مرفوع روایت سے کوئی دلیل نہیں اور قرآن کریم میں جو دو جگہ وِلْدَان مُخَلَّدُوْن آیا ہے وہ لڑکے جنت کی مخلوق ہوں گے۔

(ھ) اطفال مشرکین بھی جنتی ہوں گے۔ یہ امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کا قول ہے۔

(و) ایک رائے یہ ہے کہ اطفال مشرکین کے مسئلہ میں توقف کیا جائے۔ توقف کے دو معنی ہیں: ایک: کسی چیز کے بارے میں علم نہ ہونا یا حکم نہ لگا سکنا یعنی سکوت اختیار کرنا، دوسرے: کسی چیز پر کوئی کلی حکم نہ لگانا۔ اطفال کے مسئلہ میں توقف بالمعنی الثانی ہے یعنی ہم نہ سب کو ناجی کہتے ہیں، نہ ناری۔ کون ناجی ہوگا اور کون ناری؟ اس کی تعیین اللہ کے سپرد ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے اکابر کا مسلک یہی ہے، شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی غالباً اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ میں حدیثیں مختلف وارد ہوئی ہیں۔ اور نسخ یعنی تقدیم و تاخیر کا کوئی قرینہ نہیں اور سند کے اعتبار سے قوی **اللّٰہ أعلم بما کانوا عاملین** کی روایت ہے، جو توقف پر دلالت کرتی ہے، پس یہی قول راجح ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں عمدۃ القاری شرح بخاری ۸:۲۱۲ کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔ فیض الباری ۲:۴۹۳ شرح فقہ اکبر از بحر العلوم (فارسی) ص ۸۶ و ۸۷۔ اشرف التوضیح تقریر اردو مشکوٰۃ شریف از مولانا نذیر احمد صاحب ۱:۲۴۱-۲۴۳

[۱۲] قوله صلى الله عليه وسلم:"خلقهم لها، وهم في أصلاب آبائهم" وقوله صلى الله عليه وسلم:" هم من آبائهم" وقوله صلى الله عليه وسلم:" الله أعلم بما كانوا عاملين" وقوله صلى الله عليه وسلم في منامه الطويل:" نَسَمُ ذرية بني آدم تكون عند إبراهيم عليه السلام"

اعلم أن الأكثر أن يولد الولد على الفطرة، كما مَرَّ، لكن قد يُخلَق بحيث يستوجب اللعن بلاعمل، كالذي قتله الخضر طُبع كافرًا. وأما" من آبائهم" فمحمولٌ على أحكام الدنيا. وليس أن التوقف في النواميس إنما يكون لعدم العلم، بل قد يكون لعدم انْضباطِ الأحكام بمظِنّةٍ ظاهرة، أو لعدم الحاجة إلى بيانه، أو عموضٍ فيه، بحيث لا يفهمه المخاطبون.

ترجمہ: (۱۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پیدا کیا اللہ نے ان کو جہنم کے لئے درانحالیکہ وہ اپنے آباء کی پشت میں تھے'' اور آپ ﷺ کا ارشاد: ''وہ اپنے آباء سے ہیں'' اور آپ ﷺ کا ارشاد: ''وہ جو کچھ کرتے اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہیں'' اور آپ ﷺ کا ارشاد ایک طویل خواب میں: ''اولاد آدم کی ذریت کی ارواح ابراہیم علیہ السلام کے پاس ہوتی ہیں''

جان لیں کہ (۱) اکثر یہی ہوتا ہے کہ بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ گزرا، لیکن کبھی پیدا کیا جاتا ہے بایں طور کہ وہ لعنت کو واجب ولازم جانتا ہے کسی بھی عمل کے بغیر، جیسے وہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا پیدا کیا گیا تھا کافر ہونے کی حالت میں۔

(۲) اور رہا ارشاد کہ: ''وہ اپنے آباء سے ہیں'' تو (یہ ارشاد) محمول ہے دنیوی احکام پر۔

(۳) اور نہیں ہے یہ بات کہ احکام شرعیہ میں توقف کرنا صرف علم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، بلکہ کبھی ہوتا ہے احکام منضبط نہ ہونے کی وجہ سے واضح مظنہ (احتمالی جگہ) کے ساتھ، یا ان کی وضاحت کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے، یا اس میں دقت کی وجہ سے، بایں طور کہ اس کو مخاطبین سمجھ نہ سکتے ہوں۔

لغات: طُبع أي خُلق الناموس: وحي، النواميس: الأحكام الشرعية نَسَم جمع نسمة بمعنى الروح۔

☆ ☆ ☆

''اللہ کے ہاتھ میں ترازو'' کا مطلب

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''اللہ کا ہاتھ یعنی اس کا خزانہ بھرا ہوا ہے، کوئی خرچ کرنا اس کو ناقص نہیں کرتا۔ وہ رات دن نعمتیں لٹاتے ہیں، کیا نہیں

دیکھتے تم کہ کس قدر خرچ کیا ہے جب سے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے، پھر بھی کوئی کمی نہیں آئی اس میں جو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور (تخلیق ارض وسماء کے وقت) ان کا تخت پانی پر تھا۔ انہی کے دست قدرت میں ترازو ہے پست کرتے ہیں اور بلند کرتے ہیں'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۹۲)

تشریح اس حدیث کے آخری حصہ میں انتظام خداوندی کی طرف اشارہ ہے، اور صفت تدبیر کی کارفرمائی کا بیان ہے۔ تدبیر الٰہی کا مدار خیر سے زیادہ ہم آہنگ کو ترجیح دینے پر ہے یعنی حکمت خداوندی اس سبب کو ترجیح دیتی ہے جو خیر کامل (مفاد عامہ) سے زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ پس جب کسی نئی پیدا ہونے والی بات کے سلسلہ میں متعارض اسباب اکٹھا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں جو انصاف کی ہوتی ہے۔ اور سورۃ الرحمان میں جو آیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ہر آن کسی شان میں ہوتے ہیں'' کا بھی یہی مطلب ہے کہ بوقت تعارض اسباب اللہ تعالیٰ بعض اسباب کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں۔ تفصیل قسم اول کے مبحث اول کے باب اول و چہارم میں گزر چکی ہے۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے بیدہ المیزان کا جو مطلب بیان کیا ہے، سیاق حدیث سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ایک بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ صفت تدبیر کی جس کرشمہ سازی کا یہاں اور پہلے تذکرہ آیا ہے، وہ بات صحیح ہے اور سورۃ الرحمان کی آیت میں اسی کا تذکرہ ہے۔

بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ترازو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی پر روزی تنگ کرتے ہیں اور کسی پر فراخ۔ قرآن کریم میں متعدد جگہ یہ مضمون آیا ہے کہ پروردگار عالم جس کو چاہتے ہیں زیادہ روزی دیتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں کم دیتے ہیں، اگرچہ ان کے خزانے میں کوئی ٹوٹا نہیں، مگر وہ اپنی حکمت و مصلحت کے موافق کسی کو پلڑا بھر کر روزی دیتے ہیں اور کسی کو ناقص دیتے ہیں۔

[۱۳] قوله صلى الله عليه وسلم: "بيده الميزان يخفض ويرفع"

أقول: هـذا إشـارة إلى التدبير، فإن مبناه على اختيار الأوفق: فما من حادثة يجتمع فيها أسبابٌ متنازعة إلا ويقضي الله في ذلك ما هو العدل، وهو قوله تعالىٰ: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾

ترجمہ: (۱۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''ان کے ہاتھ میں ترازو ہے، پلڑا جھکاتے ہیں اور اٹھاتے ہیں''

میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے تدبیر الٰہی کی طرف۔ پس بیشک اس کا مدار زیادہ ہم آہنگ کے اختیار کرنے پر ہے، پس نہیں ہے کوئی نیا واقعہ جس میں متعارض اسباب اکٹھا ہوں مگر فیصلہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اس واقعہ میں اس کا جو کہ وہ انصاف کی بات ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''ہر وقت وہ کسی اہم کام میں ہیں''

☆ ☆ ☆

انسان کا اختیار ایک حد تک ہے، کامل اختیار اللہ کا ہے

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بیشک انسانوں کے سب دل مہربان ہستی کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں ایک دل کی طرح پھیرتے ہیں وہ اس کو جس طرح چاہتے ہیں یعنی وہ قادر مطلق ہیں، وہ قلوب بنی آدم پر جس طرح چاہیں تصرف کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۸۹)

حدیث ـــــ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''دل کا حال چٹیل میدان میں پڑے ہوئے پر کی طرح ہے، ہوائیں اس کو پھیرتی ہیں پیٹھ سے پیٹ کی طرف یعنی پر کی طرح دل بھلائی سے برائی کی طرف، اور برائی سے بھلائی کی طرف پھیرتے ہیں (رواہ احمد، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۱۰۳)

آیت کریمہ: سورۃ التکویر کی آخری آیت ہے ﴿ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴾ ترجمہ: اور تم بدوں خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔

تشریح: اس آیت پاک میں اور ان احادیث شریفہ میں خدائے پاک کی قدرت کاملہ کا بیان ہے۔ جس طرح اللہ پاک کا علم شامل ہے، ان کی قدرت بھی کامل ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ نہ ان کے علم سے باہر ہے، نہ ان کی قدرت سے خارج۔ اگر ایک بھی چیز کا ان کو علم نہ ہو یا کوئی بھی چیز ان کی قدرت سے خارج ہو تو ان کا علم اور ان کی قدرت ناقص ہوگی، پھر وہ خدا کہاں رہا؟ پس بااختیار مخلوق انسان کے اختیاری افعال بلکہ خود اس کا اختیار بھی اللہ ہی کی قدرت و اختیار میں ہے۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ کوئی انسان پتھر پھینکنا چاہتا ہے پتھر ایک بے اختیار مخلوق ہے۔ لیکن فرض کرو اگر انسان قادر و حکیم ہو، اور وہ اس پتھر میں حرکت کا اختیار پیدا کر دے تو اب پتھر اپنے اختیار سے حرکت کرے گا۔ اور اس حرکت کو پتھر کے اختیار کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے اختیار سے حرکت کی ہے۔ مگر اس پتھر کو اپنے اس اختیار میں اختیار نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ آدمی کا پیدا کردہ ہے۔ مگر چونکہ آدمی کو پتھر میں حرکت کا اختیار پیدا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے جب وہ پتھر پھینکتا ہے تو وہ آدمی کے اختیار سے حرکت کرتا ہے، اور اس کی حرکت آدمی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ غرض پتھر کی حرکت کا معاملہ دونوں صورتوں میں یکساں ہے، مگر ایک صورت میں پتھر مجبور ہے اور ایک صورت میں مختار۔ اسی طرح بندوں کے اختیار کا معاملہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اختیار پیدا فرمایا ہے، اس لئے اب انسان کے اختیاری افعال خود انسان کی طرف منسوب ہوں گے۔ مگر چونکہ اس کا اختیار خانہ زاد نہیں، اس لئے وہ اپنے اختیار میں مختار نہیں ہوگا۔ اسی طرح انسان کے افعالِ اختیاریہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی چیز کا خالق نہیں ہے۔

سوال: جب بندوں کے افعالِ اختیاریہ اللہ کے پیدا کردہ ہیں اور انسان کی مشیت واختیار بھی اللہ کا پیدا کردہ ہے تو انسان مجبورِ محض ہوا، پس جزاء وسزا کی کوئی بنیاد نہ رہی؟!

جواب: جزاء وسزا کا تعلق اس بات سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض کام بعض کاموں پر مرتب ہوتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ بندے میں ایک حالت پیدا کرتے ہیں جو حکمت خداوندی میں دوسری حالت کو مقتضی ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ پانی میں حرارت پیدا کرتے ہیں تو وہ تقاضا کرتی ہے کہ پانی بھاپ (ہوا) بن کر اڑ جائے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے بندے میں اختیار پیدا کیا تو اس نے تقاضا کیا کہ جزاء وسزا ہو یعنی بندے کو راحت یا رنج پہنچے۔

جواب بہ الفاظ دیگر: جزاء وسزا کے لئے کاملِ اختیار ضروری نہیں۔ ایک حد تک اختیار کافی ہے، اور وہ انسان کو حاصل ہے۔ انسان کے احوال میں اور چوپایہ کے احوال میں غور کرنے سے یہ بات عیاں ہے۔ اور ایک حد تک اختیار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھایا ہے۔ ایک شخص آپ کے پاس یہی مسئلہ لے کر آیا کہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے یا مجبور؟ آپ نے فرمایا: مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ اس نے کہا: یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: ایک پیر اٹھالو۔ اس نے اٹھالیا۔ آپ نے فرمایا دوسرا بھی اٹھالو۔ کہنے لگا: دوسرا کیسے اٹھاؤں، گر پڑوں گا۔ آپ نے فرمایا: پہلا پیر اٹھانے تک تم با اختیار تھے۔ اب مجبور ہو گئے۔ اسی طرح مشیت واختیار کا ابتدائی حصہ بندے کے اختیار میں ہے، مگر اس کا آخری سرا اس کے اختیار میں نہیں ہے یعنی انسان کو جزوی اختیار حاصل ہے، کلی اختیار حاصل نہیں۔ اور مجازات کے لئے جزوی اختیار بھی کافی ہے۔

مجازات کے لئے فی الجملہ اختیار کیوں ضروری ہے؟

کسب واختیار پر جزاء وسزا مرتب ہونے کے لئے ذاتی اختیار شرط نہیں، عرضی (خدا کا پیدا کیا ہوا، فی الجملہ) اختیار بھی کافی ہے۔ اور عرضی اختیار اس لئے ضروری ہے کہ انسان کا نفس دو قسم کے اعمال کا رنگ قبول نہیں کرتا یعنی ان سے اثر پذیر نہیں ہوتا:

ایک: ان اعمال کا جن کی نسبت کسی بھی درجہ میں اس کی طرف نہ ہو، بلکہ کسی اور کی طرف ہو۔ جیسے زید سے کوئی بڑی کوتاہی ہو جائے تو اس کو افسوس ہوگا۔ لیکن اگر کسی اور نے وہ گناہ کیا ہے تو زید کو افسوس نہیں ہوگا۔

دوم: ان اعمال کا جو نفس کے اختیار وارادہ کی طرف منسوب نہیں ہیں، جیسے سونے کی حالت میں کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے یا بھول چوک سے کوئی کام ہو جائے تو آدمی "بھئی معاف کرنا" کہہ کر جان بچالیتا ہے، کوئی افسوس نہیں کرتا۔

اور یہ بات حکمت خداوندی کے لائق نہیں کہ وہ ناکردہ گناہ کی یا بے اختیار سرزد ہونے والی خطا کی سزا دیں، جن کا رنگ انسان کے نفس نے قبول ہی نہیں کیا۔ اور جب جزاء کی صورت حال یہ ہے تو غیر مستقل اختیار بھی جزاء وسزا کی

شرطیت کے لئے کافی ہے۔ ذاتی خانہ زاد اور کامل اختیار ضروری نہیں۔ بس اس درجہ کا اختیار ضروری ہے کہ نفس عمل کا رنگ قبول کرے اور اس درجہ کا کسب ضروری ہے کہ وہ اس عمل کرنے والے میں حالت اُولی پیدا کرے تا کہ اس پر حالت ثانیہ مرتب ہو سکے۔ کسی اور میں وہ حالت اولی پیدا نہ کرے، ورنہ اس پر حالت ثانیہ (نعمت والم) کیسے پیدا ہوگی؟!

نوٹ: مذکورہ تحقیق ایک عمدہ بیش بہا تحقیق ہے، اس کی قدر وہی شخص جانتا ہے جو کبھی جبر و اختیار کے مسئلہ میں الجھا ہو اور اس مسئلہ میں شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنسا ہو۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے یہ تحقیق صحابہ وتابعین کے کلام سے سمجھی ہے، قارئین کو چاہئے کہ وہ اس کو اچھی طرح محفوظ کرلیں اور یہ مضمون کہ بندوں کا اختیار بھی باذن الٰہی ہے مبحث ۵ کے باب پنجم میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔

[۱۴] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن قلوب بنى آدمَ كلَّها بين أُصْبُعين من أصابع الرحمٰن" وقوله صلى الله عليه وسلم: " مثلُ القلب كريْشَة بأرضٍ فلاةٍ، تُقَلِّبُهَا الرياحُ ظهرًا لبطن"

أقول: أفعال العباد اختيارية، لكن لا اختيار لهم فى ذلك الاختيار، وإنما مثلُه كمثل رجل أراد أن يرمىَ حجرًا، فلو أنه كان قادرًا حكيما خلق فى الحجر اختيارَ الحركة أيضًا.

ولايرد عليه: أن الأفعال إذا كانت مخلوقة لله تعالى، وكذلك الاختيار، ففيم الجزاءُ؟ لأن معنى الجزاء يرجع إلى ترتُّب بعض أفعال الله تعالى على البعض، بمعنى أن الله تعالى خلق هذه الحالة فى العبد، فاقتضى دلك فى حكمته: أن يخلُق فيه حالةً أخرى من النعمة أو الألم، كما أنه يخلق فى الماء حرارة، فيقتضى دلك أن يكسُوَه صورةَ الهواء.

وإنما يشترط وجودُ الاختيار وكسبُ العبد فى الجزاء بالعرض، لا بالذات؛ وذلك: لأن النفسَ الناطقةَ لا تقبل لونَ الأعمال التى لا تستَنِدُ إليها، بل إلى غيرها، من جهة الكسب، ولا الأعمال التى لا تَسْتَنِدُ إلى اختيارها وقصدها، وليس فى حكمة الله: أن يجازِىَ العبد بمالم تَقْبل نفسُه الناطقةُ لونَه.

فإذا كان الأمر على ذلك كفى هذا الاختيارُ، غيرُ المستقل فى الشرطِيَّة إذا كان مُصَحِّحًا لقبول لونِ العمل، وهذا الكسبُ غيرُ المستقل إذا كان مُصَحِّحًا لتخصيص هذا العبد بخلق الحالة المتأخِّرة فيه، دون غيره، وهذا تحقيق شريف، مفهوم من كلام الصحابة والتابعين، فاحفظه.

ترجمہ: (۱۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "بیشک انسانوں کے سارے قلوب رحمان کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "دل کی حالت چٹیل میدان میں پڑے ہوئے پر جیسی ہے، پلٹتی ہیں اس کو

ہوائیں پیٹھ سے پیٹ کی طرف"

میں کہتا ہوں: بندوں کے افعال اختیاری ہیں۔لیکن کوئی اختیار نہیں ہے بندوں کے لئے اس اختیار میں۔اور (بندے کے) اختیار کا حال اس آدمی کے حال جیسا ہی ہے جو چاہتا ہے کہ کوئی پتھر پھینکے۔پس اگر وہ قادر وحکیم ہو تو پیدا کرے گا وہ حرکت کا اختیار بھی۔

اور اعتراض وارد نہیں ہوگا اس پر یہ کہ جب افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اور اسی طرح اختیار بھی (انہی کا پیدا کیا ہوا ہے) تو پھر جزاء وسزا کے کیا معنی؟ اس لئے کہ جزاء کے معنی لوٹتے ہیں (یعنی جزاء کا تعلق ہے) اللہ تعالیٰ کے بعض کاموں کے مرتب ہونے کی طرف بعض پر، بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ نے بندے میں یہ حالت (اُولی) پیدا کی، پس چاہا اس نے اللہ کی حکمت میں کہ پیدا کریں وہ اس میں ایک دوسری حالت یعنی نعمت یا الم۔جس طرح یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتے ہیں پانی میں حرارت، پس چاہتی ہے وہ حرارت کہ پہنائیں اللہ تعالیٰ اس پانی کو ہوا کی صورت۔

اور شرط کی گئی ہے اختیار پائے جانے کی اور بندے کے کسب کی جزا میں: صرف بالعرض، نہ کہ بالذات۔اور وہ (عرضی اختیار) اس لئے ضروری ہے کہ نفس ناطقہ نہیں قبول کرتا ان اعمال کا رنگ جو اس کی طرف منسوب نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے علاوہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں اکتساب کی جہت سے (یعنی وہ فعل کسی اور نے کیا ہے) اور نہ ان اعمال کا رنگ قبول کرتا ہے جو کہ وہ منسوب نہیں ہوتے نفس کے اختیار وارادہ کی طرف (یعنی وہ اس کے اختیاری افعال نہیں ہوتے، بلکہ بے خبری میں کئے ہوئے اعمال ہوتے ہیں) اور اللہ کی حکمت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ بندے کو بدلہ دیں اس عمل کا کہ نہیں قبول کیا ہے بندے کے نفس ناطقہ نے اس کا رنگ۔

پس جب معاملہ ایسا ہے تو کافی ہے یہ غیر مستقل اختیار شرطیت کے لئے، جبکہ ہو وہ اختیار درست کرنے والا عمل کے رنگ کو قبول کرنے کے لئے۔اور (کافی ہے) یہ غیر مستقل کسب، جبکہ ہو وہ درست کرنے والا اس بندے کی تعیین کو بعد میں پیش آنے والی حالت (ثانیہ) کے پیدا کرنے کے ساتھ اس بندے میں، نہ کہ اس کے علاوہ میں (یعنی وہ پہلی حالت اسی بندے میں حالت ثانیہ پیدا کرے، کسی اور میں پیدا نہ کرے، ورنہ کرے کوئی اور بھرے کوئی کا معاملہ ہو کر رہ جائے گا) اور یہ عمدہ تحقیق ہے، سمجھی گئی ہے صحابہ وتابعین کے کلام سے، پس اس کو محفوظ کر لے۔

ترکیب. کلها صفت ہے قلوب کی اصبع میں ہمزہ اور باء پر تینوں حرکتیں درست ہیں . ارض فلاۃ: موصوف صفت ہیں لبطن میں لام جارہ بمعنی إلی ہے من النعمة بیان ہے حالت اخری کا ولا الأعمال کا عطف پہلے الأعمال پر ہے هذا الکسب کا عطف هذا الاختیار پر ہے مُصحّحًا ای مُثبتا. صَحّ بمعنی ثبت آتا ہے۔

☆ ☆ ☆

تقدیر ازلی ہے، اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

'' بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات (مراد مکلف مخلوقات: جن وانس ہیں) پیدا کی ہے (بہیمیت کی) تاریکی میں (سورۃ الشمس میں اس کو الہام فجور سے تعبیر کیا گیا ہے) پھر (دنیا میں ظاہر ہونے کے بعد بعثت انبیاء کے ذریعہ) ان پر اپنی (ہدایت کی) روشنی ڈالی۔ پس جس کو اس نور میں سے حصہ ملا، اس نے ہدایت پائی۔ اور جو اس نور کو چوک گیا وہ گمراہ ہوا۔ پس اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ: ''قلم تقدیر علم الٰہی کے مطابق (لکھ کر) خشک ہو چکا ہے (اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی) (رواہ الترمذی، مشکوۃ حدیث نمبر ۱۰۱)

تشریح: اس حدیث میں تقدیر کے ازلی اور قطعی ہونے کا بیان ہے۔ اس کا ماسیق لاجلہ الکلام یہی ہے۔ باقی مضامین ضمنی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے ان کا اندازہ مقرر کر لیا ہے۔ اور تمام اندازے یکبارگی کر لئے ہیں۔ ان میں کوئی حالت منتظرہ نہیں ہے، بلکہ وہ تمام طے کردہ باتیں قلم تقدیر نے علم الٰہی اور تقدیر خداوندی کے مطابق لوح محفوظ میں لکھ بھی لی ہیں۔ اور لکھ کر قلم خشک ہو چکا ہے یعنی اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ (قلم جب تک خشک نہ ہو جائے لکھے ہوئے میں تبدیلی ہو سکتی ہے)

فائدہ: نصوص فہمی میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

ایک: نص کا مقصد و مدعیٰ یعنی عبارت النص (ماسیق لاجلہ الکلام) متعین کر لیا جائے۔ تاکہ گفتگو کا مَصَبّ (گرنے کی جگہ) معلوم ہو جائے۔ اُسی کو قاریٔ گفتگو کا ماحصل قرار دے، اور دوسری باتوں کو ضمنی سمجھے۔

دوم: ضمناً جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کا موقع اور مصداق متعین کر لیا جائے کہ یہ واقعہ کس موقع کا ہے۔

اگر ان دو باتوں کا خیال کر کے نص پڑھی جائے گی تو ان شاء اللہ نہ کوئی الجھن پیش آئے گی، نہ کہیں تعارض محسوس ہوگا۔ اب آپ شاہ صاحب کے انداز پر حدیث کا مطلب سمجھیں:

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے ان کا اندازہ مقرر کر لیا تھا۔ اور تمام مخلوقات ابتدائے آفرینش میں فی نفسہ ہر کمال سے عاری تھیں۔ پس ان کو باکمال بنانے کے لئے ضروری ہوا کہ ان کی طرف انبیاء کو مبعوث کیا جائے اور ان پر وحی نازل کی جائے۔ چنانچہ زمین میں انسان کا وجود ہونے کے بعد یہ سلسلہ شروع کیا گیا۔ پس ان میں سے جس نے اس نور ہدایت سے حصہ پایا وہ راہ یاب ہوا، اور جو محروم رہ گیا وہ گمراہ ہوا۔

اور یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے ازل میں یکبارگی اندازہ کر لی ہیں۔ ان میں زمانی تقدم وتأخر نہیں ہے۔ البتہ ذاتی ہے یعنی اُس حالت کو جو بعثت انبیاء سے پیشتر تھی یعنی لوگوں کا تاریکی میں ہونا، اس کو اس حالت پر تقدم حاصل ہے جو

بعثت انبیاء کے بعد ہے یعنی بعض کا تاریکی سے روشنی میں نکل آنا اور بعض کا تاریکی ہی میں رہ جانا۔ اسی تقدم وتأخر ذاتی کو ایک حدیث قدسی میں اس طرح سمجھایا گیا ہے۔ مسلم شریف (۱۳۲.۱۶ مصری) میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

''میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنی ذات پر حرام کیا ہے، اور تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ پس ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ میرے بندو! تم سب گمراہ تھے بجز اس کے جس کو میں راہ دکھاؤں، پس مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تمہاری راہ نمائی کرونگا۔ میرے بندو! تم سب بھوکے تھے بجز اس کے جس کو میں کھانا کھلاؤں، پس مجھ سے کھانا مانگو، میں تمہیں کھانا کھلاؤنگا۔ میرے بندو! تم سب ننگے تھے بجز اس کے جس کو میں کپڑا پہناؤں، پس مجھ سے لباس مانگو، میں تمہیں پوشاک دونگا الخ۔

دوسری توجیہ: یا اس حدیث میں کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جیسے آدم علیہ السلام کی ذریت کے جنت سے اخراج کا واقعہ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے اخراج تک ان کی ذریت کا وجود ہی نہیں ہوا تھا۔ پس ذریت آدم کا نکالا جانا ان کے باپ کے نکالے جانے کے ضمن میں ایک تقدیری واقعہ ہے۔ اسی طرح اس حدیث میں بھی غالباً اُس تقدیری واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو امام مالک، ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، جو مشکوۃ، باب الایمان بالقدر، فصل ثانی، حدیث نمبر ۹۵ میں مذکور ہے۔ وہ واقعہ اس طرح ہے:

مسلم بن یسار کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آیت پاک: ﴿ وإذ أخذ ربُّكَ مِنْ بَنِيْ آدم مِنْ ظُهُوْرِهِم ذُرِّيَّتَهُم ﴾ کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہی سوال ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا، تو آپؐ نے فرمایا تھا:

''بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر ان کی پیٹھ پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا، پس اس سے ایک ذریت نکالی، پس فرمایا: ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ جنتیوں والے اعمال کریں گے۔ پھر ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو اس سے ایک اور اولاد نکالی، پس فرمایا: ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ دوزخیوں والے اعمال کریں گے'' الخ۔

اس تقدیری واقعہ میں انسانوں کی دو حصوں میں تقسیم وجود ارضی سے پہلے ہوئی ہے، پس ممکن ہے زیر شرح حدیث میں جو دو حصوں میں انسانوں کی تقسیم کا بیان ہے، اس کا محطّ اشارہ یہی واقعہ ہو۔

[۱۵] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن الله خلق خَلقه فى ظُلمة، فألقى عليهم من نوره، فمن أصابه من ذلك النور اهتدى، ومن أخطأه ضلَّ، فلذلك أقول: جَفّ القلم على علم الله"

معناه: أنه قدَّرهم قبل أن يُخلقوا، فكانوا هنالك عُراةً عن الكمال في حدّ أنفسهم، فاستوجبوا أن يُبعث إليهم، ويُنزل عليهم، فاهتدى بعضٌ منهم، وضلَّ آخرون.

قدّر جميع ذلك مرةً واحدةً، لكن كان لِما من أنفسهم تقدُّمٌ على مالهُم ببعث الرسل، كقوله صلى الله عليه وسلم روايةً عن الله تعالى: "كلكم جائع إلا من أطعمتُه، وكلكم ضالٌّ إلا من هديتُه" أو نقول: هذا إشارة إلى واقعةٍ مثل واقعة إخراج ذرية آدم عليه السلام.

ترجمہ: (۱۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "بیشک اللہ تعالیٰ نے پیدا کی اپنی خلقت تاریکی میں۔ پس ان پر اپنی روشنی ڈالی، پس جس کو پہنچا اس نور میں سے ہدایت پائی اس نے۔ اور جو چوک گیا اس نور کو وہ گمراہ ہوا، پس اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ: "قلم علم الٰہی کے مطابق (لکھ کر) خشک ہو چکا ہے"

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا اندازہ کر لیا ہے ان کے پیدا کئے جانے سے پہلے، پس وہ تھے وہاں کمال سے کورے اپنی حد ذات میں۔ پس واجب و لازم جانا انھوں نے کہ ان کی طرف انبیاء بھیجے جائیں، اور ان پر وحی نازل کی جائے، پس راہ پائی ان میں سے بعض نے اور گمراہ ہو گئے دوسرے۔

اندازہ کر لی تھیں اللہ تعالیٰ نے یہ تمام باتیں یکبارگی، لیکن تقدم حاصل ہے اس حالت کو جو ان کی اپنی فی حد ذاتہ ہے اُس حالت پر جو ان کے لئے ہے بعثت انبیاء کے ذریعہ۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، روایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کہ: "تم سب بھوکے ہو مگر جس کو میں کھلاؤں۔ اور تم سب گمراہ ہو مگر جس کو میں راہ دکھاؤں"

یا کہیں کہ یہ اشارہ ہے کسی واقعہ کی طرف، جیسے آدم علیہ السلام کی ذریت کے جنت سے نکالنے کا واقعہ۔

تصحیح: قدّر جمیع سے پہلے واو تھا، جو تینوں مخطوطوں میں نہیں ہے، اس لئے اس کو حذف کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

آدمی وہاں ضرور پہنچتا ہے جہاں موت مقدر ہوتی ہے

حدیث ـــــ حضرت مطر بن عکامس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے کسی سرزمین میں موت کا فیصلہ فرماتے ہیں تو اس کے لئے اس زمین کی طرف کوئی حاجت گروا دیتے ہیں (رواہ احمد والترمذی، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۱۱۰)

تشریح: عام طور پر تو ایسا ہوتا ہے کہ جہاں موت مقدر ہوتی ہے، آدمی وہاں جا بستا ہے۔ اس کے دل میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ اُس جگہ میں قیام اور بود و باش خوشگوار ہے۔ یا کوئی تقریب (کسی کی ملاقات، ملازمت وغیرہ) باعث

ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسی کوئی صورت پیش نہیں آتی اور وہاں موت مقدر ہوتی ہے تو پھر وہ صورت پیش آتی ہے جس کا اس حدیث میں تذکرہ ہے کہ ناگاہ کوئی ایسی حاجت پیش آتی ہے کہ آدمی خواہ مخواہ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ اسباب کے نظام میں خلل واقع ہونا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا دارالاسباب ہے اس لئے کوئی نہ کوئی سبب بن جاتا ہے، اور آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے۔

[١٦] قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا قَضَى اللّٰه لعبد أن يموت بأرض جعل له إليها حاجةً"
أقول: فيه إشارة إلى أن بعض الحوادث يوجد لئلا يُخرِم نظامُ الأسباب، فإن لم يكن أَسْهل من إلهام، أو بعثِ تقريبٍ، لابد أن يظهر ذلك.

ترجمہ: (۱۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "جب فیصلہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے کہ مرے وہ کسی سرزمین میں تو گردانتے ہیں وہ اس کے لئے اس زمین کی طرف کوئی حاجت"

میں کہتا ہوں: اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بعض واقعات پائے جاتے ہیں تاکہ رخنہ نہ پڑے اسباب کے نظام میں۔ پس اگر وہ شخص میدانی علاقے کی طرف نہیں اترا ہے کسی الہام کی وجہ سے، یا کسی تقریب (باعث) کے بھیجنے کی وجہ سے، تو ضروری ہے کہ وہ حاجت ظاہر ہو (جس کا اس حدیث میں تذکرہ ہے)

لغات: خَرْمہ (ن) خَرْمًا: شگاف ڈالنا، سوراخ کرنا اِنْخرمَ انفُه: نتھنوں کے بیچ کی ہڈی کا چھدنا۔ یہاں یہ بمعنی رخنہ پڑنا ہے أَسْهَلَ (باب افعال): پہاڑ سے میدانی زمین کی طرف اترنا السهل: نرم زمین، ہموار زمین یعنی اس سرزمین میں جا بسنا اس کو خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ بعث تقریب کا عطف إلهام پر ہے۔ تقریب: باعث، سبب۔ اردو میں بھی کہتے ہیں: کوئی تقریب نکل آنا۔ یعنی اگر وہ شخص اس سرزمین میں الہام (دل میں داعیہ پیدا کرنے) کے ذریعہ یا کوئی تقریب پیش آنے کی وجہ سے وہاں اقامت اختیار نہیں کرتا تو بالآخر کوئی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ وہاں پہنچ کر مرتا ہے۔

تصحیح: أَسْهَلَ اصل میں اِستَهلَ تھا۔ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

تخلیق کائنات سے پچاس ہزار سال پہلے تقدیر لکھنے کا مطلب

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی ہیں۔ اور فرمایا کہ اللہ

تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۷۹)

تشریح: اس حدیث میں دو باتیں تشریح طلب ہیں: اول یہ کہ اللہ کے تقدیر لکھنے سے کیا مراد ہے؟ دوم: پچاس ہزار سال پہلے کا کیا مطلب ہے؟

پہلی بات: ظاہر ہے کہ تقدیر لکھنے کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ جس طرح ہم ہاتھ میں قلم لے کر کاغذ یا تختی پر کچھ لکھتے ہیں، ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے لکھا ہو، ایسا خیال کرنا اللہ تعالیٰ کی شان اقدس سے ناواقفی ہے۔ بلکہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک تمام مخلوقات کی تقدیر لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہماری قوت خیالیہ میں ہزاروں چیزوں کی صورتیں، اور ان کے بارے میں معلومات جمع رہتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عرش اور پانی کو پیدا کیا، اس وقت اللہ کا تخت پانی پر تھا، اور کوئی دوسری مخلوق ایسی موجود نہیں تھی جس پر حکومت کی جائے یعنی اس کا نظم وانتظام کیا جائے۔ اُسی وقت اللہ تعالیٰ نے عرش کی قوتوں میں سے کسی خاص قوت میں، جس کو ہماری قوت خیالیہ کے مشابہ سمجھنا چاہئے، تمام مخلوقات اور ان کے تمام احوال ثبت فرما دیئے تھے۔ سورۃ الانبیاء آیت ۱۰۵ میں اسی کو الذکر سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

اور یہ ہرگز خیال نہ کیا جائے کہ یہ بات احادیث کے خلاف ہے۔ کیونکہ محدثین کے نزدیک لوح وقلم کی روایات صحیح نہیں ہیں۔ وہ سب روایات اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور بعد کے محدثین نے جو ان کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے تو وہ ایک طرح کا تعمق ہے یعنی رطب ویابس کو جمع کرنے میں آخری حد تک جانے کی کوشش ہے۔ متقدمین کا ان کے سلسلہ میں کوئی کلام نہیں ہے یعنی صحاح کے مصنفین نے ان روایات کو اپنی کتابوں میں درج نہیں کیا[1]

حاصل کلام: یہ ہے کہ آج دنیا کے پردے پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب عرش کی اس قوت میں متحقق ہو چکا ہے۔ اور اسی کو کتابت تقدیر سے تعبیر کیا ہے۔ قانونی زبان میں کسی چیز کے طے کر دینے اور معین ومقرر کر دینے کو بھی کتابت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں روزوں کی فرضیت کو اور وصیت کے ایجاب کو اور قصاص کے حکم کو کُتِبَ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے پر اس کا حصۂ زنا لکھ دیا ہے یعنی تجویز کر دیا ہے۔ اور ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میرا نام فلاں غزوہ میں لکھا گیا یعنی تجویز کیا گیا، کیونکہ دور نبوی میں ایسا کوئی رجسٹر نہیں تھا جس میں فوجیوں کے نام

---

[1] البتہ ایک روایت ترمذی میں دو جگہ اور ابوداؤد اور مسند احمد میں آئی ہے اور وہ مشکوٰۃ میں نمبر ۹۴ پر باب الایمان بالقدر کی فصل ثانی کی ابتداء میں ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اسے حکم دیا کہ لکھ، اس نے عرض کیا کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا: تقدیر لکھ۔ چنانچہ اس نے جمیع ما کان وما یکون کو لکھ دیا۔ امام ترمذی نے اس روایت کو ایک جگہ (کتاب القدر میں) غریب کہا ہے اور دوسری جگہ (کتاب التفسیر میں) حسن غریب کہا ہے۔ اس روایت کی سند میں ایک راوی عبدالواحد بن سلیم ہے جو ضعیف ہے ۱۲

لکھے جاتے ہوں۔ یہ بات حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے۔ اور عربوں کے اشعار میں بھی اس کی بے شمار نظیریں ہیں۔

دوسری بات: اور پچاس ہزار برس میں احتمال ہے کہ یہی عدد مراد ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ بہت طویل زمانہ مراد ہو۔ عربی محاورات میں یہ استعمال بھی شائع ذائع ہے۔

نوٹ: یہ مضمون تفصیل سے مبحث اول باب ۱۱ اور مبحث ۵ باب ۵ میں گزر چکا ہے۔

[۱۷] قال صلى الله عليه وسلم: " كتب اللّٰه مقادير الخلائق قبلَ ان يخلُقَ السماوات والأرض بخمسين ألف سنةٍ" قال: "وكان عرشُه على الماء"

أقول: خلق اللّٰه تعالى العرشَ والماءَ أولَ ما خلق، ثم خلق جميع ما أراد أن يُوجد في قُوَّةٍ من قُوى العرش، يُشْبِهُ الخيالَ من قُوانا، وهو المعبَّرُ عنه بالذكر على ما بيَّنه الإمام الغزالي.

ولا تَظُنَّنَّ ذلك مخالفاً للسنّة، فإنه لم يَصِحْ عند أهل المعرفة بالحديث من بيان صورة القلم واللَّوح، على ما يَلْهَجُ به العامة، شيءٌ يُعتدُّ به. والذي يروُونه هو من الإسرائيليات، وليس من الأحاديث المحمدية. وذَهابُ المتاخرين من أهل الحديث إلى مثله نوعٌ من التعمُّق، وليس للمتقدمين في ذلك كلام.

وبالجملة: فتحقَّقَتْ هنالك صورةُ هذه السلسلة بتمامها، وعُبِّرَ عنه بالكتابة، أخذًا من إطلاق الكتابة في السياسة المدنية على التعيين والإيجاب، ومنه قولُه تعالى: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ وقولُه تعالى: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذا حضَرَ﴾ الآية، وقوله صلى الله عليه وسلم: " إن اللّٰه كتب على عبده حظَّه من الزنا" الحديث، وقولُ الصحابي: كُتِبتُ في غزوة كذا، ولم يكن هناك ديوان، كما ذكره كعب بن مالك، ونظيرُ ذلك في أشعار العرب كثير جدًا.

وذكر خمسين ألف سنة: يحتمل أن يكون تعيينًا، ويحتمل أن يكون بيانا لطول المدة.

ترجمہ: (۱۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ نے مخلوقات کی تقدیریں لکھ دیں آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے"۔ اور فرمایا: "اور ان کا عرش پانی پر تھا"

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا عرش اور پانی کو ابتدائے آفرینش میں۔ پھر پیدا کیا اُن تمام چیزوں کو جن کو پیدا کرنا چاہا عرش کے قُوی میں سے کسی قوت میں، جو مشابہ ہے ہمارے قُوی میں سے خیال کے۔ اور اُسی کو تعبیر کیا گیا ہے الذکر کے ذریعہ، جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

اور آپ ہرگز گمان نہ کریں اس بات کو احادیث کے خلاف۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ نہیں صحیح ہے حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک، قلم اور تختی کی صورت کے بیان میں سے، اس طور پر جس کو عام لوگ بیان کرتے ہیں، کوئی قابل لحاظ چیز (پس ترمذی کی مذکورہ روایت خارج ہوگئی، کیونکہ اس میں قلم کی صورت کا بیان نہیں ہے) اور وہ روایات جن کو لوگ بیان کرتے ہیں، وہ اسرائیلیات میں سے ہیں۔ اور نہیں ہیں وہ احادیث نبویہ میں سے۔ اور متاخرین اہل حدیث کا جانا اس کے مانند کی طرف ایک طرح کا تعمق ہے اور نہیں ہے متقدمین کا اس سلسلہ میں کچھ کلام۔

اور حاصل کلام: پس پائی گئی وہاں (یعنی عرش کی قوت خیالیہ میں، کائنات کے) اس پورے سلسلہ کی صورت، اور تعبیر کیا گیا اس (پائے جانے کو) کتابت سے، لیتے ہوئے لفظ کتابت کو اطلاق کرنے سے ملکی سیاست میں تعیین وایجاب پر۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لکھے گئے تم پر روزے'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لکھی گئی تم پر جب حاضر ہو'' آخر آیت تک۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے اپنے بندے پر اس کا حصۂ زنا'' آخر حدیث تک (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۸۶) اور صحابی کا قول: ''لکھا گیا میں فلاں غزوہ میں'' اور نہیں تھا وہاں کوئی دفتر، جیسا کہ ذکر کیا اس کو کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے۔ اور اس کی نظیریں عربوں کے اشعار میں بہت زیادہ ہیں۔

اور پچاس ہزار کا تذکرہ: احتمال رکھتا ہے کہ وہ تعیین ہو، اور احتمال رکھتا ہے کہ وہ مدت کی درازی کا بیان ہو۔

☆ ☆ ☆

آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے ذریت کو نکالنے کا بیان

آیت کریمہ: سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲ میں ارشاد پاک ہے: ''یاد کرو جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا، اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: کیوں نہیں! ہم گواہ بنتے ہیں!''

حدیث ـــــ مذکورہ آیت پاک کی تفسیر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ پھر ان کی پیٹھ پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا، پس اس سے ایک ذریت نکالی اور فرمایا: میں نے ان کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ جنتیوں والے کام کریں گے۔ پھر ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، پس اس سے ایک اور ذریت نکالی، اور فرمایا: میں نے ان کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے، اور یہ دوزخیوں والے کام کریں گے'' (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۹۵)

تشریح: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تاکہ وہ ابوالبشر (انسانوں کے پہلے جدامجد) بنیں، تو ان کے وجود (ہستی) میں ان کی ساری نسل مضمر (پنہاں) ہوگئی۔ جس طرح بیج میں سارا درخت مضمر ہوتا ہے۔ پھر اللہ

تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کسی وقت میں[1] اس ذریت کا علم عطا فرمایا جن کو ارادۂ خداوندی کی رو سے ان کی ہستی متضمن تھی۔ چنانچہ وہ ساری ذریت مثالی پیکر میں آپ کو سر کی آنکھوں سے دکھائی گئی۔ اور ان کی نیک بختی اور بدبختی کا پیکر محسوس نور وظلمت کو بنایا یعنی نیک اولاد کو روشن، چمکدار موتیوں کی طرح دکھایا۔ اور بدبخت اولاد کو تاریک کوئلہ کی طرح کالا دکھایا[2]۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس ذریت میں جو مکلف ہونے کی استعداد رکھی ہے اس کا پیکر محسوس سوال وجواب کو اور اعتراف والتزام کو بنایا۔ جس کا تذکرہ مذکورہ آیت کریمہ میں آیا ہے۔ پس انسانوں سے دارو گیر تو ان کی اصل استعداد کی بنیاد پر ہوگی، مگر اس کی نسبت اس استعداد کے پیکر محسوس کی طرف ہوگی۔

[۱۸] قوله صلى الله عليه وسلم:" إن الله خَلَق آدم، ثم مَسَحَ ظهره بيمينه" الحديث.

أقول: لما خلق الله آدم ليكون أباً للبشر التَفَّ في وجوده حقائقُ بنيه، فأعطاه الله تعالى — وقتاً من أوقاته — عِلْمَ ما تَضَمَّنَه وجودُه بحسب القصد الإلٰهي، فأراه إياهم رأىَ عينٍ بصورة مثالية، ومَثَّلَ سعادتَهم وشقاوتَهم بالنور والظلمة، ومَثَّلَ ما جَبَلَهم عليه من استعداد التكليف بالسؤال والجواب، والالتزامِ على أنفسهم، فهم يُؤاخذون بأصل استعدادهم، وتُنسب المؤاخذةُ إلى شَبَحِهِ في الظاهر.

ترجمہ: (۱۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا، پھر ان کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا" آخر حدیث تک۔

میں کہتا ہوں: جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تا کہ وہ ابوالبشر بنیں تو لپٹ گئی ان کے وجود (ہستی) میں ان کی اولاد کی ماہیتیں، پس دیا آدم کو اللہ تعالیٰ نے — ان کے اوقات میں سے کسی وقت میں — علم اس چیز کا جس کو متضمن تھا ان کا وجود، ارادۂ الٰہی کے اعتبار سے، پس دکھائی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو ان کی اولاد سر کی آنکھوں سے، مثالی صورت کے ذریعہ (یعنی ذریت کا وجود عالم مثال میں ہوا تھا) اور پیکر محسوس بنایا ان کی نیک بختی اور بدبختی کو روشنی اور تاریکی کے ذریعہ۔ اور پیکر محسوس بنایا اس کو جس پر ان کو پیدا کیا تھا یعنی مکلف ہونے کی استعداد کو سوال وجواب اور اپنی ذاتوں پر التزام کے ذریعہ۔ پس وہ دارو گیر کئے جائیں گے ان کی اصل استعداد کی وجہ سے، اور منسوب کیا جائے گا مؤاخذہ اس استعداد کی ظاہر میں پائی جانے والی شبیہ کی طرف۔

---

[1] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے وہ وقت قبل تهبطه من السماء مروی ہے (درمنثور ۳ ۱۴۱)

[2] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں ہے فاخرج منه ذريةً بيضاءَ مثل اللؤلؤ اور فاخرج منه ذرية سوداء اور حضرت ابن عباس کی تفسیر میں ہے فخرج منه سواء مثل الحمم (درمنثور)

لغات: اِلتَفَّ فی ثوبہ: کپڑے میں لپٹنا .. فی وجودہ کے فصل کی وجہ سے فعل مذکر آیا ہے. . حقائق جمع حقیقۃ کی بمعنی ماہیت... وقتاً ظرف ہے مَثَّلَ تمثیلاً: ہو بہو تصویر بنانا .. التزام: کوئی بات سر لینا شبحہ فی الظاھر پورے کا ترجمہ ہے: پیکر محسوس۔ فی الظاھر کا الگ ترجمہ نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

مراحلِ تخلیق اور فرشتہ کا چار باتیں لکھنا

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے، جو صادق (سچے) اور مصدوق (تصدیق کیے ہوئے) ہیں فرمایا کہ:

''تم میں سے ہر ایک کی پیدائش جمع کی جاتی ہے اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفہ کی حالت میں (یعنی اس مدت میں نطفہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی، بس حرارت کی وجہ سے معمولی تغیر ہوتا ہے) پھر اتنی ہی مدت میں علقہ (جما ہوا خون) ہوتا ہے، پھر اتنی ہی مدت میں مُضغہ (گوشت کا ٹکڑا) ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتے ہیں چار باتوں کے ساتھ (یعنی گوشت پوست اور ہڈی درست ہونے کے بعد فرشتہ نازل ہوتا ہے) پس وہ اس کا عمل، اس کی موت، اس کی روزی اور اس کا نیک بخت یا بد بخت ہونا لکھتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے'' آخر حدیث تک (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۸۲)

تشریح: مراحل تخلیق میں انتقال تدریجی ہوتا ہے، دَفعی (یکبارگی) نہیں ہوتا۔ اور ہر مرحلہ پہلے والے اور بعد والے مراحل سے مختلف ہوتا ہے: مادّہ میں جب تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ خون ہی کی شکل میں رہتا ہے تو نطفہ کہلاتا ہے۔ پھر جب اس میں معمولی انجماد پیدا ہو جاتا ہے تو علقہ کہلاتا ہے۔ پھر جب اس میں خوب انجماد پیدا ہو جاتا ہے، اور نرم ہڈیاں بھی بن جاتی ہیں تو مُضغہ کہلاتا ہے۔

اور جس طرح کھجور کی گٹھلی مناسب موسم میں بوئی جائے، اور اس کی مناسب دیکھ بھال کی جائے تو باغبانی کا ماہر جو بیج، زمین اور آب وہوا کی خاصیات سے واقف ہو، جان لیتا ہے کہ وہ گٹھلی شاندار طریقے پر اُگے گی۔ وہ ابتداء ہی سے اس کے بعض احوال جان لیتا ہے۔ اسی طرح جو فرشتہ جنین کی تدبیر پر مقرر ہے اس پر اللہ تعالیٰ مذکورہ چار باتیں منکشف فرما دیتے ہیں اور وہ بچہ کی فطرت ہی سے ان باتوں کا اندازہ کر لیتا ہے۔ یہ مضمون مبحث ۵ کے باب ۵ میں ظہور تقدیر کے چوتھے مرحلہ کے بیان میں گذر چکا ہے۔

[۱۹] قولہ صلی اللہ علیہ وسلم: '' إن خَلْقَ أحدِکم یُجمع فی بطن أمہ'' الحدیث.

أقول: هذا الانتقال تدريجي، غيرُ دفعي، وكل حدٍ يُباين السابقَ واللاحقَ، ويسمى مالم يتغيو من صورة الدم تغيرًا فاحشا نطفةً، ومافيه انجماد ضعيف علقةً، وما فيه انجماد أشدُّ من ذلك مُضغةً، وإن كان فيه عظمٌ رِخْوٌ.

وكما أن النواة إذا أُلقيت في الأرض في وقت معلوم، وأحاط به تدبير معلوم، عَلِمَ المطَّلِع على خاصية نوع النخل، وخاصية تلك الأرض، وذلك الماء، وذلك الوقت: أنه يحسُن نباتُها، ويتحقَّق من شأنه على بعض الأمر، فكذلك يُجَلِّي اللّٰه على بعض الملائكة حالَ المولود بَحَسَب الجبلَّة التي جُبل عليها.

ترجمہ:(۱۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بیشک تم میں سے ایک کی پیدائش جمع کی جاتی ہے اس کی ماں کے پیٹ میں'' آخر حدیث تک۔

میں کہتا ہوں: یہ انتقال (جس کا حدیث میں تذکرہ ہے) تدریجی ہے۔ دفعی نہیں ہے۔ اور ہر حد (مرحلہ) سابق ولاحق سے مختلف ہوتا ہے۔ اور کہلاتا ہے وہ (مادّہ) جب تک نہیں بدلتا خون کی صورت سے بہت زیادہ بدلنا نطفہ۔ اور وہ جس میں کمزور انجماد ہوتا ہے (کہلاتا ہے) علقہ (خون بستہ) اور وہ جس میں اس سے زیادہ انجماد ہوتا ہے مُضغہ (گوشت کی بوٹی) کہلاتا ہے، اگرچہ اس میں نرم ہڈی ہو۔

اور جس طرح یہ بات ہے کہ کھجور کی گٹھلی جب ڈالی جاتی ہے مٹی میں وقت معلوم میں، اور گھیر لیتی ہے اس کو تدبیر معلوم (تو) جان لیتا ہے کھجور کے درخت کی نوع کی خاصیت کا واقف اور اس زمین، اور اس پانی، اور اس وقت کی خاصیت کا جاننے والا کہ عمدہ ہوگا اُس کا اُگنا۔ اور پالتا ہے وہ اس کے حال سے بعض معاملہ کو۔ پس اسی طرح ظاہر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ بعض فرشتوں پر نومولود کا حال، اس فطرت کے موافق جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

ہر شخص کا ٹھکانا جنت میں بھی ہے اور جہنم میں بھی

حدیث ——— حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا دوزخ کا اور جنت کا لکھا جا چکا ہے (یعنی جو بھی شخص دوزخ میں یا جنت میں جائے گا اس کی وہ جگہ پہلے سے مقدر ومقرر ہے) (متفق علیہ، مشکوٰۃ، حدیث ۸۵)

تشریح: اس حدیث کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

پہلا مطلب. ہر شخص کا ٹھکانا جنت میں بھی ہے اور جہنم میں بھی۔ جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہنچ جائیں گے تو جہنمیوں کی جو جگہیں جنت میں ہیں وہ جنتیوں کے حصہ میں آجائیں گی اور جنتیوں کی جو جگہیں جہنم میں ہیں وہ جہنمیوں کو دیدی جائیں گی۔ یہی یوم التغابن (ہار جیت کا دن) ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص میں کمال بھی ہے اور نقصان بھی، وہ ثواب کا حقدار بھی ہوسکتا ہے اور عذاب کا بھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے ہر جگہ ٹھکانا تیار کر رکھا ہے۔

دوسرا مطلب: حدیث میں واو بمعنی او ہے یعنی اگر وہ دوزخی ہے تو اس کا ٹھکانا دوزخ میں، اور اگر وہ جنتی ہے تو اس کا ٹھکانا جنت میں لکھا جاچکا ہے۔

نوٹ: شاہ صاحب رحمہ اللہ نے پہلے قول کو اصل اور دوسرے قول کو درجۂ احتمال میں رکھا ہے۔ کیونکہ بعض روایات سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے۔ جیسے هذا فكاكك من النار (مشکوۃ حدیث ۱۰۰ باب الحساب)

[۲۰] قوله صلى الله عليه وسلم: " ما منكم من أحد إلا وقد كتب له مقعده من النار ومقعده من الجنة"
أقول: كل صنف من أصناف النفس له كمال ونقصان، عذاب وثواب، ويحتمل أن يكون المعنى: إما من الجنة وإما من النار.

ترجمہ: (۲۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "نہیں ہے تم میں سے کوئی، مگر تحقیق لکھا گیا ہے اس کے لئے اس کا ٹھکانا جنت میں اور اس کا ٹھکانا جہنم میں"

میں کہتا ہوں: نفس کی قسموں میں سے ہر قسم کے لئے (یعنی ہر انسان کے لئے خواہ نیک ہو یا بد) کمال و نقصان (اور) ثواب و عذاب ہے (اس لئے ہر ایک کا ٹھکانا دونوں جگہ لکھا گیا ہے) اور احتمال ہے کہ معنی ہوں: یا جنت میں یا جہنم میں (اس صورت میں ہر ایک کا ٹھکانا وہیں لکھا ہوا ہے جہاں اس کا جانا مقدر و مقرر ہے، دونوں جگہ لکھا ہوا نہیں ہے)

☆ ☆ ☆

رفعِ تخالف

سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲ میں ہے "اور وہ وقت یاد کرو جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کو اولادِ آدم کی پشت سے نکالا گیا ہے۔ خود آدم علیہ السلام کی پشت سے نہیں نکالا گیا۔ اور پہلے جو حدیث گذری ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری ذریت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالی گئی تھی۔ پس آیت اور حدیث میں تعارض ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تعارض نہیں۔ واقعہ کا کچھ حصہ قرآن کریم

میں بیان کیا گیا ہے، اور کچھ حصہ حدیث میں۔ بات دونوں سے مل کر مکمل ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت آدم علیہ السلام کی پشت پر پھیرا تو ان کی صلبی اولاد ان کی پشت سے نکل آئی۔ پھر خود بخود ان اولاد کی پشت سے ان کی صلبی اولاد نکلی۔ اسی طرح قیامت تک جس طرح وہ موجود ہونے والے ہیں نکلتے چلے گئے۔ پس حدیث میں واقعہ کا ابتدائی حصہ ذکر کیا گیا ہے، اور قرآن کریم میں بعد کا۔

[۲۱] وقوله تعالى: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ﴾ الآية، لا يخالف حديث: "ثم مسح ظهره بيمينه، واستخرج منه ذرّيّته" لأن آدم أُخذت عنه ذريتهُ، ومن ذريته ذريتُهم إلى يوم القيامة، على الترتيب الذي يوجدون عليه، فذُكر في القرآن بعضُ القصة، وبيّن الحديثُ تتمتها.

ترجمہ: (۲۱) ارشاد باری تعالیٰ: ''اور جب لیا آپ کے رب نے اولاد آدم سے'' آخر آیت تک، مخالف نہیں ہے حدیث: ''پھر ان کی پیٹھ پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا، اور اس سے ان کی ذریت نکالی'' سے، اس لئے کہ آدم علیہ السلام سے لی گئی ان کی ذریت، اور ان کی ذریت سے ان کی ذریت قیامت تک، اس ترتیب پر جس پر وہ پائے جائیں گے۔ پس ذکر کیا گیا قرآن میں واقعہ کا بعض حصہ، اور بیان کیا حدیث نے اس کا تتمہ۔

☆ ☆ ☆

اعتراض کا جواب

سوال: سورۃ اللیل آیات ۵-۷ میں ہے: ''سو جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا، اور وہ اللہ سے ڈرا، اور اچھی بات (کلمہ حسنیٰ) کو سچا سمجھا تو ہم عنقریب آسانی کریں گے اس کے لئے آسان کام کے لئے'' یعنی اس کے لئے مذکورہ نیک کاموں کا راستہ آسان کر دیں گے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ شخص نیکیاں کر چکا تو اب اس کے لئے راہ آسان کرنے کا کیا مطلب؟ یہی سوال اگلی تین آیتوں کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔

جواب: یہ ہے کہ آیت کریمہ میں فعل ماضی کا استعمال علم الٰہی اور تقدیر خداوندی کے لحاظ سے ہے، وجود خارجی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ اور آیات پاک کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم الٰہی میں اور اندازہ خداوندی میں ان صفات کے ساتھ متصف ہے، اس کے لئے خارج میں (پیدا ہونے کے بعد) ان کاموں کا کرنا اللہ تعالیٰ آسان کر دیتے ہیں۔ اب حدیث پڑھیے۔ بات ٹھیک منطبق ہو جائے گی۔

حدیث کا ابتدائی حصہ وہ ہے جو پہلے گذر چکا ہے کہ ''تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا دوزخ کا اور جنت کا لکھا جا چکا ہے'' آگے حدیث اس طرح ہے:

صحابہ نے عرض کیا ـــــ :تو کیا ہم اپنے اس نوشتہ تقدیر پر بھروسہ نہ کریں، اور سعی وعمل چھوڑ نہ دیں؟ (یعنی جب سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے، اور لکھا ہوا ہے، تو پھر سعی وعمل کی دردسری کیوں مول لی جائے؟!)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا ـــــ :''نہیں! عمل کئے جاؤ، کیونکہ ہر ایک کو اسی کام کی توفیق ملتی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ پس جو کوئی نیک بختوں میں سے ہے، اس کو نیک بختی کے کاموں کی توفیق ملتی ہے۔ اور جو کوئی بدبختوں میں سے ہے، اس کو بدبختی کے کاموں کی توفیق ملتی ہے''

جواب کا حاصل: یہ ہے کہ اگرچہ شخص کے لئے اُس کا آخری ٹھکانا مقدر ومقرر ہے۔ لیکن ساتھ ہی اچھے یا برے اعمال سے وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی پہلے سے مقدر ہے یعنی تقدیر الٰہی صرف یہی نہیں ہے کہ فلاں جنت میں اور فلاں جہنم میں جائے گا۔ بلکہ تقدیر الٰہی میں یہ بھی طے ہو چکا ہے کہ جو جنت میں جائے گا، وہ اپنے فلاں فلاں اعمال خیر کے راستے سے جائے گا۔ اور جو جہنم میں جائے گا وہ اپنی فلاں فلاں بداعمالیوں کی وجہ سے جائے گا ـــــ پھر دنیا میں پیدا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ دونوں کیلئے ان کی راہیں آسان کر دیتے ہیں: نیک اعمال کی راہ تو فی نفسہ بھی آسان ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مزید آسان کر دیتے ہیں۔ اور برے کام فی نفسہ تو بڑے سخت کام ہیں، مگر اللہ تعالیٰ ان کو بھی بدبختوں کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔

[۲۲] قوله تعالى: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى، وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى﴾ أي من كان متصفا بهذه الصفات في علمنا وقَدَرِنَا ﴿فَسَنُيَسِّرُهُ﴾ لتلك الأعمال في الخارج، وبهذا التوجيه ينطبق عليه الحديث.

ترجمہ: (۲۲) ارشاد باری تعالیٰ: ''پس رہا وہ جس نے دیا، اور وہ بچا، اور اس نے تصدیق کی اچھی بات کی'' یعنی جو شخص متصف ہے ان صفات کے ساتھ ہمارے علم اور ہمارے اندازے میں ''تو عنقریب آسانی کریں گے ہم اس کے لئے'' ان کاموں کو وجود خارجی میں کرنے کے لئے۔ اور اس توجیہ سے منطبق ہو جائے گی اس (آیت) پر حدیث۔

☆ ☆ ☆

نیکوکاری اور بدکاری الہام کرنے کا مطلب

سورۃ الشمس آیات ۷ و ۸ میں ہے: ''اور قسم ہے انسان کے نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا'' یعنی اول عقل سلیم عطا فرمائی تا کہ انسان اس کے ذریعہ بھلائی برائی اور صحیح غلط کی تمیز کر سکے ـــــ ''پھر الہام فرمائی اس کو اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری'' ـــــ چنانچہ دنیا میں پیدا ہونے کے بعد دل میں جو نیکی کا رجحان یا بدی کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے، وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ گو القائے اول میں فرشتہ واسطہ ہوتا ہے۔ اور ثانی میں شیطان۔ پھر یہی رجحان بندے کے اختیار سے مرتبۂ عزم تک پہنچ کر صدور فعل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جس کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں اور

کا سب بندہ ہے۔اور اسی کسب خیر وشر پر مجازات کا مدار ہے (فوائد عثمانی) حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اس آیت میں ''الہام'' سے مراد نفس میں نیکی اور بدی کی صورت پیدا کرنا ہے۔اور یہ تصور فرشتے اور شیطان کے توسط سے پیدا کیا جاتا ہے۔جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گذر چکا ہے کہ: ''شیطان کے لئے انسان سے ایک نزدیکی ہے، اور فرشتے کے لئے بھی ایک نزدیکی ہے'' الخ کیونکہ الہام درحقیقت صورت علمیہ پیدا کرنے کا نام ہے، جس کی وجہ سے آدمی عالم (جاننے والا) بن جاتا ہے۔مگر نیکی اور بدی کے تصور سے نیکی اور بدی کا وجود نہیں ہوتا۔پس لفظ الہام مجازاً ذرا وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔تفصیلی صورت علمیہ جو عالم بناتی ہے، مراد نہیں ہے، بلکہ اجمالی صورت علمیہ مراد ہے، جو آثار کا مبدأ ہوتی ہے۔

اجمالی صورت علمیہ سے آدمی عالم (جاننے والا) نہیں بنتا۔البتہ تحصیل علم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔یہی صلاحیت آثار کا سرچشمہ ہوتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔جیسے کوئی دقیق مسئلہ ہوتا ہے تو عام آدمی نہیں جان سکتا۔کیونکہ اس میں سمجھنے کی صلاحیت نہیں۔مگر معقولات پڑھا ہوا طالب علم اس کو سمجھ سکتا ہے۔کیونکہ اس میں سمجھنے کی صلاحیت ہے۔یہ صلاحیت سرچشمہ ہے، یہی اجمالی صورت علمیہ ہے، پھر جب اس نے مسئلہ سمجھ لیا تو ماحصل فی الذہن تفصیلی صورت علمیہ ہے، جس کی وجہ سے اس کو مسئلہ کا جاننے والا کہتے ہیں۔اسی طرح آیت پاک میں مذکور الہام سے نیکی اور بدی کا جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ اجمالی صورت علمیہ ہے۔اسی کی بنیاد پر نیکی اور بدی کا وجود ہوتا ہے۔

[۲۳] قوله تعالیٰ: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰهَا ، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وتقْوٰهَا﴾

أقول: المراد بالإلهام هنا خلقُ صورة الفجور فی النفس، كما سبق فی حديث ابن مسعود، فالإلهام فی الأصل: خلقُ الصورة العلمية التی يصير بها عالمًا، ثم نُقل إلى صورة إجمالية هی مبدأُ آثارٍ، وإن لم يصر بها عالِمًا، تجوُّزًا، واللّٰه أعلم.

ترجمہ. (۲۳) ارشاد باری تعالیٰ: ''قسم ہے نفس کی اور اس کو درست بنانے والے کی، پس الہام کی اللہ تعالیٰ نے نفس کو اس کی بدکاری اور اس کی نیکوکاری''

میں کہتا ہوں: الہام کرنے سے یہاں مراد نفس میں بدکاری (اور نیکوکاری) کی صورت پیدا کرنا ہے، جیسا کہ پہلے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گذرا۔پس الہام درحقیقت: اس صورت علمیہ کو پیدا کرنا ہے جس کی وجہ سے آدمی جاننے والا ہوتا ہے۔پھر منتقل کیا گیا (لفظ الہام) اس اجمالی صورت کی طرف جو آثار کا سرچشمہ ہے، اگرچہ نہ ہوا ہو اس کی وجہ سے آدمی جاننے والا، مجازاً اختیار کرنے کے طور پر (تجوُّزًا تمیز ہے نُقل سے) باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۲

کتاب وسنت کو مضبوط پکڑنے کے سلسلہ کی اصولی باتیں

اِعْتَصَمَ به کے معنی ہیں: مضبوط پکڑنا۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَاتَفَرَّقُوْا﴾ ترجمہ: اور سب متفق ہوکر اللہ کی رسّی مضبوط پکڑو، اور باہم نااتفاقی مت کرو۔ اور سنت کے معنی ہیں: اسلامی طریقہ (الطريقة المسلوكة في الدين) اور حدیث وسنت میں عام خاص من وجہ کی نسبت ہے۔ حدیث: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، افعال، تائیدات اور صفات کا نام ہے۔ اور ان میں سے سنت صرف وہ احادیث ہیں جو معمول بہا ہیں۔ مخصوص یا منسوخ نہیں ہیں۔ جیسے صوم وصال کی حدیث اور الماء من الماء حدیثیں ہیں، مگر سنت نہیں ہیں۔

اسی طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے رائج کردہ دینی طریقے بھی سنت ہیں، مگر عرف عام میں ان پر حدیث کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔ جیسے جمعہ کی پہلی اذان اور باجماعت ۲۰ رکعت تراویح سنت ہیں۔ پس وہ احادیث شریفہ جو معمول بہا ہیں مادۂ اجتماع ہیں: وہ حدیث بھی ہیں اور سنت بھی اور حدیث الماءُ من الماء پہلا مادۂ افتراق ہے: وہ حدیث ہے، سنت نہیں، کیونکہ وہ منسوخ ہے۔ اور جمعہ کی پہلی اذان دوسرا مادۂ افتراق ہے: وہ سنت ہے، حدیث نہیں، کیونکہ یہ طریقہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چلایا ہے، اور اس کو تمام صحابہ نے قبول کیا ہے۔

احادیث میں سنت کو مضبوط پکڑنے کی تاکید آئی ہے، اور کتاب وسنت کے ساتھ ہدایت کے وابستہ ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ ارشاد ہے: من تمسّك بسنتي عند فساد أمتي، فله أجر مائة شهيد (مشکوۃ حدیث ۱۷۶) اور ارشاد ہے: تركتُ فيكم أمرين لن تضلُّوا ما تمسّكتم بهما: كتابَ الله، وسنة رسوله (مشکوۃ حدیث ۱۸۶) اور احادیث کو یاد کرنے کی اور منتقل کرنے کی فضیلت آئی ہے۔ پس سوادِ اعظم أهل السنّة والجماعة ہیں، اہل حدیث نہیں ہیں۔

نوٹ: کتاب العلم کی روایات کی شرح بھی اسی عنوان کے تحت کی گئی ہے۔

تحریف سے دین کا تحفظ ضروری ہے

مبحث سادس کے اٹھارویں باب میں اس سلسلہ میں مفصل کلام گذر چکا ہے۔ اس وجہ سے شاہ صاحب نے یہاں مختصر کلام کیا ہے، بلکہ عبارت میں غایت درجہ ایجاز سے کام لیا ہے۔ ہم بھی یہاں مختصر ہی لکھتے ہیں۔

دین میں خلل واقع ہونے کی بے شمار راہیں ہیں۔ سب کا احاطہ ناممکن ہے۔ البتہ بڑے اسباب سات ہیں۔ جن کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے یہاں ان میں سے پانچ کا تذکرہ کیا ہے یعنی تہاون، تشدُّد، تعمق، خلط ملۃ بملۃ اور استحسان۔

پہلا سبب: تہاؤن ہے یعنی دین کی بے قدری کرنا اور دین کے معاملہ میں تساہل (لاپرواہی) برتنا۔ پھر تہاون کے بھی متعدد اسباب ہیں مبحث سادس کے باب ۱۸ میں تین سبب بیان کئے ہیں۔ یہاں ان میں سے سب سے بڑا سبب ذکر کرتے ہیں۔ اور وہ ہے سنت نبوی پر عمل پیرا نہ ہونا یعنی اس کو حجت شرعیہ تسلیم نہ کرنا۔ درج ذیل دو ارشادات اسی سلسلہ میں ہیں۔

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبی نہیں بھیجا، مگر اس کے لئے اس کی امت میں سے حواری (مددگار) اور اصحاب (ساتھی) ہوتے تھے۔ جو اس کا طریقہ اپناتے تھے۔ اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ناخلف پیدا ہوئے جو لوگوں سے وہ باتیں کہتے تھے جو خود نہیں کرتے تھے۔ اور وہ کام کرتے تھے جس کا وہ حکم نہیں دیئے گئے تھے (یہی تہاون فی الدین اور ترک سنت ہے) پس جو شخص ان سے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے۔ اور جو ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے (یعنی ان کو روکے) وہ بھی مؤمن ہے۔ اور جو شخص ان کے ساتھ اپنے دل سے جہاد کرے (یعنی ان کی حرکتوں کو برا جانے) وہ بھی مؤمن ہے۔ اور نہیں ہے اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر ایمان (کیونکہ اب وہ ان کی حرکتوں پر راضی ہوگا، جو ایمان کے منافی ہے) (رواہ مسلم، مشکوۃ، حدیث نمبر ۱۵۷)

حدیث ـــــ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''ہرگز نہ پاؤں میں تم میں سے کسی کو ٹیک لگائے ہوئے (یعنی تکبر سے بافراغت بیٹھے ہوئے) اپنے چھپر کھٹ پر، پہنچے اس کو میرے حکموں میں سے کوئی حکم. ان باتوں میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے، یا منع کیا ہے، پس کہے وہ کہ: میں نہیں جانتا! (کہ حدیث میں کیا ہے؟) جو بات ہم نے کتاب اللہ میں پائی ہے، ہم اس کی پیروی کرتے ہیں! (اس حدیث میں خبر دی گئی ہے کہ ایسے جاہل و متکبر لوگ ضرور پیدا ہوں گے جو حجیت حدیث کا انکار کریں گے۔ اور ان پر رد بھی کیا گیا ہے کہ حدیثیں بھی قرآن ہی کی طرح حجت ہیں) (مشکوۃ حدیث نمبر ۱۶۳)

غرض رسول اللہ ﷺ نے سنت کو مضبوط پکڑنے کی بے حد ترغیب دی ہے۔ خاص طور پر جب لوگوں میں اس کی حجیت میں اختلاف رونما ہو۔

دوسرا سبب: تشدد ہے یعنی دین کے معاملہ میں اپنے اوپر سختی برتنا اور ایسی شاق عبادتیں اختیار کرنا جن کا شارع نے حکم نہیں دیا۔ مثلاً ایسی سخت ریاضتیں اور مجاہدے کرنا جن کی نفس میں طاقت نہ ہو، اسی طرح مباح چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرنا وغیرہ۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''سختی نہ کرو اپنی جانوں پر، پس اللہ تعالیٰ سختی کریں گے تم پر۔ پس بیشک ایک قوم نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے

ان پر سختی کی، پس یہ ان کے باقی ماندہ لوگ ہیں راہبوں کی کٹیوں میں اور خانقاہوں میں (اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں)
انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کرلیا تھا، ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا'' (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ حدیث ۱۸۱)

اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے اپنے اوپر ہمیشہ روزہ رکھنا اور رات بھر نماز پڑھنا لازم کیا تھا تو آپ ﷺ نے سختی سے ان کو منع کیا تھا (مشکوۃ، کتاب الصوم، باب صیام التطوع حدیث ۲۰۵۴)

اور متفق علیہ روایت میں یہ بھی ہے کہ تین حضرات ازواج مطہرات کے پاس آئے اور آپ ﷺ کی رات کی عبادت دریافت کی۔ ازواج نے بتائی، تو انھوں نے اس کو کم سمجھا اور یہ کہا کہ ہماری آنحضور سے کیا نسبت؟! آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیے گئے ہیں! پھر ایک صاحب نے عہد کیا کہ وہ رات بھر نفلیں پڑھیں گے۔ دوسرے نے ہمیشہ روزہ رکھنے کا عہد کیا۔ اور تیسرے صاحب نے بیوی سے بے تعلق ہوجانے کا عزم کیا۔ آپ ﷺ نے ان حضرات کو نہایت سختی سے منع کیا (مشکوۃ، حدیث ۱۴۵)

تیسرا سبب: تعمق یعنی دین میں غلو کرنا ہے۔ آپ ﷺ کے درج ذیل ارشادات اسی سلسلہ میں ہیں.

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا. رسول اللہ ﷺ نے بیان جواز کے لئے ایک کام کیا۔ تاہم کچھ لوگوں نے اس سے پرہیز کیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس کی خبر ہوئی، تو آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا:

''کیا حال ہے ان لوگوں کا جو اس چیز سے پرہیز کرتے ہیں جس کو میں کرتا ہوں؟! پس قسم بخدا! میں ان میں سب سے زیادہ اللہ (کی مرضی اور نامرضی) کو جانتا ہوں۔ اور ان میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۳۶)

حدیث ـــــ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''نہیں گمراہ ہوتی کوئی قوم ایسی ہدایت کے بعد جو ان کو حاصل تھی مگر دیئے جاتے ہیں وہ جھگڑا (دین میں یہی جھگڑا تعمق ہے)(مشکوۃ حدیث نمبر ۱۸۰)

حدیث ـــــ آنحضرت ﷺ نے کھجوروں کی تلقیح کے مسئلہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ''تم اپنے دنیوی معاملات بہتر جانتے ہو'' امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے. ''ان باتوں کا امتثال ضروری ہے جو آپ نے حکم شرعی کے طور پر بیان فرمائی ہیں اور جو باتیں معیشت سے متعلق ہیں اور ان کے بارے میں آپ نے کوئی بات اپنی رائے سے ارشاد فرمائی ہے اس کا امتثال واجب نہیں'' پس ایسے ارشادات کا امتثال بھی ضروری قرار دینا تعمق فی الدین ہے۔ جو تحریف کا باعث بنتا ہے (مسلم شریف ۱۵ ۱۱۸ مصری، کتاب الفضائل)

چوتھا سبب: ایک ملت کو دوسری ملت کے ساتھ خلط ملط کرنا۔ جیسے آج بہت سی ہندوانی رسوم مسلمانوں میں در آئی ہیں اور مسلمان ان کو دین سمجھ کر اپنائے ہوئے ہیں۔ درج ذیل ارشادات اسی سلسلہ کے ہیں:

حدیث ـــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: یہود کی بعض

باتیں ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔آپؐ کی کیا رائے ہے: ہم ان کو لکھ لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا:

''کیا تم یہود و نصاریٰ کی طرح دین کے معاملہ میں حیرت کا شکار ہو؟ بخدا! میں تمہارے پاس ایک روشن صاف ستھرا دین لایا ہوں۔اگر آج موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ تھا'' (مشکوۃ،حدیث ۱۷۷)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو مبغوض ترین آدمی قرار دیا ہے جو اسلام میں جاہلیت کے طریقے رائج کرنا چاہتا ہے (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۴۲)

پانچواں سبب: استحسان ہے یعنی کسی چیز کو بغیر دلیل شرعی کے اچھا سمجھ کر اپنا لینا۔جیسے میلاد مروجہ اور عرس وغیرہ۔

آپؐ کا درج ذیل ارشاد اسی سلسلہ میں ہے:

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات پیدا کی، جو اس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے'' یعنی جس نے اپنی پسند سے دین میں کوئی ایسی بات بڑھائی جس کی کتاب وسنت سے کوئی سند نہیں نہ ظاہر نہ خفی، نہ لفظی نہ مستنبط، تو وہ مردود ہے (متفق علیہ مشکوۃ حدیث نمبر ۱۴۰)

﴿من أبواب الاعتصام بالكتاب والسنّة﴾

قد حذّرنا النبيُّ صلى الله عليه وسلم مداخلَ التحريف بأقسامها، وغلّط النهي عنها، وأخذَ العهود من أمته فيها، فمن أعظم أسباب التهاون: تركُ السنة، وفيه قوله صلى الله عليه وسلم: "ما من نبي بعثه اللّٰه في أمته قبلي، إلا كان له من أمته حواريون وأصحابٌ يأخذون بسنته،ويقتدون بأمره، ثم إنها تخلُفُ من بعدهم خُلوفٌ: يقولون مالايفعلون، ويفعلون مالايؤمرون؛ فمن جاهَدَهم بيده فهو مؤمن، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن، ومن جاهدهم بقلبه فهو مؤمن، وليس وراءَ ذلك من الإيمان حَبَّةُ خردلٍ"

وقوله صلى الله عليه وسلم:" لا أُلفينّ أحدكم مُتكئا على أريكته، يأتيه الأمرُ من أمري، مما أمرتُ به، أو نهيتُ عنه، فيقول: لا أدري! ماوجدناه في كتاب اللّٰه اتبعناه"

ورغّب في الأخذ بالسنة جدًا، لاسيما عند اختلافْ الناس.

وفي التشدُّد: قوله صلى الله عليه وسلم:" لاتُشدِّدوا على أنفسكم، فيُشَدِّد اللّٰه عليكم" وردُّه على عبد الله بن عمرٍو، والرهطِ الذين تقالُّوا عبادة النبي صلى الله عليه وسلم، وأرادوا شاقّ الطاعات.

وفی التعمُّق : قولـه صلی الله علیه وسلم:" ما بالُ أقوامٍ یتنزَّهون عن الشیئ أصنعُه؟ فو اللّٰه إنـی لأعـلـمُهـم بـاللّٰه، وأشدُّهم خشیةً للّٰه" وقوله صلی الله علیه وسلم:"ما ضلّ قومٌ بعد هدیً کانوا علیه، إلا أُوتوا الجدل" وقوله صلی الله علیه وسلم:" أنتم أعلمُ بأمور دنیاکم"

وفی الخلط : قولـه صلی الله علیه وسلم لمن أراد الخوض فی علم الیهود:" أمتهوّکون أنتم کما تهوّکت الیهود والنصاری؟! لقد جئتُکم بها بیضاء نقیّةً، ولو کان موسی حیًّا لما وسعه إلا اتّباعی" وجعلُه صلی الله علیه وسلم من أبغض الناس مَن هو مُبتَغٍ فی الإسلام سنة الجاهلیة.

وفی الاستحسان: قوله صلی الله علیه وسلم:" من أحدث فی أمرنا هذا مالیس منه فهو رَدٌّ"

ترجمہ: کتاب وسنت کو مضبوط پکڑنے کے سلسلہ کی روایات: تحقیق ڈرایا ہے ہمیں نبی ﷺ نے تحریف دین کی تمام راہوں سے۔ اور سخت کیا ہے ممانعت کو ان (راہوں) سے۔ اور عہد و پیمان لیا ہے آپ نے اپنی امت سے ان کے بارے میں۔ (تحریف کا پہلا سبب تہاون ہے) پس تہاون کے اسباب میں سے بڑا سبب: سنت نبوی کو چھوڑنا ہے۔ اور اس سلسلہ میں آپ کا یہ ارشاد ہے: ''نہیں ہے کوئی نبی الخ'' اور آپ کا ارشاد ہے: ''ہرگز نہ پاؤں میں الخ اور بے حد ترغیب دی ہے آپ نے سنت کو لینے کی، بالخصوص لوگوں کے اختلاف کے وقت۔ (اور دوسرا سبب تشدد ہے) اور تشدد کے سلسلہ میں آپ کا یہ ارشاد ہے: ''نہ سختی کرو تم الخ'' اور آپ کا رد فرمانا ہے عبداللہ بن عمرو پر اور اس جماعت پر جس نے کم سمجھا تھا نبی ﷺ کی عبادت کو، اور ارادہ کیا تھا انھوں نے عبادات شاقہ کا۔

(اور تیسرا سبب تعمق ہے) اور تعمق کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے: ''ان لوگوں کا کیا حال ہے الخ'' اور آپ کا ارشاد ہے: ''نہیں گمراہ ہوئی الخ'' اور آپ کا ارشاد ہے کہ ''تم زیادہ جانتے ہو تمہارے دنیا کے معاملات''

(اور چوتھا سبب دو ملتوں کو خلط ملط کرنا ہے) اور خلط ملط کرنے کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے اس شخص سے جس نے یہود کے علوم میں گھسنے کا ارادہ کیا تھا: ''کیا حیران ہو تم الخ'' اور آپ کا گردانا ہے مبغوض ترین آدمی اس شخص کو جو اسلام میں جاہلیت کا طریقہ چاہنے والا ہے۔

(اور پانچواں سبب استحسان ہے) اور استحسان (پسندیدگی) کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے: ''جس نے نئی پیدا کی الخ''

لغات: تحذیر ڈرانا حذَر کا مفعول ثانی مِن کے بغیر بھی آتا ہے، جیسے یحذرکم اللّٰه نفسه اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتے ہیں... مداخل: راہیں۔ مدخل کی جمع ہے غَلَّظ: بھاری کرنا، گاڑھا کرنا۔ حواری: مددگار، مخصوص اصحاب... تَقالَّ الشیئ: کم گننا تهوّك: حیران ہونا۔ مُتهوّك: حیران۔

☆ ☆ ☆

اتباع نبوی کا وجوب اور محسوس مثال سے اس کی تفہیم

حدیث ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے خواب میں فرشتے آئے۔ اور ان کے بعض نے بعض سے کہا کہ ان حضرت جی کی کوئی مثال بیان کرو (یعنی ان کی حالت محسوس مثال کے ذریعہ سمجھاؤ) انھوں نے جواب دیا: آپ سو رہے ہیں (پس مثال بیان کرنے سے کیا فائدہ؟) پہلے فرشتوں نے کہا: آپ کی آنکھیں سو رہی ہیں، دل بیدار ہے (یعنی وہ سوتے ہوئے بھی ہماری باتیں محفوظ کریں گے) پس فرشتوں نے کہا. آپ کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے حویلی بنائی، اور اس میں ایک پُر تکلف دعوت سجائی، اور ایک بلانے والے کو بھیجا۔ پس جس نے داعی کی بات مان لی، وہ حویلی میں آیا اور اس نے کھانا کھایا۔ اور جس نے اس کی بات قبول نہ کی، وہ نہ آیا اور نہ کھایا۔ پہلے فرشتوں نے کہا: مثال منطبق کرو تا کہ آپ سمجھیں۔ دوسرے فرشتوں نے کہا: آپ تو سو رہے ہیں! پہلے فرشتوں نے کہا: آپ کی آنکھیں سو رہی ہیں، دل بیدار ہے۔ پہلے فرشتوں نے کہا: حویلی جنت ہے اور داعی آپ ﷺ ہیں۔ پس جس نے آپ کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی۔ اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور آپ لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں (یعنی جنتیوں اور جہنمیوں کو جدا جدا کرنے والے ہیں) (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث نمبر ۱۴۴)

تشریح: فرشتوں نے آپ کی جو مثال بیان کی ہے اس کے دو مقصد ہیں:

پہلا مقصد: لوگ آپ کی فرمانبرداری کے مکلف ہیں۔ آپ کی اطاعت ہی اللہ تعالی کی اطاعت ہے، کیونکہ آپ اللہ کی طرف سے لوگوں کو جنت کی نعمتوں کی طرف بلانے والے ہیں پس حویلی میں وہی آئے گا جو آپ کی دعوت قبول کریگا۔

دوسرا مقصد: فرشتوں نے ایک معنوی حقیقت کو مثال دیکر محسوس بنا دیا ہے تا کہ بات پوری وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہو جائے۔

[۱] وَضَرَبَ الملائكةُ له صلى الله عليه وسلم" مثلَ رجلٍ بنى دارًا، وجعل فيها مأدُبَةً، وبعثَ داعيًا"

أقول: هذا إشارة إلى تكليف الناس به، وجعلُه كالأمر المحسوس، إكمالاً للتعليم.

ترجمہ: (۱) اور بیان کی فرشتوں نے آپ ﷺ کے لئے: "مثال اس شخص کی جس نے بنائی کوئی حویلی، اور اس میں ایک پُر تکلف دعوت رکھی، اور اس نے ایک بلانے والا بھیجا" میں کہتا ہوں یہ (مثال) اشارہ ہے لوگوں کو مکلف بنانے کی طرف آپ کو ماننے کا۔ اور اس (اطاعت) کو محسوس امر کی طرح بنانا ہے تا کہ تعلیم مکمل طور پر ہو۔

☆ ☆ ☆

کچھ اعمال فی نفسہ بھی موجبِ عذاب ہیں

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک آگ جلائی، پس جب روشن کر دیا آگ نے اپنے اردگرد کی چیزوں کو (یعنی وہ خوب جل گئی) تو پروانوں نے اور دوسرے کیڑوں نے اس میں گرنا شروع کیا۔ اور اُس آگ جلانے والے نے ان کو روکنا شروع کیا، مگر وہ اس پر غالب آتے رہے۔ اور وہ زبردستی آگ میں گھستے رہے۔ پس میں تمہاری کمریں پکڑ کر تم کو آگ سے بچاتا ہوں۔ اور تم زبردستی اس میں گھسے چلے جا رہے ہو! (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۴۹)

حدیث ـــــ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا. میری اور اس دین و شریعت کی مثال جس کے ساتھ اللہ نے مجھ کو مبعوث فرمایا ہے، بس اس شخص جیسی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا، پس اس نے کہا: اے میری قوم! میں نے دشمن کا لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے (جو تم پر حملہ کرنے کے لئے بڑھا چلا آ رہا ہے) اور میں ننگا ڈرانے والا ہوں، پس بچو! بچو!! پس اس کی بات مان لی اس کی قوم کی ایک جماعت نے پس وہ راتوں رات چل دیئے اور آہستگی کے ساتھ چلتے رہے، پس انھوں نے نجات پائی۔ اور ایک جماعت نے اس شخص کو جھٹلایا، پس وہ صبح تک وہیں رہے۔ پس شب خون مارا ان پر دشمن نے پس ان کو برباد کر دیا اور جڑ سے اکھاڑ دیا۔ پس یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے میری فرمانبرداری کی اور اس دین کی پیروی کی جس کو میں لایا ہوں۔ اور اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی اور اس برحق دین کو جھٹلایا جس کو میں لے کر آیا ہوں (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۴۸)

تشریح: ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نفس الامر میں کچھ اعمال ایسے بھی ہیں جو بعثت انبیاء سے پہلے بھی قابل مؤاخذہ ہیں۔ کیونکہ صورت حال یہ نہیں ہے کہ انبیاء لوگوں کو پکڑ پکڑ کر جہنم میں جھونک رہے ہیں یا وہ دشمن کو چڑھا لائے ہیں۔ لوگ تو خود ہی آگ میں گر رہے ہیں اور دشمن تو خود ہی چڑھا آ رہا ہے۔ انبیاء تو بچا رہے ہیں اور آگاہی دے رہے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ لوگوں کے اعمال و احوال بذات خود موجب ہلاکت ہیں۔ اور شریعت کا نزول اس نفس الامری حسن و قبح سے پردہ اٹھاتا ہے، کچھ ان میں حسن و قبح پیدا نہیں کرتا۔ مگر چونکہ نفس الامری حسن و قبح کا ادراک مشکل ہے اس لئے جزاء و سزا کو نزول شرع پر موقوف رکھا گیا ہے۔ البتہ جن اعمال کا حسن و قبح مُدرک بالعقل ہے ان پر مؤاخذہ بعثت انبیاء سے پہلے بھی ہوگا۔ یہ بحث کتاب کے مقدمہ میں، جہاں یہ مسئلہ آیا ہے کہ اعمال کا حسن و قبح عقلی ہے یا شرعی؟ تفصیل سے گذر چکی ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " مثلي كمثل رجل استوقد نارًا" الحديث، وقوله صلى الله عليه وسلم: " إنما مثلي ومَثَلُ ما بعثني الله به كمثل رجل أتى قومًا، فقال: يا قوم! أني رأيتُ الجيش بعينيَّ"

الحديث، دليلٌ ظاهر على أن هنالك أعمالاً تستوجب فی أنفسها عذاباً قبل البعثة.

ترجمہ: (۲) آپ ﷺ کا ارشاد: ''میری مثال اس آدمی کی سی ہے جس نے آگ روشن کی'' آخر حدیث تک۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد: ''میری حالت اور اس ہدایت کی حالت جس کے ساتھ اللہ نے مجھ کو بھیجا ہے اس آدمی کی سی ہے جو کسی قوم'' آخر حدیث تک (یہ دونوں ارشادات) اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ وہاں کچھ اعمال ایسے بھی ہیں جو واجب ولازم جانتے ہیں فی نفسہ عذاب کو بعثت سے پہلے (پہلا قولہ مبتدا ہے دوسرا اس پر معطوف ہے اور دلیل خبر ہے)

☆ ☆ ☆

آپؐ کے لائے ہوئے دین کے تعلق سے لوگوں کی تین قسمیں

حدیث ـــــ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا.

''اس علم وہدایت کی مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے تیز بارش کی سی ہے، جو زمین پر برسی تو زمین کی تین قسمیں ہوگئیں:

(۱) ـــــ زرخیز زمین۔ اس نے پانی اپنے اندر جذب کیا۔ پس گھاس اور بہت سبزہ اُگایا۔

(۲) ـــــ بنجر زمین۔ اس نے پانی روکا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس سے لوگوں کو نفع پہنچایا۔ لوگوں نے پیا، پلایا اور کھیتی کی۔

(۳) ـــــ زمین کی ایک اور قسم ہے جو چٹیل میدان ہے۔ اس نے نہ تو پانی روکا نہ گھاس اُگائی (سارا پانی بہ گیا)

پس یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے اللہ کا دین سمجھا اور اس کو اُس علم نے نفع پہنچایا جس کے ساتھ اللہ نے مجھ کو بھیجا ہے، پس اس نے سیکھا اور سکھلایا۔ اور مثال ہے اس شخص کی جس نے اس دین کی طرف سر ہی نہیں اٹھایا اور اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۱۵۰)

تشریح. اس حدیث میں غور طلب بات یہ ہے کہ مثال یعنی زمین کی تو تین قسمیں کی گئی ہیں، مگر ممثل لہ یعنی لوگوں کی دو ہی قسمیں بیان کی گئی ہیں، لوگوں کی تیسری قسم کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں مثال (زمین) کی طرح ممثل لہ (لوگوں) کی بھی تینوں قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ لوگوں کی پہلی قسم میں سے دو قسمیں نکلتی ہیں علماء اور عباد۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے لائے ہوئے علم وہدایت کے تعلق سے لوگوں کی اولاً دو قسمیں ہوتی ہیں: علماء (دین حاصل کرنے والے) اور جہلاء۔ پھر اول کی دو قسمیں ہیں: فقہاء اور عباد۔ فقہاء یعنی مجتہدین کی مثال پہلی قسم کی زمین ہے۔ اور عباد کی مثال دوسری قسم کی زمین ہے اور تیسری قسم کی زمین جہلاء یعنی کفار کی مثال ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اہل علم آپ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کو دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے قبول کریں گے:

پہلا طریقہ: صریح روایت کے ذریعہ یا دلالۃ روایت کے ذریعہ۔ دلالۃ روایت کا مطلب یہ ہے کہ وہ نصوص سے استنباط کریں گے اور لوگوں کو اپنی استنباط کی ہوئی باتیں بتلائیں گے تاکہ وہ ان کی پیروی کریں (اس کی مزید تفصیل مبحث سابع کے باب ثالث میں گذر چکی ہے)

دوسرا طریقہ: عباد یعنی دین کے جاننے والے شریعت پر عمل پیرا ہوں گے، اور ان کی سیرت سے لوگ راہ نمائی حاصل کریں گے۔ دوسری قسم کی زمین ان عباد و عاملین کی مثال ہے۔

اور لوگوں کی تیسری قسم جہلاء کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سرے سے دین قبول ہی نہیں کریں گے۔ زمین کی تیسری قسم ان لوگوں کی مثال ہے۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے لوگوں کی تین قسمیں جس طرح بیان فرمائی ہیں اس پر اشکال یہ ہے کہ عاملین وعباد کی مثال بنجر زمین کیسے ہوسکتی ہے؟ بنجر زمین تو خود پانی سے منتفع نہیں ہوتی، صرف دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اور یہ حضرات تو خود بھی دین سے منتفع ہوتے ہیں؟ اس لئے شارحین حدیث نے اور طرح سے لوگوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ مظاہر حق اور فتح الباری میں اس کی تفصیل ہے۔ راقم کا خیال یہ ہے کہ تیسری قسم کا تذکرہ چھوڑ دیا گیا ہے ان کو قابل ذکر نہیں سمجھا گیا۔ جیسے یوم السبت میں مچھلی کا شکار کرنے والوں کے قصہ میں بیان جزاء کے وقت ایک قسم کا تذکرہ بالقصد چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ تیسری قسم عالم غیر عامل کی ہے جس نے علم دین سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا، مگر خود منتفع نہ ہوا۔ اللہ ایسا عالم ہونے سے ہماری حفاظت فرمائیں (آمین)

[۳] وقوله صلى الله عليه وسلم: "مَثَلُ ما بعثني الله به من الهدى والعلم كمثل الغيث الكثير، أصاب أرضًا" الحديث.

فيه: بيانُ قبولِ أهل العلم هدايته صلى الله عليه وسلم بأحد وجهَيْن: الروايةِ صريحًا والروايةِ دلالةً: بأن استنبطُوا وأخبروا بالمستنبطات، أو عملوا بالشرع، فاهتدى الناس بهَدْيهم، وعدم قبولِ أهل الجهل رأسًا.

ترجمہ: (۳) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "اس علم وہدایت کی مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بھیجا ہے الخ اس حدیث میں اہل علم کے قبول کرنے کا بیان ہے آپ کی (لائی ہوئی) ہدایت کو دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے: صریح روایت کے ذریعہ یا دلالۃ روایت کے ذریعہ: بایں طور کہ وہ استنباط کریں اور بتلائیں (لوگوں کو) اپنی

استنباط کی ہوئی باتیں (تا کہ لوگ اس پر عمل پیرا ہوں۔ یہی تقلید مجتہدین کی حقیقت ہے) یا شریعت پر عمل پیرا ہوں۔ پس لوگ ان کی سیرت سے راہ نمائی حاصل کریں اور (اس حدیث میں بیان ہے) جہلاء کے قبول نہ کرنے کا سرے سے۔

☆ ☆ ☆

خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کیوں ضروری ہے؟

حدیث ـــــ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ پس ہمیں نہایت مؤثر نصیحت کی جس سے آنکھیں بہ پڑیں، اور دل دہل گئے۔ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! گویا یہ رخصت کرنے والے کی نصیحت ہے (رخصت کرنے والا کوشش کرتا ہے کہ ہر ضروری بات کہہ ڈالے، کوئی بات رہ نہ جائے) پس آپ ہمیں وصیت فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی اور امیر کی اطاعت کرنے کی، اگرچہ وہ حبشی غلام ہو (یہ اطاعت میں مبالغہ ہے) پس بیشک شان یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا، وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا۔ پس لازم پکڑو تم میری سنت، اور (میرے) راہ یاب، ہدایت مآب خلفاء کی سنت۔ تھام و تم خلفاء کی سنت کو، اور دانتوں سے اُسے مضبوط پکڑو، اور بچو تم نئی باتوں سے، پس بیشک ہر نئی بات بدعت ہے، اور جو بدعت ہے وہ گمراہی ہے'' (رواہ احمد وابوداؤد، والترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ، حدیث نمبر ۱۶۵)

تشریح: کچھ لوگوں کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ سنت نبوی کی پیروی کی ضرورت تو واضح ہے۔ آپؐ کی سنتیں تو دین کا جزء ہیں۔ مگر خلفائے راشدین کے طریقوں کی پیروی کیوں ضروری ہے۔ وہ پیغمبر ہیں نہ ان کے ذریعہ اللہ نے دین بھیجا ہے؟ شاہ صاحب قدس سرہ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ دین تو بیشک وہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ نے بھیجا ہے۔ اس لئے دین کا نظم وانتظام تو طریقۂ نبوی کی پیروی ہی سے استوار ہوسکتا ہے۔ مگر دین کے لئے اقامتِ دین کا نظام بھی ضروری ہے، اور وہ بڑی حکومت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اور حکومت کبری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم نہیں ہوسکی تھی۔ وہ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء کے ہاتھوں سے قائم ہوئی۔ اور خلافت کبری کا نظم وانتظام خلفاء کی تابعداری پر موقوف ہے۔ وہ معیشت کی مفید تدبیروں کے سلسلہ میں، جہاد برپا کرنے کے بارے میں، اور اس کے مانند دیگر امور میں جو حکم اپنے اجتہاد سے دیں گے اس کی اطاعت ضروری ہے، اس کے بغیر خلافت کبری کا نظام استوار نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ شرط ہے کہ وہ کوئی نیا حکم شرعی نافذ نہ کریں، کیونکہ غیر نبی کو اس کا اختیار نہیں، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا حکم کسی نص کے خلاف نہ ہو، کیونکہ کسی بھی مخلوق کی اطاعت احکام خداوندی کے برخلاف جائز نہیں۔ مگر معروف احکام میں خلفائے راشدین کی پیروی ضروری ہے، اس کے بغیر خلافت کبری کا نظام کیسے درست ہوسکتا ہے؟!

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم فى الموعظة البليغة: "فعليكم بسنتى وسنةِ الخلفاء الراشدين المَهْدِيِّيْنَ"

أقول: انتظامُ الدين يتوقف على اتباع سُنَنِ النبى وانتظامُ السياسة الكبرى يتوقف على الانقياد للخلفاء فيما يأمرونهم بالاجتهاد فى باب الارتفاقات، وإقامة الجهاد، وأمثالِ ذلك، مالم يكن إبداعا لشريعة، أو مخالفًا لنصّ.

ترجمہ: (۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پُر تاثیر وعظ میں: ''پس لازم پکڑو تم میرے طریقہ کو، اور راہ یاب ہدایت مآب خلفاء کے طریقہ کو''

میں کہتا ہوں: دین کا انتظام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی اتباع پر موقوف ہے۔ اور خلافت کبری کا انتظام خلفاء کی تابعداری پر موقوف ہے ان باتوں میں جن کا وہ لوگوں کو حکم دیں اپنے اجتہاد سے معیشت کی مفید تدبیروں اور جہاد برپا کرنے اور اس جیسے معاملات کے سلسلہ میں۔ جب تک نہ ہو وہ شریعت کی نئی ایجاد یا کسی نص کے خلاف۔

☆ ☆ ☆

فرقۂ ناجیہ اور فرقِ غیر ناجیہ کی تمثیل

حدیث ——— حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے ایک (سیدھا) خط کھینچا، پھر فرمایا کہ: ''یہ اللہ کا راستہ ہے'' پھر اس کے دائیں بائیں کئی خطوط کھینچے (سات خط چھوٹے اور ٹیڑھے دائیں طرف اور اسی طرح بائیں طرف کھینچے) اور فرمایا: ''یہ (دیگر) راہیں ہیں۔ ان میں سے ہر راہ پر شیطان ہے، جو اس راہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور آپ نے (سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۳) تلاوت فرمائی (اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں کہ) یہ میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے، سو اس کی پیروی کرو، اور دوسری راہوں کی پیروی مت کرو، کیونکہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی (مشکوۃ حدیث ۱۶۶)

تشریح: سب سے پہلے یہ بات واضح طور پر ذہن نشین کر لی جائے کہ اس حدیث میں فرقۂ ناجیہ اور فرق ضالہ کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ سیدھا راستہ اہل السنہ والجماعہ کا راستہ ہے، باقی اسلامی فرقوں کی راہیں کج ہیں۔ اور فرقۂ ناجیہ ہی عقائد کی بنیاد پر نجات اولی کا حقدار ہے۔ دیگر فرقے عقائد کی خرابی کی وجہ سے غیر ناجی ہیں۔ انہیں اس بنیاد پر بہر حال جہنم میں جانا ہے۔ سزایابی کے بعد ان کو نجات ملے گی۔ وہ مخلد فی النار نہیں ہیں۔ آیت کریمہ میں اسی صراط مستقیم پر گامزن رہنے اور دوسری راہوں سے بچنے کی ہدایت ہے۔ یہ حدیث اسلامی اور دیگر غیر اسلامی مذاہب کی تمثیل نہیں

ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اس حدیث کی تشریح میں جو فرقۂ ناجیہ اور دیگر فرق غیر ناجیہ کی تشخیص کی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ حدیث انہی کی تمثیل ہے۔

فرقۂ ناجیہ: وہ فرقہ ہے جو عقیدہ اور عمل دونوں ہی میں ظاہر کتاب وسنت کو اپنانے والا ہے یعنی قرآن وحدیث سے بہ ظاہر جو کچھ مفہوم ہوتا ہے اس کو لیتا ہے، بے جا تاویلات نہیں کرتا۔ اسی طرح عام طور پر صحابہ وتابعین جس راہ پر چلتے رہے ہیں اس کو اپناتا ہے۔ اور صحابۂ کرام، تابعین عظام اور مجتہدین عالی مقام میں جو باہم مسائل فرعیہ میں اختلافات ہوئے ہیں وہ مضر نہیں۔ کیونکہ یہ اختلافات ان مسائل میں ہوئے ہیں جن میں نص عام طور پر سامنے نہیں آئی، نہ ان مسائل میں صحابہ کا اجماع ہوا ہے۔ اور یہ اختلافات دو وجہ سے ہوئے ہیں:

(۱) ــــ کسی نص سے استدلال کرنے میں اختلاف ہوا ہے۔

(۲) ــــ یا کسی نص کے اجمال کی تفسیر میں اختلاف ہوا ہے۔

بہر حال یہ اختلافات مضر نہیں۔ کیونکہ یہ فروع (شاخوں) کے اختلافات ہیں۔ اصول (تنے) میں یہ سب حضرات متحد ہیں۔ اور اصل واحد (ایک تنے) سے جتنی بھی شاخیں پھوٹیں درخت ایک ہی رہتا ہے۔ متعدد درخت نہیں بن جاتے۔ البتہ اصول (تنے) مختلف ہو جائیں تو پھر درخت ایک نہیں رہے گا، متعدد ہو جائیں گے۔

ایک حدیث میں ان اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر گامزن ہونے والا نجات پانے والا ہے۔ وہ حدیث درج ذیل ہے:

حدیث ــــ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ضرور میری امت پر ایسا زمانہ آئے گا جیسا بنی اسرائیل پر آچکا ہے، جیسا کہ ایک چپل دوسرے چپل کے نمونہ پر کاٹا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ایسا شخص ہوا ہے جس نے اپنی ماں سے علانیہ بدفعلی کی ہے تو میری امت میں بھی ایسا شخص ضرور پیدا ہوگا۔ اور بیشک بنی اسرائیل بہتر گروہ ہو گئے، اور میری امت کے تہتر گروہ ہوں گے۔ وہ سب جہنم میں جائیں گے بجز ایک کے۔ صحابہ نے دریافت کیا: ''وہ ایک ناجی فرقہ کونسا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: **ما أنا علیه وأصحابی** (جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں) (رواہ الترمذی، مشکوۃ حدیث ۱۷۱)

ما أنا علیه میں سنت نبوی کی طرف اشارہ ہے (حدیثوں پر عمل کرنے والے اس کا مصداق نہیں ہیں) اور **أصحابی** سے اجماع امت مراد ہے، جس کا اعلیٰ فرد صحابہ کا اجماع ہے۔ یہی جماعت مؤمنین کی راہ ہے۔ جو اس سے برگشتہ ہے وہ جماعت حقہ کا فرد نہیں۔

قرآن کریم کی حجیت میں تو کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ احادیث اور اجماع کی حجیت میں اسلامی فرقوں نے اختلاف کیا ہے۔ حالانکہ سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ میں دونوں کی حجیت کا ایک ساتھ تذکرہ ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿ وَمَنْ يُّشَاقِقِ

الرَّسُوْلَ مِنْ بعْدِ ماتبَيَّن لَهُ الْهدى، ويَتَّبِعْ غيْرَ سبِيْلِ الْمُؤْمنِيْن، نُوَلِّهِ ماتوَلّى، ونُصْلِهِ جَهَنَّمَ، وَساءَتْ مصِيْرًا﴾ یعنی جوشخص رسول کی مخالفت کرتا ہے، اس کے بعد کہ اس کے لئے امرحق ظاہر ہو چکا (یعنی حدیث کی حجیت کا انکار کرتا ہے، حالانکہ رسول کا رسول ہونا ثابت ہو چکا، اور اللہ کے رسول کی باتیں حجت نہ ہوں گی تو پھر رسول بھیجنے کا فائدہ ہی کیا ہوگا) اور وہ مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہولیا (یعنی اجماع امت سے برگشتہ ہوگیا) تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے۔ اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور بری ہے وہ جگہ جانے کی!

اس آیت سے امام شافعی رحمہ اللہ نے اجماع کی حجیت پر استدلال کیا ہے۔ پس فرقۂ ناجیہ اہل السنہ والجماعہ ہے یعنی جو لوگ سنت نبوی کو اپناتے ہیں، احادیث نبویہ کو حجت مانتے ہیں اور جماعت مسلمین کی راہ پر چلتے ہیں یعنی اجماع امت کو حجت مانتے ہیں وہی اہل حق ہیں۔ اللّٰھم اجعلنا منھم!

فِرَق غیر ناجیہ: وہ گروہ ہیں جنھوں نے کوئی ایسا عقیدہ اپنایا ہے جو سلف کے عقیدے کے خلاف ہے۔ یا کوئی ایسا عمل اختیار کیا ہے جو جمہور صحابہ وتابعین کے عمل کے علاوہ ہے یعنی جس عمل پر امت کا اجماع ہے، اور وہ اجماع دور اول سے چلا آرہا ہے جیسے تراویح کی ۲۰ رکعتیں جو فرقہ اس کو قبول نہیں کرتا وہ گمراہ فرقہ ہے۔

[٥] خَطَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم خطًا، ثم قال: "هذا سبيل الله"، ثم خطَّ خطوطًا عن يمينه وعن شماله، وقال: "هذه سُبُلٌ، على كل سبيل منها شيطان، يدعو إليه" وقرأ: ﴿وَأَنَّ هذا صِراطِي مُسْتقِيمًا فاتَّبِعُوْه، ولاتتَّبِعُوا السُّبُلَ فتفرَّق بكُمْ عنْ سبِيْلِه﴾

أقول: الفرقة الناجية: هم الآخذون في العقيدة والعمل جميعًا بما ظهر من الكتاب والسنة، وجرى عليه جمهور الصحابة والتابعين، وإن اختلفوا فيما بينهم فيما لم يشتهِر فيه نصٌّ، ولاظهر من الصحابة اتفاقٌ عليه، استدلالاً منهم ببعض ما هنالك، أو تفسيرًا لمجمله؛ وغيرُ الناجية: كلُّ فرقةٍ انتحلتْ عقيدةً خلاف عقيدة السلف، أو عملاً دون أعمالهم.

ترجمہ: (۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے ایک (لمبا) خط کھینچا۔ پھر فرمایا: "یہ اللہ کا راستہ ہے" الخ۔

میں کہتا ہوں: نجات پانے والے لوگ وہ ہیں جو اپنانے والے ہیں عقیدہ اور عمل دونوں میں اس بات کو جو بہ ظاہر ثابت ہوتی ہے کتاب وسنت سے، اور چلے ہیں اس پر جمہور صحابہ وتابعین۔ اگرچہ وہ باہم مختلف ہوئے ہوں اس بات میں جس میں کوئی نص مشہور نہیں ہوئی۔ اور نہ صحابہ کا اس پر اتفاق ظاہر ہوا ہے (وہ حضرات مختلف ہوئے ہیں) استدلال کرتے ہوئے اپنی طرف سے بعض اُن باتوں میں جو وہاں ہیں (یعنی مسئلہ کے بارے میں جو قرائن ہیں، ان سے استدلال کرنے میں اختلاف ہوگیا ہے) یا کسی نص کے اجمال کی تفسیر کرتے ہوئے۔ اور نجات نہ پانے والے: ہر وہ

گروہ ہے جو منسوب ہوا ہے کسی ایسے عقیدے کی طرف جو سلف کے عقیدے کے خلاف ہے یا کسی ایسے عمل کی طرف جو ان کے عمل کے علاوہ ہے۔ (اِنتَحَلَ مذهب كذا: منسوب ہونا)

☆ ☆ ☆

مجدّدین کی ضرورت اور ان کے کارنامے

حدیث ——— آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''یہ امت گمراہی پر اکٹھا نہیں ہوگی'' ترمذی (۲۱۶۷) کی روایت میں ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ میری امت کو — یا فرمایا: محمدؐ کی امت کو — کسی گمراہی پر اکٹھا نہیں کریں گے۔ اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ اور جو (جماعت سے) علحدہ ہوا وہ جہنم میں جھونک دیا جائے گا'' (مشکوۃ حدیث ۱۷۳) اور مستدرک حاکم (۱۱۵.۱) میں ہے کہ: ''سوادِ اعظم کی پیروی کرو، پس جو شخص (سوادِ اعظم سے) علحدہ ہوا وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا (مشکوۃ حدیث ۱۷۴)

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک اللہ عزوجل بھیجیں گے اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر اس شخص کو جو امت کے لئے اس کے دین کی تجدید کرے گا[1]

اس حدیث کی شرح درج ذیل روایت کرتی ہے:

حدیث ——— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''اس علم کو لیں گے ہر آنے والی نسل کے نیک (ثقہ اور معتمد) لوگ۔ وہ اس علم سے دور کریں گے: حد سے بڑھنے والوں کی تحریف اور باطل پرستوں کا جھوٹ اور جاہلوں کی تاویل'' (مشکوۃ حدیث ۲۴۸)

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جب لوگوں نے اللہ کے دین میں اختلاف کیا۔ اور زمین میں بگاڑ پھیلایا۔ تو صورت حال نے تقاضا کیا اور اللہ تعالیٰ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اور آپؐ کی بعثت کے ذریعہ سابقہ ملت کی کجی کو درست کیا۔ اور اللہ کے دین کو تر و تازہ کر دیا۔

پھر جب آپؐ نے وفات پائی تو وہ عنایت الٰہی بعینہٖ آپ کے لائے ہوئے علم و ہدایت کی طرف متوجہ ہوئی۔ کیونکہ نبوت کا سلسلہ آپؐ پر منتہی ہو گیا تھا۔ اب ہدایت کی روشنی آپؐ کے دین کے بقاء پر موقوف تھی، اس لئے مصلحت خداوندی میں اس آخری دین کی حفاظت ضروری ہوئی۔ پس وہ مہر الٰہی امت کے دلوں میں الہامات اور دیگر تقریبات کا باعث بنی۔

غرض بارگاہ خداوندی میں فیصلہ ہو چکا ہے کہ ہدایت لوگوں میں قیامت تک برقرار رہے گی اس لئے ضروری ہوا کہ لوگوں میں لامحالہ ایک ایسی امت رہے جو دین کی حفاظت کرتی رہے اور یہ بھی ضروری ہوا کہ امت ساری گمراہی پر متفق

[1] رواہ ابوداؤد حدیث ۴۲۹۱ مستدرک ۴ ۵۲۲ فتح الباری ۱۳ ۲۹۵ ولم یتکلم فیه فهو عنده حسن ۱۲

نہ ہو جائے اور یہ بھی ضروری ہوا کہ قرآن کریم لوگوں میں ہمیشہ محفوظ رہے۔

ادھر صورت حال یہ ہے کہ جس طرح شاندار حویلی میں عرصۂ دراز گذرنے سے مکڑیاں جالے تنتی ہیں، گرد وغبار جمتی ہے، کہیں سے پلاستر اکھڑتا ہے اور رنگ وروغن (پینٹ) پھیکا پڑتا ہے یا اڑ جاتا ہے تو حویلی کی صفائی اور تزئین کاری ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگوں کی استعدادوں کے اختلاف نے کہ کوئی عالم ہے اور کوئی جاہل، واجب کیا کہ مدت مدید گزرنے پر لوگ اپنی طرف سے دین میں کچھ ایسی چیزیں شامل کر دیں جو دین میں سے نہیں ہیں۔ ایسے وقت میں لطف خداوندی ایسے رجال کار کو کھڑا کرتا ہے جو دین کی عمارت کی صفائی اور تزئین کاری کا کام کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوتے ہیں جن کی سربلندی کا قدرت فیصلہ کر چکی ہوتی ہے۔ یہی مجدد دین امت ہیں۔ یہ حضرات پہلے علم دین خوب محنت سے حاصل کرتے ہیں، پھر تین قسم کے کام کرتے ہیں:

پہلا کام: غالی (حد سے بڑھا ہوا شخص) دین میں جو تحریف کرتا ہے، یہ حضرات اس کو دور کرتے ہیں۔ جیسے غالی شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مانتے ہیں یا اماموں کو پیغمبروں کا درجہ دیتے ہیں۔ مجدد دین ایسے امور کی اصلاح کرتے ہیں۔ غرض تشدد اور تعمق کی راہ سے جو خرابیاں دین میں در آتی ہیں ان کو یہ حضرات دور کرتے ہیں۔

دوسرا کام: باطل پرستوں کے ادعاءات کی قلعی کھولتے ہیں، جیسے ملعون قادیانی کا دعوئے نبوت۔ غرض استحسان (جاہلوں کی پسندیدگی) اور دو ملتوں میں خلط ملط کرنے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کو یہ حضرات دور کرتے ہیں۔

تیسرا کام: جاہلوں کی غلط تاویلات سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ جیسے رضا خانیوں کا سورۃ المائدہ کی آیت ۱۵ سے استدلال کہ آنحضرت ﷺ نور تھے اور آپ کا سایہ نہیں تھا۔ حالانکہ آیت میں نور (ایک روشن چیز) سے مراد قرآن ہے، کیونکہ آگے یَھْدِی بِہٖ میں مفرد ضمیر آئی ہے اور مسند احمد (۳۳۸۰۶) کی روایت سے آپ کا سایہ ہونا ثابت ہے۔ غرض تہاون کی راہ سے اور ضعیف تاویلات کی بنیاد پر مامور بہ کو ترک کرنے کی وجہ سے دین میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، مجددین ان کو بھی دور کرتے ہیں۔

[٦] قوله صلى الله عليه وسلم: " لا تجتمع هذه الأمةُ على الضلالة" وقوله صلى الله عليه وسلم: "يبعث الله لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدِّد لها دينها" وتفسيره في حديث آخر: "يَحْملُ هذا العلمَ من كل خَلَفٍ عُدولُه، ينْفُوْنَ عنه تحريفَ الغالين، وانتحال المبطلين، وتأويلَ الجاهلين"

اعلم أن الناس لما اختلفوا في الدين، وأفسدوا في الأرض: قرع ذلك بابَ جودِ الحق، فبعث محمدًا صلى الله عليه وسلم، وأراد بذلك إقامة الملة العوجاء، ثم لما توفى النبي صلى الله عليه وسلم صارت تلك العنايةُ بعينها متوجهةً إلى حفظِ علمِه ورُشدِه فيما بينهم، فأورثت فيهم إلهاماتٍ وتقرباتٍ.

ففي حظيرة القدس داعية لإقامة الهداية فيهم مالم تقم الساعة، فوجب لذلك أن يكون فيهم لا محالة أمةٌ قائمة بأمر الله، وأن لا يجتمعوا على الضلالة بأسرهم، وأن يُحفظ القرآنُ فيهم.

وأوجب اختلافُ استعدادهم: أن يَلحق بماعندهم مع ذلك شيئ من التغير، فانتظرتِ العنايةُ لناسٍ مستعدين، قُضي لهم بالتنويه، فأورثت في قلوبهم الرغبة في العلم، ونَفْيِ تحريف الغالين، وهو إشارة إلى التشدُّد والتعمُّق، وانتحال المبطلين، وهو إشارة إلى الاستحسان، وخَلْطِ ملةٍ بملة، وتأويل الجاهلين، وهو إشارة إلى التهاون، وترك المأمور به بتأويل ضعيف.

ترجمہ:(۶) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نہیں اکٹھا ہوگی یہ امت گمراہی پر'' اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بھیجیں گے اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر (یعنی سو سال پورے ہونے پر) اس شخص کو جو نیا کرے گا امت کے لئے اس کے دین کو'' اور اس کی تفسیر ایک دوسری حدیث میں ہے: ''اٹھائیں گے اس علم کو ہر مابعد نسل میں سے اس کے معتبر لوگ، دور کریں گے وہ اس سے غالی لوگوں کی تحریفات کو، اور باطل پرستوں کے ادّعاءات کو، اور جاہلوں کی تاویلات کو''

جان لیں کہ جب لوگوں نے دین میں اختلاف کیا۔ اور زمین میں فساد پھیلایا، تو اس چیز نے دستک دی جود الٰہی کے دروازے پر، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اور اس بعثت سے ارادہ فرمایا کج ملت کو سیدھا کرنے کا۔ پھر جب آنحضرت ﷺ نے وفات پائی تو ہوگئی وہ مہربانی بعینہٖ متوجہ ہونے والی آپؐ کے علم کی اور آپ کی ہدایت کی لوگوں میں حفاظت کی طرف، پس پیچھے لائی وہ مہربانی لوگوں میں الہامات کو اور تقریبات کو۔

پس بارگاہ خداوندی میں ایک ارادہ ہے ہدایت کو برقرار رکھنے کا لوگوں میں قیامت کے دن تک۔ پس بایں وجہ ضروری ہوا کہ ہو لوگوں میں لامحالہ ایک ایسی امت جو اللہ کے دین کی حفاظت کرنے والی ہو، اور یہ کہ نہ اکٹھا ہوں وہ سارے کے سارے گمراہی پر، اور یہ کہ محفوظ رکھا جائے ان میں قرآن۔

اور لوگوں کی استعداد کے اختلاف نے واجب کیا کہ مل جائے اس دین کے ساتھ جو ان کے پاس ہے، اس کے ساتھ کچھ تبدیلی۔ پس مہر خداوندی نے انتظار کیا کچھ مستعد لوگوں کا، جن کے لئے سربلندی کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ پس پیچھے لائی وہ مہر خداوندی ان کے دلوں میں علم کی رغبت کو، اور غالی لوگوں کی تحریف کے دور کرنے کو، اور وہ اشارہ ہے تشدد وتعمق کی طرف۔ اور باطل پرستوں کے ادّعاءات کے دور کرنے کو، اور وہ اشارہ ہے استحسان اور ایک ملت کو دوسری ملت کے ساتھ خلط کرنے کی طرف۔ اور جاہلوں کی تاویلات کے دور کرنے کو، اور وہ اشارہ ہے تہاون کی طرف اور مامور بہ کو چھوڑنے کی طرف ضعیف تاویل کے ذریعہ (تفصیل کے لئے دیکھیں مبحث سادس کا باب ۱۸)

☆ ☆ ☆

علماء انبیاء کے وارث ہیں

حدیث ـــــ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر چاہتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ، کتاب العلم، حدیث ۲۰۰)

حدیث ـــــ ایک طویل حدیث میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بیشک علماء انبیاء کے وارث (جانشین) ہیں۔ اور انبیاء نے دینار و درہم کا ورثہ نہیں چھوڑا، انھوں نے علم ہی کا ورثہ چھوڑا ہے۔ پس جس نے وہ علم حاصل کیا اس نے کامل حصہ لیا'' (مشکوٰۃ، حدیث ۲۱۲)

حدیث ـــــ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عابد و عالم: دو شخصوں کا تذکرہ کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''عالم کی عابد پر برتری ایسی ہے جیسی میری تم میں سے ایک معمولی آدمی پر برتری!'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۳)

اور اس قسم کی اور روایتیں بھی ہیں۔ جیسے ایک ضعیف حدیث ہے: **فقيهٌ واحدٌ أشدُّ على الشيطان من ألف عابد** :ایک فقیہ (مسائل کا ماہر) شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ اور ایک دوسری مرسل روایت میں ہے کہ: ''جس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ علم دین حاصل کر رہا ہو تا کہ اس کے ذریعہ اسلام کو زندہ کرے، تو اس کے اور نبیوں کے درمیان جنت میں ایک درجہ (کا فرق) ہوگا'' (رواہ الدارمی، مشکوٰۃ حدیث ۲۴۹) اور اس قسم کی اور بھی حدیثیں ہیں، جن میں علماء کا مقام و مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔

تشریح: علماء کا یہ مقام و مرتبہ اس لئے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی ہستی کو نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں، اور اس سے مخلوق کی ہدایت کا کام لیتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نوازشیں ہوں۔ اور فرشتے مامور ہوں کہ وہ اس ہستی سے محبت کریں اور اس کی عظمت کا دم بھریں۔ پہلے مبحث اول کے باب سوم میں یہ روایت بیان کی جا چکی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اس سے محبت کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ پھر زمین میں اس کی مقبولیت رکھی جاتی ہے۔

پھر جب نبی اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں، تو وہ نوازشیں جو نبی کے ساتھ مخصوص تھیں حاملین علوم نبوت، ناقلین شریعت اور ناشرینِ دین پر مبذول ہوتی ہیں، اس لحاظ سے کہ وہ نبی کی ملت کے محافظ ہیں۔ اس طرح علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو بے شمار فوائد و برکات سے نوازتے ہیں۔

[۷] قوله صلى الله عليه وسلم: "من يُرِدِ اللّٰهُ به خيرًا يُفَقِّهْهُ فى الدين" وقوله صلى الله عليه وسلم: "إن العلماءَ وَرَثَةُ الأنبياء" وقوله صلى الله عليه وسلم: "فضل العالم على العابد كفضلى على أدناكم" وأمثالُ ذلك.

اعلم أن العناية الإلٰهية إذا حلّت بشخص، وصيّره اللّٰه مَظِنَّةً لتدبير إلٰهي لابد أن يصير مرحومًا، وأن تؤمر الملائكةُ بمحبته وتعظيمه لحديث مَحبة جبرائيل، ووضع القبول في الأرض.

ولما انتقل النبيُّ صلى الله عليه وسلم نزلت العناية الخاصَّةُ به بحَسَب حفظ ملته إلى حملةِ العلم، ورُواته، ومُشيعِيه، فأنتج فيهم فوائد لا تُحصى.

ترجمہ: (۷) آنحضرت ﷺ کے تین ارشادات۔ (جن کا ترجمہ اوپر آچکا ہے)

جان لیں کہ الطافِ خداوندی جب کسی شخص پر نازل ہوتے ہیں، اور اس کو اللہ تعالیٰ تدبیر الٰہی کی احتمالی جگہ بناتے ہیں، تو ضروری ہے کہ وہ مہربانی کیا ہوا ہو، اور یہ کہ فرشتے حکم دیئے جائیں اس سے محبت اور اس کی تعظیم کرنے کا محبت جبرئیل اور زمین میں قبولیت رکھنے کی حدیث کی وجہ سے۔

پھر جب نبی ﷺ (عالم بالا کی طرف) منتقل ہو گئے، تو اتری وہ عنایت جو آپؐ کے ساتھ خاص تھی، آپؐ کی ملت کی حفاظت کے لحاظ سے علم نبوت کے حاملین پر اور ناقلین علم پر اور اس علم کو پھیلانے والوں پر۔ پس پیدا کئے (اللہ نے) ان میں بے شمار فوائد۔

لغات: حَلَّ بالمکان: نازل ہونا، اترنا۔ مُشیعیہ: اسم فاعل جمع کا صیغہ ضمیر کی طرف مضاف ہے۔ **إشاعة:** پھیلانا۔ انتَح: برسانا کہا جاتا ہے انتَجت الریح السحاب: بارش برسانا۔

☆ ☆ ☆

محدثین کے لئے تروتازگی کی دعا

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تازہ رکھیں اس بندے کو (یعنی قدر و منزلت بڑھائیں۔ اور اس کو بہت خوشی حاصل ہو) جس نے میری بات سنی، پس اس کو یاد کیا اور اس کو محفوظ کیا، اور (دوسروں تک) پہنچایا۔ پس بعضے حاملین فقہ فقیہ نہیں ہوتے اور بعضے حاملین فقہ اس شخص کو پہنچاتے ہیں جو اس سے بڑا فقیہ ہوتا ہے'' (یعنی بعض حدیث کو یاد کرنے والے فقیہ نہیں ہوتے یا فقیہ ہوتے ہیں مگر جس کو وہ پہنچاتے ہیں وہ زیادہ سمجھ رکھتا ہے، پس چاہئے کہ حدیث بعینہٖ پہنچائے تا کہ آگے والا اس سے مسائل مستنبط کرے) (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۲۸ و ۲۳۰)

تشریح: علماء یعنی حاملین و ناقلین و ناشرین علوم نبوت تو انبیاء کے جانشین ہیں۔ ان کا مقام و مرتبہ تو بہت بلند ہے۔ ان کے بعد درجہ اُن محدثین کرام کا ہے جو فقیہ نہیں ہیں۔ ان کو بھی رسول اللہ ﷺ نے شادابی کی دعا دی ہے۔ یہ

فضیلت ان کو بایں وجہ حاصل ہوئی ہے کہ وہ بھی کسی درجہ میں ہدایت نبوی کو مخلوق تک پہنچانے والے ہیں۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " نضَّرَ اللّٰه عبدًا سمع مقالتى، فحفظها ووَعاها، وأدّاها كما سمعها"
أقول: سبب هذا الفضل أنه مظنّةٌ لحمل الهداية النبوية إلى الخلق.

ترجمہ: (۸) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''شاداب رکھیں الخ'' میں کہتا ہوں: اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ وہ (محدثین) احتمالی جگہ ہیں ہدایت نبوی کو مخلوق کی طرف اٹھانے کے لئے یعنی پہنچانے کے لئے۔

☆ ☆ ☆

حدیث میں کذب بیانی کبیرہ گناہ ہے

حدیث ——— حضرت عبداللہ بن عمر و رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے جان کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں ڈھونڈ لے!'' (مشکوۃ ۱۹۸)

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آخر زمانہ میں بڑے فریبی بڑے جھوٹے لوگ ہوں گے، جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے، جو نہ تم نے سنی ہوں گی، نہ تمہارے باپ دادوں نے۔ پس بچو تم اُن سے، اور بچاؤ ان کو اپنے سے۔ نہ گمراہ کردیں وہ تم کو اور نہ فتنہ میں ڈال دیں وہ تم کو'' (مشکوۃ حدیث ۱۵۴)

تشریح: حدیث میں کذب بیانی کبیرہ گناہ ہے۔ پہلی حدیث میں جو وعید ہے وہ اس حرکت کے کبیرہ گناہ ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد کی صدیوں تک دین کے پہنچنے کی راہ بس روایت ہی ہے۔ پس اگر روایات میں فساد در آئے گا تو دین کیسے محفوظ رہے گا؟! اس لئے روایت حدیث میں غایت درجہ احتیاط ضروری ہے۔ اور احتیاط کی دو صورتیں ہیں: (۱) راوی خود روایت حدیث میں بے احتیاطی نہ برتے۔ پورے تیقظ کے ساتھ روایت بیان کرے (۲) بر خود غلط قسم کے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ بلکہ ان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ دوسری روایت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

[۹] قوله صلى الله عليه وسلم: " من كذَب علىَّ متعمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأ مقعده من النار" وقوله صلى الله عليه وسلم: " يكون فى آخر الزمان دجّالون كذا بون"
أقول: لما كان طريقُ بلوغ الدين إلى الأعصار المتأخرة، إنما هى الرواية، وإذا دخل الفساد من جهة الرواية لم يكن له علاج ألبتة، كان الكذْبُ على النبى صلى الله عليه وسلم كبيرةً، ووجب الاحتياط فى الرواية، لئلا يُروى كِذْبًا.

ترجمہ: (۹) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات (جن کا ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: جب بعد کے زمانوں تک دین

کے پہنچنے کی راہ بس روایت ہی تھی، اور جب فساد داخل ہو روایت کی جہت سے، تو قطعی بات ہے کہ اس کے لئے کوئی علاج نہیں ہوگا (تو) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا کبیرہ گناہ ہوا، اور احتیاط واجب ہوئی روایت حدیث میں، تاکہ جھوٹ کے طور پر حدیث روایت نہ کی جائے۔

☆ ☆ ☆

اسرائیلی روایات کے احکام

حدیث ـــــ مذکورہ حدیث میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ''بنی اسرائیل سے باتیں نقل کرو، اس میں کوئی حرج نہیں''

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب عبرانی زبان میں تورات پڑھ کر، عربی میں مسلمانوں کے لئے تشریح کرتے تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''نہ سچا جانو اہل کتاب کو، اور نہ جھٹلاؤ ان کو، اور کہو ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس وحی پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے، اور اس پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب (علیہم السلام) اور اولاد یعقوب پر اتاری گئی ہے۔ اور اس پر جو موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) دیئے گئے ہیں، اور اس پر جو دیگر انبیاء دیئے گئے ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے۔ تفریق نہیں کرتے ہم ان میں سے کسی کے درمیان، اور ہم اللہ کے مطیع ہیں (سورۃ البقرہ آیت ۱۳۶) (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۱۵۵)

علاوہ ازیں وہ حدیث بھی اس موقع پر پڑھ لی جائے، جس میں آپؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ہے: ''کیا تم یہود و نصاریٰ کی طرح دین کے معاملہ میں حیرت کا شکار ہو؟ الخ

مسئلہ (۱) اہل کتاب سے کتاب وسنت کی تائید کے طور پر کوئی بات نقل کرنا درست ہے۔ بشرطیکہ اس بات کا اطمینان ہو کہ دین کے احکام میں خلط ملط نہ ہوگا۔ اور اس کے علاوہ دیگر باتیں نقل کرنا جائز نہیں۔ (بائبل سے باتیں نقل کرنے کا بھی یہی حکم ہے)

مسئلہ (۲) تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں جو اسرائیلیات ہیں، ان میں سے بیشتر علمائے اہل کتاب سے مروی ہیں، ان پر کسی حکم شرعی یا کسی اعتقاد کی بنیاد قائم کرنا جائز نہیں۔

نوٹ: الفوز الکبیر باب رابع کی فصل اول میں شاہ صاحب نے تفسیر میں اسرائیلی روایات نقل کرنے کو اسلام کے خلاف ایک سازش قرار دیا ہے جو دین میں در آئی ہے۔ دیکھئے الخیر الکثیر ص ۴۵۰

[۱۰] قوله صلى الله عليه وسلم: " حَدِّثوا عن بني إسرائيل، ولا حرج" وقوله صلى الله عليه وسلم: " لا تُصَدِّقوهم ولاتكذِّبوهم"

أقول: الرواية عن أهل الكتاب تجوز فيما سبيلُه سبيلُ الاعتبار، وحيث يكون الأمْنُ عن

الاختلاط فی شرائع الدین، ولا تجوز فیما سوی ذلك.

ومما ینبغی أن یُعلم أن غالب الإسرائیلیات المدسوسة فی کتب التفسیر والأخبار مقولةٌ عن أحبار أهل الکتاب، لا ینبغی أن یُبنی علیها حکمٌ واعتقادٌ، فتدبر.

ترجمہ: (۱۰) آپ کا ارشاد (جسکا ترجمہ اوپر آچکا) میں کہتا ہوں اہل کتاب سے روایت جائز ہے اُس چیز میں جس کی راہ استبار (تائید) کی راہ ہے، اور جہاں اطمینان ہو دین کے احکام میں غت ربود ہونے سے۔ اور جائز نہیں اس کے علاوہ میں۔

اور اُن باتوں میں سے جن کو جاننا مناسب ہے یہ ہے کہ اکثر اسرائیلیات جو تفسیر کی کتابوں میں اور تاریخ کی کتابوں میں ٹھونسی گئی ہیں، وہ علمائے اہل کتاب سے مروی ہیں، مناسب نہیں کہ ان پر مدار رکھا جائے کسی حکم شرعی کا یا کسی عقیدے کا۔ پس سوچ لے۔

☆ ☆ ☆

دنیوی اغراض کے لئے علم دین سیکھنا اور سکھانا حرام ہے

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کوئی علم سیکھا، اُن علوم میں سے جن کے ذریعہ اللہ کی رضا طلب کی جاتی ہے (یعنی دینی علم) نہیں سیکھتا ہے وہ اس کو مگر اس لئے کہ حاصل کرے اس کے ذریعہ دنیا کا سامان، تو وہ قیامت کے دن جنت کی مہک نہیں پائے گا'' یعنی اس کی بو (تک نہیں سونگھ سکے گا، جنت میں جانا تو درکنار!) (مشکوۃ حدیث ۲۲۷)

تشریح: دنیا کمانے کے لئے یعنی سرکاری عہدہ حاصل کرنے کے لئے: قاضی یا شیخ الاسلام بننے کے لئے یا پیٹ پالنے کے لئے دینی علم حاصل کرنا حرام ہے، حدیث میں اسی کا تذکرہ ہے۔

اسی طرح ایسے شخص کو جو علم دین کی تحصیل سے فاسد غرض رکھتا ہے، دین کی تعلیم دینا بھی چند وجوہ حرام ہے:

پہلی وجہ: ایسا شخص عام طور پر دین سیکھنے کے بعد دنیوی اغراض کے لئے ضعیف تاویلات کے ذریعہ دین میں تحریف کا مرتکب ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس ذریعہ ہی کا سدباب کردیا جائے۔

دوسری وجہ: ایسے شخص کو دین کی تعلیم دینا قرآن وحدیث کا احترام ملحوظ نہ رکھنا ہے، اور ان کے بارے میں لاپروائی برتنا ہے۔

نوٹ: سکھلانے کی حرمت کا اگرچہ حدیث میں صراحۃً تذکرہ نہیں، مگر اس کی حرمت بھی حدیث میں شامل ہے۔

[۱۱] قوله صلی الله علیه وسلم: " من تعلّم علمًا مما یُبتغی به وجهُ الله، لایتعلّمه إلا لِیُصیب به عَرَضًا من الدنیا لم یجد عرْف الجنة یوم القیامة" یعنی ریحَها.

أقول: يحرم طلبُ العلم الديني لأجل الدنيا، ويحرم تعليمُ من يَرَى فيه الغرض الفاسد لوجوهٍ:
منها: أن مثلَه لايخلو غالبًا من تحريف الدين لأغراض الدنيا بتأويل ضعيفٍ، فوجب سدُّ الذريعة.
ومنها: ترك حرمة القرآن والسنن، وعدمُ الاكتراث بها.

ترجمہ: (۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''جس نے سیکھا الخ'' میں کہتا ہوں: دنیا کے لئے دینی علم حاصل کرنا حرام ہے۔ اور اس شخص کو سکھلانا بھی حرام ہے جو اس میں فاسد غرض رکھتا ہے، بچند وجوہ: ان میں سے: یہ ہے کہ اس طرح کا آدمی عام طور پر خالی نہیں ہوتا دین کی تحریف سے، دنیا کمانے کے لئے، کمزور (یعنی باطل) تاویلات کے ذریعہ، پس ضروری ہوا سوراخ کا بند کرنا۔ اور ان میں سے: قرآن وحدیث کے احترام کو ملحوظ نہ رکھنا ہے۔ اور ان کی پروانہ کرنا ہے (اکترث للأمر. پروا کرنا کَرَثَ العمُّ فلانا: سخت غمگین کرنا)

☆ ☆ ☆

بوقت حاجت علم دین کو چھپانا حرام ہے

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے کوئی علمی (دینی) بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا ہے، پس اس نے اس کو چھپایا (یعنی نہ بتایا) تو وہ قیامت کے دن آگ کی لگام دیا جائے گا'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۳)

تشریح: حدیث شریف میں کتمان علم کی سزا آگ کی لگام بیان کی گئی ہے۔ دونوں باتوں کی وجہ درج ذیل ہے:

پہلی بات: بوقت حاجت علم دین کو چھپانا دو وجہ سے حرام ہے:

پہلی وجہ: یہ تہاون کا سرچشمہ ہے یعنی اشاعت دین سے لاپروائی ہے۔ ہر عالم دین کا فریضہ ہے کہ وہ تعلیم وتعلم کے ذریعہ اشاعت دین کا اہتمام کرے۔ ورنہ لوگ دین سیکھنے کا خیال ہی چھوڑ دیں گے، کیونکہ کوئی دین سکھلانے والا ہی نہیں ہوگا۔

دوسری وجہ: علم بیان کرنے سے محفوظ اور تازہ رہتا ہے۔ جو علم کو چھپاتا ہے وہ رفتہ رفتہ اس کو بھول جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مال جمع رکھنے سے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ اور جس طرح قرآن پاک کو بھول جانا بڑا وبال ہے، احکام شرعیہ کو بھول جانا بھی باعث خسران ہے۔

دوسری بات: اخروی جزاؤں کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ وہ جنس عمل سے ہوتی ہیں یعنی عمل اور اس کی جزاء میں مناسبت ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس شخص کا گناہ یہ ہے کہ اس نے حق کے اظہار سے زبان کو روکا ہے، اس لئے سزا بھی اسی قبیل سے دی جائے گی۔ لگام دینا منہ بند کرنے کا پیکر محسوس ہے، اس لئے آخرت میں کتمان علم کی یہ سزا تجویز کی گئی ہے۔

[۱۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " من سُئل عن علم عَلِمه، ثم كتمه، أُلجم يوم القيامة بلجام من النار"
أقول: يحرم كتمُ العلم عند الحاجة إليه، لأنه أصل التهاون، وسببُ نسيان الشرائع؛ وأَجْزِيةُ المعاد تُبنى على المناسبات، فلما كان الإثم كفَّ لسانه عن النطق، جوزى بشَبَح الكف، وهو اللجام من نار.

ترجمہ: (۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''جس سے کوئی علمی بات الخ'' میں کہتا ہوں: علم کا چھپانا حرام ہے اس کی حاجت کے وقت، اس لئے کہ وہ تہاون کی جڑ ہے اور احکام شرعیہ کو بھولنے کا سبب ہے۔ اور اُخروی جزائیں مناسبتوں پر مبنی ہیں۔ پس جب گناہ بولنے سے زبان کو روکنا تھا تو وہ سزا دیا گیا روکنے کے پیکر محسوس کے ذریعہ، اور وہ آگ کی لگام ہے۔

☆ ☆ ☆

فرض کفایہ علوم اور ان کی تعیین و تفصیل

حدیث ——— حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''علم تین ہیں: آیت محکمہ یا سنت قائمہ یا فریضۂ عادلہ، اور جو علوم ان کے سوا ہیں وہ فضل (زائد) ہیں (مشکوۃ حدیث ۲۳۹) (اس حدیث میں أَوْ تنویع کے لئے ہے)

تشریح: اس حدیث میں علم دین کے اُس درجہ کا بیان نہیں ہے جو فرض عین ہے۔ اس کا بیان **طلب العلم فريضة على كل مسلم** میں ہے۔ اس حدیث میں علم دین کے اس درجہ کا بیان ہے جو فرض کفایہ ہے۔ لفظ: فرض کفایہ کی تقدیر عبارت: فرض بقدرِ کفایہ ہے یعنی اتنے لوگوں پر اس علم کا جاننا ضروری ہے جن سے امت کی ہر طرح کی دینی ضرورت پوری ہو جائے۔

فرض کفایہ کے درجہ میں جو علوم ضروری ہیں وہ تین ہیں:

پہلا علم: قرآن کریم کا تفصیلی علم: یعنی وہ علوم جو نظم قرآنی سے متعلق ہیں، جیسے نحو و صرف، لغت و اشتقاق اور تجوید وغیرہ کا جاننا، اسی طرح قرآن کریم کی جو محکم آیات ہیں، جن پر دین و شریعت کا مدار ہے ان کو تفصیل سے جاننا۔ قرآن کریم کے مشکل کلمات کی وضاحت، آیات کا شان نزول، غامض باتوں کی توجیہ یعنی ان کو اس طرح پیش کرنا کہ اذہان قبول کر لیں اور کوئی اشکال باقی نہ رہے اور ناسخ و منسوخ آیات کو جاننا فرض کفایہ ہے ——— رہی وہ آیات جو از قبیل متشابہات ہیں، جیسے حروف مقطعات اور آیات صفات، تو ان کا حکم یہ ہے کہ ان کی مراد میں توقف کیا جائے یا محکم آیات کے ذریعہ ان کی مراد متعین کی جائے اگر یہ بات ممکن ہو۔

دوسرا علم: سنت قائمہ (معمول بہا احادیث) کا علم: یعنی ان روایات کو جاننا بھی فرض کفایہ کے درجہ میں ضروری

ہے جو احکام شرعیہ یا آداب اسلامی سے متعلق ہیں۔خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معیشت کی مفید تدبیروں سے۔ جن کا تفصلی بیان علم فقہ میں ہے ـــــ اور قائم (برقرار) کا مطلب یہ ہے کہ وہ روایات نہ تو منسوخ ہوں، نہ متروک، نہ شاذ اور وہ صحابہ وتابعین میں عام طور پر معمول بہا رہی ہوں۔

ان میں اعلی درجہ کی روایات وہ ہیں جو فقہائے مدینہ اور فقہائے کوفہ کے درمیان متفق علیہ ہیں۔اور اس کی علامت یہ ہے کہ ان مسائل پر چاروں فقہی مکاتب فکر متفق ہوں۔

اور اس کے بعد درجہ ان روایات کا ہے جن میں صحابۂ کرام میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ان کے دو یا تین قول ہیں، اور ہر قول پر کسی نہ کسی فقیہ کا عمل رہا ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ روایات موطا مالک، مصنف عبدالرزاق جیسی کتابوں میں موجود ہوں۔اس زمانہ تک جو روایتیں مخفی رہیں اور بعد کی کتابوں میں، جن میں رطب ویابس جمع کیا گیا ہے، لی گئیں ان کا اعتبار نہیں۔

یہی دو قسم کی روایتیں سنت قائمہ ہیں، ان کے علاوہ جو باتیں کتب حدیث میں ہیں، وہ بعض فقہائے متقدمین کی آراء ہیں، جو کسی حدیث کی تفسیر میں یا اس پر تفریع کرتے ہوئے یا کسی روایت سے استدلال کرتے ہوئے یا استنباط کے طور پر وجود میں آئی ہیں۔وہ باتیں سنت قائمہ میں شامل نہیں۔

تیسرا علم: فریضۂ عادلہ کا علم: فریضہ کے معنی ہیں: متعین کردہ بات فَرْضَ الأمر کے معنی ہیں: متعین کرنا۔شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ فریضۂ عادلہ سے مراد علم میراث میں ذوی الفروض کے حصص ہیں۔نیز قضاء وعدالت کے وہ مسائل بھی فریضۂ عادلہ میں شامل ہیں جن کے ذریعہ مسلمانوں کے باہمی نزاعات کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔اور راقم کے خیال میں معاملات کے سارے ہی مسائل فریضۂ عادلہ کا مصداق ہیں۔ان کی خصوصی اہمیت کی وجہ سے ان کو علحدہ ذکر کیا گیا ہے۔اور فریضہ کے ساتھ عادلہ کی قید یہ واضح کرنے کے لئے بڑھائی گئی ہے کہ معاملاتی مسائل کو بروئے کار لایا جائے گا تو معاشرہ عدل وانصاف کا گہوارہ بن جائے گا۔

غرض یہ تین علوم فرض کفایہ ہیں۔کسی بھی شہر کا ان علوم کے جاننے والے سے خالی ہونا حرام ہے۔کیونکہ دین کا دارومدار انہی علوم پر ہے۔اور ان کے ماسواء دیگر علوم فضل مزید ہیں، بشرطیکہ شرعاً ان کی تحصیل جائز ہو۔فضل کے معنی: فضول نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگ کم علمی سے ایسا خیال کرتے ہیں۔

[۱۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " العلم ثلاثة: آيةٌ محكمة، أو سنة قائمة، أو فريضة عادلة، وما كان سوى ذلك فهو فضلٌ"

أقول: هذا ضبطٌ وتحديدٌ لما يجب عليهم بالكفاية، فيجب:

[الف] معرفةُ القرآن لفظًا، ومعرفةُ محكمِه بالبحث عن شرح غريبه، وأسباب نزوله، وتوجيهِ

مُعْضَلِه، وناسخِه ومنسوخه، أما المتشابه: فحكمُه التوقفُ، أو الإرجاعُ إلى المحكم.

[ب] والسنة القائمة: ما ثبت في العبادات والارتفاقات من الشرائع والسنن، مما يشتمل عليه علمُ الفقه.

والقائمة: مالم يُنسخ، ولم يُهجر، ولم يَشُذَّ راويه، وجرى عليه جمهور الصحابة والتابعين.

أعلاها: ما اتفق فقهاءُ المدينة والكوفة عليه. وآيتُه: أن يتفق على ذلك المذاهبُ الأربعة.

ثم: ما كان فيه قولان لجمهور الصحابة، أو ثلاثة، كلُّ ذلك قد عمل به طائفة من أهل العلم. وآيةُ ذلك: أن تظهر في مثل الموطأ وجامع عبدِ الرزاق رواياتُهم.

وما سوى ذلك: فإنما هو استنباطُ بعض الفقهاء دون بعض: تفسيرًا وتخريجًا، أو استدلالاً واستنباطًا، وليس من القائمة.

[ت] والفريضة العادلة: الأنصباءُ للورثة، ويُلحق به أبوابُ القضاء، مما سبيلُه قطعُ المنازعة بين المسلمين بالعدل.

فهذه الثلاثة: يحرم خُلُوُّ البلد عن عالِمها، لتوقُّف الدين عليه، وما سوى ذلك من باب الفضل والزيادة.

ترجمہ: (۱۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''علم تین ہیں الخ'' میں کہتا ہوں: یہ منضبط کرنا ہے اور متعین کرنا ہے ان علوم کو جن کی تحصیل لوگوں پر واجب علی الکفایہ ہے۔ پس واجب ہے:

(الف) قرآن کو جاننا لفظوں کے اعتبار سے، اور اس کے محکم کو پہچاننا بحث کر کے اس کے نامانوس الفاظ کی تشریح سے، اور اس کے شان نزول کو، اور اس کے غامض کی توجیہ کو اور اس کے ناسخ ومنسوخ کو پہچاننا۔ رہا متشابہ (حصہ) پس اس کا حکم توقف کرنا ہے یا محکم کی طرف لوٹانا ہے۔

(ب) سنت قائمہ: وہ احکام شرعیہ اور سنن نبویہ ہیں جو ثابت ہوئی ہیں عبادتوں اور معیشت کی مفید تدبیروں میں، ان میں سے جس پر علم فقہ مشتمل ہے۔ اور قائمہ: وہ ہیں جو منسوخ نہیں کی گئیں۔ اور نہ چھوڑی گئیں ہیں، اور نہیں اکیلا ہوا اس کا راوی اور اس پر چلے ہیں جمہور صحابہ وتابعین۔

ان کا اعلیٰ درجہ: وہ ہے جس پر مدینہ اور کوفہ کے فقہاء متفق ہیں۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس پر چاروں مذاہب متفق ہوں۔

پھر: وہ ہیں جن میں جمہور صحابہ کے دو یا تین قول ہیں۔ ان میں سے ہر قول پر عمل کیا ہے اہل علم کی ایک جماعت نے۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ روایتیں سامنے آئی ہوں موطا مالک اور مصنف عبدالرزاق جیسی کتابوں میں۔

اوراس کے ماسواء: پس وہ بعض فقہاء کا استنباط ہے، نہ کہ بعض کا۔ تفسیر اور تخریج کے طور پر یا استدلال اور استنباط کے طور پر، اور نہیں ہیں وہ روایات سنتِ قائمہ میں سے۔

(ج) اور فریضۂ عادلہ: ورثاء کے حصص ہیں۔ اور لاحق کئے جائیں گے اس کے ساتھ قضاء کے مسائل، ان میں سے جن کی راہ انصاف کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان قطع منازعت کی راہ ہے۔

پس یہ تین علوم: حرام ہے کسی شہر کا خالی ہونا ان کے جاننے والے سے، دین ان پر موقوف ہونے کی وجہ سے۔ اور جو علوم ان کے علاوہ ہیں وہ فضل وزیادتی کے باب سے ہیں۔

☆ ☆ ☆

دین کو چیستان بنا کر پیش نہ کیا جائے

حدیث ـــــ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُغلوطات (مبہم باتوں) سے منع فرمایا

(رواہ ابوداؤد حدیث ۳۶۵۶ مشکوٰۃ حدیث ۲۴۳)

تشریح: اُغلوطات: وہ مبہم مسائل ہیں جن سے آدمی غلطی میں پڑ جائے۔ اور ان کے ذریعہ لوگوں کا امتحان لیا جائے۔ اردو میں ایسی باتیں چیستاں کہلاتی ہیں۔ اور دینی باتوں کو چیستان بنا کر بیان کرنا بچند وجوہ ممنوع ہے:

پہلی وجہ: مغالطہ دینے سے مسئول عنہ کو تکلیف پہنچتی ہے اور مسلم کی ایذا رسانی حرام ہے۔ اور اگر مخاطب سے جواب نہ بن پڑا تو وہ رسوا بھی ہوگا۔ یہ بھی ایذا رسانی ہے۔ نیز اس اندازِ بیان میں خود پسندی اور اپنی بڑائی کا اظہار بھی ہے، جو شرعاً پسندیدہ عمل نہیں۔

دوسری وجہ: یہ انداز بیان دین میں تعمق کا دروازہ کھولتا ہے۔ تعمق کی تفصیل مبحث سادس کے باب ۱۸ میں گذر چکی ہے۔ دین فہمی کا صحیح طریقہ وہی ہے جو صحابہ اور تابعین کا تھا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ:

(الف) ـــــ احادیث سے بظاہر جو کچھ مفہوم ہوتا ہے اس پر توقف کیا جائے یا زیادہ سے زیادہ جو بات بمنزلۂ ظاہر ہو اس کو لیا جائے۔ جو باتیں ایماء (مفہوم مخالف) یا اقتضاء النص یا فحوی (مفہوم موافق یعنی دلالت النص) سے سمجھی جاتی ہیں وہ بمنزلۂ ظاہر ہیں (ان تینوں کی تفصیل مبحث سابع کے باب خامس میں گذر چکی ہے) اس سے زیادہ گہرائی میں نہیں اترنا چاہئے۔

(ب) ـــــ جب تک واقعہ رونما نہ ہو اور حکم جاننے کی شدید مجبوری پیش نہ آئے اجتہاد میں نہیں گھسنا چاہئے۔ کیونکہ جب واقعہ رونما ہوتا ہے اور اس کا شرعی حکم جاننے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی عنایت سے جو ہمیشہ لوگوں کے حال پر مبذول رہتی ہے، اس سلسلہ میں علم کا دروازہ وا کرتے ہیں۔ اور یہ خیال کہ پہلے سے تیاری کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟ اس وجہ سے صحیح نہیں کہ قبل از وقت مسائل میں غور کرنے میں غلطی کا احتمال ہے۔ کیونکہ جس طرح الفاظ کا موضوع لہ جانے بغیر

الفاظ کو وضع نہیں کیا جاسکتا اسی طرح صورت واقعہ کو اچھی طرح سمجھے بغیر ان کے احکام بھی مرتب نہیں کئے جاسکتے۔

فائدہ: پیش آمدہ صورت کے ہر پہلو پر غور کر کے ان کے احکام مرتب کرنا، اس سے مختلف چیز ہے، یہ کام درست ہے بلکہ ضروری ہے۔ مثلاً جب تک ریل گاڑی نہیں چلی تھی یا ہوائی جہاز نہیں اڑا تھا۔ ان کے احکام کو مرتب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اور کوئی شخص یہ کوشش کرتا بھی تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا مگر اب ان کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے سب ممکنہ صورتوں کے احکام مرتب کرنا ضروری ہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ نے یہی کام کیا تھا۔ وہ ارأیتَ؟ سے واقعہ کا ایک پہلو ذکر کرتے تھے، پھر اس کا حکم بیان کرتے تھے۔

فائدہ: اختبار (ذہنی صلاحیت کا اندازہ کرنے) کے لئے یا ذہنی صلاحیت کی بالیدگی کے لئے کوئی مبہم سوال کرنا سنت سے ثابت ہے، وہ بھی مذکورہ ضابطہ سے مختلف چیز ہے۔ بخاری شریف، کتاب العلم، باب ۵ حدیث نمبر ۶۲ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ایک سوال کیا تھا کہ بتاؤ، وہ کونسا درخت ہے جس کے پتے کبھی نہیں جھڑتے اور وہ مؤمن کی مثال ہے؟ پھر جب کوئی جواب نہ دے سکا تو آپؐ نے خود ہی بتایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

[۱۴] ونَهَى صلى الله عليه وسلم عن الأُغلوطات: وهى المسائل التى يقع المسئولُ عنها فى الغَلَط، ويُمْتَحَنُ بها أذهانُ الناس؛ وإنما نَهى عنها لوجوه:

منها: أن فيها إيذاءً وإذلالاً للمسئول عنها، وعُجبا وبطرًا لنفسه.

ومنها: أنها تَفتح بابَ التعمُّق؛ وإنما الصوابُ: ماكان عند الصحابة والتابعين:

[الف] أن يُوقف على ظاهر السنة، وما هوبمنزلة الظاهر: من الإيماء، والاقتضاءِ، والفحوى، ولايُمعَن جدًا.

[ب] وأن لا يُقتَحَم فى الاجتهاد حتى يُضطر إليه، وتقعَ الحادثةُ، فإن الله يفتح عند ذلك العلمَ، عنايةً منه بالناس؛ وأما تهيئتُه من قبلُ فمظِنةُ الغَلَط.

ترجمہ: (۱۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مغالطے دینے سے منع فرمایا۔ اور مغالطے: وہ مسائل (مبہمہ) ہیں کہ مسئول عنہ غلطی میں پڑ جائے، اور ان کے ذریعہ لوگوں کی عقلوں کا امتحان لیا جائے۔ اور ان سے بچند وجوہ روکا گیا ہے:

ان میں سے: یہ ہے کہ اس میں مسئول عنہ کو ستانا اور سوا کرنا ہے۔ اور خود بینی اور اپنی ذات پر اترانا ہے۔

اور ان میں سے: یہ ہے کہ وہ باتیں تعمق کا دروازہ کھولتی ہیں۔ اور درست بات بس وہی ہے جو صحابہ اور تابعین کے پاس تھی کہ: (الف) ٹھہرا جائے ظاہر سنت پر اور اس پر جو بمنزلۂ ظاہر ہے یعنی ایماء اور اقتضاء اور فحوی۔ اور نہ گہرائی میں اترا جائے بہت زیادہ۔ (ب) اور یہ کہ نہ گھسا جائے اجتہاد میں۔ جب تک اس کی طرف سخت مجبور نہ ہو جائے اور جب

تک واقعہ پیش نہ آجائے۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ اس وقت علم کھولتے ہیں اپنی طرف سے لوگوں پر مہربانی کے طور پر ـــــ اور رہا اس کی تیاری کر لینا پہلے سے تو وہ غلطی کی احتمالی جگہ ہے۔

☆ ☆ ☆

تفسیر بالرائے حرام ہے، اور رائے کا مطلب

حدیث ـــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآن میں اپنی رائے سے بات کہی، پس چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے'' اور ایک روایت میں ہے: ''جس نے قرآن میں علم کے بغیر کہا پس چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں ڈھونڈھے''

حدیث ـــــ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا، پس اس نے درست کہا تو بھی یقیناً اس نے خطا کی'' (مشکوۃ حدیث نمبر ۲۳۴ و ۲۳۵)

تشریح: پہلی حدیث میں جو وعید ہے اس کے پیش نظر رائے سے تفسیر کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ تفسیر کرنے کے لئے سب سے پہلے عربی زبان کا کما حقہ علم ضروری ہے۔ نیز احادیث مرفوعہ اور صحابہ و تابعین کے آثار کا علم بھی ضروری ہے۔ خواہ ان کا تعلق مشکل الفاظ کی وضاحت سے ہو، یا شان نزول سے یا ناسخ و منسوخ سے۔ کیونکہ ان باتوں کے بغیر جو بھی شخص تفسیر کرے گا، وہ اپنی سمجھ سے کرے گا۔ اور قرآن کی تفسیر میں خود رائی حرام ہے (شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات پوری ہوئی)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ نے تحذیر الناس کے آخر میں عقل کی مثال دوربین اور خوردبین سے دی ہے۔ دوربین سے دور فاصلہ کی چیزیں قریب نظر آتی ہیں، اور خوردبین سے چھوٹی چیزیں بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح عقل بھی اذہان سے بعید اور دقیق باتوں کو واضح کرتی ہے۔ پس تفسیر قرآن میں عقل کا استعمال ممنوع نہیں اور رائے سے عقل مراد نہیں تفسیر میں عقل کا استعمال ممنوع کیسے ہوسکتا ہے، قرآن کریم میں تو جگہ جگہ عقل سے کام لینے کی ہدایت ہے؟ اور عقلوں کے تفاوت ہی سے بے شمار تفاسیر وجود میں آئی ہیں۔ بلکہ حدیث میں ہے: لا یَنقَضِی عجائبہ (اس کی حیرت زا باتیں کبھی ختم ہونے والی نہیں) اس سے تو تفسیر میں عقل کا زیادہ سے زیادہ استعمال مستحسن ثابت ہوتا ہے۔

البتہ قرآن کریم میں عقل کا استعمال بس اسی درجہ تک ہونا چاہئے کہ جو باتیں عام فہم نہ ہوں ان کو عقل کی مدد سے عام فہم بنایا جائے اور جو مضامین دقیق ہوں ان کی وضاحت کی جائے۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوربین اور خوردبین پر رنگین گلاس چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے آلہ سے جب کوئی چیز دیکھی جائے گی تو علاوہ نزدیک اور جلی ہونے کے رنگین بھی نظر آئے گی۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ رنگ نظر آنے والی چیز کا وصف نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ایک عارض ہے۔ یہ تفسیر بالرائے کی مثال ہے۔ یعنی قرآن کریم کی کسی آیت میں درجۂ اجمال میں جو مضامین ملحوظ ہوں ان کو عقل کی مدد سے واضح کرنا تو

درست ہے۔مگراس پر کوئی ایسا رنگ چڑھانا جو محض مفسر کی عقل کے اثر سے ہو جائز نہیں۔

مثلاً: قرآن کریم میں کوئی ضابطہ کلیہ بیان کیا گیا ہو، تو جو اس کی واقعی جزئیات ہیں، ان کی وضاحت کرنا تفسیر بالرائے نہیں ہے۔ البتہ کسی ایسی جزئی و جو اس قاعدہ کا فرد نہیں ہے، مگر اس کی جزئیات کے مشابہ ہے، تفسیر کرتے ہوئے اس کو اس قاعدہ کا فرد قرار دینا تفسیر بالرائے ہے اور درست نہیں۔ جیسے انسان کی ماہیت حیوان ناطق ہے۔ جس کی اربوں کھربوں جزئیات ہیں۔ مگر جن مانس اس کی جزئی نہیں ہے بلکہ وہ حیوانات کی ایک مستقل نوع ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کو انسان کا فرد قرار دے اور حیوان ناطق کی جزئیات میں اس کو شمار کرائے تو یہ حیوان ناطق کی تفسیر بالرائے ہے (حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی بات وضاحت کے ساتھ پوری ہوئی)

راقم کے خیال میں حدیث میں جس رائے کا تذکرہ ہے۔ اس سے مراد نظریہ بھی ہو سکتا ہے یعنی پہلے سے ایک نظریہ قائم کرنا پھر قرآن کو توڑ مروڑ کر اس کے مطابق بنانا تفسیر بالرائے ہے۔ جیسے ایک صاحب نے حکومت الٰہیہ کے قیام کو، جو اسلام کا ایک شعبہ (شاخ) تھا، اسلام کی اصل (تنا) بنایا، اور اس کو تعلیمات اسلام کا قُطبُ الرّحی (چکی کا بیچ کا کیلا) قرار دیا۔ پھر جب قرآن سے یہ بات بے تکلف ثابت ہوتی نظر نہ آئی تو قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں وضع کیں۔ اور ان میں اقتدار اعلیٰ کا مفہوم شامل کیا، تاکہ قرآن پاک سے مطلب برآری کی جا سکے۔ یہ بھی تفسیر بالرائے ہے، اور ایسا کرنا حرام ہے۔ اگر اتفاقاً کسی نے کوئی صحیح نظریہ قائم کیا، اور اس کو قرآن سے ثابت کیا تو بھی یہ حرکت نادرست ہے۔ دوسری حدیث میں اسی کا بیان ہے۔ کیونکہ جب ایسا کرنے کی عادت پڑ جائے گی تو معلوم نہیں وہ کہاں کہاں ٹھوکر کھائے گا۔ تفسیر کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تفسیر کرنے کے لئے جو علوم ضروری ہیں، پہلے ان کو حاصل کیا جائے، پھر روایات کی روشنی میں جو بات قرآن کریم سے مفہوم ہوتی ہے اس کو رائے اور نظریہ بنایا جائے اور قرآن کے کسی اجمال کی وضاحت میں کوئی ایسی بات نہ بڑھائی جائے جو درجۂ اجمال میں ملحوظ نہ ہو۔ ورنہ ثواب ندارد گناہ لازم ہوگا۔

[۱۵] قوله صلى الله عليه وسلم: "من قال فى القرآن برأيه فليتبوأ مقعده فى النار"
أقول: يحرم الخوضُ فى التفسير لمن لا يعرف اللسان الذى نزل القرآنُ به، والمأثورَ عن النبى صلى الله عليه وسلم، وأصحابه والتابعين: من شرح غريب، وسبب نزولٍ، وناسخٍ ومنسوخ.

ترجمہ: (۱۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: "جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا، پس چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے" میں کہتا ہوں: تفسیر میں گھسنا حرام ہے اس شخص کے لئے جو نہیں جانتا اس زبان کو جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے، اور نہ اُن روایات کو (جانتا ہے) جو نبی ﷺ، اور آپ کے صحابہ و تابعین سے مروی ہیں۔ خواہ وہ کسی مشکل لفظ کی شرح ہو، یا شانِ نزول یا ناسخ و منسوخ۔

☆ ☆ ☆

قرآن میں جھگڑا کفر ہے اور جھگڑا کرنے کا مطلب

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے'' (رواہ ابوداؤد واحمد والحاکم، مشکوٰۃ حدیث ۲۳۶)

تشریح: مِراءٌ: باب مفاعلہ کا مصدر ہے ماریٰ مراءً ومُماراۃً کے معنی ہیں: جھگڑا کرنا۔ دوسرا لفظ اس مفہوم کے لئے جدال ہے۔ قرآن میں جدال حرام ہے۔ اور جدال فی القرآن یہ ہے کہ قرآن کے منصوص (مصرح) حکم کو دل میں پیدا ہونے والے کسی شبہ کی وجہ سے رد کرنا۔

فائدہ: مگر اس میں اشکال یہ ہے کہ باب مفاعلہ کا خاصہ اشتراک ہے یعنی دو شخص کسی کام میں شریک ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی ہے: دع المراء فان نفعه قليل. وهو يهيج العداوة بين الإخوان (دارمی ۹۱:۱) جھگڑا چھوڑ، کیونکہ اس کا فائدہ تھوڑا ہے، اور وہ برادروں میں عداوت بھڑکاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جھگڑا دو شخصوں میں ہوگا۔ حدیث میں ہے: من ترك المراء وهو مُحِقٌ بُنِي له في وسطها (ابن ماجہ حدیث ۵۱) جو جھگڑا چھوڑ دے درانحالیکہ وہ حق پر ہے تو اس کے لئے جنت کے بیچ میں ایک محل بنایا جائے گا۔ یہ جھگڑا بھی ظاہر ہے کہ دو شخصوں کے درمیان ہوگا۔ پس مراء کی جو صورت شاہ صاحب نے بیان کی ہے وہ محل نظر ہے۔

زین العرب نے مراء کے معنی شک کے کئے ہیں۔ اور اس لفظ کو مِرْیَۃ کے معنی میں لیا ہے۔ مگر یہ بات بھی مضبوط نہیں ہے، کیونکہ مِراء اور ہے اور مِرْیَۃ اور ہے۔ قاضی بیضاوی نے تذارُء (جھگڑے میں بات کو ایک دوسرے پر ڈالنا) کے معنی کئے ہیں۔ پس یہ حدیث آئندہ حدیث کے معنی میں ہوگی (یہ دونوں قول مرقات شرح مشکات میں ہیں)

[۱۶] قوله صلى الله عليه وسلم: " المراء في القرآن كفر "
أقول: يحرم الجدال في القرآن، وهو: أن يَرُدَّ الحكم المنصوص بشبهة، يجدها في نفسه.

ترجمہ: (۱۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے'' میں کہتا ہوں: قرآن میں جھگڑا کرنا حرام ہے، اور وہ یہ ہے کہ رد کردے مصرح حکم کو کسی شبہ کی وجہ سے، جس کو وہ اپنے دل میں پاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

قرآن وحدیث کو باہم ٹکرانا حرام ہے اور اس کی صورت

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ قرآن کریم کے ذریعہ ایک دوسرے کی تردید کررہے ہیں۔ پس آپ نے فرمایا: ''جو لوگ تم سے پہلے ہوئے وہ بس اسی وجہ سے

برباد ہوئے کہ انھوں نے اللہ کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے ٹکرایا۔ حالانکہ قرآن کریم اس حال میں نازل ہوا ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہے۔ پس تم اس کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ کے ذریعہ مت جھٹلاؤ۔ تم اس میں سے جو جانتے ہو اس کو کہو، اور جو نہیں جانتے اسکو جاننے والے کے حوالے کرو (رواہ احمد ۲.۱۵۸ مشکوٰۃ حدیث ۲۳۷)

تشریح: قرآن کریم کے ذریعہ تدافُع حرام ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کی دو صورتیں بیان کی ہیں:

پہلی صورت: ایک شخص ایک آیت سے اپنے موقف پر استدلال کرے، دوسرا اس کی تردید کرے۔، اور وہ اس کے برخلاف دوسری آیت سے اپنے موقف پر استدلال کرے اور پہلا اس کی تردید کرے —— یہ صورت حرام ہے۔ روایت کے بعض طُرُق میں ہے کہ صحابہ میں تقدیر کے مسئلہ میں بحث ہو رہی تھی کہ آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا۔ پس ایسے پیچیدہ مسئلہ میں عام لوگوں کا بحث کرنا اور قرآن کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے ٹکرانا باعث ہلاکت ہے۔ قرآن کا بعض بعض کی تصدیق کرنے والا ہی ہے۔ اس کے مضامین میں کوئی اختلاف نہیں۔ سورۃ النساء آیت ۸۲ میں قرآن میں اختلاف کی نفی کی گئی ہے۔ اگر کسی کو قرآن میں دو مختلف باتیں نظر آئیں تو وہ نظر کا قصور ہے۔ ایسی صورت میں کسی بڑے عالم کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اور صحیح بات سمجھنی چاہئے۔

دوسری صورت: کوئی شخص ائمہ مجتہدین میں سے کسی امام کے قول کی تائید میں قرآن سے یا حدیث سے استدلال کرے، دوسرا اس کی تردید کرے اور دوسرا اپنے امام کے مذہب کی تائید میں استدلال کرے اور پہلا اس کی تردید کرے۔ اور دونوں کا مقصد مناظرہ (مکابرہ) ہو، صرف اپنے امام کے قول کو ثابت کرنا پیش نظر ہو، ان کا پختہ عزم درست بات کو واضح کرنے کا نہ ہو، تو یہ بھی قرآن یا حدیث کے ذریعہ تدافُع ہے اور حرام ہے۔

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی بات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ارباب مذاہب اپنے اماموں کے قول پر قرآن وحدیث سے استدلال نہ کریں۔ کیونکہ صحابہ وتابعین ہمیشہ اپنے موقف پر قرآن وحدیث سے استدلال کرتے رہے ہیں، اور دوسرے کے استدلال کا جواب بھی دیتے رہے ہیں۔ بلکہ شاہ صاحب کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے استدلالات میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ نصوص کو باہم ٹکرانے کی صورت پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ نیز مستدِل کا مقصد اظہار حق ہونا چاہئے۔ صرف بات کی پچ مقصد نہ ہو۔

[۱۶] قوله صلى الله عليه وسلم: " إنما هلك من كان قبلكم بهذا، ضربوا كتابَ اللّٰه بعضَه ببعض"
أقول: يحرم التَّدَارُؤُ بالقرآن، وهو: أن يَستدلَّ واحدٌ بآية، فيرده آخر بآيةٍ أخرى، طلبًا لإثبات مذهبِ نفسِه، وهَدْمِ وضعِ صاحبه، أو ذهابًا إلى نصرة مذهب بعض الأئمة على مذهب بعض، ولايكون جامعَ الهمة على ظهور الصواب؛ والتدارؤُ بالسنة مثلُ ذلك.

ترجمہ: (۱۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "جو لوگ تم سے پہلے ہوئے وہ بس اسی وجہ سے برباد ہوئے کہ انھوں نے

اللہ کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے ٹکرایا'' میں کہتا ہوں: قرآن کے ذریعہ تدافع (ایک دوسرے کی بات کو ہٹانا) حرام ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص ایک آیت سے استدلال کرے، پس دوسرا شخص اس کو دوسری آیت سے رد کرے، مذہب خود کو ثابت کرنے کی کوشش میں، اور اپنے ساتھی کے نظریہ کو گرانے کی خاطر سے۔ یا جاتے ہوئے بعض ائمہ کے مذہب کی مدد کی طرف، دوسرے بعض کے مقابلہ میں۔ اور نہ ہو وہ پختہ ارادہ رکھنے والا درست بات کے واضح ہونے کا ـــــ اور ایک حدیث کے ذریعہ دوسری حدیث کی تردید بھی اسی کے مانند ہے (تَدَارُؤ (باب تفاعل) بمعنی تدافع ہے، یعنی ایک دوسرے کی بات کو ٹالنا۔ مجرد دَرْأہ (ف) دَرءاً: زور سے دھکا دینا)

☆ ☆ ☆

آیات کا ظاہر و باطن اور ہر ایک کی جائے اطلاع

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے (اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ: ہر حرف کی ایک حد ہے یعنی ظاہر و باطن کے دائرے الگ الگ ہیں) اور ہر حد کی ایک جائے اطلاع ہے'' (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۳۸)

تشریح: قرآن کریم میں بکثرت بیان ہونے والے مضامین پانچ ہیں: (۱) اللہ کی صفات اور ان کی قدرت کی نشانیوں کا بیان (۲) احکام شرعیہ کا بیان (۳) انبیاء کے واقعات (۴) آیات مخاصمہ۔ جن میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین کے مزعومات اور ان کی سخافت سے بحث کی گئی ہے (۵) تذکیر کے مضامین یعنی جنت و جہنم وغیرہ کا تذکرہ کر کے نصیحت کرنا۔

قرآن کریم کے مرکزی مضامین یہی علوم خمسہ ہیں۔ ان کی کچھ تفصیل مبحث اول کے ساتویں باب میں گذر چکی ہے۔ اور ان کا مفصل بیان حضرت کی دوسری کتاب الفوز الکبیر میں ہے۔ یہاں آپ نے یہ مضمون نہایت مختصر لکھا ہے۔

علوم خمسہ سے متعلق تمام آیات کا ظاہر اُن مضامین کو اچھی طرح سمجھ لینا ہے جن کے لئے کلام چلایا گیا ہے یعنی عبارت النص (وہ مفہوم و مدلول جن پر آیات صراحۃً دلالت کرتی ہیں) اُن آیات کا ظاہر ہے۔ اور باطن پانچوں قسم کی آیات کا الگ الگ ہے، جو درج ذیل ہے:

آیاتِ صفات کا باطن: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور کرنا اور ان کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہے۔

آیاتِ احکام کا باطن: احکام کا استنباط ہے۔ خواہ استنباط ایماء یعنی مفہوم مخالف سے ہو، یا اشارۃ النص سے ہو، یا فحوی یعنی مفہوم موافق (دلالۃ النص) سے ہو، یا اقتضاء النص سے ہو (استنباط کے ان چاروں طریقوں کی وضاحت مبحث سابع کے باب خامس میں ہے)

استنباط کی ایک مثال: خلافت عثمانی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عورت نے نکاح سے چھ ماہ بعد بچہ جنا۔ شوہر نے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی۔ آپ نے عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی۔ آپ حضرت عثمان کے پاس گئے۔ اور فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ حضرت عثمان نے فرمایا: اس نے چھ ماہ میں بچہ جنا ہے کیا یہ بات ممکن ہے؟ حضرت علی رضی اللہ نے فرمایا: ہاں یہ بات ممکن ہے، اور قرآن کریم سے ثابت ہے۔ سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ میں ہے کہ: ''بچے کو پیٹ میں رکھنا، اور دودھ چھڑانا تیس مہینے (میں پورا ہوتا) ہے'' اور سورۂ لقمان آیت ۱۴ میں ہے: ''اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے'' اور سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۳ میں ہے: ''اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں'' آخری دو آیتوں سے ثابت ہوا کہ مدت رضاعت دو سال ہے، پس مدت حمل کے لئے چھ ماہ بچے۔ یہی اقل مدت حمل ہے، پس چھ ماہ میں ولادت ہو سکتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات تو میری سمجھ میں آئی ہی نہیں! اس عورت کو واپس لاؤ۔ مگر وہ سنگسار کی جا چکی تھی۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۃ الاحقاف کی تفسیر میں (۴:۱۵۷) یہ استدلال ذکر کر کے فرمایا ہے: **وھو استنباط قوی صحیح، ووافقه علیه عثمان وجماعة من الصحابة** (یہ مضبوط اور درست استنباط ہے، حضرت عثمان اور صحابہ کی ایک جماعت نے حضرت علی کی ہمنوائی کی ہے) احناف کے یہاں بھی فتویٰ اسی پر ہے کہ مدت رضاعت دو ہی سال ہے۔ اور چھ ماہ کم سے کم مدت حمل ہے۔ غرض اس قسم کے استنباطات آیات احکام کا باطن ہیں۔

فائدہ: سورۃ الاحقاف کی آیت میں اکثر مدت رضاعت اور اقل مدت حمل کو اس لئے جمع کیا گیا ہے کہ کم سے کم مدت رضاعت اول تو متعین نہیں۔ ماں کسی وجہ سے مطلق دودھ نہ پلائے یہ بھی درست ہے، ثانیاً: اس سے احکام بھی متعلق نہیں۔ اور اکثر مدت رضاعت متعین بھی ہے اور اس سے احکام بھی متعلق ہیں، اس لئے اس کو لیا گیا ہے۔ اسی طرح زیادہ سے زیادہ مدت حمل اول تو قطعی طور پر متعین نہیں، ثانیاً: اس سے بھی احکام متعلق نہیں، اس لئے اکثر مدت حمل کا بیان ضروری نہیں۔ اور اقل مدت حمل متعین بھی ہے اور اس سے ثبوت نسب وغیرہ احکام بھی متعلق ہیں۔ اس لئے اس کو لیا گیا ہے۔ اور دونوں کو ملا کر تیس مہینے بیان کئے گئے ہیں (فائدہ ختم ہوا)

آیات قصص کا باطن. انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات میں غور کرنا کہ انبیاء اور مؤمنین جو انعامات سے نوازے گئے اور ان کی مدح وستائش کی گئی تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اور مخالفین کو جو سزائیں دی گئیں اور ان کی قباحت وشناعت بیان کی گئی تو اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہی باتیں جاننا قصص القرآن کا باطن ہے۔

آیات مخاصمہ کا باطن: فِرَق اربعہ کی گمراہیوں کی بنیاد پہچاننا، اور ان جیسی گمراہیوں کو ان کے ساتھ ملانا ہے یعنی یہود ونصاریٰ اور مشرکین ومنافقین کی ضلالت کی جڑ جاننا، اور ان کی جن گمراہیوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے ان کے جوابات نکالنا آیات جدل کا باطن ہے۔ مثلاً تناسخ (آواگون) کا تذکرہ قرآن میں صراحۃً نہیں ہے۔ ہنود کا یہ نظریہ غلط کیوں ہے؟ اس کی وجہ آیات مخاصمہ میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ یہی ان آیات کا بطن ہے (آیات مخاصمہ کے

باطن کا تذکرہ مختصر نویسی کی نذر ہوگیا ہے، ہم نے الفوز الکبیر باب رابع فصل سوم سے بڑھایا ہے)

آیاتِ تذکیر کا باطن: یہ ہے کہ آیات تذکیر کے مضامین سے دل ودماغ متاثر ہوں، دل پسیجے اور قلب میں خوف ورجاء کی کیفیت پیدا ہو، تاکہ بندے میں شکر گذاری کا جذبہ ابھرے، اور وہ اطاعت خداوندی میں مضبوط ہوجائے۔

ہر حد کی جائے اطلاع: ظاہر کی جائے اطلاع: عربی زبان کی کماحقہ معرفت اور ان روایات کو پہچاننا ہے جن کا فن تفسیر سے تعلق ہے۔ اور باطن کی جائے اطلاع: ذہن کا رسا اور فہم کا درست ہونا ہے۔ ساتھ ہی دل کا نور ایمان سے روشن اور پرسکون ہونا ہے یعنی جس کا ذہن عمدہ، فہم درست اور دل ایمان واعمال صالحہ کی روشنی سے منور ہوگا، وہ بطن قرآن کو سمجھ سکے گا۔ اور جس میں یہ خوبیاں نہیں ہیں، اس کے لئے بطن قرآن کا سمجھنا دشوار ہے (شاہ صاحب نے یہ مضمون بھی یہاں بہت مختصر لکھا ہے۔ ہم نے الفوز الکبیر سے یہ مضمون بڑھایا ہے)

[۱۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " لكل آية منها ظهر وبطن، ولكل حدٍّ مُطَّلع"

أقول: أكثرُ ما في القرآن: بيانُ صفات الله تعالى، وآياته، والأحكامُ، والقصصُ، والاحتجاجُ على الكفار، والموعظةُ بالجنة والنار:

فالظَّهر: الإحاطةُ بنفس ماسيق الكلامُ له.

والبطن في آيات الصفات: التفكر في آلاء الله والمراقبةُ؛ وفي آيات الأحكام: الاستنباط بالإيماء، والإشارة والفحوى، والاقتضاء، كاستنباط علي رضي الله عنه من قوله تعالى: ﴿وحمْلُهُ وفصالُهُ ثلاثُون شهرًا﴾ أن مدة الحمل قد تكون ستة أشهرٍ، لقوله: ﴿حولَيْن كاملَيْن﴾ وفي القصص: معرفةُ مناط الثواب والمدح، أوالعذاب والذم؛ وفي الْعِظة: رقةُ القلب، وظهورُ الخوف والرجاء، وأمثالُ ذلك.

ومُطَّلَعُ كلِّ حد: الاستعدادُ الذي به يحصل، كمعرفة اللسان والآثار، وكلُطف الذهن، واستقامة الفهم.

ترجمہ. (۱۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "آیات میں سے ہر ایک آیت کا ظاہر وباطن ہے، اور ہر حد کے لئے ایک جائے اطلاع ہے"

میں کہتا ہوں: زیادہ تر مضامین جو قرآن کریم میں ہیں: (۱) اللہ کی صفات اور ان کی نشانیوں کا بیان ہے (۲) اور احکام (۳) اور واقعات (۴) اور کفار کے ساتھ مباحثہ (۵) اور جنت وجہنم کے ذریعہ نصیحت کرنا ہے۔

پس ظاہر: بعینہٖ اُن مضامین کو اچھی طرح سمجھنا ہے جن کے لئے کلام چلایا گیا ہے۔

اور صفات کی آیات کا باطن: اللہ کی نعمتوں میں غور کرنا اور ان کو پیش نظر رکھنا ہے۔ اور آیات احکام کا باطن: احکام کا استنباط ہے ایماء اور اشارہ اور فحوی اور اقتضاء سے۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استنباط ارشاد باری تعالیٰ: وحملہ الخ سے کہ مدت حمل کبھی چھ ماہ بھی ہوتی ہے، ارشاد باری حولین کاملین کی وجہ سے۔ اور واقعات کا باطن: ثواب وستائش یا عذاب وقباحت کی بنیاد (علت) کو پہچاننا ہے۔ اور موعظت کا باطن: دل کا پسیجنا اور خوف ورجاء کا ظاہر ہونا اور اس کے مانند چیزیں ہیں۔

اور ہر حد کی جائے اطلاع: وہ استعداد ہے جس سے وہ بات حاصل ہوتی ہے، جیسے زبان اور روایات کو جاننا، اور ذہن کی عمدگی اور فہم کی درستگی۔

لغات: ظَهر کے لغوی معنی ہیں پیٹھ، اور مرادی معنی ہیں: ظاہر۔ اور بطن کے معنی ہیں: پیٹ اور مراد ہے باطن اور حد کے معنی ہیں: سرحد، کنارہ یعنی ظاہر و باطن میں سے ہر ایک کا ایک دائرہ ہے۔ دونوں باہم خلط ملط نہیں ہیں مُطّلع کے معنی ہیں: باہر جھانکنے کا جھروکا، واقف ہونے کی جگہ، جائے اطلاع یعنی آیات کے ظاہری معنی کو جاننے کا ایک طریقہ ہے، اور باطنی معنی کو سمجھنے کا بھی ایک راستہ ہے أحاط به: گھیرنا، احاط کرنا أحاط به علما: پوری طرح سے جان لینا راقبه: نگہبانی کرنا یعنی ہر وقت ان نعمتوں کو پیش نظر رکھنا وعطه عظة: نصیحت کرنا۔ توبہ اور اصلاح پر ابھارنے والی باتیں یاد دلانا۔

☆ ☆ ☆

محکم ومتشابہ کا مطلب

سورۂ آل عمران آیت سات ہے: ''اللہ وہی ہیں جنھوں نے آپ پر کتاب اتاری۔ اس کی بعض آیتیں محکم ہیں یعنی ان کے معنی واضح ہیں وہ کتاب اللہ کی اصل آیات ہیں۔ اور دوسری متشابہ ہیں یعنی ان کے معنی معلوم یا متعین نہیں ہیں سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں۔ گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب جاننے کی نیت سے۔ اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ اور مضبوط علم رکھنے والے کہتے ہیں: ہم اس پر یقین رکھتے ہیں۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور سمجھانے سے وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے''

تشریح: محکم: وہ کلام ہے جو ایک ہی معنی کا احتمال رکھتا ہو۔ یعنی عربی زبان کا جاننے والا اس سے ایک ہی معنی سمجھے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں الخ (سورۃ النساء، آیت ۲۳)

متشابہ: وہ کلام ہے جو متعدد معانی کا احتمال رکھتا ہو، مگر مراد ان میں سے کوئی ایک ہی معنی ہوں۔ الفوز الکبیر میں شاہ صاحب نے اس کی چار صورتیں بیان کی ہیں: (۱) کسی ضمیر کا مرجع دو چیزیں بن سکتی ہوں (۲) کوئی کلمہ دو معنوں میں

مشترک ہو (۳) عطف میں دو احتمال ہوں (۵) عطف اور استیناف دونوں کا احتمال ہو۔ مگر یہاں جو مثال دی ہے، وہ ان کے علاوہ صورت ہے۔

متشابہ کی مثال: سورۃ المائدہ کی آیت ۹۳ اس طرح ہے: ''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک کام کئے کوئی گناہ نہیں اُس میں جو وہ (پہلے) کھا چکے، جبکہ وہ (آئندہ) ڈر گئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کئے'' آخر آیت تک۔ اس آیت سے کچھ گمراہ لوگوں نے شراب کی حلت ثابت کی ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ سرکشی یا اودھم مچانے کے لئے نہ پی گئی ہو۔ حالانکہ آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے شراب حرام ہونے سے پہلے شراب پی ہے ان پر کوئی مواخذہ نہیں جبکہ وہ آئندہ اللہ سے ڈریں اور ایمان کے ساتھ نیک کام کریں۔

فوائد عثمانی میں اس کی وضاحت اس طرح ہے:

''نہایت صحیح اور قوی احادیث میں ہے کہ جب تحریم خمر کی آیات نازل ہوئیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! ان مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جنھوں نے حکم تحریم آنے سے پہلے شراب پی اور اُسی حالت میں انتقال کر گئے؟ مثلاً: بعض صحابہ جنگ احد میں شراب پی کر شریک ہوئے تھے۔ اور اسی حالت میں شہید ہو گئے کہ پیٹ میں شراب موجود تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ضابطہ کلیہ بیان کیا کہ جو لوگ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں ان کے لئے کسی مباح چیز کے بوقت اباحت کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جبکہ وہ عام احوال میں تقوی اور خصال ایمان سے متصف ہوں''

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے الفوز الکبیر میں متشابہ کی جو صورتیں بیان کی ہیں اور ان کی جو مثالیں دی ہیں ان پر تو کوئی خاص اشکال وارد نہیں ہوتا۔ مگر یہاں متشابہ کی جو مثال دی ہے وہ محل نظر ہے۔ کیونکہ گمراہ لوگوں کے اس قسم کے استدلالات سے اگر آیات متشابہ ہو جائیں گی تو پھر نماز کی آیات بھی متشابہ ہو جائیں گی۔ کیونکہ گمراہ لوگ صلوۃ کے معنی دعا اور گیان دھیان کے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نماز ضروری نہیں۔ غرض یہ آیت از قبیل متشابہات نہیں، محکم ہے۔ ہاں مشکلات القرآن میں اس کو شمار کر سکتے ہیں۔

نوٹ: محکم و متشابہ کی وضاحت فوائد عثمانی میں بہت اچھی کی گئی ہے اور متشابہ کی انواع کا بیان لغات القرآن میں ہے۔

[۱۹] قوله تعالى: ﴿منهُ آياتٌ مُحكماتٌ، هُنَّ أُمُّ الكِتاب، وأُخرُ مُتشابهاتٍ﴾

أقول: الظاهر أن المحكم مالم يحتمل إلا وجهًا واحدًا، مثل ﴿حُرِّمتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهاتُكُمْ وبَناتُكُمْ وأَخواتُكُمْ﴾ والمتشابه: ما احتمل وجوهًا، إنما المرادُ بعضُها، كقوله تعالى: ﴿لَيْسَ على الَّذِيْنَ آمَنُوْا، وعَمِلُوْا الصّالحات جُناحٌ فيما طَعِمُوْا﴾ حملها الزائغون على إباحة الخمر مالم يكن بغيٌ، أو إفسادٌ في الأرض، والصحيحُ حملُها على شاربيها قبل التحريم.

ترجمہ: (۱۹) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جس میں کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہ مراد سے محفوظ ہیں (یعنی ان کا

مطلب واضح ہے) اور یہی آیتیں کتاب کی بنیادی آیتیں ہیں۔ اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں"

میں کہتا ہوں: ظاہر یہ ہے کہ محکم وہ کلام ہے جو نہ احتمال رکھتا ہو، مگر ایک معنی کا، جیسے: "حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں" اور متشابہ: وہ ہے جو احتمال رکھتا ہو متعدد معانی کا، جیسے ارشاد باری تعالیٰ: "کوئی گناہ نہیں ان لوگوں پر جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں اس چیز میں جس کو وہ کھاتے ہیں" کو بعض کج روؤں نے محمول کیا ہے شراب کی حلت پر جب کہ نہ ہو سرکشی یا زمین میں فساد مچانا۔ اور صحیح اس کو محمول کرنا ہے شراب کی تحریم سے پہلے اس کو پینے والوں پر۔

☆ ☆ ☆

نیت اصل ہے، اعمال اس کے پیکر ہیں

حدیث ـــــ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق ہی اجر ملتا ہے۔ پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے۔ اور جس نے کسی دنیوی غرض کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کام کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہے" (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث اول)

تشریح: نیت کے معنی ہیں: قصد وارادہ۔ مگر حدیث شریف میں نیت سے علت غائی مراد ہے۔ علت غائی: وہ مقصد ہے جس کے پیش نظر کام کیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص گھر یا چارپائی بناتا ہے تو ایک مقصد لے کر بناتا ہے۔ یہی مقصد علت غائی ہے۔ اور حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی نے دینی کام کرتے وقت اچھا مقصد پیش نظر رکھا ہے، مثلاً ثواب کی امید باندھی ہے یا اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا پیش نظر ہے تو وہ دینی عمل ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی دنیوی غرض پیش نظر ہے تو وہ دینی عمل نہیں ہے، اور اس پر کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ مثلاً ہجرت ایک عمل ہے، پس جو دین کی نصرت کے لئے وطن چھوڑ کر مدینہ آیا، اس کا یہ عمل بہت بڑے اجر کا حقدار ہے۔ اور جو مدینہ میں تجارت کرنے کے لئے یا کسی خاتون سے نکاح کرنے کے لئے آیا اس کا یہ عمل بس اسی مقصد کے لئے ہے جو وہ لے کر آیا ہے۔ اس کا یہ عمل نہ تو دینی ہے اور نہ باعث اجر۔

اور حدیث شریف کے ذریعہ یہ بات سمجھانی مقصود ہے کہ اعمال صالحہ نفس کو اس وقت سنوارتے ہیں اور اس کی کجی کو اس وقت دور کرتے ہیں جب ان کے پیچھے کوئی ایسا مقصد ہو جس کا تہذیب نفس سے تعلق ہو۔ اگر اعمال بطور عادت کئے گئے ہیں، یا لوگوں کو دکھلانے اور سنانے کے لئے کئے گئے ہیں یا طبیعت کے تقاضے سے کئے گئے ہیں تو وہ بے فائدہ اور بے کار ہیں۔ اور طبیعت کے تقاضے سے عمل کی مثال وہ بہادر شخص ہے، جس کو لڑے بغیر چین ہی نہیں آتا۔ اگر دشمن

سے لڑنے کا موقعہ نہیں ملتا تو اپنے بھائیوں سے لڑنے لگتا ہے۔ ایسے شخص کا جہاد دینی عمل نہیں۔ نہ ایسے جہاد سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ درج ذیل حدیث میں یہی مضمون ہے۔

حدیث ـــــ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سوال کیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے لڑتا ہے، دوسرا ناموری کے لئے لڑتا ہے اور تیسرا اپنی بہادری کا ڈنکا بجانے کے لئے لڑتا ہے۔ ان تینوں میں سے راہ خدا میں جہاد کرنے والا کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جو اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کا بول بالا ہو، وہی راہ خدا میں جہاد کرنے والا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۳۸۱۴ کتاب الجہاد)

اور نیت کی اہمیت: اس قدر اس لئے ہے کہ وہ اعمال کی روح ہے۔ اور اعمال اس کی صورتیں اور پیکر ہائے محسوس ہیں۔ اور اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ وہ قربانیوں کے گوشت پوست اور خون نہیں دیکھتے۔ وہ تو تقوی (دل کی کیفیت) کو دیکھتے ہیں (سورۃ الحج آیت ۳۷)

[۲۰] قوله صلى الله عليه وسلم: " إنما الأعمال بالنيات"

أقول: السية: القصد والعزيمة، والمراد ههنا العلّة الغائية التي يتصورها الإنسان، فيبعثه على العمل، مثلُ طلب ثواب من الله، أو طلب رضا الله.

والمعنى: ليس للأعمال أثر في تهذيب النفس وإصلاح عوجها إلا إذا كانت صادرةً من تصوُّرِ مقصدٍ، مما يرجع إلى التهذيب، دون العادةِ، وموافقةِ الناس، أو الرياء والسُّمعة، أو قضاءِ جبلّةٍ، كالقتال من الشجاع الذي لايستطيع الصبر عن القتال، فلو لامجاهدةُ الكفار لَصَرَفَ هذا الخُلُقَ في قتال المسلمين، وهو ما سئل النبي صلى الله عليه وسلم: الرجل يقاتل رياءً، ويقاتل شجاعة، فأيُهما في سبيل الله؟ فقال: "من قاتل لتكون كلمة الله هي العلياء فهو في سبيل الله"

والفقه في ذلك: أن عزيمةَ القلب روحٌ، والأعمال أشباحٌ لها:

ترجمہ: (۲۰) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''اعمال کا تعلق نیتوں سے ہے''

میں کہتا ہوں: نیت: قصد وارادے کا نام ہے۔ اور مراد یہاں (حدیث میں) وہ علت غائی ہے جس کا انسان تصور کرتا ہے، پس ابھارتا ہے وہ تصور آدمی کو کام کرنے پر، جیسے اللہ سے ثواب چاہنا، اور اللہ کی خوشنودی چاہنا۔

اور حدیث شریف کا مطلب: یہ ہے کہ اعمال کے لئے کوئی تاثیر نہیں ہے نفس کو سنوارنے میں، اور اس کی کجی کو دور کرنے میں، مگر جب ہوں اعمال صادر ہونے والے کسی مقصد کے تصور سے، ان مقاصد میں سے جو لوٹتے ہیں نفس کو سنوارنے کی طرف، نہ کہ عادت سے، یا دکھلانے اور سنانے کے لئے یا فطرت کا تقاضا پورا کرنے کے لئے، جیسے اس

بہادر کا لڑنا جو لڑنے سے صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس اگر نہیں ہوگا کفار کے ساتھ جہاد تو خرچ کرے گا وہ اس اخلاق کو مسلمانوں کے ساتھ لڑنے میں۔ اور وہ وہ ہے کہ سوال کیے گئے نبی ﷺ: ایک شخص لڑتا ہے دکھلانے کے لئے، اور لڑتا ہے بہادری جتانے کے لئے، پس ان دونوں میں سے کون راہ خدا میں لڑنے والا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو لڑتا ہے تا کہ اللہ ہی کا بول بالا ہو۔ پس وہ راہ خدا میں لڑنے والا ہے''

اور گہری بات: اس سلسلہ میں یہ ہے کہ دل کا ارادہ (عمل کی) روح ہے، اور اعمال ارادے کے پیکر ہیں۔

☆ ☆ ☆

کسی چیز کا قطعی حکم معلوم نہ ہو تو احتیاط چاہئے

حدیث ـــــ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''حلال واضح ہے۔ اور حرام واضح ہے۔ اور دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں۔ جن کا حکم بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص شبہ والی چیزوں سے بچا تو اس نے اپنے دین کو اور اپنی آبرو کو بچایا۔ اور جو شخص شبہ والی چیزوں میں پڑا، وہ حرام میں جا پڑا۔ جیسے وہ چرواہا جو محفوظ چراگاہ کے اردگرد جانور چراتا ہے ممکن ہے چراگاہ میں جا پڑے۔ سنو! بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہے سنو! اللہ تعالیٰ کی محفوظ چراگاہ حرام امور ہیں۔ سنو! بیشک جسم میں ایک بوٹی ہے، جب وہ سنور جاتی ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو! وہ بوٹی دل ہے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ، کتاب البیوع، حدیث ۲۷۶۲)

تشریح: کبھی کسی مسئلہ میں مختلف جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک دلیل سے حلت مفہوم ہوتی ہے، دوسری دلیل اس کے معارض ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ہدایت نبوی یہ ہے کہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جائے، اور دین اور آبرو کو محفوظ رکھا جائے۔ اور تعارض ـــ مثال کے طور پر ـــ تین طرح سے ہوتا ہے:

پہلی صورت: کبھی صریح روایات متعارض ہوتی ہیں: جیسے:

(۱) ـــــ مس ذکر سے وضوء ٹوٹتی ہے یا نہیں؟ حضرت بُسرۃ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹوٹتی ہے۔ اسی کو امام شافعی رحمہ اللہ نے لیا ہے۔ اور حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں ٹوٹتی۔ اسی کو احناف نے لیا ہے۔ تفصیل ''موجبات وضوء'' میں آئے گی۔

(۲) ـــــ حالت احرام میں عقد نکاح جائز ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک جائز ہے، اور دیگر ائمہ کے نزدیک جائز نہیں۔ اور روایات میں بھی اختلاف ہے۔ تفصیل ''صفۃ المناسک'' میں آئے گی۔

دوسری صورت: کبھی نص میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کے معنی کی تعیین میں دشواری پیش آتی ہے۔ کیونکہ

بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی جامع مانع تعریف ممکن نہیں ہوتی۔ بلکہ تقسیم کر کے اور اقسام کی تعریف کر کے ہی مقسم کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسے اہل معانی فصاحت کی تعریف نہیں کر سکے۔ وہ اس کی تین قسمیں کرتے ہیں اور ہر قسم کی تعریف کرتے ہیں اور اس ذریعہ سے مقسَم (فصاحت) کو سمجھتے ہیں۔ یا مثال کے ذریعہ ہی اس لفظ کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں۔ تفصیل مبحث سادس کے باب ۱۳ میں گذر چکی ہے۔ پس ایسی صورت میں تین شکلیں ہوتی ہیں: ایک وہ جو یقیناً لفظ کا مصداق ہے، دوسری: وہ جو یقیناً لفظ کا مصداق نہیں ہے۔ اور تیسری: وہ جس میں تذبذب ہے کہ وہ لفظ کا مصداق ہے یا نہیں؟ یہی تیسری صورت حلال وحرام کے درمیان کی اشتباہ والی صورت ہے۔

تیسری صورت: کبھی حکم کی ایک علت ہوتی ہے۔ اور ایک اس کا منشا ہوتا ہے۔ اب ایک ایسی صورت پیش آتی ہے کہ اس میں حکم کی علت تو پائی جاتی ہے، مگر منشا نہیں پایا جاتا، تو اس صورت میں حکم کیا ہوگا؟ اس میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً: کوئی باندی خریدی جائے تو تبدّل ملک سے استبرائے رحم واجب ہوتا ہے یعنی ایک حیض آنے تک نیا مالک مقاربت نہیں کر سکتا۔ اس حکم کی علت تبدّل ملک ہے۔ اور منشا نطفوں کو اختلاط سے بچانا ہے۔ اب اگر ایسی صورت پیش آئے کہ کسی ایسے نابالغ بچہ سے، جس سے جماع متصور نہیں، کوئی شخص باندی خریدے، تو کیا اس صورت میں بھی استبراء واجب ہوگا؟ علت: تبدلِ ملک وجوب کو چاہتی ہے۔ اور منشا عدم وجوب کو۔

پس ایسی اشتباہ والی تمام صورتوں میں احتیاط لازم ہے۔ حدیث شریف میں اسی احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے، تاکہ آدمی کا دین محفوظ رہے اور اس کی آبرو پر حرف نہ آئے۔

فائدہ: فقہی ضابطہ بھی یہی ہے کہ: ''جہاں مراعاتِ اختلاف سے مذہب کا مکروہ لازم نہ آتا ہو، احتیاط اولی ہے'' مثلاً: مس ذکر سے اگر وضوء نہ بھی ٹوٹتی ہو، تاہم احتیاطاً دوبارہ وضوء کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟ اسی طرح خروج دم اور قئے وغیرہ سے۔ اور احرام کی حالت میں نکاح درست بھی ہو، تاہم تاخیر کرنے میں اور احرام کھلنے کے بعد عقد کرنے میں کیا حرج ہے؟ یعنی ان صورتوں میں مذہب کا کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ پس احتیاط والے پہلو پر عمل کرنا اولی ہے۔ البتہ مقتدی کا احتیاطاً فاتحہ پڑھنا درست نہیں۔ کیونکہ مانعین فاتحہ کے نزدیک مقتدی کی قراءت مکروہ تحریمی ہے۔ پس اس احتیاط پر عمل کرنے سے مذہب کا مکروہ لازم آئے گا۔

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے حدیث کی شرح میں اشتباہ کی جو صورتیں بیان کی ہیں، وہ سب درست ہیں۔ مگر ایک صورت جو حدیث کا ماسیق لاجلہ الکلام ہے، اس کو ظاہر ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ اسی کی وضاحت ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے:

کچھ چیزوں کی حلت ہر مسلمان جانتا ہے۔ اسی طرح کچھ چیزوں کی حرمت کا علم بھی سبھی لوگوں کو ہوتا ہے۔ مگر کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا حکم شرعی عام مسلمانوں کو یا کسی خاص شخص کو معلوم نہیں ہوتا۔ مفتی ہی اس کا حکم جانتا ہے۔ ایسی

چیزوں کے بارے میں ایک مسلمان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟ یہ اس حدیث کا اصل مدعیٰ ہے اور حدیث کا یہ جملہ کہ لایدری کثیر من الناس، أهی من الحلال ام من الحرام؟ اس کا واضح قرینہ ہے۔ پس حدیث شریف میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب تک اس چیز کا حکم شرعی معلوم نہ ہو جائے اس سے احتراز کیا جائے۔ یہ خیال کر کے کہ ابھی اس کا ناجائز ہونا طے نہیں ہے یا ہمیں معلوم نہیں ہے، اس کام کو کر لینا احتیاط کے خلاف ہے۔ معاملات میں ایسی صورتیں بکثرت پیش آتی ہیں۔ ان میں بے احتیاطی ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ اس سے دین داغدار بھی ہو سکتا ہے، اور آبرو پر بھی حرف آ سکتا ہے۔ دینداری کی بات یہ ہے کہ محفوظ چراگاہ (حرام ومشتبہ امور) سے اپنے جانور دور ہی رکھے، تاکہ بے خبری میں وہ چراگاہ میں منہ نہ مار لیں۔ اور ایسا احتیاط والا مزاج اسی وقت بن سکتا ہے جب آدمی کا دل سنور جائے۔ یہ بوٹی اگر سنور جائے تو بیڑا پار ہے۔ غرض اس حدیث میں ایسے امور کے سلسلہ میں جن کا حکم شرعی معلوم نہ ہو محتاط طرزِ عمل اپنانے کی ہدایت ہے۔

[۲۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " الحلال بَيِّنٌ، والحرام بين، وبينهما مشتبهات، فمن اتقى الشبهاتِ فقد استبرأ لدينه وعِرْضه"

أقول: قد تتعارض الوجوهُ في المسألة، فتكون السنةُ حينئذ الاستبراءُ والاحتياط، فمن التعارض:

[الف] أن تختلف الرواية تصريحًا، كمسّ الذَّكر، هل ينقُض الوضوء؟ أثبته البعضُ، ونفاه الآخرون، ولكل واحد حديث يشهد له، وكالنكاح للمحرم، سَوَّغه طائفة، ونفاه آخرون، واختلفت الرواية.

[ب] ومنه: أن يكون اللفظُ المستعملُ في ذلك الباب غيرَ منضبط المعنى، يكون معلوما بالقسمة والمثال، ولايكون معلومًا بالحدِّ الجامع المانع، فيخرج ثلاثُ موادَّ: مادةٌ يُطلق عليه اللفظُ يقينًا، ومادةٌ لايطلق عليها يقينا، ومادةٌ لايُدرى هل يصح الإطلاقُ عليها أم لا؟

[ج] ومنه: أن يكون الحكم موطًا يقينًا بعلةٍ، هي مظنَّةٌ لمقصدٍ يقيناً، ويكون نوع لايوجد فيه المقصدُ، ويوجد فيه العلةُ، كالأمة المشتراة ممن لايجامِعُ مثلُه، هل يجب استبراؤها؟ — فهذه وأمثالُها يتأكد الاحتياط فيها.

ترجمہ: (۲۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے، اور دونوں کے درمیان اشتباہ والی چیزیں ہیں۔ پس جو شخص بچا اشتباہ والی چیزوں سے تو یقیناً اس نے براءت (پاکی) طلب کی اپنے دین اور اپنی آبرو کے لئے"۔

میں کہتا ہوں: کبھی مسئلہ میں جہتیں متعارض ہوتی ہیں۔ پس ہوتی ہے ہدایت نبوی اس وقت میں براءت طلب کرنا اور احتیاط برتنا۔ پس تعارض (کی صورتوں میں) سے ہے:

(الف) یہ بات کہ صراحۃً روایتیں مختلف ہو جائیں۔ جیسے مس ذکر: کیا وضوء کو توڑتا ہے؟ ثابت کیا نقض کو بعض نے،

اور نفی کی اس کی دوسروں نے۔ اور ہر ایک کے لئے حدیث ہے جو اس کے لئے گواہی دیتی ہے۔ اور جیسے محرم کا نکاح۔ جائز قرار دیا اس کو ایک جماعت نے اور نفی کی اس کی دوسروں نے اور مختلف ہوئیں روایتیں۔

(ب) اور تعارض میں سے: یہ ہے کہ اس مسئلہ میں استعمال کیا جانے والا لفظ ایسا ہو کہ اس کے معنی منضبط نہ ہوں۔ وہ لفظ جانا جاتا ہو تقسیم اور مثال کے ذریعہ، اور نہ جانا جاتا ہو جامع مانع تعریف کے ذریعہ۔ پس نکلیں گی تین صورتیں: ایک صورت: جس پر لفظ یقیناً بولا جاتا ہے۔ اور دوسری صورت: جس پر لفظ یقیناً نہیں بولا جاتا۔ اور تیسری صورت: نہیں معلوم کہ اس پر لفظ کا اطلاق صحیح ہے یا نہیں؟

(ج) اور تعارض میں سے: یہ ہے کہ حکم معلق ہو بالیقین کسی ایسی علت کے ساتھ جو کہ یقیناً احتمالی جگہ ہو کسی مقصد کے لئے۔ اور ہو ایک قسم جس میں وہ مقصد (منشأ) یقیناً نہ پایا جاتا ہو، اور اس میں علت پائی جاتی ہو۔ جیسے اس شخص سے خریدی ہوئی باندی جس کا مانند جماع نہیں کرتا۔ کیا واجب ہے اس کا استبراء؟ — پس یہ اور ان کے مانند مؤکد ہے ان میں احتیاط۔

☆ ☆ ☆

قرآن کی پانچ قسمیں اور ان پر عمل کا طریقہ

حدیث ——— حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قرآن کریم پانچ صورتوں پر اتارا گیا ہے: حلال اور حرام اور محکم اور متشابہ اور امثال۔ پس حلال کو حلال جانو، اور حرام کو حرام جانو، اور محکم پر عمل کرو، اور متشابہ پر ایمان لاؤ، اور امثال سے عبرت پکڑو'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۲ باب الاعتصام)

تشریح: اس حدیث میں جو قرآن کریم کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں، وہ ایک تقسیم کی اقسام نہیں ہیں، بلکہ متعدد تقسیموں کی اقسام ہیں۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ ایک تقسیم کی اقسام میں تو منافات ہوتی ہے مگر دو قسموں کی اقسام میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ وہ ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں پس ایک ہی آیت میں محکم و حلال دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ جیسے اصول فقہ والوں نے قرآن کی چار تقسیمات کی ہیں۔ جن سے بیس اقسام حاصل ہوتی ہیں پس ہر تقسیم کی اقسام متباین ہونگی۔ خاص اور عام جمع نہیں ہو سکتے، مگر دو تقسیموں کی اقسام جمع ہو سکتی ہیں۔ عبارۃ النص، ظاہر اور خاص تینوں ایک ساتھ جمع ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک تقسیم کی رو سے قرآن کی دو قسمیں ہیں: حلال اور حرام اور دوسری تقسیم کی رو سے بھی دو قسمیں ہیں: محکم اور متشابہ۔ پس حلال و حرام تو جمع نہیں ہو سکتے، مگر حلال اور محکم یا حرام اور محکم جمع ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بات جاننی چاہئے کہ اصول دین میں سے: متشابہ آیات و احادیث میں غور نہ کرنا ہے۔ متشابہات میں سے جو آیات و احادیث امور آخرت سے متعلق ہیں ان کے بارے میں تو امت کا اجماع ہے کہ وہ ظاہر پر محمول ہیں، پس ان میں تو کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔ اور نہ ان میں تاویل جائز ہے۔ اور باقی متشابہات میں سے بہت سی آیات

واحادیث میں وہ باتیں مذکور ہیں جن کے بارے میں معلوم نہیں کہ ان کے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی معنی میں سے جو قریب ترین معنی ہیں وہ مراد ہیں۔ مثلاً: صفاتِ متشابہات کی آیات واحادیث جن میں وجہ، ید، استواء اور نزول وغیرہ صفات آئی ہیں: تو ان کے حقیقی معانی مراد ہیں یا ذات، مدد، غلبہ اور توجہ کا منعطف ہونا مراد ہے؟ یہ بات معلوم نہیں، پس ان میں غور کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ اس لئے حدیث میں متشابہ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔

[۲۲] قوله صلى الله عليه وسلم " نزل القرآن على خمسة وجوه: حلالٌ، وحرام، ومحكم، ومتشابِه، وأمثال"

أقول: هذه الوجوه أقسام للكتاب، ولو بتقسيمات شتى، فلاجرم ليس فيها تمانعٌ حقيقي، فالحكمُ يكون تارةً حلالاً، وأخرى حرامًا.

ومن أصول الدين. تركُ الخوض بالعقل في المتشابهات من الآيات والأحاديث. ومن ذلك أمور كثيرة، لا يُدرى أُريد حقيقةُ الكلام أم أَقربُ مَجازٍ إليها؟ وذلك فيما لم يُجْمِعْ عليه الأئمةُ، ولم تَرْتَفِعْ فيه الشبهةُ. والله أعلم.

ترجمہ: (۲۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "اترا ہے قرآن پانچ طرح پر: حلال اور حرام اور محکم اور متشابہ اور مثالیں"

میں کہتا ہوں: یہ صورتیں کتاب اللہ کی قسمیں ہیں، اگرچہ مختلف تقسیموں سے ہوں۔ پس یقیناً یہ بات ہے کہ ان میں حقیقی تنافی نہیں۔ پس حکم کبھی ہوتا ہے حلال اور کبھی حرام (یعنی یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے)

اور اصول اسلام میں سے ہے: غور نہ کرنا عقل کے ذریعہ متشابہ آیات واحادیث میں۔ اور ان متشابہات میں سے بہت سی چیزیں: نہیں جانا جاتا کہ آیا کلام کے حقیقی معنی مراد لئے گئے ہیں یا حقیقی معانی سے قریب ترین مجازی معنی مراد لئے گئے ہیں؟ اور یہ (نہ جاننا) ان آیات واحادیث میں ہے جن پر امت نے اتفاق نہیں کیا اور جن کے سلسلہ میں اشتباہ رفع نہیں ہوا (اور جو امورِ آخرت سے متعلق آیات واحادیث ہیں، ان کے بارے میں امت میں اتفاق ہے کہ ان کی حقیقی معانی مراد ہیں۔ پس وہ متشابہات کے زمرہ میں شامل نہیں) باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(الحمد للہ! باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ اور کتاب العلم کی احادیث کی شرح مکمل ہوئی)

دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حِکم کا بیان

کتاب الطہارۃ

باب (۱) طہارت کے سلسلہ کی اصولی باتیں

باب (۲) فضیلتِ وضوء

باب (۳) وضوء کا طریقہ

باب (۴) آداب وضوء

باب (۵) نواقض وضوء کا بیان

باب (۶) خفین پر مسح کا راز

باب (۷) غسل کا طریقہ

باب (۸) غسل واجب کرنے والی چیزوں کا بیان

باب (۹) جنبی اور بے وضوء کے لئے کیا کام جائز ہیں اور کیا ناجائز؟

باب (۱۰) تیمم کا بیان

باب (۱۱) قضائے حاجت کے آداب

باب (۱۲) فطرت کی باتیں اور ان سے لگتی چیزیں

باب (۱۳) پانی کے احکام

باب (۱۴) نجاستوں کو پاک کرنے کا طریقہ

باب ——— ۱

طہارت کے سلسلہ کی اصولی باتیں

طہارت کی اقسام

طہارت کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: حدث (نجاست حکمیہ) سے طہارت یعنی جن حالتوں میں وضوء یا غسل واجب ہوتا ہے، ان حالتوں میں وضوء یا غسل کر کے پاکی حاصل کرنا۔

دوسری قسم: ظاہری گندگی (نجاست حقیقیہ) سے طہارت۔ خواہ وہ بدن پر لگی ہو، یا کپڑوں پر، یا جگہ پر۔

تیسری قسم: جسم کے مختلف حصوں میں جو میل کچیل پیدا ہوتا ہے اس کی صفائی کرنا۔ جیسے منہ اور دانتوں کی صفائی، ناک کے نتھنوں کی صفائی، اور بغل اور زیر ناف کے بال اور ناخن کاٹنا۔

فائدہ: طہارت کی پہلی قسم کا تعلق اصول برّ سے ہے یعنی احداث سے طہارت ایک عبادت ہے۔ وضوء اور غسل شرعی احکام ہیں۔ اور طہارت کی باقی دو قسموں کا تعلق ارتفاقات (آداب معیشت) اور اقتضائے طبیعت سے ہے۔ چنانچہ دنیا کی تمام متمدن اقوام ان کا اہتمام کرتی ہیں۔ وہ انسان کا فطری اقتضاء ہیں اس لئے وہ تمام اقوام وملل میں رائج ہیں اور وضوء اور غسل صرف مسلمانوں میں رائج ہیں۔

حدث وطہارت کی پہچان

حدث کیا چیز ہے؟ اور طہارت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا مدار انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذوق ووجدان پر ہے۔ کیونکہ وہ ایسے عالی نفوس والے ہیں جن میں ملکوتی انوار ظاہر ہوئے ہیں۔ وہ جس حالت کے پیش آنے پر انقباض محسوس کرتے ہیں وہ حدث ہے۔ اور جس حالت میں سرور وانبساط محسوس کرتے ہیں وہ طہارت ہے۔

طہارت کی شکلوں اور موجبات طہارت کی پہچان:

احداث سے پاکی کیسے حاصل کی جائے؟ اور وہ کیا اسباب ہیں جو طہارت کو لازم کرتے ہیں؟ اس کا مدار ملل

سابقہ کے مسلمات پر ہے۔ یہود و نصاریٰ اور مجوس میں اور ملت اسماعیلی کی باقی ماندہ تعلیمات میں جو باتیں مشہور تھیں، وہ ان دونوں باتوں کی بنیاد ہیں۔ یہ ملتیں نجاستِ حکمیہ کی دو قسمیں کرتی تھیں: اصغر اور اکبر۔ اسی طرح طہارت کی بھی دو قسمیں کرتی تھی: اصغر اور اکبر۔ اور عربوں میں غسلِ جنابت کا رواج عام تھا۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پاکی کی دو قسموں کو حدث کی دو قسموں پر تقسیم کیا۔ حدث اکبر کی صورت میں طہارت کبریٰ رکھی۔ کیونکہ یہ حدث (جنابت اور حیض) بہت کم پیش آتا ہے۔ اور جب وہ پیش آتا ہے تو آلودگی بہت ہوتی ہے۔ اور نفس کسی ایسے سخت عمل کے ذریعہ تنبیہ کا محتاج ہوتا ہے جو روز روز نہ کیا جاتا ہو یعنی غسل کے ذریعہ اس کو چوکنا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور حدث اصغر کی صورت میں طہارت صغریٰ رکھی۔ کیونکہ یہ حدث (بول و براز) بکثرت پیش آتا ہے۔ اور اس میں آلودگی کم ہوتی ہے۔ اور اس میں نفس کو معمولی تنبیہ بھی کافی ہو جاتی ہے۔

حدث کیا ہے؟

حدث بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ جن کو ذوقِ سلیم رکھنے والے جانتے ہیں۔ مثلاً. گالی بکنا، اولیاء سے عداوت رکھنا، اور گندے تصورات ان سب میں حدث کے معنی ہیں۔ ان سے بھی سلیم الفطرت لوگوں کو انقباض ہوتا ہے۔ مگر وہ چیز جس کا عام لوگوں کو مخاطب بنایا جائے یعنی جسے آئینی شکل دی جائے، وہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جو حسی طور پر منضبط ہو، جس کا نفس پر اثر واضح ہو، تاکہ اس کے ذریعہ برملا روک ٹوک کی جا سکے۔ کہا جا سکے کہ تیری ریح خارج ہو گئی، وضوء کر۔ چنانچہ شریعت نے پیٹ کے قراقر کو حدث قرار نہیں دیا۔ بلکہ درج ذیل تین وجوہ سے سبیلین سے نکلنے والی چیزوں کو حدث قرار دیا ہے:

پہلی وجہ: پیٹ کا بولنا معلوم المقدار نہیں یعنی یہ متعین نہیں کیا جا سکتا کہ کتنے اختلاج کو حدث قرار دیا جائے۔ نیز پیٹ کے گڑگڑانے کو حدث قرار دینے کی صورت میں جب وہ اختلاج پایا جائے گا، تو وضوء کے ذریعہ اس کا مداوا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وضوء ایک بیرونی چیز ہے جو باطن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی یعنی وضو سے پیٹ کا اختلاج ختم نہیں ہو سکتا۔ اور سبیلین سے نکلنے والی چیزیں محسوس ہیں۔ اس لئے انکی مقدار کی تعیین بھی کی جا سکتی ہے، اور خارج کا خارجی تدبیر سے علاج بھی ممکن ہے۔

دوسری وجہ: جب سبیلین سے کوئی چیز نکلتی ہے تو نفس کو انقباض ہوتا ہے۔ اور اس انقباض کا آدمی میں پیکر محسوس پایا جاتا ہے۔ یعنی نجاست کے ساتھ جو جسم آلودہ ہوتا ہے وہ اس انقباض کا واضح نائب (قائم مقام) ہے۔ اس لئے سبیلین سے نکلنے والی چیز کو حدث گردانا جا سکتا ہے۔ اور پیٹ کے بولنے سے بھی اگرچہ نفس منقبض ہوتا ہے۔ مگر اس کا پیکر محسوس اور واضح نائب موجود نہیں، کیونکہ اس سے جسم آلودہ نہیں ہوتا، اس لئے اس کو حدث قرار دینا مشکل ہے۔

تیسری وجہ: وضوء کا نفس پر اثر اس وقت پڑتا ہے جب نفس کا حدث میں اشتغال ختم ہو جائے اور اس کی مصروفیت نجاست نکل جانے ہی سے ختم ہو سکتی ہے، کیونکہ پیٹ کا بولنا جب تک جاری ہے حدث کی حالت مستمر ہے۔ پس اس حالت میں وضوء اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

فائدہ: اور پیٹ کی گڑبڑ ایک طرح سے حالت حدث ہے اس پر تنبیہ اُس حدث میں آئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: ''تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں نماز نہ پڑھے کہ اس سے دو گندی چیزیں (پیشاب اور پاخانہ) مزاحمت کر رہی ہوں'' (مسلم ۵:۴۷ مصری و اللفظ لأبی عوانة ۱۶:۲) یعنی چھوٹی بڑی حاجت کے شدید تقاضے کی صورت میں نماز نہیں پڑھنی چاہئے کہ یہ بھی گونہ حدث کی حالت ہے، کامل طہارت کی حالت نہیں ہے۔

طہارتیں کیا ہیں؟

وہ چیزیں جن کو پاکی قرار دیا جا سکتا ہے بہت ہیں۔ جیسے خوشبو لگانا، ایسے اذکار اور ایسی دعائیں مانگنا جو پاکی کی خصلت یاد دلائیں۔ جیسے یہ دعا کرنا کہ الٰہی! مجھے گناہوں اور گندگیوں سے پاک فرما۔ اور یہ دعا کہ الٰہی! مجھے گناہوں سے ایسا پاک کر دے جیسا کپڑا میل کچیل سے پاک کیا جاتا ہے، اسی طرح متبرک جگہ میں پہنچنا، اور اس قسم کی دوسری چیزوں سے بھی نفس میں سرور و انبساط پیدا ہوتا ہے، جو وضوء و غسل سے پیدا ہونے والی حالت کے مشابہ ہے، اس لئے اس کیفیت کو بھی پاکی کہہ سکتے ہیں۔

غرض ایسی چیزیں بہت ہیں جن میں طہارت کے معنی پائے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر چیز کو پاکی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پاکی اسی چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے اور عام لوگوں کو اسی کا مخاطب بنایا جا سکتا ہے جس کے کرنے کا کوئی طریقہ متعین ہو، اور جس کو ہر جگہ ہر شخص آسانی سے کر سکے، اور جس کا اثر واضح طور پر نفس پر پڑے، اور جس کو دنیا کے تمام مذاہب نے طہارت تسلیم کیا ہو —— ایسی چیزیں صرف دو ہیں: وضوء اور غسل۔

وضوء: دراصل جسم کے اطراف کو دھونے کا نام ہے۔ شریعت نے طرف اعلیٰ میں سے سر اور چہرے کو لیا ہے۔ سر پر مسح کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ اس کو بار بار دھونے میں حرج ہے۔ اور چہرہ کو لفظ وجہ سے منضبط کیا ہے یعنی جس قدر حصہ سے مواجہہ (سامنا) ہوتا ہے وہ چہرہ ہے اس کو دھونے کا حکم دیا۔ اور بیچ سے دونوں ہاتھوں و کہنیوں سمیت لیا، کیونکہ اس سے کم مقدار دھونے کا طبیعت پر کوئی واضح اثر نہیں پڑتا اور طرف اسفل سے دونوں پیروں کو ٹخنوں سمیت لیا۔ کیونکہ ٹخنوں کے ساتھ قدم ایک مکمل عضو ہے، اس سے کم مقدار عضو تام نہیں۔

اور غُسل: دراصل سارے بدن کو دھونے کا نام ہے۔

اور موجبات وضوء: دراصل وہ چیزیں ہیں جو سبیلین سے نکلتی ہیں۔ اور دیگر احداث جیسے قے، پیپ اور خون بعض

علماء کے نزدیک اور مسِّ ذکر اور مسِّ عورت دوسرے حضرات کے نزدیک، یہ سب ما خرج من السبیلین کے ساتھ ملحق ہیں۔ اس لئے کہ ان سے بھی نفس منقبض ہوتا ہے۔

اور موجباتِ غسل: دو ہیں: صحبت اور حیض ونفاس۔ ان دونوں چیزوں کا موجبِ غسل ہونا قدیم عربوں میں تقریباً مسلم تھا۔

فائدہ: شارع نے بھی ان دونوں پاکیوں کو مسلّم رکھا ہے۔ اور ان کے احکام متعین کئے ہیں۔ اور تعین احکام میں نہ تو تہذیب کے ادنیٰ درجہ کا اعتبار کیا ہے، نہ اعلیٰ درجہ کو پیش نظر رکھا ہے، بلکہ عربوں کی متوسط تہذیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور یہ بات صرف طہارت کے باب ہی میں نہیں، بلکہ معیشت وعمرانیات کی جو بھی باتیں بیان کی ہیں، ان میں اسی متوسط حالت کا لحاظ کیا ہے۔ اور قوانین بناتے وقت اس بات کا بھی لحاظ کیا ہے کہ بالکل نئے قوانین نہ بنائے جائیں۔ بلکہ عربوں میں ان دونوں طہارتوں کے جو طریقے رائج تھے انہی کو سنوار دیا جائے، اور ان کے آداب کی تعیین کی جائے، جیسے پندرہ دن میں ناخن اور زیر ناف کاٹ لینے چاہئیں؛ اور چالیس دن سے زیادہ نہ کاٹنا مکروہ تحریمی ہے۔ اسی طرح جو چیزیں مشتبہ تھیں، ان کے احکام پوری وضاحت کے ساتھ متعین کئے۔ جیسے ڈاڑھی اور مونچھ میں امتیاز کیا گیا، اول کو باقی رکھنے کا اور ثانی کو مبالغہ کے ساتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ کیونکہ لوگوں میں سے کوئی تو دونوں کو کاٹتا ہے، اور کوئی دونوں کو چھوڑتا ہے اور کوئی ڈاڑھی کاٹتا ہے اور مونچھیں بڑھاتا ہے۔ اسلام میں یہ سب صورتیں ممنوع ہیں۔

عرب ڈاڑھی اور مونچھ دونوں بڑھاتے تھے۔ عربی میں مونچھ کو شارب (پینے والی) کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کھانے پانی میں آلودہ ہوتی تھی۔ اور ایرانی ڈاڑھی مونڈھتے تھے اور مونچھیں بڑھاتے تھے۔ اسلام نے حکم دیا کہ ڈاڑھی بڑھائی جائے، اور مونچھوں کو پست کیا جائے، تاکہ اسلامی چہرہ سب سے ممتاز ہو جائے۔

اسی طرح اگر کوئی چیز مبہم تھی تو شریعت نے اس کا پیمانہ مقرر کیا۔ مثلاً: یہ بات کہ بدن میں میل کچیل پیدا ہوا یا نہیں؟ ایک مبہم چیز ہے۔ عام لوگوں کے لئے اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ کیونکہ کوئی تو روزانہ نہاتا ہے، اور کوئی ہفتوں مہینوں نام نہیں لیتا۔ اس لئے اسلام نے ہفتہ کی مقدار متعین کی۔ اور جمعہ کے دن نہانا مسنون کیا۔ کیونکہ اتنی مدت گزرنے پر عام طور پر جسم میں میل کچیل پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

﴿من أبواب الطهارة﴾

اعلم أن الطهارة على ثلاثةِ أقسامٍ:

[۱] طهارةٌ من الحدث.

[۲] وطهارةٌ من النجاسة المتعلِّقة بالبدن، أو الثوب، أو المكان.

[۳] وطهارةٌ من الأوساخ النابتةِ من البدن، كشَعر العانة، والأظفار، والدَّرَن.

أما الطهارةُ من الأحداث فماٌ خوذةٌ من أصول البر.

والعمدة فی معرفة الحدث وروح الطهارة: وجدانُ أصحاب النفوس التی ظهرتْ فیها أنوارٌ ملَکیة، فاحسّتْ بمنافرتها فی الحالة التی تُسمی حدثًا، وسرورها وانشراحها فی الحالة التی تسمی طهارةً.

وفی تعیین هیئات الطهارة وموجباتِها: ما اشتهر فی الملل السابقة: من الیهود والنصاری، والمجوس، وبقایا الملة الإسماعیلیة؛ فکانوا یجعلون الحدث علی قسمین. والطهارة علی ضربین، کما ذکرنا من قبلُ؛ وکان الغسلُ من الجنابة سنةً سائرةً فی العرب، فوزّع النبیُّ صلی اللہ علیه وسلم قسمیِ الطهارةِ علی نوعَی الحدث: فجعل الطهارة الکبری بإزاء الحدث الأکبر، لأنه أقلُّ وقوعًا، وأکثر لوثًا، وأحوجُ إلی تنبیه النفس بعمل شاقّ، قلّما یُفعل مثلُه؛ والطهارة الصغری بإزاء الحدث الأصغر، لأنه أکثر وقوعًا، وأقلُّ لوثًا، ویکفیه التنبیه فی الجملة.

ترجمہ: طہارت سے تعلق رکھنے والی روایات: جان لیں کہ طہارت کی تین قسمیں ہیں: (۱) حدث سے طہارت (۲) اس نجاست سے طہارت جو تعلق رکھنے والی ہے بدن سے، یا کپڑے سے، یا جگہ سے (۳) اور اس میل کچیل سے طہارت جو بدن میں پیدا ہونے والا ہے۔ جیسے زیر ناف کے بال، اور ناخن اور میل کچیل ——— رہی احداث سے طہارت تو وہ لی ہوئی ہے نیکی کے اصولوں سے۔

اور مدار حدث اور طہارت کی روح کی معرفت میں ایسے نفوس والوں کے ذوق پر ہے جن میں ملکوتی انوار ظاہر ہوئے ہیں۔ پس محسوس کی ہے ان نفوس نے اپنی عدم مناسبت اس حالت سے جو حدث کہلاتی ہے اور (محسوس کیا ہے) اپنا سرور وانبساط اس حالت سے جو طہارت کہلاتی ہے۔

اور (مدار) طہارت کی شکلوں، اور اس کو واجب کرنے والی چیزوں کی تعیین میں اُن باتوں پر ہے جو گذشتہ ملتوں میں مشہور تھیں۔ یعنی یہود، نصاری، مجوس اور باقی ماندہ ملت اسماعیلی۔ پس وہ لوگ حدث کی دو قسمیں کیا کرتے تھے، اور طہارت کی بھی دو قسمیں کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے (رحمۃ اللہ ۲۔۴۲) اور جنابت کا غسل ایک عام طریقہ تھا عربوں میں۔ پس تقسیم کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت کی دونوں قسموں کو حدث کی دونوں قسموں پر۔ پس گردانا طہارت کبری کو حدث اکبر کے مقابلہ میں، اس لئے کہ حدث اکبر کم ہے واقع ہونے کے اعتبار سے، اور زیادہ ہے تلویث کے اعتبار سے۔ اور زیادہ محتاج ہے نفس کو تنبیہ کرنے کا کسی ایسے دشوار عمل کے ذریعہ جس کا مانند کم کیا جاتا ہو۔ اور (گردانا) طہارت صغریٰ کو حدث اصغر کے مقابلہ میں، اس لئے کہ حدث اصغر زیادہ ہے واقع ہونے کے اعتبار سے، اور کم ہے تلویث کے اعتبار سے، اور کافی ہے اس میں فی الجملہ (کسی درجہ میں) تنبیہ۔

ترکیب: فی تعیین کا عطف فی معرفة الحدث پر ہے۔

تصحیح: فی الحالة پہلی جگہ اصل میں اور تینوں مخطوطوں میں للحالة تھا۔ میں نے دوسرے فی الحالة کے قرینہ سے تصحیح کی ہے۔

والأمورُ التی فیها معنی الحدث کثیرة جدًا، یَعرفها أهلُ الأذواق السلیمة، لکنّ الذی یصلُح أن یخاطَب به الناسْ کافَّةً: ما هو منضبطٌ بأمور محسوسةٍ، ظاهرةِ الأثر فی النفس، لیمکن المواخَذَةُ به جهرةً، فلذلك:

تُعیِّنَ أن لایُدار الحکمُ علی اشتغال النفس بما یَختَلجُ فی المعدة، ولکنْ یُدار علی خروج شیئ من السبیلین، فإن الأول غیرُ مضبوطِ المقدار، وإذا تمکّن لایرفعُه الوضوء من خارج، والثانی معلومٌ بالحس.

وأیضًا: فللمعنی انقباض النفس فیه شبَحٌ محسوسٌ، وخلیفتُه ظاهرة، وهی التلطُّخ بالنجاسة.

وأیضاً: إنما یؤثر الوضوء عند زوال اشتغال النفس، وذلك بالخروج، وقد نبَّه النبی صلی الله علیه وسلم فی قوله:" لایصلّ أحدکم وهو یدافعُه الأخبثان": أن نفس الاشتغال فیه معنی من معانی الحدث

ترجمہ: اور وہ چیزیں جن میں حدث کے معنی (انقباض) ہیں بہت زیادہ ہیں۔ پہچانتے ہیں ان کو سلیم ذوق رکھنے والے۔ البتہ وہ چیز جو اس قابل ہے کہ اس کے ذریعہ تمام لوگوں کو خطاب کیا جائے یعنی سب کو اس کا حکم دیا جائے، وہ وہی ہے جو محسوس چیزوں کے ساتھ منضبط ہو، جس کا اثر نفس میں واضح ہو، تاکہ اس کے ذریعہ علی الاعلان دارو گیر ہو سکے، پس اسی وجہ سے۔

متعین کی گئی یہ بات کہ حکم دائر نہ کیا جائے نفس کی مشغولیت پر اس چیز کے ساتھ جو پیٹ میں کُڑکُڑاتی ہے۔ بلکہ حکم دائر کیا جائے سبیلین سے کسی چیز کے نکلنے پر۔ اس لئے کہ اول کی مقدار منضبط نہیں ہے۔ اور جب وہ پایا جائے گا تو نہیں رفع کرے گا اس کو باہر سے وضوء کرنا۔ اور دوسری چیز حسی طور پر معلوم ہے۔

اور نیز: نفس کے انقباض کے معنی کے لئے (اس میں لفظ معنی زائد ہے، مراد انقباض ہے) آدمی میں پیکر محسوس ہے۔ اور اس کا نائب واضح ہے (عطف تفسیری ہے۔ پیکر اور خلیفہ ایک ہی چیز ہیں) اور وہ نائب نجاست کے ساتھ لت پت ہوتا ہے۔

اور نیز: وضوء اثر انداز ہوتا ہے نفس کی مشغولیت کے ختم ہونے کی صورت ہی میں۔ اور وہ (مشغولیت کا ختم ہونا) نجاست نکلنے سے ہے۔ اور تحقیق آگاہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد لایصل الخ میں اس بات پر کہ خود مشغولیت، اس میں حدث کے معانی میں سے کوئی معنی ہیں (یعنی اس سے بھی گونہ انقباض ہوتا ہے)

تصحیح: لیمکن المؤاخذة اصل میں لتمکن المؤاحذة تھا۔تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے یدافعه الأخبثان اصل میں یدافع الأخبثین تھا۔تصحیح تینوں مخطوطوں اور مسند ابی عوانہ سے کی ہے دافعہ: مزاحمت کرنا اخبث (اسم تفضیل) نہایت ناپاک۔یہ فاعل ہے۔

والأمور التی فیها معنی الطهارة کثیرة، کالتطیُّب، والأذکار المذکّرة لهذه الخَلّة، کقوله: "اللّٰهم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطهّرین" وقوله: "اللّٰهم نقّنی من الخطایا، کما نقّیت الثوب الأبیض من الدنس" والحلولِ بالمواضع المتبرکة، ونحوِ ذلك، لکنّ الذی یصلُح أن یخاطَب به جماهِرُ الناس: مایکون منضبطًا متیسّرًا لهم کلَّ حین وکلَّ مکان، والذی یُحَسُّ أثرُه بادی الرأی، والذی جری علیه طوائف الأمم.

وأصل الوضوء: غسل الأطراف، فضَبط الوجهَ بما ضبطه، والیدین إلی المرفقین، لأن دون ذلك لایُحَس أثرُه، والرِّجلین إلی الکعبین، لأن دون ذلك لیس بعضو تامٍ، وجعل وظیفةَ الرأسِ المسحَ، لأن غسلَه نوعٌ من الحرج.

وأصل الغُسل: تعمیم البدن بالغَسل.

وأصل موجِبِ الوضوء: الخارج من السبیلین، وما سوی ذلك محمولٌ علیه.

وأصل موجِب الغسل: الجماع، والحیض، وکأن هذین الأمرین کانا مسلَّمین فی العرب قبل النبی صلی الله علیه وسلم.

وأما القسمان الآخران من الطهارة · فمأحوذان من الارتفاقات، فإنهما من مقتضی أصل طبیعة الإنسان، لایفك عنهما قوم ولاملة، والشارع اعتمد فی ذلك علی ما عد العرب القَحّ من الرفاهیة المتوسطة، کما اعتمد علیه فی سائر ما ضبط من الارتفاقات، فلم یزد النبی صلی الله علیه وسلم علی تعیین الآداب، وتمییز المشکل، وتقدیر المبهم.

ترجمہ: اور وہ چیزیں جن میں طہارت کے معنی (سرور وانبساط) ہیں بہت ہیں۔جیسے خوشبو لگانا۔اور یہ خصلت یعنی طہارت کو یاد دلانے والے اذکار، جیسے قائل کا قول· اللّٰهم اجعلنی إلخ اور قائل کا قول: اللّٰهم نقنی إلخ اور بابرکت جگہوں میں اترنا، اور اس جیسی چیزیں۔لیکن وہ چیز جو صلاحیت رکھتی ہے کہ اس کے ذریعہ عام لوگوں کو مخاطب بنایا جائے یعنی ان کو بتلائی جائے، وہ ہے جو منضبط ہو، آسان ہو لوگوں کے لئے ہر وقت میں اور ہر جگہ میں اور جس کا اثر محسوس کیا جائے واضح طور پر، اور جس پر چلتے رہے ہوں تمام مذاہب۔

اور وضو کی اصل اطراف بدن کا دھونا ہے۔پس شارع نے چہرے کو منضبط کیا اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ اس کو

منضبط کیا۔اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت منضبط کیا۔اس لئے کہ اس سے کم نہیں محسوس کیا جاتا اس کا اثر۔اور دونوں پیروں کو ٹخنوں سمیت منضبط کیا، اس لئے کہ اس سے کم نہیں ہے عضو تام۔اور گردانا سر کا حکم مسح۔اس لئے کہ اس کا دھونا ایک طرح کی پریشانی ہے۔

اور غسل کی اصل: سارے ہی بدن کو دھونا ہے۔

اور وضوء واجب کرنے والی چیزوں کی اصل: وہ چیز ہے جو سبیلین سے نکلتی ہے۔اور جو چیزیں اس کے علاوہ ہیں وہ اس پر محمول ہیں یعنی ان کو سبیلین سے نکلنے والی چیز کا حکم دیا گیا ہے۔

اور غسل واجب کرنے والی چیزوں کی اصل: جماع اور حیض ہیں۔اور گویا یہ دونوں چیزیں مسلّم تھیں عربوں میں نبی ﷺ سے پہلے۔

رہی طہارت کی دوسری دو قسمیں. تو وہ دونوں لی ہوئی ہیں ارتفاقات سے۔پس بیشک وہ دونوں طہارتیں انسان کی طبیعت کی اصل کا مقتضی ہیں (اس میں لفظ اصل زائد ہے) نہیں جدا ہوتی ان دونوں سے کوئی قوم اور نہ کوئی ملت۔اور شارع نے اعتماد کیا ہے ان دونوں طہارتوں میں اس چیز پر جو خالص عربوں کے پاس تھیں درمیانی تمدن سے، جیسا کہ اعتماد کیا ہے اس پر دیگر ان چیزوں میں جو منضبط کی ہیں شارع نے ارتفاقات میں سے۔پس نہیں زیادہ کیا نبی ﷺ نے آداب کی تعیین پر، اور مشتبہ کے امتیاز پر اور مبہم کا اندازہ کرنے پر۔

تصحیح: بما صطه: تینوں مخطوطوں سے بڑھایا ہے۔اصل میں نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۲

فضیلتِ وضوء

وہ احادیث جو وضوء کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں

پاکی آدھا ایمان ہے

پہلے ابواب الایمان میں یہ حدیث گذری ہے کہ پاکی آدھا ایمان ہے۔اور وہیں ایمان کے چار معانی بھی بیان کئے گئے ہیں۔چوتھے معنی ہیں: ''دل کا سکون واطمینان'' یہ ایک وجدانی کیفیت ہے، جو طہارت واخبات کے انوار کا مرکب ہے۔جب آدمی مسلسل پاکی کا اہتمام کرتا ہے، اور اس کا دل بارگاہ خداوندی میں نیاز مند بنا رہتا ہے تو یہ نورانی

کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو مؤمن کے لئے باعث طمانیت ہے۔ مذکورہ حدیث میں ایمان سے یہی حالت مراد ہے، تصدیق قلبی مراد نہیں۔ اور اس کیفیت کے لئے ایمان کے بجائے احسان کا لفظ زیادہ موزون ہے۔ اور جب یہ کیفیت دو چیزوں (پاکی اور نیازمندی) کا مجموعہ ہے تو پاکی بالیقین اس کا آدھا ہے۔

وضوء سے گناہ معاف ہوتے ہیں

حدیث ـــــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جو شخص وضوء کرے، پس عمدہ وضوء کرے یعنی آداب کی رعایت کے ساتھ وضوء کرے، تو اس کے گناہ اس کے بدن سے نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں یعنی وہ خطاؤں سے بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے۔

تشریح: جب پاکی کا اثر دل کی جڑ تک پہنچ جاتا ہے یعنی آدمی کا باطن پاک ہو جاتا ہے تو تین فائدے حاصل ہوتے ہیں: اول: وہ باطنی طہارت نفس کو مقدس بناتی ہے۔ دوم: وہ اس نفس کو ملائکہ کی لڑی میں پروتی ہے۔ سوم: وہ بہت سے گندے احوال کو فراموش کرا دیتی ہے۔ پس طہارت باطنی کا جو خاصہ تھا یعنی گندے احوال کو فراموش کرا دینا وہ وضوء کو دیدیا گیا۔ پس وہ بھی گناہوں کی معافی کا سبب بن جاتا ہے۔ کیونکہ وضوء طہارت باطنی کا پیکر محسوس، احتمالی جگہ اور عنوان تعبیری ہے یعنی طہارت باطنی وضوء کے ذریعہ بھی حاصل کی جاتی ہے اور آدمی اپنی طہارت کو وضوء سے تعبیر بھی کرتا ہے کہتا ہے کہ میں باوضوء ہوں۔

قیامت کے دن اعضائے وضو روشن ہوں گے

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میری امت قیامت کے دن بلائی جائے گی، روشن پیشانی، سفید اعضاء، وضوء کے اثر سے، پس جو چاہے کہ اپنی پیشانی کی روشنی کو دراز کرے، تو چاہئے کہ کرے'' (مشکوۃ ۲۹۰)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مؤمن کو زیور پہنایا جائے گا جہاں تک وضوء کا پانی پہنچے گا'' (مشکوۃ ۲۹۱)

تشریح: طہارت باطنی کا پیکر محسوس اعضائے خمسہ (چہرہ، دو ہاتھ اور دو پاؤں) کو دھونا ہے۔ پس طہارت باطنی کی وجہ سے نفس کو جو خوش عیشی حاصل ہوگی، وہ اُن اعضاء کے زیور، پیشانی کی روشنی اور ہاتھ پاؤں کی چمک کی صورت میں متشکل ہوگی۔ کیونکہ واقعات خارجیہ کی بھی خوابوں کی طرح تعبیر ہوتی ہے۔ پس جس طرح خواب میں بزدلی وبُز (بلی سے چھوٹا ایک جانور جس کی دم اور کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں) اور بہادری شیر کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح

طہارت باطنی کی برکت سے نفس کی لطف اندوزی زیوراور اعضائے وضوء کی چمک کی صورت اختیار کرے گی۔

ہمیشہ باوضوء رہنا ایمان کی نشانی ہے

حدیث ـــــ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِستقیموا، ولن تُحصُوا، واعلموا أن خَیرَ أعمالِکم الصلاۃُ، ولایُحافظُ علی الوضوء إلا مؤمن. ترجمہ: سیدھے رہو یعنی اعمال پر مستقیم رہو اور ہمیشہ سیدھی راہ چلو اور ہرگز تم اس کی طاقت نہیں رکھتے یعنی کامل استقامت تو بہت مشکل امر ہے، پس حتی الامکان مستقیم رہو۔ اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں سب سے بہتر نماز ہے (یعنی تمام اعمال پر مستقیم نہ رہ سکو، تو کم از کم نماز کا اہتمام تو ضرور کرو، کیونکہ وہ عبادات میں سب سے عمدہ ہے، اور اس کا مقدمہ وضوء ہے) اور وضوء پر محافظت نہیں کرتا مگر مؤمن (مشکوۃ ۲۹۲)

تشریح: ہمیشہ باوضوء رہنا ایک سخت دشوار عمل ہے۔ اس پر مداومت وہی شخص کرسکتا ہے جو طہارت کے معاملہ میں بابصیرت ہو (اس کی تفصیل مبحث ۵ باب ۸ میں گذر چکی ہے) اور وضوء کے عظیم فوائد پر کامل یقین رکھتا ہو، اس لئے ہمیشہ باوضوء رہنے کو ایمان کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

﴿فضلُ الوضوء﴾

[۱] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "الطُّهور شَطْرُ الإیمان"

أقول: المراد بالإیمان ههنا: هیئة نفسانیة مرکبة من نور الطهارة والإخبات، والإحسان أوضح منه فی هذا المعنی، ولاشك أن الطُّهور شطره.

[۲] قوله صلی اللہ علیه وسلم: "من توضَّأ، فأحسن الوضوءَ، خرجت خطایاه من جسده، حتی تَخْرُجَ من تحتِ أظفاره"

أقول: النظافةُ المؤثرة فی جدر النفس تُقَدِّسُ النفسَ، وتُلْحِقُهَا بالملائکة، وتُنسی کثیرًا من الحالات الدَّنسیة، فَجُعلت خاصیتُها خاصیةً للوضوء الذی هو شَبْحُهَا ومَظَنَّتُهَا وعنوانُها.

[۳] قوله صلی اللہ علیه وسلم: "إن أمتی یُدْعَوْنَ یوم القیامة غُرًّا مُحجَّلِیْنَ من آثار الوضوء، فمن استطاع منکم أن یُطیلَ غُرَّته فلیفعل" وقوله صلی اللہ علیه وسلم: "تبلغ الحلیة من المؤمن حیث یبلغ الوضوء"

أقول: لما کان شَبْحُ الطهارةِ ما یتعلق بالأعضاء الخمسة، تمثَّلَ تَنَعُّمُ النفس بها حلیةً لتلك الأعضاء، وغرةً وتحجیلا، کما یتمثل الجُبْنُ وبْرًا، والشجاعةُ أسدًا.

[٤] قوله صلی اللہ علیه وسلم: "لایُحافظ علی الوضوء إلا مؤمن"

أقول: لما كان المحافظة عليه شاقةً، لاتتأتى إلا ممن كان على بصيرة من أمر الطهارة، مُوْقِنًا بنفعها الجسيم، جُعلت علامةَ الإيمان.

ترجمہ: فضیلتِ وضوء (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''پاکی آدھا ایمان ہے'' میں کہتا ہوں: یہاں ایمان سے مراد وہ ہیئتِ نفسانیہ ہے جو طہارت اور اخبات کے نور سے مرکب ہے۔ اور لفظ احسان، لفظ ایمان سے اس معنی کے لئے زیادہ موزون ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ پاکی اس ایمان کا نصف ہے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: جس نے وضوء کیا الخ'' میں کہتا ہوں: وہ پاکی جو نفس کی جڑ میں اثر انداز ہونے والی ہے، وہ مقدس بناتی ہے نفس کو، اور ملاتی ہے اس کو فرشتوں سے، اور فراموش کرا دیتی ہے بہت سے ناپاک حالات کو۔ پس گردانی گئی اس باطنی پاکی کی خاصیت اس وضوء کی خاصیت جو کہ وہ اس باطنی نظافت کا پیکر اور احتمالی جگہ اور عنوان تعبیری ہے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشادات: (جن کا ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: جب طہارت باطنی کا پیکر محسوس وہ عمل تھا جو اعضائے خمسہ کے ساتھ متعلق ہے یعنی ان کا دھونا، تو متشکل ہوئی نفس کی خوش عیشی طہارت باطنی کی وجہ سے، زیور کی شکل میں ان اعضاء کے لئے۔ اور پیشانی کی روشنی اور ہاتھ پاؤں کی چمک کی صورت میں۔ جس طرح بزدلی وغیرہ جانور اور بہادری شیر کی صورت میں متشکل ہوتی ہے۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''نہیں مداومت کرتا وضوء پر مگر مؤمن'' میں کہتا ہوں. جب وضوء پر مداومت سخت دشوار عمل تھا، نہیں حاصل ہوتی مداومت مگر اس شخص سے جو بابصیرت ہو طہارت کے معاملہ میں، یقین رکھنے والا ہو اس کے عظیم نفع کا، تو اس مداومت کو ایمان کی نشانی گردانا گیا۔

تصحیح: عنوان فضلُ الوضوء مطبوعہ نسخہ میں فصل فی الوضوء تھا۔ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی گئی ہے۔ اور یہ عجیب تصحیف ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۳

وضوء کا طریقہ

وضوء کا طریقہ: جس کو حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم، وغیرہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، بلکہ آپؐ سے تواتر کے ساتھ وہ طریقہ مروی ہے۔ اور جس پر امت نے اتفاق کیا ہے: وہ یہ ہے کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے دونوں ہاتھوں کو گٹوں تک تین بار دھولے۔ پھر کلی کرے اور ناک میں پانی ڈالے اور

اس کو جھاڑے، پھر چہرہ دھوئے پھر دونوں ہاتھ بغیوں تک دھوئے، پھر سر کا مسح کرے، پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے۔

پیروں کے دھونے کا انکار: اَجلیٰ بدیہیات کا انکار ہے

شیعوں کا فرقہ امامیہ (اثناعشریہ) وضوء میں ننگے پاؤں پر مسح کا قائل ہے۔ یہ گمراہ فرقہ پیروں کے دھونے کا انکار کرتا ہے اور یہ بات ابوعلی جُبائی اور داؤد ظاہری کی طرف بھی منسوب کی گئی ہے۔ یہ لوگ آیت وضوء میں جر والی قراءت سے استدلال کرتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اَجلیٰ بدیہیات کا انکار ہے، یہ انکار ایسا ہی ہے جیسا کوئی غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد کا انکار کرے۔ جو چیز سورج کے انکار کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہ دونوں غزوے تواتر کے ساتھ مروی ہیں۔ اسی طرح وضوء میں خالی پیروں کا دھونا بھی تواتر سے ثابت ہے۔

البتہ دو باتیں ایسی ہیں کہ علماء ان کے فیصلہ میں اس وقت تک توقف کر سکتے ہیں، جب تک حقیقتِ حال خوب روشن نہ ہو جائے:

پہلی بات: اگر کوئی کہے کہ وضوء میں ننگے پیروں کا مسح بھی کرنا چاہئے اور ان کو دھونا بھی چاہئے یعنی دونوں چیزوں کو جمع کرنا چاہئے جیسا کہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی رائے ہے (اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضوء کے شروع میں پیر دھولے، پھر وضوء شروع کرے اور سر کے مسح کے بعد پیروں پر مسح کرے جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں، مگر یہ طریقہ غیر ثابت اور غیر مشروع ہے۔ پیروں کو ان کے نمبر پر دھونا ضروری ہے، ورنہ وضوء خلاف ترتیب ہوگا)

دوسری بات: یا کوئی کہے کہ فرض کا ادنی درجہ مسح کرنا ہے۔ تاہم پیروں کا دھونا بھی ضروری ہے۔ جو شخص پیر نہیں دھوتا وہ سخت سرزنش کا حقدار ہے (معلوم نہیں یہ بات کس نے کہی ہے)

مگر جمہور علماء نے یہ دونوں باتیں قبول نہیں کیں۔ ان کے نزدیک پیروں کا قطعی حکم دھونا اور صرف دھونا ہے۔ پھر کوئی تو جر کی قراءت کو جرّ جوار کہتا ہے اور کوئی نصب و جر کی دونوں قراءتوں کو دو حالتوں پر محمول کرتا ہے یعنی پیروں میں خفین ہوں تو جر والی قراءت کے مطابق ان پر مسح ہوگا۔ اور پیر خالی ہوں تو نصب والی قراءت کے مطابق ان کا دھونا ضروری ہے۔

اور ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ مسح کے دو معنی ہیں: (۱) تر ہاتھ کسی عضو پر پھیرنا (۲) ہلکا دھونا۔ (یہ توجیہ شاہ صاحب نے مسوّی باب وجوب الوضوء الخ میں کی ہے) یعنی جب مسح کا تعلق سر کے ساتھ کیا جائے تو پہلے معنی مراد لئے جائیں۔ اور جب جر والی قراءت میں اس کا تعلق پیروں کے ساتھ کیا جائے تو صنعت استخدام کے طور پر دوسرے معنی مراد لئے جائیں۔ اور دلیل نصب والی قراءت ہے۔ کیونکہ جر کی صورت میں بھی مسح کے پہلے ہی معنی مراد لئے جائیں گے تو دونوں قراءتوں میں تعارض پیدا ہو جائے گا۔

اور صنعتِ استخدام سے کام اس لئے لیا گیا ہے کہ عرب میں پانی بہت کم تھا۔ اور لفظ غُسل میں مبالغہ ہے، اور عام

طور پر لوگ ننگے پاؤں چلتے تھے۔ پس اگر پیروں کو غسل کے تحت لایا جاتا تو ممکن تھا مخاطبین اوّلین کے لئے یہ حکم شاق ہوتا۔ کیونکہ پیروں کو خوب صاف کرنے کے لئے ایک لوٹا پانی درکار ہوگا۔ اس لئے رجلین کو مسح کے تحت لایا گیا، اور اشارہ کیا گیا کہ ہلکا دھونے سے بھی وضوء متحقق ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

کلی، ناک کی صفائی اور ترتیب کی اہمیت

کسی صحیح روایت میں اس کی صراحت نظر سے نہیں گذری کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کلی اور ناک صاف کئے بغیر اور ترتیبِ قرآنی کے خلاف وضوء کی ہو۔ پس یہ تینوں چیزیں وضوء میں نہایت مؤکد ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ تو وضوء میں ترتیب کو فرض کہتے ہیں۔

مضمضہ اور استنشاق دراصل دو مستقل طہارتیں ہیں

منہ اور ناک کی صفائی درحقیقت دو مستقل طہارتیں ہیں۔ اور امورِ فطرت میں شامل ہیں۔ حدیثِ فطرت میں ان کا تذکرہ آیا ہے ان دونوں کو دو مقاصد سے وضوء میں شامل کیا گیا ہے۔

پہلا مقصد: دونوں کی توقیت (وقت مقرر کرنا) پیشِ نظر ہے۔ جس طرح ناخن اور زیرِ ناف کے بال کاٹنے کی مدت مقرر کی گئی ہے اسی طرح ان دونوں سنتوں کو وضوء میں لے کر ان کی توقیت کی گئی ہے کہ رات دن میں جتنی مرتبہ وضوء کرے، دونوں کی صفائی کرے۔

دوسرا مقصد: جسم کے شکنوں کا وضوء غسل میں خیال رکھنا ضروری ہے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وضوء میں آنکھوں کے گوشوں کا بھی مسح فرماتے تھے۔ بلکہ کانوں کا مسح بھی اسی باب سے ہے۔ اور منہ کے اندر کا حصہ اور ناک کے اندر کا حصہ جسم کے شکنوں کے ذیل میں آتا ہے، اس لئے یہ دو مستقل طہارتیں وضوء میں شامل کر لی گئی ہیں۔

مضمضہ اور استنشاق میں فصل اولیٰ ہے یا وصل؟

منہ اور ناک صاف کرنے کے پانچ طریقے ہیں۔ ان میں سے احناف کے نزدیک اَولیٰ چھ چلّو اور فصل ہے۔ یہی امام مالک کی ایک روایت ہے۔ اور یہی زعفرانی کی امام شافعی رحمہ اللہ سے روایت ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول جدید یہ ہے کہ بہتر تین چلّو اور وصل ہے۔ یہی امام مالک کی ایک روایت ہے اور یہی امام احمد کا مختار قول ہے۔

احناف کی تین دلیلیں:

پہلی دلیل: صحیح ابن السکن میں روایت ہے کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے وضوء کیا ثلاثا ثلاثا،

وأفردا المضمضة من الاستنشاق، ثم قالا: هكذا رأينا رسول الله صلى الله عليه وسلم توضأ ۔ یہ روایت حافظ ابن حجر نے التلخیص الحبیر میں ذکر کی ہے، اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا۔

دوسری دلیل: طلحہ بن مُصَرِّف نے دادا عمرو بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت ابوداؤد باب الفرق بین المضمضة والاستنشاق میں ہے۔ فرماتے ہیں فرأيته يفصل بين المضمضة والاستنشاق ۔ ابوداؤد اور منذری نے اس باب میں اس روایت پر سکوت کیا ہے اور ابن الصلاح نے حدیث کو حَسَن کہا ہے۔ اور طبرانی کی روایت کے الفاظ اور زیادہ واضح ہیں۔ اس میں ہے. فمضمض ثلاثا، واستنشق ثلاثا، يأخذ لكل واحد ماء أ جديدًا.

تیسری دلیل: حضرات ابوہریرہ، عثمان، علی، انس رضی اللہ عنہم سے بکثرت روایات مروی ہیں۔ جن میں فمضمض ثلاثاً، واستنشق ثلاثا ہے۔ ثلاثاً کی تکرار فعل پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے۔

شوافع کی دلیل:

جو حضرات وصل کو اولی کہتے ہیں ان کی دلیل حضرت عبداللہ بن زید کی حدیث ہے جس کو عمرو بن یحییٰ کے تلمیذ خالد بن عبداللہ طحان واسطی روایت کرتے ہیں۔ یہ متفق علیہ روایت ہے اور صحیحین میں مختلف طرق سے اس کے جو مختلف الفاظ مروی ہیں ان کو صاحب مشکوۃ نے باب سنن الوضوء میں جمع کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک طریق سے یہ الفاظ آئے ہیں۔ فمضمض واستنشق من كف واحدةٍ، فعل ذلك ثلاثا.

شاہ صاحب کی رائے:

شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ وصل یعنی کلی اور ناک کی صفائی ایک ہی چلو سے کرنے کی روایت فصل کی روایت سے اصح یعنی زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ یہ روایت متفق علیہ ہے (مگر اس روایت میں ایک علت خفیہ ہے جس کی وجہ سے اس سے استدلال مختلف فیہ ہو گیا ہے اور وہ علت یہ ہے کہ من كف واحدة کا اضافہ عمرو بن یحییٰ کے تلامذہ میں سے صرف خالد ہی کرتے ہیں۔ ان کے ہم رتبہ، بلکہ ان سے بھی مضبوط راوی امام مالک اور وُھیب رحمہما اللہ اپنی روایات میں یہ اضافہ نہیں کرتے۔ نہ خالد کی روایت کا کوئی شاہد ہے پس یہ قصہ ایسا ہے جیسا صدقہ فطر کی حدیث میں امام مالک رحمہ اللہ من المسلمین کا اضافہ کرتے ہیں، مگر ان کا کوئی ثقہ متابع نہیں خالد و مالک رحمہما اللہ کی روایات مسلم شریف، کتاب الطہارۃ باب آخر فی صفة الوضوء میں ہیں)

﴿صفة الوضوء﴾

صفة الوضوء على ما ذكره عثمان، وعلى، وعبد الله بن زيد، وغيرهم رضى الله عنهم، عن

النبی صلی اللہ علیہ وسلم، بل تواتر عنه صلی اللہ علیہ وسلم، وتَطابَقَ علیه الأمةُ: أن يَغْسل يديه قبل إدخالهما الإناءَ، ويتمضمض، ويستنثر، ويستنشق، فيغسل وجهَه، فذراعيه إلى المرفقين، فيمسح برأسه، فيغسل رجليه إلى الكعبين.

ولا عبرةَ بقوم تَجارَتْ بهم الأهواءُ، فأنكروا غَسْلَ الرجلين، متمسكين بظاهر الآية، فإنه لافرق عندى بين من قال بهذا القول وبين من أنكر غزوةَ بدرٍ، أو أُحُدٍ، مماهو كالشمس فى رابعة النهار.

نعم من قال: بأن الاحتياطَ الجمعُ بين الغَسل والمسح، أو أن أدنى الفرضِ المسحُ، وإن كان الغسل مما يُلام أشدَّ الملامة على تركه، فذلك أمر يمكن أن يتوقف فيه العلماءُ، حتى تنكشف جليلةُ الحال.

ولم أجد فى رواية صحيحة تصريحًا: بأن النبى صلى اللہ علیہ وسلم توضأ بغير مضمضة، واستنشاق،وترتيب، فهى متأكدة فى الوضوء غاية الوَكادة.

وهما طهارتان مستقلتان من خصال الفطرة، ضُمَّتا مع الوضوء، ليكون ذلك توقيتًا لهما؛ ولأنهما من باب تعهُّدِ المَغابِنِ؛ والوصل بينهما أصح من الفصل.

ترجمہ: وضوء کا طریقہ: وضوء کا طریقہ اس طور پر جس کو روایت کیا ہے حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن زید اور ان کے علاوہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ سے، بلکہ وہ طریقہ آپؐ سے تواتر کے ساتھ مروی ہے۔ اور اس پر امت نے اتفاق کیا ہے: یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو دھوئے ان کو برتن میں ڈالنے سے پہلے۔ اور کلی کرے اور ناک جھاڑے، اور ناک میں پانی ڈالے (ان میں تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے) پھر اپنا چہرہ دھوئے، پھر دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے، پھر اپنے سر کا مسح کرے۔ پھر اپنے دونوں پیر ٹخنوں تک دھوئے۔

اور ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں جن میں خواہشات سرایت کر چکی ہیں، پس انھوں نے پیروں کے دھونے کا انکار کیا۔ آیت کے ظاہر سے تمسک کرتے ہوئے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ کوئی فرق نہیں میرے نزدیک اس کے درمیان جو یہ بات کہتا ہے اور اس کے درمیان جو غزوۂ بدر یا غزوۂ احد کا انکار کرتا ہے۔ ان باتوں میں سے جو کہ وہ آفتاب نصف النہار کی طرح واضح ہیں۔

ہاں جو کہتا ہے کہ: (۱) احتیاط دھونے اور مسح کے درمیان جمع کرنے میں ہے (۲) یا یہ کہ فرض کا ادنی درجہ مسح ہے، اگرچہ دھونا اُن چیزوں میں سے ہے کہ اس کے ترک پر سخت ترین ملامت کی جاتی ہے ——— پس یہ باتیں ممکن ہے کہ توقف کریں اس میں علماء تا آنکہ صورتِ حال واضح طور پر منکشف ہو جائے۔

اور نہیں پائی میں نے کسی روایت میں اس بات کی صراحت کہ نبی ﷺ نے وضوء فرمائی ہے: کلی اور ناک میں پانی

ڈالے بغیر اور ترتیب کے خلاف۔ پس وہ (تینوں باتیں) وضوء میں مؤکد ہیں غایت تاکید۔

اور وہ دونوں دو مستقل طہارتیں ہیں۔ خصالِ فطرت میں سے۔ وہ دونوں وضوء کے ساتھ ملائی گئی ہیں تاکہ ہوے وہ ملانا وقت مقرر کرنا، ان دونوں کے لئے، اور اس لئے کہ وہ دونوں شکنوں کا خیال کرنے کے قبیل سے ہیں ـــــ اور وصل کی روایت زیادہ صحیح ہے فصل کی روایت سے۔

لغات: تطابق القوم: اتفاق کرنا تجاری: ساتھ ساتھ دوڑنا، چلنا مغضن: جسم کی لوٹ، شکن۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۴

آدابِ وضوء

آداب: ادب کی جمع ہے۔ اصطلاح میں ادب کے معنی ہیں. استعمالُ مایُحمد قولاً وفعلاً: شائستہ بات کہنا اور قابل تعریف کام کرنا۔ اور وضوء میں جو باتیں ادب قرار دی گئی ہیں، وہ چار باتوں کو پیش نظر رکھ کر تجویز کی گئی ہیں۔

پہلی بات: جسم کے ایسے شکنوں کو دھونے کا خصوصی اہتمام کرنا، جن تک خصوصی توجہ کے بغیر پانی نہیں پہنچ سکتا۔ اس بات کے پیش نظر وضوء میں چھ باتیں ادب قرار دی گئی ہیں: (۱) کلی کرنا (۲) پانی ڈال کر ناک کی صفائی کرنا (۳) ہاتھوں کی انگلیوں میں خلال کرنا (۴) پیروں کی انگلیوں میں خلال کرنا (۵) ڈاڑھی میں خلال کرنا (۶) انگوٹھی ہلا کر اس کے نیچے پانی پہنچانا۔

دوسری بات: صفائی کا پورا اہتمام کرنا۔ اس بات کے پیش نظر وضوء میں پانچ چیزیں ادب قرار دی گئی ہیں (۱) اعضائے مغسولہ کو تین تین بار دھونا (۲) وضوء کامل کرنا یعنی چہرہ کی جو حد ہے اس سے زیادہ دھونا۔ اور ہاتھوں پیروں کو جہاں تک دھونا ضروری ہے اس سے زائد دھونا (۳) اعضاء کو رگڑ کر دھونا (۴) سر کے مسح کے ساتھ کانوں کا بھی مسح کرنا (۵) جب وضوء پرانی ہو جائے تو تازہ وضوء کرنا۔

تیسری بات: اہم کاموں کی انجام دہی میں اسلامی عرف وعادت کا لحاظ رکھنا۔ اس بات کے پیش نظر پہلے دایاں ہاتھ اور دایاں پیر دھونا ادب قرار دیا گیا ہے۔

ضابطہ کلیہ: اور اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جو کام دونوں ہاتھوں سے یا دونوں پیروں سے کئے جاتے ہیں ان میں دائیں کو ترجیح دینی چاہئے، کیونکہ دایاں اقوی اور اولی ہے۔ جیسے وضوء میں دونوں ہاتھ اور دونوں پیر دھوئے جاتے ہیں اور مسجد میں دونوں پیروں سے داخل ہو سکتے ہیں، پس ایسی جگہوں میں دائیں کو تقدیم حاصل ہوگی۔ اور جو کام اچھے برے ہیں، اور وہ صرف ایک ہاتھ سے کئے جاتے ہیں ان میں اچھے کاموں کے لئے دائیں ہاتھ کو اور گندے کاموں

کے لئے بائیں ہاتھ کو مخصوص کرنا چاہئے۔ جیسے دائیں ہاتھ سے کھانا پینا اور بائیں ہاتھ سے استنجاء کرنا اور ناک جھاڑنا۔

چوتھی بات: نیت صرف دل سے نہیں کرنی چاہئے، بلکہ زبان سے بھی کرنی چاہئے، تاکہ دل اور زبان ہم آہنگ ہوجائیں نیز نیت پر دلالت کرنے والا زبان سے کوئی ذکر بھی کرنا چاہے۔ جیسے احرام میں تلبیہ، نماز میں تکبیر تحریمہ اور وضوء میں تسمیہ۔ غرض زبان سے بھی نیت کرنا اور بسم اللہ والحمد للہ کہہ کر وضوء شروع کرنا ادب ہے۔

﴿ آداب الوضوء ﴾

وآداب الوضوء ترجع إلى معانٍ:

منها: تعهدُ المغابِن التي لايصل إليها الماءُ إلا بعناية، كالمضمضة، والاستنشاق، وتخليل أصابع اليدين والرجلين واللحية، وتحريك الخاتَم.

ومنها: إكمال التنظيف، كتثليث الغَسل، وكالإسباغ، وهو إطالة الغُرّة والتَّحجِيل، والإنقاءِ، وهو الدلك، ومسح الأذنين مع الرأس، والوضوءِ على الوضوء.

ومنها: موافقة عاداتِهم في الأمور المهِمَّة، كالبداءة بالأيمان، فإن اليمين أقوى وأولى، فكان أحقَّ بالبداءة فيما كان بهما، واختصاصُه بالطيبات والمحاسن، دون أضدادها، فيما كان باحداهما.

ومنها: ضبط فعل القلب بألفاظ صريحة في المراد، وصمُّ الذكر اللساني مع القلب.

ترجمہ: وضوء کے آداب چند باتوں کی طرف لوٹتے ہیں:

ان میں سے: جسم کے اُن شکنوں کا خیال رکھنا ہے جن تک پانی نہیں پہنچ سکتا مگر خصوصی اہتمام سے، جیسے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا۔ اور ہاتھوں پیروں کی انگلیوں اور ڈاڑھی کا خلال کرنا اور انگوٹھی کو ہلانا۔

اور ان میں سے: صفائی کی تکمیل کرنا ہے۔ جیسے تین تین بار دھونا۔ اور جیسے وضوء کامل کرنا۔ اور اسباغ چہرے کی چمک کو اور ہاتھوں پیروں کی سفیدی کو دراز کرنا ہے۔ اور جیسے صفائی۔ اور وہ انقاء رگڑنا ہے۔ اور سر کے ساتھ دونوں کانوں کا مسح کرنا اور باوضوء ہوتے ہوئے وضوء کرنا۔

اور ان میں سے: مسلمانوں کے عرف کی ہمنوائی کرنا ہے اہم کاموں میں، جیسے دائیں ہاتھ سے شروع کرنا۔ پس بیشک دایاں قوی تر اور بہتر ہے۔ پس وہ زیادہ حقدار تھا اس سے ابتداء کرنے کا اُن کاموں میں جو دونوں ہاتھوں سے کئے جاتے ہیں۔ اور دائیں کو مختص کرنا ستھری چیزوں اور عمدہ چیزوں کے ساتھ — نہ کہ ان کی اضداد کے ساتھ — اُن کاموں میں جو ایک ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔

اوران میں سے: دل کے عمل (نیت) کو منضبط کرنا ہے صراحت کے ساتھ مراد کو واضح کرنے والے الفاظ کے ذریعہ۔ اور ذکر لسانی کو ملانا ہے ذکر قلبی (نیت) کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

وضوء میں تسمیہ کی بحث

حدیث ——— حضرت سعید بن زید، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لاوُضوء لمن لَمْ یَذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ علیہ: جو شخص وضوء پر اللہ کا نام نہ لے اس کی وضوء نہیں (مشکوٰۃ حدیث ۴۰۲)

تشریح: اس حدیث سے بہ صراحت یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وضوء میں تسمیہ ——— تکبیر تحریمہ کی طرح ——— رکن ہے یا شرط ہے۔ حالانکہ جمہور سنیت یا استحباب کے قائل ہیں۔ کیونکہ خبر واحد اگر اعلیٰ درجہ کی صحیح روایت ہو، اور اس کی دلالت بھی محکم ہو یعنی کوئی دوسرا احتمال نہ ہو تو احناف کے نزدیک اس سے وجوب ثابت ہوتا ہے، اور دیگر ائمہ کے نزدیک اس سے فرضیت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اور تسمیہ کی مذکورہ روایت نہ اعلیٰ درجہ کی صحیح روایت ہے، نہ اس کی دلالت محکم ہے۔ اس میں احتمال ہے کہ لا نفی کمال کا ہو یا اللہ کا نام لینے سے مراد نیت ہو۔ پس اس روایت سے زیادہ سے زیادہ سنیت یا استحباب ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ شاہ صاحب کے کلام کا خلاصہ ہے۔ اب تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

اس حدیث کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق نہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی عدم صحت پر تقریباً تمام اکابر محدثین متفق ہیں، تو یہ بات زیادہ درست ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے علم میں اس مسئلہ میں کوئی ایسی حدیث نہیں جس کی سند عمدہ ہو: لا أعلمُ فی ھذا الباب حدیثًا لہ إسناد جَیِّد۔ علامہ مُنذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں متعدد حدیثیں ہیں، جن کی سندیں درست نہیں ہیں: فی ھذا الباب أحادیثُ، لیست أسانیدھا مستقیمۃً محدث بزار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں مروی کوئی بھی روایت قوی نہیں: کلُّ ما رُوی فی ھذا الباب فلیس بقوی۔

اور بر تقدیر صحت یعنی اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس قولی روایت میں اور آنحضور ﷺ سے مروی وضوء کی تمام فعلی روایات میں اختلاف ہے۔ اور ساتویں مبحث کے تیسرے باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ سے دین اخذ کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک تلقی ظاہر۔ دوم: تلقی دلالۃً۔ اب ایک طرف تو یہ قولی حدیث ہے جس سے وضوء میں تسمیہ کا ضروری ہونا صراحۃً ثابت ہوتا ہے۔ دوسری طرف تمام فعلی روایات ہیں۔ مسلمان برابر نبی ﷺ کی وضوء نقل کرتے رہے ہیں۔ اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ مگر کسی روایت میں تسمیہ کا ذکر نہیں، تا آنکہ تدوین حدیث کا دور آیا، تو یہ قولی ارشاد سامنے آیا۔ غرض امت نے جو دلالۃً دین اخذ کیا ہے اس سے یہ حدیث مختلف۔ پس یہ مسئلہ

ان مسائل میں سے ہے جن میں نبی ﷺ سے تلقی کے دونوں طریقے مختلف ہو گئے ہیں:

البتہ اس حدیث کی ایک ایسی توجیہ کی جا سکتی ہے، جس سے تلقی کے دونوں طریقوں کا اختلاف ختم ہو جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ حدیث میں ''اللہ کا نام لینے'' سے دل سے اللہ کو یاد کرنا یعنی وضوء کی نیت کرنا مراد لیا جائے۔ کیونکہ عبادتوں کی صحت کے لئے نیت ضروری ہے اور وضوء بھی ایک عبادت ہے، پس اس کے لئے بھی نیت ضروری ہے۔ اس توجیہ کی صورت میں حدیث کے الفاظ لا وضوء اپنے ظاہری معنی پر رہیں گے یعنی لا نفی صحت کے لئے ہوگا۔ اور یہ حدیث دلالۃً اخذ شریعت کے خلاف نہیں ہوگی۔

مگر اس توجیہ پر سوال پیدا ہوگا کہ جب یہ حدیث نیت پر محمول ہے، تو پھر تسمیہ کا استحباب کیسے ثابت ہوگا؟ شاہ صاحب اس کا جواب دیتے ہیں کہ تسمیہ کا آداب وضوء سے ہونا حدیث کُلُّ أمرٍ ذی بال إلخ سے اور دیگر بہت سی جگہوں پر قیاس کے ذریعہ ثابت ہوگا۔ مثلاً: کھانا پینا امر ذی بال ہے۔ اور اس کے شروع میں تسمیہ مستحب ہے، تو وضوء تو ایک عبادت ہے، اس کے شروع میں تسمیہ بدرجۂ اولی ادب ہوگا۔

آخر میں ایک مشہور توجیہ کا ردّ فرماتے ہیں۔ بعض حضرات نے حدیث میں لا نفی کمال کا لیا ہے یعنی تسمیہ کے بغیر وضوء کامل نہیں ہوتی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دور کی کوڑی ہے۔ اور الفاظ حدیث کے سراسر خلاف ہے۔

فائدہ: جمہور کے نزدیک: وضوء میں تسمیہ سنت یا کم از کم مستحب ہے۔ محض ادب نہیں۔ اور حدیث کل امرٍ ذی بالٍ إلخ نہایت ضعیف ہے۔ بلکہ بعض نے تو اس کو موضوع تک کہا ہے۔ اور نیت مراد لینا تو اور بھی دور کی کوڑی ہے۔ لا نفیِ کمال کے تو شواہد بھی ہیں۔ اس کی تو کوئی نظیر ہی نہیں۔ اور عبادات کے لئے نیت بیشک ضروری ہے۔ مگر یہ بات عباداتِ مقصودہ ہی کی حد تک متفق علیہ ہے۔ عبادات غیر مقصودہ میں اختلاف ہے۔ پس صحیح بات یہ ہے کہ ذکر اللہ سے تسمیہ مراد ہے، نیت مراد نہیں۔ الفاظ حدیث اس کی قطعاً موافقت نہیں کرتے۔ رہا احادیث تسمیہ کا تمام طرق سے ضعیف ہونا: تو یہ بات صحیح ہے، مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الظاهر أن مجموع الأحاديث يحدث منها قوة، تدل على أن له أصلا۔ اور علامہ ابن سید الناس شرح ترمذی میں فرماتے ہیں: لا يخلو هذا الباب من حسنٍ صريح، وصحيح غير صريح پس حدیث مجموعۂ طرق سے حسن لغیرہٖ اور قابل اخذ واستدلال ہے۔ مگر حدیث چونکہ اعلیٰ درجہ کی صحیح نہیں، نیز دلالت بھی قطعی نہیں، کیونکہ لا نفیِ کمال کا بھی ہو سکتا ہے، اور وضوء کی فعلی روایات تسمیہ کے تذکرہ سے خالی ہیں، اس لئے حدیث سے تسمیہ کی سنیت یا استحباب ہی ثابت ہو سکتا ہے۔ وجوب یا فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔

[٥] قوله صلى الله عليه وسلم: " لا وضوءَ لمن لم يَذْكُر اللهِ"

أقول: هذا الحديثُ لم يُجْمِعْ أهلُ المعرفة بالحديث على تصحيحه، وعلى تقدير صحّته: فهو من المواضع التي اختَلَف فيها طريقا التلقي من النبي صلى الله عليه وسلم، فقد استمر

المسلمون يحكون وضوءَ النبى صلى الله عليه وسلم، ويعلّمون الناس، ولايذكرون التسمية، حتى ظهر زمانُ أهل الحديث.

وهو نَصٌّ على أن التسمية ركن أو شرط، ويمكن أن يُجمع بين الوجهين: بأن المراد هو التذكر بالقلب، فإن العباداتِ لاتُقبل إلا بالنية، وحينئذ يكون صيغةُ:" لاوضوء" على ظاهرها.

نعم، التسميةُ أدبٌ كسائر الآداب، لقوله صلى الله عليه وسلم:"كل أمرذى بال لم يُبدأ باسم الله فهو أبتر" وقياساً على مواضعَ كثيرة.

ويحتمل أن يكون المعنى: لايَكْمُلُ الوضوءُ، لكن لا أرْتَضِى مثلَ هذا التأويل، فإنه من التأويل البعيد الذى يعودُ بالمخالفة على اللفظ.

ترجمہ:(۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:''اس شخص کی وضوء نہیں، جس نے اللہ کا نام نہیں لیا''

میں کہتا ہوں: یہ حدیث: اتفاق نہیں کیا علم حدیث کی معرفت رکھنے والوں نے اس کی صحت پر۔ اور بر تقدیر صحت. پس وہ ان جگہوں میں سے ہے جس میں مختلف ہو گئے ہیں نبی ﷺ سے دین اخذ کرنے کے دونوں طریقے۔ پس مسلمان برابر نقل کرتے رہے ہیں نبی ﷺ کی وضوء، اور سکھلاتے رہے ہیں وہ لوگوں کو۔ اور نہیں تذکرہ کرتے وہ بسم اللہ پڑھنے کا۔ یہاں تک کہ محدثین کا زمانہ آیا۔

اور وہ حدیث اس امر میں صریح ہے کہ تسمیہ یا تو رکن ہے یا شرط (یہ بات سب سے پہلے آنی چاہئے تھی) اور ممکن ہے کہ جمع کیا جائے دونوں صورتوں میں (یعنی تلقی کے دونوں طریقوں کا اختلاف ختم کیا جائے) بایں طور کہ مراد دل سے یاد کرنا ہے۔ پس بیشک عبادتیں قبول نہیں کی جاتیں مگر نیت کے ساتھ۔ اور اس وقت حدیث کے الفاظ لاوضوء اپنے ظاہری معنی پر ہوں گے۔

ہاں تسمیہ: وضوء کا ایک ادب ہے دیگر آداب کی طرح، اس ارشاد نبوی کی وجہ سے کہ جو بھی مہتم بالشان کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے تو وہ بے برکت ہے، اور قیاس کے ذریعہ بہت سی جگہوں پر۔

اور احتمال ہے کہ اس حدیث کے معنی ہوں: ''وضوء کامل نہیں ہوتی'' لیکن میں خوش نہیں ہوں اس قسم کی تاویل سے۔ پس بیشک وہ ایسی تاویل بعید ہے جو لوٹتی ہے لفظ کی مخالفت کے ساتھ یعنی یہ تاویل سراسر الفاظِ حدیث کے خلاف ہے۔

تصحیح: طریقا التلقی اصل میں اور مخطوطہ پٹنہ و برلین میں طریق التلقی ہے۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے یعنی یہ تثنیہ ہے اور نون: اضافت کی وجہ سے حذف ہوا ہے، مفرد نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

نیند سے اٹھنے کے بعد برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُن کو دھونے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو اپنا ہاتھ برتن میں نہ ڈبوئے، یہاں تک کہ اس کو تین بار دھوئے پس بیشک وہ نہیں جانتا کہ کہاں رات گذاری ہے اس کے ہاتھ نے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ، باب سنن الوضوء، حدیث ۳۹۱)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ میں ہاتھ دھونے کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ جب ہاتھ دھوئے دیر ہو جاتی ہے، اور عرصہ تک ہاتھوں سے غفلت رہتی ہے تو احتمال پیدا ہوتا ہے کہ ان پر کوئی ناپاکی لگ گئی ہو، یا وہ میل کچیل سے ملوث ہو گئے ہوں، ایسی صورت میں دھوئے بغیر ہاتھوں کو پانی میں ڈالنا یا تو پانی کو ناپاک کرے گا یا گدلا کرے گا اور خلاف تہذیب وشائستگی ہوگا (پس یہ حکم سونے کے ساتھ خاص نہیں)

اور حدیث میں جو پینے کے برتن میں سانس لینے کی اور پھونکنے کی ممانعت آئی ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ممکن ہے منہ میں سے تھوک وغیرہ نکل کر پانی میں گر جائے، اور مشروب کو گدلا کر دے اور یہ حرکت شائستگی کے بھی خلاف ہے۔ (پانی میں سانس لینے کی ممانعت کی حدیث مشکوٰۃ، کتاب الاطعمہ، باب الاشربہ میں ہے، حدیث نمبر ۴۲۷۷)

[٦] قوله صلى الله عليه وسلم: "فإنه لايدري أين باتت يده"

أقول: معناه: أن بُعد العهد بالتطهُّر، والغفلة عنهما مليًا مظنّةٌ لوصول النجاسة والأوساخ إليهما، ممايكونُ إدخالُ الماء معه تنجيسًا له، او تكديرًا وشناعةً؛ وهو علة النهي عن النفخ في الشراب.

ترجمہ: (۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''پس وہ نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے کہاں رات گذاری ہے؟!''

میں کہتا ہوں: اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکی حاصل کئے ہوئے عرصہ بیت جانا، اور دیر تک دونوں ہاتھوں سے بے خبری رہنا احتمالی جگہ ہے نجاست اور میل کچیل کے دونوں ہاتھوں تک پہنچنے کی ان چیزوں میں سے جو کہ ہوتا ہے پانی میں ہاتھ ڈالنا اس صورتِ حال کے ساتھ پانی کو ناپاک کرنا یا گدلا کرنا اور برائی والا کام ـــــ اور وہی مشروب میں پھونک مارنے کی ممانعت کی وجہ ہے۔

ترکیب: مظنة پہلی خبر ہے أن کی، اور مما إلخ دوسری خبر ہے اور إدخال الماء میں مجاز بالحذف ہے أی إدخال فی الماء۔

☆ ☆ ☆

بانسے پر شیطان کی شب باشی کا مطلب

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو، پس وضوء کرے، تو چاہئے کہ تین بار ناک جھاڑے۔ پس بیشک شیطان رات گذارتا ہے اس کی ناک کے بانسے پر'' (مشکوٰۃ ۳۹۳)

تشریح: حدیث کے آخری جملہ میں حکم کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی رات میں جب تہجد یا فجر کی نماز کے لئے اٹھے گا، اور وضوء کرے گا اور اس وضوء میں ناک اچھی طرح صاف نہیں کرے گا تو شیطان کو وسوسہ اندازی کا خوب موقع ملے گا، اور وہ تہجد کی نماز میں یا فجر کی نماز میں جو اذکار و تلاوت کرے گا اس میں کما حقہ غور نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ ناک کی جڑ میں رینٹ اور غلیظ مواد کا جمع ہونا کند ذہنی اور سوچ کی خرابی کا ایک بڑا سبب ہے۔ جو لوگ بیداری میں بھی ہر وقت ناک میں غلیظ مواد بھرے رہتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ بلید اور سست خاطر ہو جاتے ہیں اور رات میں سونے کی حالت میں تو ہر شخص اس صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے۔ غلیظ مادہ ناک کے بانسہ میں جمع ہو جاتا ہے، بلکہ اکثر سوکھ بھی جاتا ہے۔ اس لئے بیدار ہونے کے بعد جب وضوء کرے تو تین بار ناک میں پانی دیکر اس مواد کو خوب جھاڑ کر صاف کرے۔ یہی ناک کے بانسہ پر شیطان کی شب باشی کا مطلب ہے۔ یعنی حدیث میں بیان تمثیل ہے، بیان واقعہ نہیں۔ واللہ اعلم

> **[۷] قوله صلى الله عليه وسلم: '' فإن الشيطان يَبِيْتُ على خَيشومه''**
> **أقول: معناه: أن اجتماع المُخاط والموادّ الغليظة في الخيشوم سببٌ لتبلُّدِ الذهن وفساد الفكر، فيكون أمكن لتأثير الشيطان بالوسوسة، وصَدّه عن تدبر الأذكار.**

ترجمہ: (۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ''پس بیشک شیطان رات گذارتا ہے اس کی ناک کی جڑ میں'' میں کہتا ہوں: اس کا مطلب یہ ہے کہ رینٹ اور غلیظ مواد کا ناک کی جڑ میں جمع ہونا ایک بڑا سبب ہے ذہن کے کُند ہونے کا اور سوچ کے خراب ہونے کا۔ پس ہوتی ہے یہ بات زیادہ قدرت دینے والی شیطان کی اثر اندازی کو وسوسہ اندازی کے ذریعہ، اور اس کو روکنے کے لئے اذکار میں غور و فکر کرنے سے۔

☆ ☆ ☆

وضوء کے بعد کی دعا سے جنت کے سب دروازے کھل جانے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بھی شخص وضوء کرے، پس

آخری درجہ تک پانی پہنچائے، یا فرمایا: پس وضوء کامل کرے، پھر کہے: أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں. أشهد أن لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له، وأشهد أن محمدًا عبده ورسوله اور ترمذی کی روایت میں یہ اضافہ ہے اللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين تو اس کے لئے بہشت کے آٹھوں دروازے کھولدیئے جائیں گے، وہ جنت میں جس دروازے سے چاہے: جائے۔

(مشکوۃ، کتاب الطہارۃ، حدیث ۲۸۹)

تشریح: طہارت کی روح اس وقت بدست آتی ہے جب دو چیزیں پائی جائیں: ایک: نفس پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجائے دوسری: پوری کوشش کرکے خوب اچھی طرح پاکی حاصل کرے۔ چنانچہ وضوء میں اسباغ کا حکم دیا، دوسری چیز کو حاصل کرنے کے لئے۔ اور پہلی چیز کو حاصل کرنے کے لئے یہ دعا تلقین فرمائی، تاکہ بندے کی اللہ کی طرف توجہ تام ہوجائے۔ اور دخولِ جنت اُس طہارت کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جو نفس کی جڑ میں پیوست ہوچکی ہے۔ چنانچہ حدیث میں طہارت بالغہ اور توجہ الی اللہ کے مجموعہ پر اس ثمرہ کو مرتب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس کے لئے جنت کے سبھی دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ جس سے چاہے جنت میں جائے۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم: " مامنكم من أحد يتوضأ، فَيُبْلِغُ الوضوءَ، ثم يقول: أشهد إلخ وفي رواية اللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين، إلا فُتحت له أبواب الجنة الثمانيةُ، يدخل من أيها شاء"

أقول: روح الطهارة لايتم إلا بتوجه النفس إلى عالم الغيب، واستفراغ الْجُهْد في طلبها، فضبط لذلك ذكرًا، ورتّب عليه ماهو فائدة الطهارة الداخلة في جذر النفس.

ترجمہ: (۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "نہیں ہے تم میں سے کوئی جو وضوء کرے، پس آخری درجہ تک پہنچائے وہ وضوء کو (یا وضوء کے پانی کو) پھر کہے أشهد إلخ اور ایک روایت میں (یہ اضافہ) ہے: اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والے بندوں میں شامل فرما، اور مجھے خوب پاک ہونے والے بندوں میں شامل فرما، مگر کھول دیئے جائیں گے اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے، داخل ہو وہ ان میں سے جونسے سے چاہے۔

میں کہتا ہوں: طہارت کی روح تام نہیں ہوتی مگر نفس کے توجہ کرنے سے عالم غیب کی طرف (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف) اور خوب کوشش ریڑھنے سے طہارت کی طلب میں (یعنی خوب اچھی طرح وضوء کرنے سے) پس منضبط کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد (اول کو حاصل کرنے) کے لئے ایک ذکر (یعنی دعا) اور مرتب کیا اس پر اس کو جو کہ وہ اُس طہارت کا فائدہ ہے (یعنی دخول جنت کو) جو نفس کی جڑ میں داخل ہونے والی ہے (یعنی جو طہارت نفس میں رچ بس گئی

ہے، فطرت ثانیہ بن گئی ہے)

تصحیح: الا فتحت میں الاحدیث کے مصادر سے بڑھایا ہے۔ مطبوعہ اور مخطوطوں میں نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

خشک رہنے والی ایڑیوں کے لئے عذاب الیم کی وعید

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف لوٹ رہے تھے۔ قافلہ راستہ میں ایک پانی پر پہنچا۔ ایک جماعت نے عصر کے وقت (تنگئی وقت کی وجہ سے) جلدی جلدی وضوء کی۔ ان کی ایڑیوں کو پانی نہیں پہنچا۔ وہ چمک رہی تھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہنچے (اور صورتِ حال دیکھی) تو فرمایا: ''ہلاکت ہے ایڑیوں کے لئے عذاب دوزخ سے!'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، باب سنن الوضوء، حدیث ۲۹۸) اور ایک روایت میں ہے: ''ہلاکت ہے ایڑیوں کے لئے اور پیروں کے تلووں کے لئے عذاب نار سے!'' (مسند احمد ۴ ۱۹۱)

تشریح: ایڑیوں اور تلووں سے مراد ایڑیوں اور تلووں والے ہیں یعنی جن کی ایڑیاں اور پاؤں کے تلوے خشک رہ گئے ہیں ان کے لئے ہلاک عظیم ہے۔ یہاں دو باتیں سمجھنی ہیں۔ ایک عذاب الیم کی وعید کیوں سنائی؟ دوسری۔ ایڑیوں اور تلووں کو کیوں سنائی؟

پہلی بات: جب اللہ تعالیٰ نے اعضاء ثلاثہ کا دھونا واجب کیا، تو ضروری ہوا کہ ان کو پورے طور پر دھویا جائے۔ پس جب کچھ دھویا اور کچھ خشک رہ گیا تو مکمل عضو کا دھونا متحقق نہیں ہوا، اور جب وضوء نہیں ہوئی تو نماز کہاں ہوئی؟ اس لئے ہلاک عظیم کی وعید سنائی۔ نیز وعید سنانے کا یہ بھی مقصد ہے کہ لوگ احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں لاپروائی نہ برتیں۔ ہر حکم کو کما حقہ بجالائیں۔

دوسری بات: ایڑیوں اور تلووں کو بالتخصیص وعید اس لئے سنائی گئی ہے کہ وہی اصالۃً ناپاک رہ گئے ہیں۔ اور ناپاکی کا توبہ تو جمع ہونا، اور اس کو دور نہ کرنے پر اصرار کرنا موجب نار خصلت ہے۔ اور طہارت موجب دخول جنت اور باعث کفارۂ سیئات خصلت ہے۔ پس جب وضوء کرنے والے نے ایڑیوں اور تلووں کو پاک نہیں کیا۔ اور ان اعضاء میں حکم الٰہی کی مخالفت کی، تو اولاً یہی اعضاء معذب ہوں گے، پھر ان کی وجہ سے نفس رنجیدہ ہوگا۔ جیسے پیر میں کانٹا چبھتا ہے، تو اولاً تکلیف اس حصۂ بدن کو پہنچتی ہے جہاں کانٹا چبھا ہے۔ پھر آدمی کا سارا وجود تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح نفس میں بگاڑ ان اعضاء کے خشک رہ جانے کی وجہ سے آیا ہے۔ اس لئے اولاً یہی اعضاء معذب ہوں گے۔ پھر ان کی وجہ سے آدمی کا سارا وجود رنجیدہ ہوگا۔

[۹] قوله صلى الله عليه وسلم لمن لم يستوعب: " ويل للأعقاب من النار"

أقول: السرُّ فيه: أن الله تعالى لما أوجَبَ غَسْل هذه الأعضاء، اقتضى ذلك: أن يُحَقَّق معناه، فإذا غسل بعض العضو، ولم يستوعب كلّه، لايصحُّ أن يقال: غسل العضو، وأيضًا فيه سدُّ باب التهاون.

وإنما تخللت النار في الأعقاب: لأن تراكُمَ الحدثِ، والإصرار على عدم إزالته، خصلةٌ موجبةٌ للنار، والطهارةُ موجِبةٌ للنجاة منها، وتكفير الخطايا، فإذا لم يُحقِّقْ معنى الطهارة في عضو، وخالف حكمَ الله فيه، كان ذلك سببَ أن يظهر تألُّمُ النفس بالخصلة الموجبة لفساد النفس من قِبَلِ هذا العضو، والله أعلم.

ترجمہ: (۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس شخص سے جس نے پورا پیر نہیں دھویا تھا: "وائے ایڑیوں کے لئے عذاب جہنم سے!"

میں کہتا ہوں: راز اس (وعید) میں یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان اعضاء (ثلاثہ) کا دھونا واجب کیا، تو اس (ایجاب) نے چاہا کہ پورے طور پر ثابت کرے آدمی اُس (دھونے) کے معنی کو۔ پس جب اس نے عضو کا کچھ حصہ دھویا، اور اس کو بالاستیعاب نہیں دھویا تو نہیں صحیح ہے کہ کہا جائے: "اس نے عضو کو دھویا" اور نیز اس میں لاپروائی کا دروازہ بند کرنا ہے۔

اور آگ نے ایڑیوں ہی میں نفوذ اس لئے کیا کہ ناپاکی کا ڈھیر لگنا، اور اس کو زائل نہ کرنے پر اصرار کرنا آگ کو واجب کرنے والی بات ہے۔ اور پاکی آگ سے نجات کو واجب کرنے والی اور گناہوں کا کفارہ بننے والی بات ہے۔ پس جب اس نے پورے طور پر ثابت نہیں کیا طہارت کے معنی کو کسی عضو میں، اور اللہ کے حکم کی اس عضو میں مخالفت کی، تو ہوگی یہ بات سبب نفس کی رنجیدگی ظاہر ہونے کا، اُس خصلت کے ذریعہ جو نفس کے بگاڑ کو واجب کرنے والی ہے، اُس عضو کی جانب سے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

ترکیب: من قِبَلِ متعلق ہے ان یظهر سے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۵

نواقضِ وضوء کا بیان

نماز کے لئے پاکی کیوں شرط ہے؟

حدیث ـــــ متفق علیہ روایت ہے کہ اس شخص کی نماز قبول نہیں ہوتی جس کو حدث پیش آیا ہے، یہاں تک کہ وضوء

کرے (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۰)

حدیث ـــــ مسلم شریف کی روایت ہے کہ کوئی نماز پاکی کے بغیر قبول نہیں کی جاتی (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۱)

حدیث ـــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نماز کی چابی پاکی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۱۲)

تشریح: ان سب روایات سے بالتصریح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پاکی نماز کے لئے شرط ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: پاکی درحقیقت ایک مستقل عبادت ہے۔ اس کو نماز کے ساتھ منضم کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا فائدہ دوسری پر موقوف ہے یعنی نماز کے بغیر وضوء کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اور وضوء کے بغیر نماز ایک بے معنی عبادت ہے۔ اس لئے نماز کے لئے وضوء کو شرط ٹھہرایا گیا ہے۔

دوسری وجہ: نماز شعائر اللہ میں سے ہے جیسے قرآن کریم۔ اور شعائر اللہ کا احترام ضروری ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (سورۃ الحج آیت ۳۲ تفصیل کے لئے پانچویں مبحث کا ساتواں باب دیکھیں) اور باوضوء نماز پڑھنے میں نماز کا احترام ہے، جیسے باوضوء قرآن پاک کو ہاتھ لگانے میں قرآن کا احترام ہے۔ اس لئے نماز کے لئے وضوء شرط کی گئی ہے۔

﴿موجبات الوضوء﴾

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " لاتُقبل صلاةُ من أحدثَ حتى يتوضأ" وقوله صلى الله عليه وسلم: " لاتُقبل صلاةٌ بغير طُهور" وقوله صلى الله عليه وسلم: " مفتاح الصلاة الطهور"

أقول: كل ذلك تصريح باشتراط الطهارة، والطهارة طاعة مستقلة وُقِّتَتْ بالصلاة، لتوقُّف فائدةِ كلِّ واحدةٍ منهما على الأخرى، وفيه تعظيم أمرِ الصلاة التي هي من شعائر الله.

ترجمہ: وضوء کو واجب کرنے والی چیزوں کا بیان: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین ارشادات: (جن کا ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: ان سب روایات میں صراحت ہے کہ پاکی نماز کے لئے شرط ہے: (۱) اور پاکی ایک مستقل عبادت ہے، وہ نماز کے ساتھ مقرر کی گئی ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کے فائدے کے موقوف ہونے کی وجہ سے دوسری پر (۲) اور اس میں اُس نماز کے معاملہ کی تعظیم ہے جو کہ شعائر اللہ میں سے ہے۔

نوٹ: پاکی ایک مستقل عبادت ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عبادتِ مقصودہ ہے، بلکہ اس کا مطلب ایسا ہی ہے جیسا کہ پہلے فرمایا ہے کہ مضمضہ اور استنشاق دو مستقل فطری سنتیں ہیں، جن کو وضوء میں شامل کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

نواقضِ وضوء تین طرح کے ہیں

(متفق علیہ، مختلف فیہ اور منسوخ)

نواقضِ وضوء کی پہلی قسم: متفق علیہ نواقض:

شریعتِ اسلامیہ میں نواقض وضوء تین طرح کے ہیں:

اول: وہ نواقض ہیں، جن کے نواقض ہونے پر تمام صحابہ متفق ہیں۔ اور روایات اور مسلمانوں کے تعامل میں بھی ہم آہنگی ہے۔ اور وہ پیشاب، پاخانہ، ہوا، مذی، گہری نیند اور وہ چیزیں ہیں جو ان کے معنی میں ہیں۔ جیسے ودی، پیشاب کے حکم میں ہے اور جیسے اغماء اور جنون۔ یہ سب چیزیں دوراہوں سے نکلنے والی یا اس کا احتمال پیدا کرنے والی چیزیں ہیں۔ اور سبیلین سے نکلنے والی چیز کا ناقض طہارت ہونا متفق علیہ ہے۔ اب ذیل میں اس قسم سے تعلق رکھنے والی روایات کے رموز بیان کرتے ہیں۔ پھر قسم دوم وسوم کو بیان کریں گے۔

نیند ناقضِ وضوء کیوں ہے؟

حدیث ـــ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرین کی بندش دو آنکھیں ہیں، پس جو شخص سو جائے وہ وضوء کرے (مشکوٰۃ حدیث ۳۱۶)

حدیث ـــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ ارشاد نبوی نقل کرتے ہیں: ''وضوء اس پر ہے جو پہلو کے بل لیٹ کر سوئے۔ کیونکہ جب آدمی پہلو کے بل لیٹ کر سوتا ہے تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۱۸)

تشریح: نیند دو وجہ سے ناقض وضوء ہے:

پہلی وجہ: گہری نیند سے جسم کے تمام جوڑوں کی طرح محل راز بھی ڈھیلا پڑ جاتا ہے، اور خروج ریح کا احتمال پیدا ہوتا ہے یعنی اصل ناقض تو خروج ریح ہے، مگر گہری نیند کی حالت میں چونکہ اس کا احساس نہیں ہو سکتا، اس لئے شریعت نے سبب ظاہری (گہری نیند) کو سبب حقیقی (خروج ریح) کے قائم مقام کر دیا ہے۔

دوسری وجہ: نیند نفس کے اندر بلادت پیدا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے جو لوگ حد سے زیادہ سوتے ہیں وہ کند خاطر ہو جاتے ہیں۔ پس نیند بھی حدث والا کام کرتی ہے۔ حدث: طبیعت میں انقباض واضمحلال پیدا کرتا ہے اور نیند بھی سستی اور کاہلی پیدا کرتی ہے۔ پس طبیعت میں نشاط اور انبساط وسرور پیدا کرنے کے لئے نیند کے بعد وضوء ضروری ہے۔

مذی نکلنے سے وضوء کیوں واجب ہوتی ہے؟

حدیث ـــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بہت زیادہ مذی آتی تھی۔ اور چونکہ میرے نکاح میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں، اس لئے مسئلہ دریافت کرنے میں مجھے شرم محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے حضرت مقداد سے مسئلہ پوچھوایا، تو آپؐ نے فرمایا: ''وہ اپنے عضو کو دھولے، اور وضوء کرلے'' یعنی مذی نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا، صرف وضوء واجب ہوتی ہے (مشکوۃ حدیث ۳۰۲)

تشریح: مذی نکلنے سے وضوء اس لئے واجب ہوتی ہے کہ جو مذی بیوی کے ساتھ ملاعبت (ہنسی مذاق) کی وجہ سے خارج ہوتی ہے، وہ مجامعت کا فروتر درجہ ہے یعنی اس سے بھی گونہ حظ نفس حاصل ہوتا ہے، پس اس کے لازمی تقاضے کے طور پر ادنی درجہ کی طہارت (وضوء) واجب ہوگی۔

جب حدث کا یقین ہوجائے تبھی وضوء ٹوٹتی ہے

حدیث ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی شخص اپنے پیٹ میں کوئی چیز پائے (یعنی پیٹ میں ریاح کی وجہ سے قراقر ہو) پھر اس پر یہ بات مشتبہ ہوجائے کہ کوئی چیز نکلی یا نہیں؟ تو وہ (وضوء کے لئے) مسجد سے ہرگز نہ نکلے یہاں تک کہ آواز سنے یا بدبو پائے'' یعنی خروج ریح کا یقین ہوجائے، آواز سننا یا بدبو محسوس کرنا ضروری نہیں (مشکوۃ حدیث ۳۰۶)

تشریح: نقضِ وضوء کے لئے حدث (خروج ریح) کا یقین دو وجہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ: جب نقضِ وضوء کا مدار سبیلین سے کسی چیز کے نکلنے پر ہے تو ضروری ہے کہ دو چیزوں میں امتیاز کیا جائے: ایک وہ جو واقعۃً سبیلین سے نکلی ہے، اور دوسری وہ جو یقیناً سبیلین سے نہیں نکلی، صرف اس سے مشابہ ہے۔ اس حدیث میں امتیاز کرنے کی ہدایت ہے کہ جب خروج ریاح کا یقین ہوجائے تب آدمی اپنے کو بے وضوء سمجھے۔ کیونکہ ناقض وہی ہے، اس سے مشتبہ چیز ناقض نہیں ہے۔

دوسری وجہ: حدیث کا مقصود تعمق وتشدد کی نفی کرنا ہے، کیونکہ اس قسم کے شک کا اعتبار کرکے احتیاطاً وضوء کرنے کا حکم دیا جائے گا تو معلوم نہیں شکی مزاج آدمی اور کتنی احتیاطیں شروع کردے گا!

وموجِباتُ الوضوء: فی شریعتنا علی ثلاث درجات:

إحداها: ما اجتمع علیه جمهور الصحابة، وتطَابَقَ فیه الروایةُ والعملُ الشائعُ، وهو البول، والغائط، والریح، والمَذْیُ، والنومُ الثقیل، ومافی معناها.

[۲] قوله صلی الله علیه وسلم: "وکاءُ السَّه العینان" وقوله صلی الله علیه وسلم. "فإنه إذا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَتْ مفاصلُه"

أقول: معناه: أن النوم الثقیل مظِنَّةٌ لاسْتِرْخاءِ الأعضاء وخروج الحدث، وأُرِیٰ أن مع ذلك

له سبب آخَرُ: هو أن النوم يُبَلِّدُ النفسَ، ويفعلُ فعلَ الأحداثِ.

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم فى المَذْيِ: "يغسل ذكَرَه، ويتوضأ"

أقول: لاشك أن المذْيَ الحاصل من الملاعبة قضاءُ شهوة دون شهوة الجماع، فكان من حقه: أن يستوجِبَ طهارةً دون الطهارة الكبرى.

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم فى الشاكِّ: "لايَخْرُجَنَّ من المسجد حتى يسمعَ صوتًا أو يجدَ ريحًا"

أقول: معناه: حتى يستيقن؛ لَمَّا أُدير الحكمُ على الخارج من السبيلين، كان ذلك مقتضيا أن يُمَيَّزَ بين ما هو هو فى الحقيقة، وبين ماهو مشتبهٌ به، وليس هو؛ والمقصودُ نفى التعمُّق.

ترجمہ: اور وضوء واجب کرنے والی چیزیں ہماری شریعت میں تین درجوں پر ہیں:

ان کا پہلا درجہ: وہ موجبات ہیں جن پر جمہور صحابہ متفق ہیں۔ اور ان میں روایت اور عام عمل ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ اور وہ پیشاب، پاخانہ، ہوا، مذی، گہری نیند اور وہ چیزیں ہیں جو ان کے معنی میں ہیں۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشاد۔ میں کہتا ہوں: (۱) اس کے معنی یہ ہیں کہ نیند اعضاء کے استرخاء اور حدث کے نکلنے کی احتمالی جگہ ہے (۲) اور میں گمان کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ اس (وضوء کے ٹوٹنے) کے لئے ایک دوسرا سبب بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نیند نفس کو بلید (کمزور رائے والا) کر دیتی ہے، اور وہ (نیند) حدثوں جیسا کام کرتی ہے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "دھو لیوے وہ اپنے عضو کو، اور وضوء کر لیوے" میں کہتا ہوں: اس میں کوئی شک نہیں کہ جو مذی ملاعبت کی وجہ سے نکلتی ہے وہ بھی ہم بستری کی شہوت سے فروتر شہوت کو پورا کرنا ہے۔ پس اس کے حق میں سے ہے کہ وہ واجب ولازم جانے طہارت کبری سے فروتر طہارت کو۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "وہ مسجد سے ہرگز نہ نکلے، یہاں تک کہ سنے آواز یا پائے بدبو" میں کہتا ہوں: اس کے معنی: یہاں تک کہ یقین کر لے وہ ـــــ جب (نقض وضوء کا) حکم دائر کیا گیا ہے دو راہوں سے نکلنے والی چیز پر (یعنی اصل علت یہی ہے) تو تھا وہ چاہنے والا اس بات کو کہ امتیاز کیا جائے اس چیز کے درمیان جو کہ وہ وہ ہے حقیقت میں، اور اس چیز کے درمیان جو کہ وہ مشابہ ہے اس سے، اور وہ نہیں ہے۔ اور مقصود تعمق کی نفی کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

نواقضِ وضوء کی دوسری قسم ـــــ مختلف فیہ نواقض

دوسرے درجہ کے نواقض وہ ہیں جن کے ناقضِ طہارت ہونے میں فقہائے صحابہ وتابعین میں اختلاف رہا ہے۔ اور ان کے بارے میں احادیث مرفوعہ میں بھی تعارض ہے۔ ایسے نواقض پانچ ہیں: ۱- پیشاب کے عضو کو چھونا ۲- عورت کو

ہاتھ لگانا ۳-خون اور پیپ کا نکل کر بہ جانا ۴-منہ بھر کر قئے کرنا ۵-نماز میں کھل کھلا کر ہنسنا ــــ تفصیل درج ذیل ہے۔

۱-پیشاب کے عضو کو چھونا:

حدیث ــــ حضرت بُسرہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے پیشاب کے عضو کو چھوئے، تو چاہئے کہ وضو کرے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۹) صحابہ میں سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، اور مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں سے حضرت سالم اور حضرت عروہ رحمہما اللہ اور کچھ دیگر حضرات اس کے قائل تھے۔

اور حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما، اور کوفہ کے تمام فقہاء اس کے قائل نہیں تھے۔ ان کی دلیل درج ذیل حدیث ہے:

حدیث ــــ حضرت طَلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص وضو کرنے کے بعد اپنے پیشاب کے عضو کو چھوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اس کے جسم کا ایک ٹکڑا ہی ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۰) یعنی جس طرح جسم کے کسی اور حصہ کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتی اس عضو کو چھونے سے بھی نہیں ٹوٹتی۔

اور ان دو روایتوں میں سے کسی ایک روایت کے منسوخ ہونے کی کوئی قابل اطمینان دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ ائمہ اربعہ میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے: امام اعظم رحمہ اللہ وضوء نہ ٹوٹنے کے قائل ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نقضِ وضوء کے قائل ہیں۔

۲-عورت کو ہاتھ لگانا:

حضرت عمر، حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور حضرت ابراہیم نَخعی رحمہ اللہ اس بات کے قائل تھے کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے وضوء ٹوٹ جاتی ہے۔ ان حضرات کی دلیل آیت پاک: ﴿أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ تھی۔ کوئی حدیث ان کے قول کی تائید میں موجود نہیں۔ بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی درج ذیل روایت اس کے خلاف ہے۔

حدیث ــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ اپنی کسی اہلیہ کو چومتے تھے، پھر نماز پڑھتے تھے اور وضوء نہیں کرتے تھے (مشکوۃ حدیث ۳۲۳) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کو ہاتھ لگانا ہی نہیں، چومنا بھی ناقض وضوء نہیں۔

اعتراض: مگر اس حدیث پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس کی اسناد منقطع ہے، پس اس سے استدلال درست نہیں۔ اس حدیث کی دو سندیں ہیں: (۱) حبیب بن ابی ثابت روایت کرتے ہیں حضرت عروہ سے، وہ حضرت عائشہ سے۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ حبیب کا عروہ سے لقاء اور سماع نہیں (۲) ابراہیم تیمی روایت کرتے ہیں حضرت عائشہ سے۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ ابراہیم تیمی کا بھی حضرت عائشہ سے لقاء اور سماع نہیں (یہ اعتراض مشکوۃ میں مذکور ہے)

جواب: شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس طرح کی علت (خرابی) اسی صورت میں معتبر ہونی چاہئے جبکہ احادیث میں ترجیح کا معاملہ درپیش ہو۔ لیکن اگر کسی مسئلہ میں بس ایسی ہی روایت ہو، اور اس کے معارض کوئی دوسری روایت نہ ہو، تو اس قسم کی معمولی خرابی کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ یعنی یہ حدیث باوجود اپنی علت کے قابل استدلال ہے۔

فائدہ: یہ جواب انقطاع تسلیم کرنے کی صورت میں ہے۔ اور اس تقدیر پر ہے کہ مسئلہ میں یہی ایک حدیث دلیل ہے۔ حالانکہ محدثین کے نزدیک چار حدیثوں میں حبیب کا حضرت عروہ سے سماع ثابت ہے۔ تفصیل معارف السنن (۳۰۳:۱) میں ہے۔ نیز مسئلہ دیگر روایات سے بھی ثابت ہے۔ متفق علیہ روایت ہے کہ تہجد کی نماز میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سجدہ کی جگہ میں آجاتے تھے۔ آپ ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے۔ وہ پیر ہٹا لیتی تھیں (مشکوۃ باب الستر ۃ، حدیث ۷۸۶) اور یہ محض احتمال ہے کہ کپڑے کے اوپر سے ہاتھ لگاتے ہوں گے۔ کیونکہ گھر میں اندھیرا ہوتا تھا، پس اس کا اہتمام کیوں کر ممکن ہے؟

حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کے استدلال کا جواب:

حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما چونکہ جنابت میں تیمم کے قائل نہیں تھے۔ اس لئے وہ لَامَسْتُمُ النِّسَآءَ کو نواقضِ وضوء کا بیان قرار دیتے تھے۔ اور عورت کے لَمْس (ہاتھ لگانے) کو ناقض وضوء کہتے تھے۔ حالانکہ جنابت میں تیمم کا ثبوت حضرت عمران، حضرت عمار اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کی روایات سے بہم پہنچا ہوا ہے۔ اور بعد میں جواز پر اجماع بھی منعقد ہو گیا ہے۔ اس لئے ان دونوں حضرات کا استدلال محل نظر ہو گیا۔

فائدہ: ان حضرات کا استدلال مجاز پر مبنی تھا۔ وہ باب مفاعلہ کو مجرد کے معنی میں لیتے تھے یعنی مُلامسہ کو بمعنی لَمْس لیتے تھے۔ حالانکہ حقیقت مجاز سے اولی ہے۔ اور باب مفاعلہ کا خاصہ عمل میں اشتراک ہے یعنی ایک عمل دو شخص مل کر کرتے ہیں۔ جیسے مقاتلہ، مضاربہ، مجادلہ، مناظرہ وغیرہ۔ پس آیت کے معنی ہیں: مرد و زن ایک ساتھ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں یعنی پکڑیں اور یہ صورت جماع میں بوقتِ فراغ پیش آتی ہے پس آیت کنایہ ہے مقاربت سے یعنی بیوی سے صحبت کی ہو تو غسل واجب ہوگا۔ پھر اگر پانی میسر نہ ہو تو تیمم کا حکم ہے۔

حضرت ابن عمر کے مسلک کی حقیقت:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جنابت میں تیمم کے قائل تھے۔ وہ مذکورہ آیت کو نواقض وضوء کا بیان نہیں قرار دیتے تھے۔ وہ صرف احتیاطاً عورت کو ہاتھ لگانے کی صورت میں وضوء کے قائل تھے یعنی خروج عن الخلاف کے لئے وہ وضوء کرتے تھے۔

حضرت ابراہیم نخعی کا مسلک اور امام اعظم کا اس سے گریز:

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پیروی میں یہ بات کہتے تھے۔ پس جو اُن کی دلیل تھی وہی ان کی بھی ہے۔ مگر جب امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ جس دلیل سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ استدلال فرماتے ہیں اس کی تقریب تام نہیں، تو آپ نے حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا قول ترک کر دیا۔ حالانکہ آپ سختی سے نخعی رحمہ اللہ کی پیروی کرتے تھے۔

خلاصۂ کلام: یہ ان دونوں مسئلوں میں دور اول کی داستان تھی۔ پھر جب امت میں دو مستقل مکاتبِ فکر وجود میں آئے تو عراقی مکتب فکر کی پیروی کرنے والوں نے یعنی احناف نے دونوں مسئلوں میں وضوء نہ ٹوٹنے کا قول اختیار کیا۔ اور حجازی مکتب فکر کی پیروی کرنے والوں نے یعنی ائمہ ثلاثہ نے نقض وضوء کا قول اختیار کیا۔ پھر ان میں یہ اختلاف ہوا کہ مطلقاً وضوء ٹوٹتی ہے یا خواہش پیدا ہونے کی صورت میں ٹوٹتی ہے؟ تفصیل ان کی کتابوں میں ہے۔

۳-۵ بہنے والا خون، کافی مقدار میں قئے اور نماز میں کھل کھلا کر ہنسنا:

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ دم سائل اور قئے کثیر کو ناقض وضوء مانتے تھے۔ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نماز میں قہقہہ لگانے کو ناقض وضوء مانتے تھے۔ دیگر تابعین ناقض وضوء نہیں مانتے تھے۔ ان تینوں چیزوں کے ناقض وضوء ہونے کی روایات بھی موجود ہیں، مگر ان کی صحت پر محدثین کا اتفاق نہیں۔ اور اصح بات ان تینوں نواقض کے بارے میں یہ ہے کہ جو شخص احتیاط برتے، وہ اپنے دین اور آبرو کی حفاظت کرے گا۔ اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ بھی قابل مواخذہ نہیں۔

فائدہ: شاہ صاحب نے یہ بات مجتہدین کے تعلق سے فرمائی ہے کہ احناف نے ان کو نواقض قرار دیا ہے تو انھوں نے احتیاط والا پہلو اختیار کیا ہے۔ اور دوسرے ائمہ نے جو ان چیزوں کو ناقض وضوء نہیں مانا تو انھوں نے بھی ٹھیک کیا ہے۔ کیونکہ مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے قطعی اور دوٹوک دلائل نہیں ہیں۔ رہا مقلدین کا معاملہ تو ان کے لئے التزامات عبد کی رُو سے اس مذہب پر عمل کرنا ضروری ہے جو انھوں نے اپنایا ہے۔ اور خروج عن الخلاف کے نقطۂ نظر سے احتیاط والے پہلو پر عمل کرنا بہتر ہے۔

فائدہ: مذکورہ تینوں چیزوں کے ناقض ہونے نہ ہونے میں اختلاف کی اصل بنیاد یہ ہے کہ آیت کریمہ ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ﴾ (یا تم میں سے کوئی شخص پست زمین سے آئے یعنی استنجا کر کے آیا ہو) اس آیت میں بالاتفاق نواقض وضوء کا بیان ہے۔ مگر تنقیح مناط میں اختلاف ہے۔ ائمہ ثلاثہ نے علت ''خارج من السبیلین'' نکالی ہے۔ اور چھ چیزوں کو اس کے ساتھ ملحق کیا ہے۔ اور احناف نے علت ''خارج نجس'' نکالی ہے۔ سبیلین کی تخصیص نہیں کی۔ پس جو

بھی ناپاک چیز بدن سے نکلے گی ناقض وضو، ہوگی، خواہ وہ بہنے والا خون ہو، یا منہ بھر کر قئے ہو یا نکسیر ہو (اور قہقہہ کا ناقض ہونا ایک مستثنیٰ صورت ہے) اور احناف نے ملت میں تعمیم انہی احادیث کی بناء پر کی ہے جو ان چیزوں کے ناقض ہونے کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اور وہ روایات اگرچہ علیحدہ علیحدہ متکلم فیہ ہیں، مگر سب مل کر ایک قوت حاصل کر لیتی ہیں۔ اور مناط کی تخریج میں ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ جیسے زاد وراحلہ کی روایت نہایت ضعیف ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ کے علاوہ تمام فقہاء نے ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ کی تفسیر میں اس کا اعتبار کیا ہے۔ اور اس کے ذریعہ استطاعت کی حد بندی کی ہے۔ اور حج کی فرضیت کے لئے زاد وراحلہ کو شرط قرار دیا ہے۔

امور مذکورہ ناقض وضوء کیوں ہیں؟

۱ــــ عورت کو ہاتھ لگانا اس لئے ناقض وضوء ہے کہ وہ خواہش کو بھڑکاتا ہے، اور اس میں جماع کی حاجت سے فروتر حاجت برآری کا احتمال ہے۔

۲ــــ عضو تناسل کو چھونا اس لئے ناقض وضوء ہے کہ وہ ایک قبیح فعل ہے، چنانچہ استنجاء کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے پیشاب کے عضو کو چھونے کی ممانعت آئی ہے۔ خاص طور پر جب اس کو پورے ہاتھ سے مٹھی میں پکڑے تو وہ یقیناً ایک شیطانی حرکت ہے۔

۳و۴ــــ بہنے والا خون یعنی جب وہ نکلنے کی جگہ سے متجاوز ہو جائے اور منہ بھر قئے، بدن کو تھرتھرانے والے ہیں اور نفس کو غبی بناتے ہیں۔ اس لئے وہ ناقض وضوء ہیں۔

۵ــــ اور نماز میں قہقہہ مارنا ایک بھاری بھول ہے، جس کے لئے کفارہ کی حاجت ہے۔ اس لئے ممکن ہے شارع نے اس صورت میں کفارہ کے طور پر تجدید وضوء کا حکم دیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شریعت حکم نہ دے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وجوب کے طور پر حکم نہ دے بلکہ استحباب کے طور پر حکم دے۔

والثانية: ما اختلف فيه السلف من فقهاء الصحابة والتابعين، وتعارض فيه الرواية عن النبي صلى الله عليه وسلم، كمَسِّ الذكر: لقوله صلى الله عليه وسلم: "من مسّ ذكرهُ فليتوضأ" قال به ابن عمر، وسالم، وعروة، وغيرهم، وردّه عليٌّ، وابن مسعود، وفقهاء الكوفة، ولهم قوله صلى الله عليه وسلم: "هل هو إلا بَضْعَةٌ منه" ولم يحيِ التَلْجُ بكون أحدهما منسوخًا

ولَمْس المرأة. قال به عمر، وابن عمر، وابن مسعود، وإبراهيم، لقوله تعالى: ﴿أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ ولايشهدُ له حديث، بل يشهد حديثُ عائشة بخلافه، لكن فيه نظرٌ، لأن في إسناده انقطاعًا.

وعندي: أن مثل هذه العلةِ إنما تُعتبر في مثل ترجيح أحد الحديثين على الآخر، ولاتُعتبر

فی ترك حدیث من غیر تعارض، واللّٰه أعلم.

وكان عمر وابن مسعود لایریان التیمّم عن الجنابة، فتعیّن حملُ الآیة عندهما علی اللمس، لكن صَحَّ التیمم عنها عن عمران، وعمار، وعمرو بن العاص، وانعقد علیه الإجماع. وكان ابن عمر یذهب إلی الاحتیاط، وكان إبراهیم یقلّد ابن مسعود، حتی وَضَحَ علی أبی حنیفة حالُ الدلیل الذی تمسك به ابن مسعود، فترك قولَه مع شدَّةِ اتباعه مذهب إبراهیم.

وبالجملة: فجاء الفقهاء من بعدهم فی هذین علی ثلاثِ طبقات: آخذٌ به علی ظاهره، وتاركٌ له رأسًا، وفارقٌ بین الشهوة وغیرها.

وقال إبراهیم بالوضوء من الدم السائل، والقیء الكثیر، والحسنُ بالوضوء من القهقهة فی الصلاة، ولم یقل بذلك آخرون، وفی كلّ ذلك حدیث لم یُجمِع أهل المعرفة بالحدیث علی تصحیحه.

والأصحُّ فی هذه: أن من احتاط فقد استبرأ لدینه وعِرضه، ومن لا فلاسبیل علیه فی صُراح الشریعة.

ولاشبهةَ أن لمس المرأة مُهَیِّجٌ للشهوة، مَظِنَّةٌ لقضاء شهوةٍ دون شهوة الجماع، وأن مسَّ الذَّكر فعلٌ شنیعٌ، ولذلك جاء النهیُ عن مسِّ الذكر بیمینه فی الاستنجاء، فإذا كان قبضًا علیه كان من أفعال الشیاطین لامُحالة، والدمُ السائل والقیء الكثیر مُلَوِّثان للبدن، مُبَلِّدان للنفس، والقَهْقَهَةُ فی الصلاة خطیئة، تحتاج إلی كفارة، فلا عَجَبَ أن یأمر الشارعُ بالوضوء من هذه، ولا عجبَ أن لایأمر، ولا عجب أن یرغِّبَ فیه من غیر عزیمة.

ترجمہ: اور دوسرا درجہ: وہ (نواقض) ہیں جن میں اختلاف کیا ہے فقہائے صحابہ وتابعین میں سے متقدمین نے۔ اور متعارض ہے اس میں نبی کریم ﷺ سے روایت، جیسے پیشاب کے عضو کو چھونا آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے کہ: ''جس نے ذکر کو چھو یا وہ وضو کرے'' قائل تھے اس کے ابن عمر، سالم، عروہ اور ان کے علاوہ۔ اور رد کیا اس کو علی، ابن مسعود اور کوفہ کے فقہاء نے۔ اور ان کی دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''نہیں ہے وہ مگر اس کے جسم کا ایک پارہ'' اور دل مطمئن نہیں ہوا ان میں سے کسی ایک کے منسوخ ہونے پر۔

اور (جیسے) عورت کو ہاتھ لگانا قائل تھے اس کے عمر، ابن مسعود اور ابراہیم نخعی، ارشاد باری تعالیٰ: ﴿أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ کی وجہ سے۔ اور نہیں گواہی دیتی اس کے لئے کوئی حدیث۔ بلکہ حضرت عائشہ کی حدیث اس کے برخلاف کی گواہی دیتی ہے۔ مگر اس (حدیث) میں نظر ہے۔ اس لئے کہ اس کی اسناد میں انقطاع ہے۔

اور میرے نزدیک: اس قسم کی خرابی صرف معتبر ہے دو حدیثوں میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینے جیسے معاملہ میں۔ اور نہیں معتبر ہے تعارض کے بغیر کسی حدیث کو چھوڑنے میں۔ اور اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والے ہیں۔

اور عمر اور ابن مسعود دونوں قائل نہیں تھے جنابت میں تیمم کے۔ پس متعین ہوگیا ان کے نزدیک آیت کو محمول کرنا ہاتھ لگانے پر۔ مگر ثابت ہوا ہے جنابت میں تیمم عمران، عمار، عَمرو بن العاص سے۔ اور منعقد ہو چکا ہے اس پر اجماع۔ اور ابن عمر احتیاط کی طرف جاتے تھے۔ اور ابراہیم پیروی کرتے تھے ابن مسعود کی، یہاں تک کہ واضح ہوا ابوحنیفہ پر اُس دلیل کا حال جس سے ابن مسعود نے استدلال کیا ہے۔ پس چھوڑ دیا ابوحنیفہ نے ابراہیم کا قول، باوجود ان کے شدت کے ساتھ اتباع کرنے کے ابراہیم کی۔

اور حاصل کلام: پس آئے (یعنی ہوگئے) فقہاء ان (صحابہ وتابعین) کے بعد، ان دونوں (مس ولمس) میں تین درجوں پر: لینے والا اس کو اس کے ظاہر پر، اور چھوڑنے والا اس کو سرے سے، اور فرق کرنے والا شہوت اور عدم شہوت کے درمیان۔

اور قائل تھے ابراہیم بہنے والے خون اور زیادہ قئے سے وضوء کے، اور حسنؒ نماز میں قہقہہ مارنے سے وضوء کے۔ اور نہیں قائل تھے اس کے دوسرے حضرات۔ اور ان (تینوں مسئلوں) میں سے ہر مسئلہ میں ایک ایسی حدیث ہے جس کی تصحیح پر حدیث کا علم رکھنے والوں نے اتفاق نہیں کیا۔

اور صحیح تر بات ان مسائل میں یہ ہے کہ جس نے احتیاط پر عمل کیا اس نے یقیناً براءت (پاکی) طلب کی اپنے دین کے لئے اور اپنی آبرو کے لئے۔ اور جو ایسا نہ کرے تو کوئی راہ نہیں ہے اس پر خالص شریعت میں۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ عورت کو ہاتھ لگانا شہوت کو برانگیختہ کرنے والا ہے۔ جماع کی شہوت سے کم تر شہوت کو پورا کرنے کی احتمالی جگہ ہے ـــــ اور یہ کہ عضو تناسل کو چھونا ایک برا فعل ہے۔ اور اسی وجہ سے ممانعت آئی ہے دائیں ہاتھ سے پیشاب کا عضو چھونے کی استنجاء میں۔ پس جب ہو اس کو ہاتھ سے پکڑنا تو ہوگا وہ یقیناً شیطان کے افعال میں سے (ای: إذا كان مسُّ الذكر في صورة القبض عليه، كان لامحالة من أفعال الشياطين) ـــــ اور بہنے والا خون اور زیادہ قئے دونوں بدن کو آلودہ کرنے والے ہیں، نفس کو بلید کرنے والے ہیں ـــــ اور نماز میں قہقہہ مارنا ایک بھاری غلطی ہے، وہ کبھی کفارہ کی محتاج ہوتی ہے۔ پس عجب نہیں کہ شارع حکم دے قہقہہ سے وضوء کا، اور عجب نہیں کہ نہ حکم دے، اور عجب نہیں کہ وضوء کی ترغیب دے، تاکید (وجوب) کے بغیر۔

☆ ☆ ☆

نواقضِ وضوء کی تیسری قسم ـــــ منسوخ نواقض

تیسرے درجہ کے نواقض وہ ہیں جن کے بارے میں بعض احادیث کی بناء پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید وہ نواقض ہیں، مگر ان کے ناقضِ وضوء نہ ہونے پر فقہائے صحابہ وتابعین کا اتفاق ہے۔ ایسے نواقض دو ہیں ایک: آگ پر پکی ہوئی چیز کا کھانا۔ دوسرا: اونٹ کا گوشت کھانا۔ تفصیل درج ذیل ہے:

۱- مامسّتِ النار کا ناقض وضوء ہونا:

مسلم شریف میں یہ ارشادِ نبوی مروی ہے کہ توضؤوا مما مسّتِ النار یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضوء کرو۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، حضرت ابن عباس، حضرت ابوطلحہ اور دیگر بہت سے صحابہ سے مامست النار سے وضوء نہ کرنا ثابت ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے صاف طور پر یہ بات بیان کردی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل وضوء نہ کرنا ہے۔۔ پس مسلم شریف کی روایت یقیناً منسوخ ہے۔

مامسّتِ النار سے وضوء کرنے کی وجہ:

مامست النار سے وضوء کرنے کا حکم دو وجہ سے تھا:

پہلی وجہ: آگ پر پکی ہوئی چیز کھانا، کچی کھانے کی بہ نسبت، دنیا کی چیزوں سے کامل انتفاع ہے، جو فرشتوں کی شان کے خلاف ہے، اس لئے اس کے کھانے سے فرشتوں سے وہ مشابہت منقطع ہوجاتی ہے جو طہارت کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی پس مشابہت کی تجدید کے لئے نئی وضوء کرنے کا حکم دیا تھا۔

دوسری وجہ: جب آگ پر پکی ہوئی چیز آدمی کھاتا ہے تو اس سے جہنم کی آگ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اور اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر شدید ضرورت کے لوہا گرم کرکے اس سے داغنے کا علاج کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ پس انسان کے لئے سزاوار نہیں کہ وہ اپنا دل اس کے ساتھ مشغول کرے۔ اور جہنم کی یاد لے کر عبادت کرے۔ اور جب ضرورتِ دنیوی کی وجہ سے ایسی چیز کھانا ناگزیر ہے تو مناسب یہ ہے کہ اس کے بعد وضوء کرلے۔ تاکہ پانی کی برودت نہ صرف جہنم کی آگ کو بھلادے، بلکہ رحمت و جنت کی یاد تازہ کردے۔

۲- اونٹ کے گوشت کا ناقض وضوء ہونا:

اونٹ کے گوشت کا معاملہ مامست النار کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔ مسلم شریف میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: کیا ہم بکری کا گوشت کھاکر وضوء کریں؟ آپ نے فرمایا: ''اگر چاہو تو کرو، اور اگر نہ چاہو تو نہ کرو'' سائل نے پوچھا: کیا ہم اونٹ کا گوشت کھاکر وضوء کریں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، اونٹ کے گوشت سے وضوء کرو'' (مشکوۃ حدیث ۳۰۵)

مگر فقہائے صحابہ میں سے اس کا کوئی قائل نہیں۔ اور نسخ کا فیصلہ کرنے کی بھی کوئی راہ نہیں، کیونکہ کسی صحابی نے نسخ کی صراحت نہیں کی۔ پھر جب مجتہدین کا زمانہ آیا تو جن حضرات پر قیاس واستنباط کی چھاپ گہری تھی وہ اونٹ کے گوشت سے نقضِ وضوء کے قائل نہیں ہوئے (یعنی ابوحنیفہ، مالک اور شافعی رحمہم اللہ) اور امام احمد اور امام اسحاق رحمہما

اللہ اس کے قائل ہوئے۔ کیونکہ ان حضرات پر ظاہر حدیث پر عمل کرنے کا جذبہ غالب تھا۔ اور شاہ صاحب کے نزدیک مناسب یہ ہے کہ آدمی احتیاطاً وضوء کرلے۔

اونٹ کے گوشت سے وضوء واجب ہونے میں راز:

ان حضرات کے قول کے مطابق جو اونٹ کے گوشت سے وضوء واجب کرتے ہیں، وجوب وضوء کا راز یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت تورات میں حرام تھا۔ اور تمام انبیائے بنی اسرائیل اس کی حرمت پر متفق تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس کو ہمارے لئے حلال کیا، تو دو وجہ سے اس کے کھانے کے بعد وضوء واجب کی:

پہلی وجہ: اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضوء کرنا شکر نعمت کے طور پر ہے۔ جو چیز پہلے حرام تھی وہ ہم پر حلال کی گئی اس کا شکر بجالانے کے لئے وضوء واجب کی گئی ہے ـــــ مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ شکر عبادت مقصودہ کے ذریعہ بجالایا جاتا ہے۔ اور وضوء عبادت غیر مقصودہ ہے۔

دوسری وجہ: اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وساوس کے علاج کے طور پر وضوء تجویز کی گئی ہے۔ ممکن ہے کسی کے دل میں یہ بات کھٹکے کہ جس چیز کو تمام انبیائے بنی اسرائیل نے حرام ٹھہرایا تھا، وہ ہمارے لئے حلال کیونکر ہوگئی؟! اس کھٹک کو مٹانے کے لئے اباحت کے ساتھ وضوء واجب کی۔ کیونکہ تحریم میں تبدیلی کرکے کسی چیز کو ایسا مباح قرار دینا جس کے ساتھ وضوء کو بھی واجب کیا ہو، لوگوں کے لئے زیادہ باعث اطمینان ہے۔

اور اس کو ایک نظیر سے سمجھیں: میت کو نہلانا ضروری ہے۔ مگر عام لوگ اس سے خوف کھاتے ہیں۔ ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے ہیں۔ چنانچہ وساوس کے علاج کے طور پر حکم دیا کہ میت کو نہلانے والا فارغ ہوکر خود بھی نہالے۔

آخر میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اونٹ کے گوشت سے وضوء کا وجوب ابتدائے اسلام میں تھا، بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا تھا۔ اور اوپر جو احتیاطاً وضوء کرنے کے لئے فرمایا ہے وہ صرف استحباباً ہے۔

والثالثة: ما وُجد فيه شبهةٌ من لفظ الحديث. وقد أجمع الفقهاء من الصحابة والتابعين على تركه، كالوضوء مما مَسَّتْهُ النارُ، فإنه ظهر عملُ النبي صلى الله عليه وسلم، والخلفاءِ وابن عباس، وأبي طلحة، وغيرهم بخلافه، وبيَّن جابر أنه منسوخ.

وكان السبب في الوضوء منه: أنه ارتفاق كامل، لايفعل مثله الملائكةُ، فيكون سببًا لانقطاع مشابهتهم. وأيضًا: فإن ما يُطبخ بالنار يُذكّرُ نار جهنم، ولذلك نُهي عن الكيِّ، إلا لضرورة، فلذلك لاينبغي للإنسان أن يُشْغِلَ قلبَه به.

وأما لحم الإبل: فالأمر فيه أشدُّ، لم يقل به أحد من فقهاء الصحابة والتابعين، ولاسبيل إلى الحكم بنسخه، فلذلك لم يقل به من يَغْلبُ عليه التخريجُ، وقال به أحمد وإسحاق؛

وعندى: أنه ينبغى أن يَحتاط فيه الإنسان، واللّٰهُ أعلم.

والسِّرُّ فى إيجاب الوضوء من لحوم الإبل على قول من قال به: أنها كانت محرّمةً فى التوراةِ، واتفق جمهور أنبياء بنى إسرائيل على تحريمها، فلما أباحها اللّٰه لنا شرع الوضوء منها لمعنَيَيْنِ:

أحدهما: أن يكون الوضوء شكرًا لما أنعم اللّٰه علينا من إباحتها بعد تحريمها على من قبلنا.

وثانيهما: أن يكون الوضوء علاجاً لما عسى أن يختلج فى بعض الصدور من إباحتها، بعد ما حَرَّمها الأنبياءُ من بنى إسرائيل، فإن النقل من التحريم إلى كونه مباحًا يجب منه الوضوء، أقربُ لاطمئنان نفوسهم.

وعندى أنه كان فى أول الإسلام، ثم نُسخ.

ترجمہ: اور تیسرا درجہ: وہ (نواقض) ہیں جن میں حدیث کے لفظ سے (نقض کا) شبہ ہوتا ہے۔ اور اتفاق کیا ہے فقہائے صحابہ وتابعین نے وضوء کے چھوڑنے پر، جیسے اس چیز سے وضوء کرنا جس کو آگ نے چھویا ہے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ ظاہر ہوا ہے نبی ﷺ، خلفائے راشدین، ابن عباس، ابوطلحہ اور ان کے علاوہ کا عمل اس (حدیث) کے خلاف۔ اور بیان کیا ہے جابرؓ نے کہ وہ منسوخ ہے۔

اور مامست النار سے وضوء کا سبب یہ تھا کہ (۱) وہ کامل فائدہ اٹھانا ہے۔ فرشتے ویسا کام نہیں کرتے۔ پس ہوگا وہ فرشتوں سے مشابہت کے منقطع ہونے کا سبب (۲) اور نیز۔ پس بیشک جو چیز آگ پر پکائی جاتی ہے، وہ نار جہنم کو یاد دلاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے روکا گیا ہے لوہا گرم کرکے داغ دینے سے۔ مگر ضرورت کی وجہ سے (داغنا جائز ہے) چنانچہ انسان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنا دل اس کے ساتھ مشغول کرے۔

رہا اونٹ کا گوشت: تو معاملہ اس میں زیادہ سخت ہے۔ فقہائے صحابہ وتابعین میں سے اس کا کوئی قائل نہیں تھا۔ اور اس کے نسخ کا فیصلہ کرنے کی بھی کوئی راہ نہیں۔ پس اس وجہ سے اس کے قائل نہیں ہوئے وہ فقہاء جن پر تخریج کا غلبہ ہے۔ اور احمد اور اسحاق اس کے قائل ہیں اور میرے نزدیک: یہ بات ہے کہ مناسب یہ ہے کہ انسان اس میں احتیاط برتے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

اور اونٹ کے گوشت سے وضوء واجب کرنے میں راز ـــــ اس شخص کے قول کے مطابق جو اس کو ناقض وضوء مانتا ہے ـــــ: یہ ہے کہ وہ تورات میں حرام تھا، اور تمام انبیائے بنی اسرائیل اس کی حرمت پر متفق تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ

نے اس کو ہمارے لئے حلال کیا تو اس سے وضوء کرنا مشروع کیا، دو وجہ سے:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ اس کے کھانے کے بعد وضوء کر لینا اللہ کی اس نعمت کا شکر بجالانا ہے کہ جو چیز پہلے حرام تھی وہ ہمارے لئے حلال کر دی گئی۔

اور ان میں سے دوسری: یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضوء کرنا علاج ہے اس بات کا جو ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں کھٹکے یعنی اس کو حلال کرنا اس کے بعد کہ اس کو انبیائے بنی اسرائیل نے حرام کیا تھا۔ پس بیشک تحریم سے منتقل ہونا ایسا مباح ہونے کی طرف جس سے وضوء واجب ہو، لوگوں کے قلوب کے اطمینان سے قریب تر ہے ـــــ اور میرے نزدیک: یہ بات ہے کہ یہ (وجوب کا) حکم ابتدائے اسلام میں تھا۔ پھر منسوخ کر دیا گیا۔

ترکیب: یجب منه الوضوء جملہ صفت ہے مباحاً کی۔ اور اقرب خبر ہے إنّ کی تخریج کے معنی استنباط کے ہیں۔

نوٹ: قوله: والسر فی إیجاب الوضوء إلخ مخطوطہ کراچی میں نہیں ہے۔ یہ مضمون شاہ صاحب نے بعد میں بڑھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۶

خُفّین (چمڑے کے موزوں) پر مسح کا راز

مشروعیت مسح کی وجہ:

چونکہ وضوء کا مدار ان اعضاء کے دھونے پر ہے جو عام طور پر کھلے رہتے ہیں، اور جن کی طرف میل کچیل سبقت کرتا ہے۔ اور جب موزے پہن لئے جاتے ہیں تو پیر ان میں چھپ جاتے ہیں، اور وہ اعضائے باطنہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور عربوں میں جوتے چپل کی جگہ خفین پہننے کا عام رواج تھا۔ اور ہر مرتبہ وضوء کے وقت ان کو نکال کر پیر دھونا تنگی سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے شریعت نے خفین پہننے کی صورت میں، کچھ وقت کے لئے، آسانی پیدا کرنے کے لئے پاؤں کے دھونے کا حکم ختم کر دیا۔ اور ان پر مسح کرنے کی اجازت دیدی۔

موزوں پر مسح کے لئے تین شرطیں ـــــ اور اشتراط کا راز:

جب شریعت دین میں آسانی پیدا کرتی ہے تو یہ بات ملحوظ رکھتی ہے کہ تیسیر کا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے نفس مطلق العنان (بے لگام) ہو جائے، اور امر مطلوب کو بالکل ہی بھلا بیٹھے۔ پیروں میں اصل مطلوب ''دھونا''

ہے۔مسح کی اجازت ایک سہولت ہے۔اب اگر بے قید اور بے مدت مسح کی اجازت دیدی جائے گی تو آدمی یہ تک بھول جائے گا کہ پیروں کا اصل حکم "دھونا" تھا۔اس لئے شارع نے تین شرطوں کے ساتھ مسح کی اجازت دی ہے۔

پہلی شرط: مسح کی توقیت (مدت مقرر) کی۔غیر متعین مدت کے لئے مسح کی اجازت نہیں دی۔مقیم کے لئے ایک شبانہ روز اور مسافر کے لئے تین شبانہ روز مقرر کئے۔کیونکہ یہ مدتیں کسی چیز کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کی جانے والی بہترین مدتیں ہیں۔لوگ اپنے عرف میں جب کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا چاہتے ہیں تو یہی مدتیں مقرر کرتے ہیں۔مثلاً کسی مریض کی حالت نازک ہے۔اس کو شفاخانہ میں انتہائی نگہداشت والے شعبہ میں داخل کیا گیا۔ڈاکٹر پہلے ۲۴ گھنٹے تک انتظار کرتا ہے۔اگر مریض یہ مدت پوری کردیتا ہے تو طبیب شفایابی کی امید دلاتا ہے۔پھر ۷۲ گھنٹے انتظار کرتا ہے۔اگر مریض یہ مدت بھی بخیریت پوری کردیتا ہے تو ڈاکٹر خوش خبری سناتا ہے کہ مریض خطرہ سے نکل گیا ہے! غرض یہی مدتیں تعہد (دیکھ بھال) کے لئے موزون ہیں اس لئے شریعت نے بھی یہی مدتیں مقرر کی ہیں۔

اور مقیم کو پہلی اور مسافر کو دوسری مدت ان کی تنگی کا لحاظ کرکے دی گئی ہے۔مقیم کو اسباب طہارت اور وقت میسر ہوتا ہے۔اور مسافر کو یہ دونوں چیزیں بہ سہولت میسر نہیں ہوتیں،اس لئے اس کو مزید سہولت دی گئی ہے۔

دوسری شرط: خفین کا طہارت کاملہ پر پہننا۔یہ شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ آدمی کے پیش نظر یہ بات رہے اور اس کے دل میں یہ نقشہ جمارہے کہ اس کے پیر گویا پاک ہیں۔وہ پیروں کو اعضائے مستورہ پر قیاس کرکے سمجھے کہ جس طرح اعضائے مستورہ تک میل کچیل کم پہنچتا ہے،اس لئے وہ گویا پاک ہیں،اسی طرح پاؤں بھی مستور ہونے کی وجہ سے گویا اسی حالت پر ہیں جس حالت میں ان کو خفین میں داخل کیا گیا تھا۔اور اس قسم کے قیاسات ان چیزوں میں کارآمد ہوتے ہیں، جن کا تعلق نفس کی تنبیہ سے ہوتا ہے۔

تیسری شرط: غسل کے بعد مسح موزوں کے اوپر کیا جائے۔صرف نیچے مسح کرنا کافی نہیں،تاکہ وہ پیروں کا دھونا یاد دلائے اور وہ غسل کا نمونہ بنے۔امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ صرف موزوں کے اوپر مسح کے قائل ہیں۔اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ اوپر بھی اور نیچے بھی مسح کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک بھی صرف نیچے مسح کافی نہیں البتہ صرف اوپر کافی ہے۔گویا نیچے مسح ان دونوں کے نزدیک مستحب ہے،ضروری نہیں۔

المسح على الخُفَّين

لما كان مبنى الوضوء على غسل الأعضاء الظاهرة، التى تسْرُع إليها الأوساخ، وكانت الرِّجلان تدخُلان عند لُبس الخفين فى الأعضاء الباطنة، وكان لُبْسهما عادةً متعارفةً عندهم، ولايخلو الأمْرُ بخلْعهما عند كل صلاة من حرج، سقط غسلُهما عند لُبسهما، فى الجملة.

ولما كان من باب التيسير الاحتيالُ بما لاتسترسل معه النفسُ بترك المطلوب، استعمله الشارع ههنا من وجوهٍ ثلاثةٍ:

أحدها: التوقيتُ بيوم وليلة للمقيم، وثلاثةِ أيام ولياليها للمسافر: لأن اليومَ بليلةٍ مقدارٌ صالحٌ للتعهُّد، يستعمله الناس في كثير مما يريدون تعهُّده، وكذلك ثلاثةُ أيام بلياليها، فوُزِّع المقدارن على المقيم والمسافر، لمكانهما من الحرج.

والثاني: اشتراطُ أن يكون لُبسهما على طهارة: ليتمثَّل بين عيني المكلَّف أنهما كالباقي على الطهارة، قياساً على قلةِ وصول الأوساخ إلى الأعضاء المستورة؛ وأمثالُ هذه القياسات مؤثرةٌ فيما يرجع إلى تنبيه النفس.

والثالث: أن يمسح على ظاهرهما، عوَضَ الغَسل، إبقاءً لمذكِّرٍ ونموذج.

ترجمہ: خفین پر مسح: جب وضوء کا مدار اُن عضائے ظاہرہ کے دھونے پر تھا جن کی طرف میل کچیل سبقت کرتا ہے۔ اور دونوں پیر خفین پہننے کی صورت میں اعضائے باطنہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور خفین کا پہننا عربوں میں ایک معروف عادت تھی۔ اور ہر نماز کے وقت ان کو نکالنا تنگی سے خالی نہیں تھا۔ تو فی الجملہ (کچھ وقت کے لئے) ان کا دھونا ساقط ہو گیا، خفین پہننے کی صورت میں۔

اور جب تھا تیسیر کے باب سے حیلہ کرنا ایسی چیز کے ذریعہ کہ نہ بے لگام ہو جائے اس کے ساتھ نفس مطلوب کو ترک کرنے میں، تو شارع نے مسح کو استعمال کیا یہاں (خفین میں) تین صورتوں سے:

ان میں سے ایک. مدت مقرر کرنا ہے مقیم کے لئے ایک رات دن کی اور مسافر کے لئے تین رات دن کی۔ اس لئے کہ ایک دن مع اس کی رات کے ایک کارآمد مقدار ہے دیکھ بھال کے لئے۔ لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں بہت سی ان چیزوں میں جن کی دیکھ بھال کا وہ ارادہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح تین دن مع ان کی راتوں کے۔ پس تقسیم کی گئیں دونوں مقداریں مقیم اور مسافر پر، ان دونوں کے حرج کا لحاظ کر کے۔

اور دوسری: اس بات کی شرط لگانا ہے کہ خفین طہارت پر پہنے گئے ہوں، تاکہ نقشہ جما رہے مکلف کی دونوں آنکھوں کے سامنے کہ وہ دونوں پیر گویا طہارت پر باقی ہیں، قیاس کرتے ہوئے میل کچیل کے کم پہنچنے پر مستور اعضاء کی طرف۔ اور اس قسم کے قیاسات اثر انداز ہوتے ہیں ان چیزوں میں جن کا تعلق نفس کو چوکنا کرنے سے ہے۔

اور تیسری. یہ ہے کہ مسح کرے خفین کے اوپر کے حصہ میں، دھونے کے بدلے کے طور پر، تاکہ پاؤں دھونے کی یاد دہانی اور اس کا نمونہ باقی رہے۔

☆ ☆ ☆

موزوں کے اوپر مسح استحسانی ہے اور نیچے قیاسی

اب شاہ صاحب رحمہ اللہ باب کے آخر میں ایک سوال مقدر کا جواب دیتے ہیں۔ موزوں پر مسح کے جواز کے لئے اوپر تین شرطیں بیان کی گئی ہیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ مسح موزوں کے اوپر کے حصہ میں کیا جائے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابو داؤد شریف (حدیث نمبر ۱۶۲) میں حضرت علیؓ کا ارشاد مروی ہے کہ: ''اگر دین کا مدار رائے (عقل وقیاس) پر ہوتا تو موزوں کے نیچے مسح کرنا، اوپر مسح کرنے سے بہتر تھا'' اس ارشاد سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ظاہر خف پر مسح خلافِ قیاس ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ جواب دیتے ہیں کہ ظاہر خف پر مسح خلافِ قیاس نہیں، بلکہ موافق قیاس ہے۔ کیونکہ موزوں پر مسح پاؤں دھونے کے نمونہ کے طور پر تجویز کیا گیا ہے۔ مسح کا اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں۔ پس اگر موزوں کے نیچے مسح کیا جائے گا یعنی بھیگا ہوا ہاتھ نیچے پھیرا جائے گا تو جب آدمی وضوء سے فارغ ہو کر چلے گا تو وہ حصہ گندہ ہو جائے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ مسح موزوں کے اوپر کیا جائے۔ اس طرح ظاہر خف پر مسح معقول اور رائے کے موافق ہو جاتا ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ احکام شرعیہ کے اسرار ورموز بخوبی جانتے تھے۔ ان کے ارشادات اور خطابات اس کی واضح دلیل ہیں۔ ان کے نزدیک بھی مسح ظاہر خف ہی پر اصل تھا۔ مگر آپؓ نے چاہا کہ لوگ عقل کا گھوڑا نہ دوڑائیں۔ اس لئے آپ نے رائے کی راہ مسدود کرتے ہوئے مذکورہ بات فرمائی، تاکہ لوگ احکام شرعیہ میں رائے زنی کر کے اپنا دین بگاڑ نہ لیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ موزوں کے نیچے مسح کرنا قیاس جلی ہے۔ کیونکہ وہی حصہ گرد وغبار سے ملوث ہوتا ہے، پس اسی کو صاف کرنا چاہئے۔ مگر قیاس جلی گو فہم کے اعتبار سے واضح ہوتا ہے۔ مگر اثر کے اعتبار سے ضعیف ہوتا ہے، غور فرمائیں! مذکورہ بات اس وقت معقول تھی جبکہ خشک ہاتھ سے گرد جھاڑی جاتی۔ مگر مسح بھیگا ہوا ہاتھ عضو پر پھیرنے کا نام ہے۔ پس نیچے مسح کرنے سے وہ حصہ بھیگ جائے گا۔ پھر جب آدمی چلے گا تو وہ حصہ گندہ ہوگا۔ اور ''بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا'' والی کہاوت صادق آئے گی۔ نیز نیچے مسح کرنا دھونے کا نمونہ بھی نہیں بنے گا، کیونکہ وہ مسح آنکھوں سے مستور ہوگا۔

اور موزوں کے اوپر مسح کرنا استحسان ہے۔ استحسان بھی قیاس ہی ہوتا ہے، مگر وہ قیاس خفی ہوتا ہے۔ جو فہم کے اعتبار سے تو دقیق ہوتا ہے، مگر اثر کے اعتبار سے قوی ہوتا ہے۔ اور وہ قوتِ اثر یہ ہے کہ اوپر مسح کرنا دھونے کا نمونہ بنے گا، اور چلنے سے وہ حصہ گندہ بھی نہیں ہوگا۔ پس ظاہر خف پر ہی مسح اَولیٰ ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے، مگر آپؓ نے عوام کے دین کی حفاظت کے لئے مذکورہ بالا ارشاد فرمایا تاکہ لوگ قیاس جلی کی طرف نہ پڑیں اور باطن خف پر مسح کو اَولیٰ خیال کر کے اپنا دین بگاڑ نہ لیں۔

وقال علی رضی اللہ عنہ: " لو کان الدینُ بالرأی لکان أسفلُ الخف أولیٰ بالمسح من أعلاہ"
أقول: لما کان المسحُ إبقاءً لمنوذَج الغَسل، لایُراد منه إلا ذلك؛ وکان الأسفلُ مظنةً

لتلويث الخفين عند المشي في الأرض، كان المسحُ على ظاهرهما، دون باطنهما، معقولاً، موافقا بالرأي. وكان علي رضي الله عنه من أعلم الناس بعلم معاني الشرائع، كما يظهر من كلامه وخُطَبِهِ، لكن أراد أن يَسُدَّ مَدْخَلَ الرأي، لئلا يُفْسِدَ العامةُ على أنفسهم دينهم.

ترجمہ: اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر دین رائے کے ذریعہ ہوتا تو موزوں کے نیچے مسح کرنا، اوپر مسح کرنے سے بہتر تھا''

میں کہتا ہوں: جب مسح کرنا پاؤں کو دھونے کا نمونہ باقی رکھنے کے طور پر تھا، اور اس کے سوا اس سے اور کچھ مقصود نہیں تھا، اور موزوں کا نیچے کا حصہ، زمین میں چلنے کی صورت میں، تلویث کی احتمالی جگہ تھا. تو خفین کے اوپری حصہ پر، نہ کہ نیچے کے حصہ پر، مسح معقول (اور) رائے کے موافق تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے احکام کے معانی (اسرار وحکم) کو، جیسا کہ ان کے ارشادات سے اور ان کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر آپؓ نے چاہا کہ رائے کی راہ مسدود کریں، تا کہ عام لوگ اپنے اوپر اپنے دین کو بگاڑ نہ لیں۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۷

غسل کا طریقہ

غسل کا طریقہ: جس کو بخاری و مسلم نے حضرت عائشہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے،[1] اور جس پر امت نے اتفاق کیا ہے: یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو برتن میں ڈالنے سے پہلے دھو لے۔ پھر بدن پر اور شرمگاہ پر جو ناپاکی ہو اس کو دھو ڈالے۔ پھر نماز والی وضوء کرے۔ پھر سر کے بالوں میں تر انگلیاں ڈال کر بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح پانی پہنچائے۔ پھر سارے جسم پر پانی بہائے۔ غسل کا یہ پورا طریقہ متفق علیہ ہے۔ صرف ایک بات میں اختلاف ہے کہ وضوء میں پیر کب دھوئے؟ وضوء کے ساتھ یا غسل سے فارغ ہو کر؟ دونوں رائیں ہیں۔ اور بعض حضرات فرق کرتے ہیں کہ اگر ایسی جگہ نہا رہا ہے جہاں مستعمل پانی جمع ہو رہا ہے تو پیر بعد میں دھوئے۔ اور اگر وہاں سے پانی بہ جاتا ہے تو پیر وضوء کے ساتھ ہی دھو لے۔

غسل شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھونے کی وجہ: وہی ہے جو وضوء کے بیان میں گذر چکی ہے کہ جب ہاتھ دھوئے دیر ہو جاتی ہے اور عرصہ تک ہاتھوں سے غفلت رہتی ہے تو احتمال پیدا ہوتا ہے کہ ان پر کوئی ناپاکی لگ گئی ہو، یا

[1] یہ دونوں حدیثیں متفق علیہ ہیں مشکوۃ، باب الغسل، حدیث نمبر ۴۳۵ و ۴۳۶

میل کچیل سے ہاتھ ملوث ہو گئے ہوں، اور جنابت کے بعد غسل میں تو ہاتھوں کے ناپاک ہونے کا قوی احتمال ہے، پس ہاتھوں کو دھوئے بغیر پانی میں ڈالنا یا تو پانی کو ناپاک کردے گا، یا گدلا کردے گا جو خلاف تہذیب وشائستگی ہوگا۔

اور غسل شروع کرنے سے پہلے شرمگاہ کو دھونے کا حکم: دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: اگر شرمگاہ پر یا بدن پر ناپاکی ہوگی، اور اس کو دھوئے بغیر جسم پر پانی بہائے گا، تو ناپاکی جسم پر پھیل جائے گی، اور اس کو پاک کرنے میں دشواری لاحق ہوگی اور بہت زیادہ پانی درکار ہوگا، اس لئے پہلے ناپاکی کو الگ سے دھولینا چاہئے۔

دوسری وجہ: غسلِ جنابت: نجاست حکمیہ کے ازالہ ہی کے لئے ہے۔ اگر ناپاک بدن کے ساتھ غسل جنابت کرے گا تو غسل کا مقصد دو نجاستوں کا ازالہ ہوگا۔ پس غسل: حدث کے ازالہ کے لئے خالص نہیں رہے گا۔ اس لئے نجاست حقیقیہ کو الگ سے دھولینا چاہئے تاکہ غسل: نجاست حکمیہ کے ازالہ کے لئے خالص ہوجائے۔

غسل کے شروع میں وضوء: کی تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: غسل طہارت کبری (بڑی پاکی) ہے۔ اس کا مقتضی یہ ہے کہ وہ طہارت صغری (وضوء) اور کچھ زائد پر مشتمل ہو، تاکہ نفس پاکی کی صفت سے اچھی طرح باخبر ہوجائے۔

دوسری حکمت: غسل میں جسم کے شکنوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اور وضوء: جسم کے شکنوں کی دیکھ بھال کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ اگر وضوء کئے بغیر سر پر پانی بہائے گا تو احتمال ہے کہ پانی جسم کے اطراف تک نہ پہنچے۔ جب تک اطراف کا خیال نہ رکھا جائے اور ان تک پانی پہنچانے کا اہتمام نہ کیا جائے وہ خشک رہ سکتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ پہلے وضوء کر کے اطراف کو دھولے۔

تیسری حکمت: جب جنابت لاحق ہوتی ہے تو جسم کا ظاہری حصہ گرم ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر فوراً ٹھنڈے پانی سے نہائے گا اور یکدم سر پر ٹھنڈا پانی ڈالے گا تو اس کا ردعمل ہوسکتا ہے۔ نزلے زکام میں یا کسی اور بیماری میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اور غسل سے پہلے وضوء کرلے گا تو گرمی اندر دب جائے گی، اور ظاہری جسم ٹھنڈا ہوجائے گا۔ پس ٹھنڈے پانی کا ردعمل نہیں ہوگا، اور آدمی بیماری سے محفوظ رہے گا (یہ حکمت شارح نے بڑھائی ہے)

پیروں کو بعد میں دھونے: کی حکمت یہ ہے کہ اگر وضوء کے ساتھ ہی پیر دھولے گا تو غسل سے فارغ ہوکر دوبارہ پیر دھونے پڑیں گے، جبکہ پانی جمع ہونے کی جگہ میں نہا رہا ہو، پس خواہ مخواہ پاؤں کو بار بار دھونا لازم آئے گا۔ البتہ اگر کوئی وضوء کے ساتھ پیر اس لئے دھوتا ہے کہ وضوء کی صورت مکمل ہوجائے۔ اور غسل کے بعد پاک کرنے کے لئے پیروں کو دھوتا ہے تو یہ بے فائدہ تکرار نہیں ہے۔

مستحباتِ غسل: چار ہیں (۱) تمام بدن کو تین بار دھونا (۲) بدن کو ملنا اور خوب اچھی طرح سے کھال کو صاف کرنا (۳) جسم کے شکنوں کی دیکھ بھال کرنا اور اہتمام سے ان تک پانی پہنچانا (۴) اور پردہ میں نہانا ——— شارع علیہ السلام نے یہ امور

غسل میں اس لئے مستحب قرار دیئے ہیں کہ غسل کامل ومکمل ہو۔

نوٹ: دنیا میں پانی سب جگہ وافر مقدار میں نہیں پایا جاتا۔ عرب میں پانی کی بہت قلت تھی، وضوء وغسل کے احکام میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ تھوڑے پانی سے کامل طہارت حاصل ہوجائے۔

﴿صفة الغسل﴾

على ماروته عائشةُ وميمونةُ، وتطابق عليه الأمةُ: أن يغسل يديه قبل إدخالهما الإناءَ، ثم يغسل ما وجد من نجاسة على بدنه وفرجه، ثم يتوضأ كما يتوضأ للصلاة، ويتعهَّد رأسه بالتخليل، ثم يصُب الماء على جسده. واختلفوا فى حرفٍ واحدٍ: يؤخر غسْلَ القدمين أولا؟ وقيل بالفرق بين ما إذا كان فى مُسْتَقَعٍ من الأرض، وما إذا لم يكن كذلك.

أما غَسل اليدين: فلما مر فى الوضوء.

وأما غَسل الفرج: فلئلا تتكثر النجاسة بإسالة الماء عليها، فيعسر غسلها، ويحتاج إلى ماء كثير، وأيضًا: لايصفو الغُسل لطهارة الحدث.

وأما الوضوء: فلأن من حق الطهارة الكبرى أن تشتمل على الطهارة الصغرى وزيادةٍ، ليتضاعف تنبهُ النفس لِخَلْةِ الطهارة. وأيضًا: فالوضوء فى الغُسل من باب تعهُّد المغابن، فإنه إذا أفاض على رأسه الماءَ، لايستوعب الأطرافَ إلا بتعَهُّدٍ واعتناءٍ.

وأما تاخير غَسل القدمين: فلئلا يتكرر غسلهما بلافائدة، اللهم إلا لمحافظة على صورة الوضوء.

ثم كَمَّلَ الغُسْلَ: بالندب إلى التثليث والدَّلك وتعهد المغابن وتاكيد السّتر.

ترجمہ: نہانے کا طریقہ: اس طور پر جس کو روایت کیا ہے عائشہ اور میمونہ رضی اللہ عنہما نے، اور جس پر اتفاق کیا ہے امت نے: یہ ہے کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھولے۔ پھر اس ناپاکی کو دھوڈالے جس کو اپنے بدن اور اپنی شرمگاہ پر پائے۔ پھر وضوء کرے جس طرح نماز کے لئے وضوء کرتا ہے۔ پھر خلال کے ذریعہ اپنے سر کی دیکھ بھال کرے (یعنی بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح پانی پہنچائے) پھر اپنے جسم پر پانی بہائے ——— اور (علماء نے) صرف ایک بات میں اختلاف کیا ہے: (وہ یہ ہے کہ) دونوں پیروں کے دھونے کو مؤخر کرے یا نہیں؟ اور بعض نے فرق کیا ہے اس صورت میں جبکہ وہ نہا رہا ہو پانی جمع ہونے کی جگہ میں اور اس صورت میں جبکہ ایسا نہ ہو۔

رہا دونوں ہاتھوں کا دھونا: تو اس کی وجہ وہ ہے جو وضوء کے بیان میں گذر چکی ہے۔

اور رہا شرمگاہ کا دھونا: پس اس لئے ہے کہ ناپاکی زیادہ نہ ہو جائے، اس پر پانی بہانے کی وجہ سے، پس دشوار ہو اس کو دھونا اور بہت پانی درکار ہو۔ اور نیز: خالص نہ رہے نہانا حدث کی پاکی کے لئے۔

اور رہا وضوء: پس اس لئے ہے کہ طہارت کبری کے حق میں سے یہ بات ہے کہ وہ طہارت صغری اور کچھ زیادہ (عمل) پر مشتمل ہو، تاکہ دو چند ہو نفس کا چوکنا ہونا پاکی کی خصلت پر۔ اور نیز: پس غسل میں وضوء کرنا شکنوں کی دیکھ بھال کرنے کے قبیل سے ہے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ جب وہ اپنے سر پر پانی بہائے گا تو وہ اطراف کو نہیں گھیرے گا مگر دیکھ بھال کرنے اور اہتمام کرنے سے۔

اور رہا دونوں پیروں کو بعد میں دھونا پس وہ اس لئے ہے کہ خواہ مخواہ پاؤں کا بار بار دھونا لازم نہ آئے۔ اے اللہ! مگر صورت وضوء کی محافظت کے لئے۔

پھر کامل کیا (شارع علیہ السلام نے) غسل: تین بار دھونے کو، اور بدن کے ملنے کو، اور شکنوں کی دیکھ بھال کرنے کو مستحب قرار دیکر، اور ستر پوشی کی تاکید کر کے۔

تصحیح: اللھم إلا لمحافظة مطبوعہ اور تینوں مخطوطوں میں اللھم إلا المحافظة تھا۔ تصحیح مطبوعہ صدیقی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

حیاداری اور پردہ پوشی

حدیث ——— حضرت یعلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کھلے میدان میں (ننگے) نہاتے دیکھا، تو آپ منبر پر چڑھے۔ خدا کی حمد وثنا کی اور فرمایا: "بیشک اللہ تعالیٰ بہت حیادار، بہت پردہ پوش ہیں۔ وہ حیا اور پردہ کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص نہائے تو پردہ کرے" (رواہ ابوداؤد والنسائی، مشکوۃ، باب الغسل، حدیث ۴۴۷)

تشریح: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی اہم بات بیان فرمانا چاہتے تھے تو منبر پر چڑھ کر باقاعدہ تقریر فرماتے تھے پہلے اللہ کی حمد کرتے، پھر وہ بات بیان فرماتے جو مقصود ہوتی ——— مذکورہ حدیث میں آپ نے جو بات بیان فرمائی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حیاداری اور پردہ پوشی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اور بندوں سے مطلوب یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اللہ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کریں۔ پس جب وہ نہائیں تو پردہ کا اہتمام کر کے نہائیں۔

اس حدیث کے ذیل میں شاہ صاحب نے دو مسئلے بیان کئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

مسئلہ: (۱) لوگوں کی نگاہوں سے پردہ کرنا واجب ہے یعنی بیوی کے علاوہ کسی کے سامنے بے ضرورت ستر کھولنا

جائز نہیں۔

مسئلہ:(۲) مستحب یہ ہے کہ استنجاء اور غسل اس طرح کرے اور تنہائی میں اس طرح رہے کہ اگر کوئی شخص اچانک معتاد طریقے پر آجائے تو وہ ستر نہ دیکھے۔ یعنی پردہ اور آڑ کر کے قضائے حاجت کرے اور تنہائی میں بھی ستر ڈھانپے رکھے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن اللّٰه حَيِيٌّ سِتِّيرٌ" تفسيره قوله: " يحب الحياء والسِّتر" والسّتر من أعين الناس واجب، وكونه بحيث لو هجم إنسان بالوجه المعتاد لم يرعورته مستحب.

ترجمہ:(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "بیشک اللہ تعالیٰ بہت حیادار، بہت پردہ پوش ہیں" اس کی تفسیر آپ کا یہ ارشاد ہے کہ: "وہ حیا اور پردہ کو پسند کرتے ہیں" اور لوگوں کی نگاہوں سے پردہ واجب ہے۔ اور آدمی کا اس طور پر ہونا مستحب ہے کہ اگر اچانک کوئی انسان معتاد طریقے پر آجائے تو اس کا ستر نہ دیکھے۔

☆ ☆ ☆

غسلِ حیض میں خصوصی اہتمام کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک انصاری خاتون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غسلِ حیض کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے اس کو غسل کا طریقہ بتایا۔ پھر فرمایا کہ (غسل سے فارغ ہو کر): "مشک میں بسا ہوا کپڑے کا ٹکڑا لے، اور اس سے پاکی حاصل کرے" اس نے پوچھا: اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا: "اس سے پاکی حاصل کر" اس نے پوچھا: اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا: "سبحان اللہ! اس سے پاکی حاصل کر" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور میں نے اس کو سمجھایا کہ اس سے خون کے نشان کا پیچھا کر یعنی اس کو خون کی جگہ میں (ستر میں) لگا (متفق علیہ، مشکوٰۃ، باب الغسل، حدیث نمبر ۴۳۷)

تشریح: غسلِ حیض سے فارغ ہو کر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشک میں بسایا ہوا کپڑے کا ٹکڑا یا روئی کا پھاہا اندام نہانی وغیرہ پر لگانے کا حکم دیا ہے اس میں تین حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: اس عمل سے پاکی کی زیادتی مطلوب ہے۔ کیونکہ خوشبو بھی طہارت کا کام کرتی ہے یعنی طبیعت میں انبساط و سرور پیدا کرتی ہے۔ اور ہر غسل میں اس کا حکم اس لئے نہیں دیا کہ اس میں حرج تھا۔

دوسری حکمت: مشک کا پھاہا لگانے سے اس بدبو کا ازالہ مقصود ہے جس سے حیض کا کوئی خون خالی نہیں ہوتا۔ (پس خوشبودار کریم اور پاؤڈر بھی ان شاء اللہ کسی درجہ میں اس کا قائم مقام ہو جائے گا)

تیسری حکمت. حیض کا انقطاع اور طہر کی ابتداء طلب اولاد کا وقت ہے۔اس وقت مرد وزن کا ایک دوسرے کی طرف میلان ہوتا ہے اور بچہ دانی میں بھی استقرار حمل کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔اور خوشبو اس قوت (مجامعت واستقرار) کو ابھارتی ہے۔اس لئے خوشبو کے خصوصی اہتمام کا امر فرمایا ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم "خُذى فِرْصَةً من مِسْكٍ فتطَهَّرِىْ بها" يعنى تتبعى بها أثرَ الدم.
أقول: إنما أمر الحائض بالفرْصةِ الممسَّكة لمعانٍ:
منها: زيادة الطهارة، إذ الطيبُ يفعل فعلَ الطهارة، وإنما لم يُسنَّ فى سائر الأوقات احترازا عن الحرج.
ومنها: إزالةُ الرائحة الكريهة التى لايخلو عنها الحيضُ.
ومنها: أن انقضاءَ الحيض والشروعَ فى الطهر وقتُ ابتغاء الولد، والطِّيبُ يُهيِّجُ تلك القوة

ترجمہ: (۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "تو مشک میں بسا ہوا کپڑے کا ٹکڑا لے، پھر اس سے پاکی حاصل کر" یعنی پیچھا کر تو اس سے خون کے نشان کا۔
میں کہتا ہوں: آپؐ نے بچند وجوہ حائضہ کو مشک میں بسا ہوا کپڑے کا ٹکڑا لینے کا حکم دیا ہے:
ان میں سے: پاکی کی زیادتی ہے، کیونکہ خوشبو طہارت کا کام کرتی ہے۔اور ہر وقت میں مسنون نہیں کیا صرف تنگی سے بچتے ہوئے۔
اور ان میں سے: اس بدبو کو زائل کرنا ہے جس سے حیض خالی نہیں ہوتا۔
اور ان میں سے: یہ بات ہے کہ حیض کا گذرنا اور طہر کا شروع ہونا اولاد چاہنے کا وقت ہے۔اور خوشبو اس قوت کو ابھارتی ہے۔

☆ ☆ ☆

وضوء وغسل کے لئے پانی کی مقدار

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مُدّ سے وضوء کیا کرتے تھے، اور ایک صاع سے پانچ مُدّ تک غسل فرمایا کرتے تھے یعنی غسل میں زیادہ سے زیادہ سوا صاع اور کم سے کم ایک صاع پانی استعمال فرماتے تھے (متفق علیہ، مشکوۃ، حدیث ۴۳۹)
تشریح: مُدّ: ایک پیمانہ ہے۔جس کا وزن ۷۸۷ گرام ہوتا ہے۔اور صاع: چار مدّ کا ہوتا ہے۔پس اس کا وزن تین

کلو ۱۴۸ گرام ہوگا۔ یعنی تقریباً ۸۰۰ گرام پانی آنحضرت ﷺ وضوء میں، اور تقریباً چار کلو تک پانی غسل میں استعمال فرماتے تھے۔ پانی کی یہ مقدار متوسط جسموں کے لئے کافی ہے۔ نہ کم ہے نہ زیادہ۔

جن خطوں میں پانی کم ہے، وہاں لوگ پانی میں کنجوسی کرتے ہیں۔ طہارت میں بھی پانی کم استعمال کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ حجاز میں بھی پانی کم تھا۔ مگر آپ پانی کی معتد بہ مقدار طہارت میں استعمال فرماتے تھے۔ اور جن علاقوں میں پانی کی فراوانی ہے، وہاں لوگ پانی کا اسراف کرتے ہیں۔ یہ بھی مناسب نہیں۔ پانی کی مسنون مقدار وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی۔

[۳] واختار الصاع إلى خمسة أمداد للغسل، والمُدَّ للوضوء: لأن ذلك مقدار صالح فى الأجسام المتوسطة.

ترجمہ: (۳) اور آنحضرت ﷺ نے غسل کے لئے ایک صاع کو پانچ مد تک، اور وضوء کے لئے ایک مد پانی کو پسند فرمایا۔ اس لئے کہ پانی کی یہ مقدار کافی ہے متوسط جسموں کے لئے (یعنی ان اجسام کے لئے جو نہ بہت لمبے تڑنگے ہیں، نہ پتلے دُبلے)

☆ ☆ ☆

غسلِ جنابت میں اہتمام کی وجہ

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ہر بال کے نیچے جنابت ہے۔ پس بالوں کو دھوؤ، اور کھال کو صاف کرو''[۱]

تشریح: جو بال کھال پر گرتا ہے اور اس کا جو حصہ کھال سے لگتا ہے، وہ بال کا نچلا حصہ ہے۔ اس میں جنابت ہے پس سارے بال کو دھونا ضروری ہے۔ اور وہ کھال کی جس مقدار کو اپنے تلے چھپاتا ہے وہ کھال بھی جنبی ہے۔ پس اس کو بھی دھونا ضروری ہے۔ غرض بال برابر جگہ بھی خشک رہ جائے گی تو غسل جنابت نہیں ہوگا۔

حدیث ——— حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس نے بال برابر جنابت چھوڑ دی، جس کو نہیں دھویا، تو اس جنابت کو ایسی اور ایسی آگ کی سزا دی جائے گی!'' حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے میں اپنے سر کا دشمن ہوگیا ہوں![۲] (یہ جملہ تین بار فرمایا) یعنی آپ ہمیشہ سر کے بال منڈواتے تھے، تاکہ غسل

[۱] رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۴۴۳ یہ حدیث حارث بن وجیہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ مگر آئندہ حدیث اس کے لئے شاہد صحیح ہے ۱۲

[۲] رواہ ابوداؤد واحمد والدارمی مشکوٰۃ حدیث نمبر ۴۴۴

جنابت میں کوئی بال خشک نہ رہ جائے ——— اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہمیشہ سر کے بال منڈوانا جائز ہے۔ اگرچہ سنت بال رکھنا ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ اور تین خلفائے راشدین، حج کے علاوہ بال نہیں منڈواتے تھے (مظاہر حق)

تشریح: ان حدیثوں کا راز بھی وہی ہے جو استیعابِ وضوء کے باب میں گذر چکا ہے اور اس کا خلاصہ تین باتیں ہیں:

پہلی بات: ہر ہر بال کا دھونا غسل کے معنی کو ثابت کرتا ہے یعنی جب سارا جسم اور جسم کا ہر ہر بال دُھل جائے گا تو ہی مکمل طور پر دھونا متحقق ہوگا۔ اگر ذرا سا حصہ بھی خشک رہ گیا تو سارا جسم نہیں دُھلا۔

دوسری بات: آدمی کا جنابت کی حالت میں رہنا، اور اس کو دور نہ کرنے پر اصرار کرنا موجبِ نار خصلت ہے، اور طہارت موجبِ دخولِ جنت اور باعثِ کفارۂ سیئات خصلت ہے۔ اس لئے بال برابر جگہ خشک رہ جانے پر جہنم کی وعید سنائی۔

تیسری بات: غسل جنابت میں جو جگہ خشک رہ گئی ہے، چونکہ غسل کرنے والے نے اس عضو میں حکم الٰہی کی مخالفت کی ہے، اس لئے اولاً یہی عضو معذب ہوگا، پھر اس کی وجہ سے سارا نفس رنجیدہ ہوگا ——— حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جسم کا صرف وہی حصہ معذب ہوگا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ نفس میں چونکہ بگاڑ اسی عضو کے خشک رہ جانے کی وجہ سے آیا ہے، اس لئے اولاً اور بالذات وہی عضو معذب ہوگا، پھر اس کی وجہ سے آدمی کا سارا وجود رنجیدہ ہوگا۔

[٤] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: " تحتَ كلّ شعرة جنابة، فاغسلوا الشعر، وأنقوا البشرةَ" وقوله صلی اللہ علیہ وسلم: " من ترك موضِع شعرة من الجنابة ، لم يَغْسِلْها، فُعل بها كذا وكذا"

أقول: سِرُّ ذلك مثل ما ذكرناه فی استيعاب الوضوء: من أنه تحقيق لمعنى الغَسل، وأن البقاء على الجنابة والإصرار على ذلك موجبة للنار، وأنه يظهر تألُّمُ النفس من قِبَلِ العضو الذی جاء منه الخلل.

ترجمہ: (۴) آنحضرت ﷺ کے دو ارشادات (جن کا ترجمہ گذر چکا)

میں کہتا ہوں: ان کا راز ویسا ہی ہے جیسا ہم استیعاب وضوء میں ذکر کر چکے: (۱) یعنی یہ بات کہ ہر ہر بال کو دھونا غسل کے معنی کو ثابت کرتا ہے (۲) اور یہ کہ جنابت پر باقی رہنا، اور اس پر اصرار کرنا جہنم کی سزا کو واجب کرنے والا ہے (۳) اور یہ بات کہ نفس کی رنجیدگی ظاہر ہوگی اس عضو کی جانب سے جس کی جانب سے خلل واقع ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۸

غسل واجب کرنے والی چیزوں کا بیان

موجبات غسل دو چیزیں ہیں: جنابت اور حیض۔ اور انزال کے بغیر ایلاج بحکم جنابت ہے۔ اور نفاس بحکم حیض ہے۔ اور جب حیض کے ساتھ بیماری کا خون (استحاضہ) مل جائے تو دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے کہ حیض کا زمانہ کونسا ہے اور استحاضہ کا کونسا؟

صحبت سے غسل کب واجب ہوتا ہے؟

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب وہ (مرد) بیٹھ گیا، اُس (عورت) کی چار شاخوں (شرمگاہ کے چار کونوں) کے سامنے، پھر عورت کو مشقت میں ڈالا یعنی پوری سُپاری اندام نہانی میں داخل کردی، تو یقیناً غسل واجب ہوگیا، گو انزال نہ ہو'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۳۰)

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: إذا جاوزَ الختانُ الختانَ وجب الغسلُ یعنی جب مرد کی ختنہ کی جگہ عورت کی ختنہ کی جگہ سے آگے بڑھ جائے یعنی پورا حشفہ اندام نہانی میں چھپ جائے تو غسل واجب ہوگیا''[1] (یہ حدیث شارح نے بڑھائی ہے)

حدیث ـــــ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پیر کے دن قُبا گیا۔ جب ہم بنو سالم قبیلہ کے محلہ میں پہنچے تو آپ ﷺ حضرت عِتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کے دروازے پر ٹھہرے، اور ان کو آواز دی۔ وہ لنگی گھسیٹتے نکلے۔ آپؐ نے فرمایا: أعجلنا الرَّجل: ہم نے آدمی کو جلدی کرادی۔ حضرت عتبان نے دریافت کیا: ''اگر کوئی شخص بیوی سے جلدی علحدہ ہوجائے، اور اس کو انزال نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: إنما الماء من الماء: پانی: پانی ہی سے ہے یعنی غسل کے لئے پانی استعمال کرنا اسی وقت واجب ہوتا ہے جب منی نکلے (رواہ مسلم ۴:۳۶ مصری)

تشریح: روایات میں اختلاف ہے کہ اکسال بحکم جماع ہے یا نہیں؟ اکسال: باب افعال کا مصدر ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں: سست کرنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: صحبت شروع کرنے کے بعد عضو سست ہوجائے یا اور کوئی ناگہانی بات پیش آئے، اور آدمی بیوی سے علحدہ ہوجائے، اور انزال نہ ہو۔ یہ اکسال: جماع کامل کے حکم میں ہے یا نہیں؟ اور جماع

[1] رواہ الترمذی، وابن ماجہ، واحمد، وسندہ صحیح علی شرط الشیخین، مشکوۃ حدیث ۴۴۲

کامل سے مراد وہ جماع ہے جس میں حاجت پوری ہو جاتی ہے یعنی فراغت ہو جاتی ہے۔ پہلی اور دوسری روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیبوبتِ حشفہ سے غسل واجب ہو جاتا ہے، چاہے انزال نہ ہوا ہو۔ جمہور فقہاء بھی اس پر متفق ہیں۔

رہی یہ بات کہ پہلی دو حدیثوں میں اور تیسری حدیث میں تطبیق کیسے دی جائے؟ تو اس سلسلہ میں تین رائیں ہیں

پہلی رائے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تیسری حدیث احتلام کے بارے میں ہے۔ اور پہلی دو حدیثیں صحبت کے بارے میں ہیں۔ اور جب موضوع مختلف ہو گیا تو تعارض ختم ہو گیا۔ مگر یہ توجیہ حدیث کے شانِ ورود کے خلاف ہے۔ حضرت عتبان کا واقعہ بیداری میں صحبت کا ہے۔ اور اسی واقعہ میں آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

دوسری رائے: حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے نزدیک تیسری حدیث منسوخ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ انزال ہی سے غسل لازم آنا ابتدائے اسلام میں ایک سہولت تھی، جو بعد میں ختم کر دی گئی (مشکوۃ حدیث ۴۴۸) ـــــ مگر اکابر صحابہ: حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم سے، بلکہ خود حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف مروی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک اگر کوئی صحبت کرے، اور انزال نہ ہو تو نماز والی وضوء کافی ہے۔ اور شرمگاہ کو پاک کر لے۔ اور یہ بات مرفوعاً بھی روایت کی گئی ہے۔ پس نسخ کی بات بھی دل کو نہیں لگتی۔

تیسری رائے: شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک تیسری حدیث مباشرتِ فاحشہ پر محمول ہے۔ کیونکہ اس پر بھی جماع کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مباشرت فاحشہ کے معنی ہیں. کپڑے کی آڑ کے بغیر شرمگاہ کو شرمگاہ سے لگانا، عضوِ ستر میں داخل کئے بغیر۔ ایسی صورت میں غسل اس وقت واجب ہوگا جب انزال ہو جائے، ورنہ نہیں۔ ممکن ہے حضرت عتبان نے اسی صورت پر جماع کا اطلاق کیا ہو۔

فائدہ: شارح کے نزدیک صحیح بات وہ ہے جو جمہور نے اختیار کی ہے یعنی تیسری حدیث منسوخ ہے۔ مگر وہ ایک جزئیہ میں معمول بہ ہے یعنی احتلام کا حکم اب بھی یہی ہے کہ انزال ہوگا تو غسل واجب ہوگا، ورنہ نہیں۔ حضرت ابن عباس کے قول کا یہی مطلب ہے۔

اور یہ قول بایں وجہ راجح ہے کہ دورِ فاروقی میں: اکسال کی صورت میں وجوبِ غسل پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو گیا تھا۔ اور اکابر صحابہ کا اختلاف ختم ہو گیا تھا۔ جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار میں تفصیل سے یہ بات بیان کی ہے۔

اور اس کی تقریر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اصل حکم الماء من الماء ہے۔ اور یہی حکم ابتدائے اسلام میں تھا۔ اور صحبت کی صورت میں چونکہ بعض مرتبہ نزول ماء کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے اس مخفی امر کی جگہ ایلاج کو رکھ دیا۔ اور اس پر حکم دائر کیا۔ اور صحبت کے علاوہ باقی صورتوں میں حکم اپنی اصل پر باقی رہا۔ جیسے سفر میں قصر کی اصل علت مشقت ہے۔

مگر چونکہ مشقت کا کوئی معیار نہیں، اس لئے نفس سفر کو مشقت کے قائم مقام کر دیا۔ اور حکم اس پر دائر کیا۔ اسی طرح اصل ناقض وضوء خروج ریح ہے۔ مگر نیند کی حالت میں اس کا ادراک نہیں ہوتا، اس لئے لیٹ کر سونے کو مظنہ (احتمالی جگہ) ہونے کی وجہ سے خروج ریح کا قائم مقام گردانا ہے اور اس پر حکم دائر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

﴿موجباتُ الغُسل﴾

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " إذا جلس بين شُعبها الأربع، ثم جهدها، فقد وجب الغسل، وإن لم يُنزِلْ"

أقول: اختلفت الرواية: هل يُحْمَل الإكسالُ ـــ أى الجماعُ من غير إنزال ـــ على الجماع الكامل فى معنى قضاء الشهوة، أعنى مايكون معه الإنزال؟ والذى صحَّ روايةً ـــ وعليه جمهور الفقهاء ـــ هو: أن من جَهَدَها فقد وجب عليهما الغسلُ، وإن لم يُنزل.

واختلفوا فى كيفية الجمع بين هذا الحديث، وحديث: " إنما الماء من الماء"، فقال ابن عباس: إنما الماء من الماء فى الاحتلام؛ وفيه ما فيه. وقال أبىٌّ: إنما كان الماء من الماء رخصةً فى أول الإسلام، ثم نُهى.

وقد رُوى عن عثمان، وعلى، وطلحة، والزبير، وأبىّ بن كعب، وابى أيوب ـــ رضى الله عنهم ـــ فيمن جامع امرأته، ولم يُمْنِ، قالوا: يتوضأ كمايتوضأ للصلاة، ويغسل ذكره، ورُفع ذلك إلى النبى صلى الله عليه وسلم.

ولا يبعد عندى: أن يُحمل ذلك على المباشرة الفاحشة، فإنه قد يُطلق الجماعُ عليها.

ترجمہ: غسل کو واجب کرنے والی چیزیں: (۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بیٹھ گیا وہ الخ۔

میں کہتا ہوں: روایتیں مختلف ہیں: آیا اکسال ـــ یعنی انزال کے بغیر صحبت ـــ کو محمول کیا جائے قضائے شہوت کے معنی میں کامل جماع پر، مراد لیتا ہوں میں اس جماع کو جس کے ساتھ انزال ہے اور جو بات روایت سے ثابت ہے ـــ اور جس پر جمہور فقہاء ہیں ـــ وہ یہ ہے کہ جس نے مشقت میں ڈالا عورت کو تو یقیناً اس پر غسل واجب ہو گیا، اگرچہ انزال نہ ہوا ہو۔

اور اختلاف کیا ہے انھوں نے تطبیق کے طریقہ میں: اس حدیث کے درمیان، اور حدیث: إنما الماء من الماء کے درمیان: پس ابن عباس نے فرمایا کہ حدیث إنما الماء من الماء احتلام کے حق میں ہے۔ اور اس میں وہ بات ہے جو اس میں ہے یعنی یہ توجیہ شانِ ورود کے خلاف ہے۔ اور اُبی نے فرمایا کہ انزال ہی سے غسل لازم آنا یہ ابتدائے

اسلام میں ایک سہولت تھی۔ پھر روک دیا گیا۔

اور تحقیق روایت کیا گیا ہے عثمان وعلی وطلحہ وزبیر وأبی بن کعب وابی ایوب رضی اللہ عنہم سے: اس شخص کے بارے میں جو اپنی عورت سے جماع کرے اور وہ منی نہ ڈالے؟ کہا انھوں نے وضوء کرے وہ جس طرح وہ نماز کے لئے وضوء کرتا ہے۔ اور وہ اپنے پیشاب کے عضو کو دھولے۔ اور اٹھائی گئی ہے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔

اور بعید نہیں میرے نزدیک کہ محمول کی جائے وہ حدیث مباشرت فاحشہ پر۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ کبھی جماع کا اطلاق کیا جاتا ہے مباشرتِ فاحشہ پر۔

لغات: شُعَب جمع ہے شعبۃ کی بمعنی شاخ، کنارہ۔ جهد فلانا: بلغ مشقته (معجم وسیط) أمنى إمناءً: بہانا، کرانا۔

تصحیح: فی الاحتلام تمام نسخوں میں للاحتلام تھا۔ تصحیح مشکوٰۃ شریف سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

بدخوابی سے اس وقت غسل واجب ہوتا ہے، جب تَری پائے

حدیث ـــــ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو تری پاتا ہے، اور اس کو خواب یاد نہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ: ''وہ غسل کرے'' اور اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو دیکھتا ہے کہ اس کو احتلام ہوا ہے، اور وہ تری نہیں پاتا؟ آپؐ نے فرمایا کہ: ''اس پر غسل نہیں ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۰)

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو وجہ سے وجوب غسل کا حکم تری پر دائر کیا ہے۔ خواب پر دائر نہیں کیا:

پہلی وجہ: بدخوابی دو طرح کی ہوتی ہے کبھی محض خیال ہوتا ہے۔ جس کا وجوب غسل میں کوئی دخل نہیں۔ اور کبھی بدخوابی میں شہوت پوری ہوتی ہے یعنی انزال ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں لامحالہ تری موجود ہوگی۔ پس تری ہی پر حکم کا مدار رکھا جاسکتا ہے۔

دوسری وجہ: تری ایک ایسی واضح چیز ہے جس کا تعین ہوسکتا ہے، کیونکہ خواب تو بارہا آدمی بھول جاتا ہے۔ اس لئے وجوب غسل کا مدار تری پر ہے خواب پر نہیں ہے[1]

(۱) تری پائے جانے کی صورت میں چودہ احتمال ہیں یا منی کا یقین ہے، یا مذی کا، یا ودی کا، یا اول دو میں شک ہے، یا اخیر دو میں، یا طرفین میں، یا تینوں میں۔ یہ کل سات احتمال ہوئے۔ پھر ہر صورت میں خواب یاد ہے یا نہیں۔ پس کل چودہ صورتیں ہوئیں۔ ان میں سے چار صورتوں میں بالاتفاق غسل واجب نہیں ہے: ایک: جبکہ مذی کا یقین ہو، اور خواب یاد نہ ہو۔ دوم وسوم: جبکہ ودی کا یقین ہو، اور خواب یاد ہو یا نہ ہو۔ چہارم: مذی اور ودی میں شک ہو، اور خواب یاد نہ ہو۔ درتین صورتوں میں طرفین کے نزدیک غسل واجب ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک واجب نہیں۔ اول: منی اور مذی میں شک ہو اور خواب یاد نہ ہو دوم: منی اور ودی میں شک ہو، اور خواب یاد نہ ہو۔ سوم: منی، مذی اور ودی میں شک ہو، اور خواب یاد نہ ہو۔ باقی سات صورتوں میں بالاتفاق غسل واجب ہے (حاشیہ امداد الفتاوی ۱: ۵۰)

[۲] وسُئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الرجل یجدُ البلل، ولا یذکر الاحتلام؟ قال: "یغتسل"، وعن الرجل الذی یری أنه قد احتلم، ولایجد بللا؟ قال: " لاغسل علیه"

أقول: إنما أدار الحکم علی البلل، دون الرؤیا: لأن الرؤیا تکون تارة حدیثُ نفسٍ، ولا تأثیر له، وتارة: تکون قضاءَ شهوةٍ، ولاتکون بغیر بللٍ، فلایصلح لإدارة الحکم إلا البلل.

وأیضًا: فإن البللَ شیئٌ ظاهرٌ، یصلح للانضباط، وأما الرؤیا: فإنها کثیرًا ما تُنسٰی.

ترجمہ: اور رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا الی آخرہ۔ میں کہتا ہوں: آپ ﷺ نے حکم تری ہی پر دائر کیا، نہ کہ خواب پر: اس لئے کہ خواب کبھی دل کی بات (خیال) ہوتا ہے۔ اور کوئی اثر اندازی نہیں اس (خیال) کے لئے۔ اور کبھی خواب قضائے شہوت ہوتا ہے۔ اور وہ تری کے بغیر نہیں ہوتا۔ پس حکم دائر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی مگر تری ـــــ اور نیز: پس بیشک تری ایک واضح چیز ہے، جو تعین کے قابل ہے۔ اور رہا خواب: تو وہ بارہا بھلا دیا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

حیض وطہر کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت

احناف: کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت تین رات دن ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مدت دس رات دن ہے۔ پس اگر اقل مدت سے کم خون آکر بند ہو جائے، یا اکثر مدت سے زیادہ جاری رہے، تو وہ استحاضہ (بیماری کا خون) ہے۔ اور شوافع اور حنابلہ: کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت ایک رات دن ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے۔ ان حضرات کے یہاں سترہ دن کی بھی روایت ہے۔ اور مالکیہ: کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت کچھ نہیں۔ ذرا سا خون آکر بند ہو جائے تو بھی حیض ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مدت میں تفصیل ہے، جو ان کی کتابوں سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

اور کم سے کم طہر بالاجماع پندرہ دن ہے یعنی دو خونوں کے درمیان پندرہ دن یا زیادہ عورت پاک رہی ہو، تو وہ خون الگ الگ حیض ہیں۔ اور اگر اس سے کم پاک رہی ہو تو وہ طہر متخلل ہے اور دونوں خون مسلسل شمار ہوں گے۔ اور طہر کی زیادہ سے زیادہ مدت بالاجماع متعین نہیں۔ دو حیضوں کے درمیان سالوں کا فاصلہ بھی ہو سکتا ہے۔

اور حیض کی مدت کے سلسلہ میں احناف کا مستدل وہ روایت ہے جو چھ صحابہ سے مروی ہے۔ جس کی تخریج نصب الرایہ (۱۹۱:۱) میں کی گئی ہے۔ یہ روایت اگرچہ تمام طرق سے ضعیف ہے، مگر تعدد اسانید سے قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کوئی روایت اس کے خلاف نہیں ہے پس اس کا اعتبار کیا جانا چاہئے۔ خود شاہ صاحب نے پہلے یہ ضابطہ بیان کیا ہے کہ

جب روایات میں ترجیح کا معاملہ درپیش ہوتو ضعف کا اعتبار ہوگا۔ ورنہ فی نفسہ استدلال میں معمولی ضعف مانع نہیں۔

مگر ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ نے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث سے استدلال نہیں کیا۔ انھوں نے عورتوں کے احوال کا جائزہ لے کر مدت طے کی ہے۔ شاہ صاحب کی رائے امام مالک رحمہ اللہ کی رائے سے ملتی جلتی ہے۔ فرماتے ہیں:

حیض اور طہر کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم مدت عورت کے مزاج، خوراک اور اس قسم کی دیگر چیزوں کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے۔ اور دونوں کے لئے کوئی ایسی عام مدت متعین کرنا ممکن نہیں جو سب عورتوں کو شامل ہو جائے۔ پس اصح یہی ہے کہ اس سلسلہ میں عورتوں کی عادت کی طرف رجوع کیا جائے۔ خود عورت جس خون کو حیض خیال کرے وہ حیض ہے۔ اور جس خون کو بیماری کا خون خیال کرے وہ استحاضہ ہے اور صحابہ وتابعین کے اقوال میں جو اختلاف ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے عورتوں کے احوال کا جائزہ لیا ہے اور ایک تخمینہ قائم کیا ہے۔

[۳] ولاشك أن طولَ مدة الطهر والحيض، وقصرَها يختلفان باختلاف المزاج والغذاء ونحوهما، ولايكادان يُضبطان بشيءٍ مُطَّرِدٍ، فلا جرم أن الأصح هو الرجوع إلى عادتهن، فإذا رأين: أنه حيض، فهو حيضٌ، وإذا رأين: أنه استحاضة فهو استحاضة. واختلاف الصحابة والتابعين في ذلك، منشؤه: الاستقراء والتقريب.

ترجمہ: (۳) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حیض اور طہر کی مدت کی درازی اور اس کی کمی: دونوں مختلف ہوتے ہیں مزاج، غذا اور ان کے مانند امور کے اختلاف سے۔ اور نہیں قریب ہیں دونوں کہ منضبط کئے جائیں کسی عام چیز کے ذریعہ۔ پس یقیناً یہ بات ہے کہ اصح رجوع کرنا ہے عورتوں کی عادت کی طرف۔ پس جب دیکھیں وہ کہ وہ خون حیض ہے تو وہ حیض ہے۔ اور جب دیکھیں وہ کہ وہ خون بیماری کا خون ہے تو وہ استحاضہ ہے۔ اور صحابہ وتابعین کا اس سلسلہ میں اختلاف: اس کا منشا (پیدا ہونے کی جگہ): جائزہ لینا اور تخمینہ قائم کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

مستحاضہ: اپنے حیض کو کس طرح جدا کرے؟

حدیث ـــــ حضرتِ حَمنہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھے بہت ہی زیادہ خون آتا تھا۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسئلہ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوئی۔ آپؐ اتفاق سے میری بہن زینب رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے بہت ہی زیادہ خون آتا ہے۔ آپؐ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ میں نہ تو نماز کی رہی نہ روزے کی! آپؐ نے فرمایا: ''میں آپ کو روئی استعمال کرنے کا مشورہ دیتا ہوں، امید ہے کہ اس سے خون رک جائے

گا'' یعنی روئی کی بتی بنا کر اندام نہانی میں رکھ لی جائے۔ روئی میں خون روکنے کی خاصیت ہے۔ حضرت حمنہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ: وہ اس سے زیادہ ہے یعنی روئی سے تھوڑا خون رک سکتا ہے۔ مجھے تو بہت زیادہ خون آتا ہے۔ روئی سے اس کا علاج نہیں ہوسکتا۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو (روئی رکھ کر) لنگوٹ کس لو'' (لنگوٹ باندھنے سے جسم کس جاتا ہے۔ پس یہ بھی خون روکنے کا علاج ہے) انھوں نے عرض کیا: وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو کپڑا رکھ لو'' یعنی روئی رکھ کر، اوپر کپڑا دوہرا چوہرا کر کے رکھ لیا جائے، پھر لنگوٹ باندھ لی جائے تو خاص جسم دبے گا اور خون رُکے گا۔ حضرت حمنہؓ نے عرض کیا: وہ اس سے بھی زیادہ ہے، مجھے تو دھڑ دھڑ خون گرتا ہے! آپؐ نے فرمایا: ''ابھی میں تمہیں دو باتیں (علاج) بتاتا ہوں۔ اُن میں سے جس پر بھی عمل کروگی کافی ہوجائے گا۔ اور اگر دونوں پر عمل کرسکو تو تم بہتر جانتی ہو'' یعنی دونوں علاجوں میں سے جس کو چاہو اختیار کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا: ''یہ خون بس شیطان کی ایک ایڑ ہے'' یعنی بیماری کا خون ہے۔ حیض کا خون نہیں ہے۔ ''پس خود کو چھ یا سات دن حائضہ سمجھو (صحیح صورتِ حال) اللہ کے علم میں ہے۔ پھر نہالو۔ یہاں تک کہ جب دیکھو کہ خوب پاک ہوگئیں اور صاف ہوگئیں تو ۲۳ دن یا ۲۴ دن نماز پڑھو اور روزے رکھو۔ پس بیشک یہ بات آپ کے لئے کافی ہے۔ اور اسی طرح ہر ماہ کرو: جس طرح عورتوں کو حیض آتا ہے، اور جس طرح وہ پاک ہوتی ہیں، ان کے حیض اور طہر کے وقت میں'' (یہ تو آپؐ نے اُن کو استحاضہ کا مسئلہ بتایا۔ پھر ان کو وہ دو علاج بتائے جس کا آپؐ نے وعدہ فرمایا تھا۔ راوی نے ایک کا تذکرہ چھوڑ دیا ہے، جو دوسری حدیثوں میں آیا ہے۔ اور وہ روزانہ پانچ مرتبہ ہر نماز سے پہلے نہانا ہے۔ اور دوسرا علاج روزانہ تین مرتبہ نہانا ہے۔ فرمایا:)

''اگر ایسا کرسکو کہ ظہر کو مؤخر کرو، اور عصر کو جلدی پڑھو، تو نہاؤ اور دونوں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھو۔ اور مغرب کو مؤخر کرو اور عشاء کو جلدی پڑھو، تو نہاؤ اور دونوں نمازوں کو جمع کرو، ایسا کرسکو تو ایسا کرو، اور فجر کے لئے علحدہ نہاؤ۔ اور روزے رکھو'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ دو باتوں میں سے مجھے زیادہ پسند ہے'' کیونکہ روزانہ پانچ مرتبہ نہانا دشوار ہے اور تین بار نہانا نسبۃً آسان ہے (رواہ احمد، وابوداؤد، والترمذی، مشکوٰۃ حدیث ۵۶۱ باب المستحاضہ)

تشریح: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اس حدیث کی جو شرح فرمائی ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے پہلے چند باتیں عرض ہیں:

پہلی بات: مذکورہ روایت عبداللہ بن محمد بن عَقیل کی روایت ہے۔ یہ راوی صدوق (سچا) ہے مگر اس کا حافظہ کمزور تھا۔ اس وجہ سے اس سے بعض روایات میں وہم ہوگیا ہے۔ مذکورہ حدیث کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کا ارشاد ہے: حدیثُ ابنِ عَقیل فی نفسی منه شیئ (ابوداؤد مصری حدیث ۲۸۷) یعنی ابن عقیل کی مذکورہ حدیث پر دل نہیں ٹھکتا۔ شاید اُن سے اس حدیث میں کچھ وہم ہوگیا ہے وہ وہم یہی ہے کہ انھوں نے دو باتوں میں سے پہلی بات کو چھوڑ دیا ہے۔

اور وہ روزانہ پانچ بار غسل کرنے کا امر ہے اس امر اول کو چھوڑ دینے کی وجہ سے حدیث فہمی میں غلطی ہوگئی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حمنہؓ کو مستحاضہ کا مسئلہ سمجھایا ہے اس کو امر اول سمجھ لیا گیا ہے۔

دوسری بات: احناف تمیز بالدم کا اعتبار نہیں کرتے اور ائمہ ثلاثہ اس کا اعتبار کرتے ہیں (شاہ صاحب نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے) اس لئے احناف کے نزدیک مستحاضہ کی تین قسمیں ہیں: مُبتدأہ، مُعتادہ اور مُتحیرہ۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چار قسمیں ہیں: (۱) معتادہ غیر ممیزہ (جس کی عادت بنی ہوئی ہے اور وہ خون کے رنگ سے تمیز نہیں کرسکتی) (۲) ممیزہ غیر معتادہ (جس کی کوئی عادت قائم نہیں ہوئی، مگر وہ خون کے رنگ سے تمیز کرسکتی ہے) (۳) معتادہ ممیزہ (جس کی عادت بھی ہے اور وہ خون کے رنگ سے تمیز بھی کرسکتی ہے) (۴) غیر معتادہ غیر ممیزہ (جس کی نہ کوئی عادت ہے، نہ وہ رنگ سے تمیز کرسکتی ہے) اسی کو متحیرہ بھی کہتے ہیں۔ پھر اس کے تین حالات ہیں۔ تفصیل طویل ہے۔ ابن قدامہ کی مُغنی میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تیسری بات: مہر مثل کی طرح حیض مثل کا اعتبار ہے یا نہیں؟ احناف اعتبار نہیں کرتے بعض لوگ اس کا اعتبار کرتے ہیں۔ مذکورہ حدیث میں جو چھ یا سات دن کا تذکرہ آیا ہے اس کو بعض حضرات تحری کرنے کا حکم قرار دیتے ہیں۔ اور بعض حیضِ مثل پر محمول کرتے ہیں۔

چوتھی بات: تمام فقہاء مستحاضہ کے لئے پاکی کے ایام میں ہر نماز کے لئے یا ہر نماز کے وقت کے لئے وضو ضروری قرار دیتے ہیں۔ پانچ یا تین غسل کے امر کو ملاج پر محمول کرتے ہیں۔ مگر متحیرہ کے لئے بعض صورتوں میں ہر نماز سے پہلے غسل ضروری قرار دیتے ہیں۔

اب شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات پیش کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

استحاضہ کے بارے میں یہ بنیادی بات سمجھ لینی چاہئے کہ وہ بیماری کا خون ہے۔ یہ تندرست عورتوں کو جو خون آتا ہے، وہ نہیں ہے۔ اور حیض کی مدت متعین ہے مگر استحاضہ کا زمانہ متعین نہیں۔ یہ خون سالوں تک بھی جاری رہ سکتا ہے۔ اور لمبی مدت تک نماز کو چھوڑ دینا نماز کو رائیگاں کرنا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحاضہ کو حیض کا زمانہ الگ کرلینے کا حکم دیا، تاکہ وہ حیض کے زمانہ میں نماز چھوڑ دے، اور باقی دونوں میں نماز ادا کرے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت حمنہؓ کو دو باتیں بتائیں:

پہلی بات: یہ بتائی کہ استحاضہ کسی رگ کا خون ہے یعنی وہ کوئی پیچیدہ بیماری ہے۔ اور یہ خون نکسیر کے خون کی طرح ہے۔ حیض کا خون نہیں ہے۔ پس اگر عورت تندرستی کے زمانہ میں معتادہ تھی یعنی اس کی حیض کی اور پاکی کی عادت مقرر تھی تو وہ اسی کا اعتبار کرے گی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق خود کو حائضہ سمجھے گی۔ اور جب وہ دن گذر جائیں گے تو خود کو پاک تصور کرے گی۔ اور نماز روزہ شروع کردے گی۔ وہ ہر ماہ ایسا ہی کرتی رہے گی۔ اور اس طرح وہ اپنے حیض کو

استحاضہ سے جدا کر لے گی۔ اور اگر وہ ممیزہ ہے تو خون کے رنگ کے ذریعہ اپنے حیض کو جدا کرے گی یعنی اقوی خون مثلاً سیاہ خون کو حیض سمجھے گی۔ اور ضعیف خون مثلاً پیلا خون آنے لگے تو خود کو پاک تصور کرے گی۔ اور نہا کر نماز روزہ شروع کر دے گی۔

دوسری بات: یہ بتلائی کہ استحاضہ چونکہ بگڑا ہوا حیض ہے اس لئے مستحاضہ کے لئے روزانہ پانچ مرتبہ غسل ضروری ہے۔ اور اس میں دشواری محسوس کرے تو تین بار غسل کرے۔ اور چونکہ یہ صحیح حیض نہیں بلکہ بگڑا ہوا ہے اس لئے نماز معاف نہیں۔ وہ اسی حالت میں نماز پڑھے گی اور روزے بھی رکھے گی۔

اور روئی اور لنگوٹ باندھنے میں دو حکمتیں ہیں: اول. یہ ایک علاج ہے۔ اس سے خون کی آمد رک جائے گی۔ دوم: عورت کا بدن اور کپڑے خراب نہیں ہوں گے۔

[٤] واستفتت حَمْنَةُ فی الاستحاضة، فأمرها بالكُرسُف والتلجُّم، وخَيَّرها بين أمرين إلخ.

أقول: الأصل فی ذلك: أنه صلى الله عليه وسلم لما رأى أن الاستحاضة ليست من الأمور الصِحِّيَّة، وترك الصلاة فيها يؤدی إلى إهمالها مدة مديدة، أراد أن يَحْمِلَها على الأمر المعروف عندهم، فبدا وجهان:

أحدهما: أنها عرق، أی: داءٌ خفيُّ الماخذِ، وليست حيضةً، بمنزلة الرعاف، فردَّها إلى ماكان فی الصحة من حيضها وطهرها فی كل شهر، ولا بد حينئذ من تمييز الحيضة عن غيرها: إما باللون: فالأقوى كالأسود للحيض، أو بأيامها المعروفة عندها.

والثانی: أنها حيضة فاسدة، فلكونها حيضة ينبغی أن تؤمر بالغسل عند كل صلاة، وإن تعذّر فعند كل صلاتين؛ ولكونها فاسدةً لم تمنع الصلاة.

والحكمةُ فی الكرسف والتلجُّم: أن يَلْحق الدمُ بما استقر فی مكانه، لايعْدُوْهُ، ولئلا يُصيب بدنها وثيابها، وأفتى جمهور الفقهاء بالأول، إلا عند تعذُّره.

ترجمہ: (۴) اور مسئلہ دریافت کیا حمنہؓ نے استحاضہ کے بارے میں۔ پس آپ نے ان کو روئی اور لگام باندھنے کا حکم دیا۔ اور اختیار دیا ان کو دو باتوں میں الخ۔ (یہ دونوں باتیں حدیث میں مذکور نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک بات ذکر کی گئی ہے)

میں کہتا ہوں: استحاضہ کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ استحاضہ امور صحت میں سے نہیں ہے اور استحاضہ میں نماز چھوڑ دینا ایک مدتِ دراز تک، نماز کو رائیگاں کرنے کی طرف پہنچاتا ہے، تو آپؐ

نے چاہا کہ استحاضہ کو اس امر پر محمول کریں جو ان کے نزدیک معروف تھا۔ پس دو صورتیں ظاہر ہوئیں:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ استحاضہ ایک رگ ہے یعنی کوئی پیچیدہ روگ ہے۔ اور وہ حیض نہیں ہے، بمنزلہ نکسیر ہے۔ پس آپؐ نے اس کو پھیر دیا اس بات کی طرف جو تندرستی میں تھی، اس کے حیض اور اس کے طہر سے ہر مہینہ میں۔ اور ضروری ہے اس وقت حیض کو اس کے سوا وہ سے جدا کرنا: یا تو رنگ کے ذریعہ۔ پس قوی تر جیسے سیاہ خون حیض کے لئے ہے۔ یا عورت کے ان ایام کے ذریعہ جو اس کے نزدیک معروف تھے۔

اور دوسری: یہ کہ استحاضہ فاسد حیض ہے۔ پس اس کے حیض ہونے کی وجہ سے مناسب یہ ہے کہ وہ حکم دی جائے ہر نماز کے وقت نہانے کا۔ اور اگر یہ بات دشوار ہو تو ہر دو نمازوں کے لئے۔ اور اس حیض کے فاسد ہونے کی وجہ سے نہیں روکا اس نے نماز کو۔

اور روئی اور لنگوٹ باندھنے میں حکمت یہ ہے کہ (۱) خون مل جائے اُس خون کے ساتھ جو ٹھہرا ہوا ہے اس کی جگہ میں، نہ تجاوز کرے وہ اس سے یعنی خون کی آمد رک جائے (۲) اور تا کہ خون عورت کے بدن اور کپڑوں کو نہ لگے ——— اور جمہور فقہاء نے پہلی بات پر فتوی دیا ہے، مگر اس کے دشوار ہونے کی صورت میں (اس عبارت کا مطلب واضح نہیں)

☆ ☆ ☆

باب ——— ۹

جنبی اور بے وضوء کے لئے کیا کام جائز ہیں اور کیا ناجائز؟

بے وضوء قرآن کو چھونا، نماز پڑھنا اور کعبہ کا طواف کرنا جائز نہیں۔ البتہ زبانی قرآن پاک پڑھنا جائز ہے۔ اور جنابت کی حالت میں نہ تو قرآن پڑھنا جائز ہے اور نہ جنبی اور حائضہ کے لئے مسجد میں جانا درست ہے۔ کیونکہ نماز، کعبہ اور قرآن شعائر اللہ میں سے ہیں۔ اور شعائر اللہ کی تعظیم واجب ہے۔ اور سب سے بڑی تعظیم یہ ہے کہ کامل طہارت کے ساتھ ہی ان سے قُرب ہو یعنی پہلے کوئی ایسا عمل کرلیا جائے جس سے نفس چوکنا ہو جائے یعنی وضوء و غسل کرلیا جائے، جس سے نفس کو شعائر اللہ کی عظمت و حرمت یاد آجائے۔ اس حکمت سے مذکورہ شعائر ثلاثہ سے نزدیک ہونے کے لئے کامل طہارت ضروری ہوئی ہے۔

البتہ قرآن پڑھنے کے لئے وضوء ضروری نہیں۔ بے وضوء بھی قرآن پڑھنا جائز ہے۔ کیونکہ قرآن پڑھنے کا کوئی وقت متعین نہیں ہے۔ کسی بھی وقت آدمی قرآن پڑھ سکتا ہے۔ اور دیر تک پڑھنے میں مشغول رہ سکتا ہے۔ پس ہمہ وقت قرآن پڑھنے کے لئے وضوء ضروری قرار دینے میں حفظِ قرآن اور اس کی تعلیم و تعلم میں خلل پڑے گا۔ جبکہ ان کاموں

کا دروازہ کھولنا، ان کاموں کی ترغیب دینا اور قرآن حفظ کرنے والوں کے لئے آسانی کرنا ضروری ہے۔

البتہ حیض ونفاس اور جنابت کی حالت چونکہ دائمی اور دراز نہیں۔ اور یہ ناپاکی بھی سخت ہے۔ اس لئے جنابت اور حیض ونفاس کی حالت میں زبانی قرآن پڑھنا بھی جائز نہیں۔ نہ جنبی اور حائضہ کے لئے مسجد میں جانا درست ہے۔ اس لئے کہ مسجد ذکر ونماز کے لئے ہے اور یہ لوگ نماز نہیں پڑھ سکتے، پھر مسجد میں کیوں جائیں؟! نیز مسجد شعائر اللہ میں سے ہے اور کعبہ کے قبیل سے ہے پس اس کے احترام کے باب سے یہ بات ہے کہ یہ لوگ اس میں داخل نہ ہوں۔

سوال: پہلے مبحث پنجم کے باب ہفتم (رحمۃ اللہ ۱.۷۰۹) میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بڑے شعائر اللہ چار ہیں: قرآن، کعبہ، نماز اور نبی۔ اور نبی کی نزدیکی یعنی ہم نشینی کے لئے طہارت شرط نہیں۔ جنابت کی حالت میں بھی نبی کے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔ اس سے مصافحہ کر سکتے ہیں، یہ کیا بات ہے؟ یہاں شعائر اللہ کی تعظیم والا قاعدہ کیوں جاری نہیں ہوا؟

جواب: بیشک نبی شعائر اللہ میں سے ہے۔ اور شعائر اللہ کی تعظیم واجب ہے۔ مگر ہر معظم کی تعظیم اس کے مناسب حال ہوتی ہے۔ نبی کی تعظیم یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ ادب واحترام ملحوظ رکھا جائے۔ اس کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اسکی شان میں گستاخی اور بے ادبی نہ کی جائے، حتی کہ اس کے سامنے بلند آواز سے بولا بھی نہ جائے۔ مگر ہم نشینی کے لئے طہارت کو ضروری قرار دینا نبی کے مناسب حال نہیں۔ کیونکہ نبی بھی ایک انسان ہے۔ اور جو احوال انسانوں کو پیش آتے ہیں، وہ نبی کو بھی پیش آتے ہیں یعنی اس کو بھی حدثِ اصغر واکبر دونوں لاحق ہوتے ہیں۔ پس اس کی ہم نشینی کے لئے طہارت کو شرط قرار دینا قلبِ موضوع ہے یعنی برعکس معاملہ ہے کہ معظم یعنی بزرگ تو بے وضوء، بلکہ بے غسل ہو، اور معظِّم (تعظیم کرنے والے) کے لئے طہارت ضروری ہو۔

﴿ما يُباح للجنب والمُحْدِث، ومالايُباحُ لهما﴾

لما كان تعظيمُ شعائر الله واجبًا، ومن الشعائر الصلاة والكعبة والقرآن، وكان أعظمُ التعظيم أن لايَقْرُبَ منه الإنسان إلا بطهارة كاملة، وتَنَبُّهِ النفس بفعل مستأنف، وجب أن لايقربها إلا متطهر.

ولم يُشتَرَط الوضوء لقراءة القرآن: لأن التزام الوضوء عند كل قراءة يُخِلُّ فى حفظ القرآن وتلقِّيه، ولابد من فتح هذا الباب، والترغيب فيه، والتخفيفِ على من أراد حفظَه.

ووجب أن يُؤَكَّدَ الأمرُ فى الحدث الأكبر، فلايُجَوِّزُ نفسُ القراءة أيضًا، ولا أن يَدْخُلَ المسجدَ جنبٌ أو حائض، لأن المسجد مُهَيَّأٌ للصلاة والذكر، وهو من شعائر الإسلام، ونموذج الكعبة.

ولم تُشترط الطهارةُ فی مجالسة النبی صلی الله علیه وسلم: لأن کل شیئ له تعظیم یناسبُه، وکان بشرًا یَعْرُوْه من الأحداث والجنابة ما یعْرُو البشر، فکان اشتراط الطهارة فی ذلك قلبًا للموضوع.

ترجمہ: ان امور کا بیان جو جنبی اور بے وضوء کے لئے مباح کئے گئے ہیں، اور جو مباح نہیں کئے گئے: جبکہ شعائر اللہ کی تعظیم واجب تھی۔ اور منجملہ شعائر اللہ: نماز، کعبہ اور قرآن ہیں۔ اور سب سے بڑی تعظیم یہ تھی کہ نہ نزدیک ہو اس سے انسان مگر کامل پاکی کے ساتھ، اور کسی نئے عمل کے ذریعہ نفس کو چوکنا کرنے کے ساتھ، تو ضروری ہوا کہ نہ نزدیک ہو اُن (شعائر ثلاثہ) سے مگر نہایت پاک آدمی۔

اور وضوء شرط نہیں کی گئی قرآن پڑھنے کے لئے، اس لئے کہ ہر وقت قرآن پڑھنے کے ساتھ وضوء کا التزام کرنا حفظ قرآن اور اس کے سیکھنے میں خلل انداز ہوگا، جبکہ یہ دروازہ کھولنا، اور اس کی ترغیب دینا اور جو شخص قرآن یاد کرنا چاہتا ہے اس کے لئے آسان کرنا ضروری ہے۔

اور ضروری ہے کہ معاملہ مؤکد کیا جائے حدثِ اکبر میں، پس جائز نہ رکھا جائے خود پڑھنا بھی، اور نہ یہ کہ جنبی یا حائضہ مسجد میں داخل ہوں، اس لئے کہ مسجد تیار کی ہوئی ہے نماز و ذکر کے لئے۔ اور مسجد شعائر اللہ میں سے ہے۔ اور کعبہ کا نمونہ ہے۔

اور نبی کی ہم نشینی میں طہارت شرط قرار نہیں دی گئی، اس لئے کہ ہر چیز کی تعظیم اس کے مناسب حال ہوتی ہے۔ اور تھا نبی ایک بشر، پیش آتے ہیں اس کو حدث و جنابت میں سے جو پیش آتے ہیں بشر کو، پس ہم نشینی میں طہارت کو شرط قرار دینا قلبِ موضوع ہے۔

لغت: عَرَا یَعْرُو عَرْوًا: پیش آنا۔

☆ ☆ ☆

جہاں تصویر، کتا یا جنبی ہو، وہاں فرشتے نہیں آتے

حدیث ـــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں صورت یا کتا یا جنبی ہوتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۳ باب محالطة الجنب)

تشریح: اس جگہ فرشتوں کے نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ پاک مخلوق ہیں، پاکی کو پسند کرتے ہیں۔ اور وہ اللہ کے بندے ہیں، اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ بت پرستوں سے ان کو نفرت ہے۔

فائدہ: فرشتوں سے رحمت کے فرشتے مراد ہیں: جو برکت لاتے ہیں۔ اور صورت سے جاندار کی تصویر مراد ہے جو بلند جگہ پر موضع اکرام میں کھلی ہوئی ہو، جو چھپی ہوئی یا موضع امتہان میں یا غیر جاندار کی ہو وہ مراد نہیں۔ اسی طرح شکاری یا کھیتی وغیرہ کی حفاظت کا کتا مراد نہیں۔ اور جنبی سے مراد وہ ہے جو کاہلی سے ترکِ غسل کی عادت بنالے، یہاں تک کہ نماز کا وقت بھی گذر جائے۔ ہر جنبی مراد نہیں (مظاہر حق)

[۱] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: " لاتدخل الملائکة بیتًا فیه صورةٌ، ولا کلبٌ، ولاجنبٌ"
أقول: المراد أن هذه تَنفر منها الملائکةُ، وأنها أضداد ما فیه الملائکة: من الطهارة، والتنفُّرِ من عبدة الإصنام.

ترجمہ: (۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں داخل ہوتے فرشتے ایسے گھر میں جس میں تصویر ہوتی ہے۔ اور نہ اس گھر میں جس میں کتا ہوتا ہے۔ اور نہ اس گھر میں جس میں جنبی ہوتا ہے"

میں کہتا ہوں: مراد یہ ہے کہ یہ چیزیں: نفرت کرتے ہیں ان سے فرشتے۔ اور یہ کہ یہ چیزیں اضداد ہیں ان احوال کے جن میں فرشتے ہیں یعنی پاکی اور بت پرستوں سے نفرت کرنا۔

☆ ☆ ☆

جنابت میں عضو دھوکر، وضو کر کے سونے کی حکمت

حدیث ——— حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ ان کو رات میں جنابت پہنچتی ہے؟ تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ: "وضوء کرو اور اپنا ستر دھولو، پھر سوو" (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۴۵۲) (ستر پہلے دھوئے وضوء بعد میں کرے)

تشریح: جنبی کے لئے افضل یہ ہے کہ نہا کر کھائے پیئے اور سوئے۔ اور اگر کسی ضرورت سے یا بے ضرورت نہانے میں تاخیر کرے تو پھر ستر دھولے، اور نماز والی وضوء کر لے، پھر کھائے پیئے یا سوئے۔ ورنہ کم از کم ستر اور ہاتھ منہ دھولے، پھر کھائے یا سوئے۔ اس کے بعد فضیلت کا کوئی درجہ نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا کمال فرشتہ صفت بننا ہے۔ اور جنابت فرشتوں کے احوال کے منافی ہے۔ پس مؤمن کے لئے پسندیدہ بات یہ ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں، جنابت کی حالت میں بے قید نہ ہو جائے۔ بلکہ خوب پاک ہو کر حاجات میں مشغول ہو۔ اور جب طہارت کبری کا موقعہ نہ ہو تو کم از کم طہارتِ صغری کو نہ چھوڑے کہ دونوں ہی طہارتیں ہیں، اگرچہ شریعت نے کسی حکمت سے طہارت کبری کو جنابت کے لئے اور طہارت صغری کو حدث کے لئے تجویز کیا ہے۔ اور ستر دھونے اور وضوء لغوی کر لینے سے بھی طمانیت

حاصل ہوتی ہے۔آرام کی نیند آتی ہے اور پریشان خوابوں سے حفاظت ہو جاتی ہے۔

[۲] وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیمن تُصیبه الجنابةُ من اللیل:" توضأ واغسلْ ذَکرك، ثم نَمْ" أقول: لما کانت الجنابةُ منافیةً لهیئات الملائکة، کان المرضیُّ فی حق المؤمن: أن لایسترسل فی حوائجه من النوم والأکل مع الجنابة؛ وإذا تعذَّرت الطهارةُ الکبری لاینبغی أن یدع الطهارة الصغری، لأن أمرهما واحد، غیر أن الشارع وزَّعهما علی الحدثین.

ترجمہ:(۲) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جس کو رات میں جنابت پہنچتی ہے، ارشاد فرمایا کہ: ''وضوء کرو اور اپنا آلت دھولو، پھر سو جاؤ''

میں کہتا ہوں: جب جنابت فرشتوں کے احوال کے منافی تھی، تو مؤمن کے حق میں پسندیدہ بات یہ تھی کہ وہ بے قید نہ ہو جائے اپنی ضروریات میں یعنی سونے اور کھانے میں، جنابت کے ساتھ۔اور جب طہارت کبری دشوار ہو تو نہیں مناسب ہے کہ طہارتِ صغری کو چھوڑ دے۔کیونکہ دونوں طہارتوں کا معاملہ ایک ہے۔البتہ شارع نے دونوں کو تقسیم کیا ہے دو حدثوں پر۔

☆ ☆ ☆

باب ــــ ۱۰

تیمّم کا بیان

مشروعیت کی وجہ: نماز اور بعض دیگر کاموں کے لئے وضو یا غسل لازم ہے۔مگر کبھی انسان ایسی جگہ ہوتا ہے، مثلاً سفر میں ہوتا ہے، اور وہاں پانی میسر نہیں ہوتا، اور کبھی آدمی ایسی حالت میں یا ایسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے کہ غسل یا وضوء کرنا سخت مضر ہوتا ہے، تو ایسی حالت میں حکمت خداوندی نے پانی سے غسل یا وضو کے بدل تیمم تجویز کیا ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالی بندوں کو استطاعت کے بقدر ہی احکام کا مکلف بناتے ہیں۔قرآن کریم میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نفس کو اسی بات کا حکم دیتے ہیں جس کی اس میں استطاعت ہوتی ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی آئین نازل فرمایا ہے، اس میں سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے ہر اس کام میں آسانی پیدا فرماتے ہیں جو ان کی استطاعت میں نہیں ہوتا۔

بدل کیوں تجویز کیا؟ دین میں آسانی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ان میں سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ عبادت کا بدل تجویز کیا جائے، تاکہ لوگوں کے دل مطمئن رہیں۔اور ان کے دل کسی ایسی چیز کو یکدم ترک کر دینے کی وجہ سے،

جس کا انھوں نے غایت درجہ التزام کر رکھا ہے، پراگندہ نہ ہو جائیں یعنی وضوء اور غسل کی پابندی کے ذریعہ، اللہ تعالیٰ کے دربار کی حاضری کا جو اہتمام وہ کرتے رہے ہیں، اور جس کی وجہ سے اس حاضری کی عظمت وتقدس کا تصور ان کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے وہ مجروح نہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کوئی یہ سوچنے لگے کہ پاکی کی شرط خواہ مخواہ تھی۔ علاوہ ازیں اگر اعذار کی صورت میں بلا غسل اور بلا وضوء نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جائے گی، تو ان اتفاقات سے طبیعتیں ترکِ طہارت کی عادی بن جائیں گی۔ اس لئے بدل تجویز کیا گیا، تاکہ ذہن پر اور عادت پر اس طرح کا کوئی غلط اثر نہ پڑے۔

تیمم اس امت کا امتیاز ہے: جب صورتِ حال یہ ہے جو اوپر بیان کی گئی تو اولاً تیمم کا فیصلۂ خداوندی ملأ اعلیٰ میں نازل ہوا۔ اور تیمم کے طہارت ہونے کو ایک وجود شبہی (وجود سے مشابہ وجود) حاصل ہو گیا یعنی تیمم بھی نفس الامر میں ایک طہارت قرار پایا۔ پھر وہاں سے یہ حکم ہماری شریعت میں نازل ہوا۔

اور یہ فیصلہ خداوندی ان چند اہم امور میں سے ہے جن کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کی ملت کو دیگر ملتوں سے امتیاز حاصل ہوا ہے۔ مسلم شریف میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ہم برتری دیئے گئے ہیں لوگوں پر تین چیزوں کے ذریعہ: (۱) ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح بنائی گئی ہیں (۲) ہمارے لئے ساری زمین کو مسجد (نماز کی جگہ) بنایا گیا ہے (۳) اور مٹی کو ہمارے لئے پاکی کا ذریعہ بنایا گیا ہے، جبکہ ہم پانی نہ پائیں''
(مشکوٰۃ حدیث ۵۲۶ باب التیمم)

مٹی سے تیمم کیوں تجویز کیا گیا؟: مٹی ہی سے تیمم تین وجوہ سے تجویز کیا گیا ہے:

پہلی وجہ: مٹی سہل الحصول ہے۔ سمندر کے علاوہ ہر جگہ دستیاب ہے۔ پس اسکے ذریعہ تنگی رفع کرنا زیادہ مناسب ہے۔

دوسری وجہ: مٹی بعض اور مواقع میں بھی پاکی کا ذریعہ ہے۔ چمڑے کے موزے یا جوتے پر یا تلوار یا دھات کے برتن پر کوئی جسم دار ناپاکی لگ جائے، تو پانی سے دھونے کے بجائے مٹی سے رگڑ کر صاف کرنے سے بھی پاکی حاصل ہو جاتی ہے۔ غرض مٹی بھی فی الجملہ طہارت کا سامان ہے، اس لئے اس سے تیمم تجویز کیا گیا ہے۔

تیسری وجہ: مٹی کو ہاتھ لگا کر منہ پر پھیرنے میں تذلل وخاکساری ہے۔ یہ بھی چہرے کو خاک آلود کرنے کی طرح ہے۔ پس وہ درگذر کی درخواست کے مناسب ہے یعنی عذر کی وجہ سے پانی سے طہارت حاصل نہ کرنا بھی ہماری ایک طرح کی کوتاہی ہے۔ جس کی معافی کی ہم تیمم کے ذریعہ درخواست کرتے ہیں۔

غسل اور وضوء کے تیمم میں فرق کیوں نہیں؟ شریعت نے غسل اور وضو کے تیمم کے درمیان فرق نہیں کیا۔ دونوں کا تیمم یکساں ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے معروف تیمم ہی میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ دونوں طرح کے حدثوں کا ازالہ کر سکتا ہے۔ پس تیمم اپنی خاصیت سے اثر انداز ہے۔ الگ الگ طرح سے تیمم کی حاجت نہیں۔ اور یہ بات ہر اس حکم میں مان لینی

چاہئے جس کی وجہ سرسری نظر میں ذہن میں نہیں آتی۔لوگوں کے دل اسی سے مطمئن ہوں گے۔موشگافی سے اور الجھن کھڑی ہوجائے گی۔مثلاً سورۂ فاتحہ ہر بیماری کے لئے شفا ہے۔خواہ دردِ سر ہو،خواہ سانپ نے ڈسا ہو،سورۂ فاتحہ سب جگہ کام کرتی ہے۔حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے ایک سانپ ڈسے کو سورۂ فاتحہ سے جھاڑا تھا،اور وہ شفایاب ہوگیا تھا۔اب اگر کوئی اس کی وجہ پوچھے تو یہی جواب دینا چاہئے کہ فاتحہ اپنی خاصیت سے مؤثر ہے یعنی اللہ تعالی نے اس میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ ہر بیماری میں کام کرے۔اسی طرح تیمم بھی اپنی خاصیت سے اثر انداز ہے۔مقدار کا اس میں لحاظ نہیں کہ وضو کے لئے ایسا تیمم ہونا چاہئے،اور غسل کے لئے ایسا۔

دوسری وجہ: غسل کا تیمم کرنے کے لئے مٹی میں لوٹ لگانے میں ایک طرح کی پریشانی ہے۔پس اس سے حرج بالکلیہ رفع نہیں ہوسکتا۔ایک تنگی کا علاج ہوگا تو دوسری تنگی سر پڑے گی۔اس لئے غسل کا تیمم بھی وضو کے تیمم کی طرح تجویز کیا گیا۔

سخت سردی بیماری کی طرح ہے اگر سردی سخت ہو،اور ٹھنڈے پانی سے نہانے میں ہلاکت کا یا بیمار ہوجانے کا اندیشہ ہو،تو تیمم جائز ہے۔درمختار میں ہے: أو برد يهلك الجنب أو يمرضه اھ اور دلیل حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا درج ذیل واقعہ ہے:

حدیث ـــــ غزوہ ذات السلاسل میں،ایک نہایت سرد رات میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو جنابت لاحق ہوئی۔آپ میر لشکر تھے۔آپ نے اندیشہ محسوس کیا کہ اگر نہائیں گے تو ہلاک ہوجائیں گے۔چنانچہ آپ نے جسم کے شکن دھوئے،نماز والی وضو کی اور تیمم کرکے فجر کی نماز پڑھائی۔جب لشکر واپس آیا تو لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ماجرا بیان کیا۔آپؐ نے دریافت کیا:''عمرو،تم نے جنابت کی حالت میں نماز پڑھادی؟!''انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے اس وجہ سے غسل نہیں کیا کہ مجھے سردی سے ہلاکت کا اندیشہ تھا۔اور اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں. ﴿ وَلَاتَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ، إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا﴾ (۴:۲۹) یعنی تم خود کو مار نہ ڈالو،بیشک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے،اور کچھ نہ فرمایا(رواہ ابوداؤد،جامع الاصول ۸:۱۵۷)

تیمم سفر کے ساتھ خاص نہیں آیت تیمم میں جو فرمایا گیا ہے: ﴿ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ﴾ الآیۃ (۴ ۴۳،۵ ۲) اس میں سفر قیدِ احترازی نہیں ہے۔پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم جائز ہے۔خواہ سفر ہو یا حضر۔سفر محض پانی نہ پانے کی ایک شکل ہے۔عرب کے ریگستان میں سفر کا تذکرہ سن کر فوراً ذہن پانی موجود نہ ہونے کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔اور وہی آیت پاک میں مراد ہے۔

تیمم میں پیر کیوں شامل نہیں؟ اگرچہ پیر اعضائے مغسولہ میں سے ہیں۔مگر تیمم میں ان کو نہیں لیا گیا،کیونکہ پاؤں میل کچیل کا محل ہیں۔اور حکم اس چیز کا دیا جاتا ہے جو حاصل نہ ہو،تاکہ نئے عمل کے ذریعہ نفس چوکنا ہو۔چہرہ اور ہاتھ

صاف ہوتے ہیں اس لئے ان پر مسح کرنے سے نفس کو احساس ہوگا کہ طہارت کی خاطر کوئی عمل کیا گیا۔ پیروں پر مسح کرنے سے یہ فائدہ حاصل نہ ہوگا، اس لئے ان کو خارج کیا گیا۔

﴿التیمم﴾

لما كان من سنة الله في شرائعه: أن يسّهل عليهم كلَّ مالا يستطيعونه، وكان أحقُّ أنواع التيسير: أن يُسقَط ما فيه حرجٌ إلى بدلٍ، لتطمئن نفوسُهم، ولا تختلف الخواطرُ عليهم، بإهمال ما التزموه غايةَ الالتزام مرةً واحدةً، ولا يَألَفُوْا تركَ الطهارات: أسقطَ الوضوءَ والغسلَ في المرض والسفر إلى التيمم.

ولما كان ذلك كذلك نزل القضاءُ في الملأ الأعلى بإقامة التيمم مقامَ الوضوء والغسل، وحصل وجود تَشْبِيْهِيٌّ: أنه طهارة من الطهارات؛ وهذا القضاءُ أحدُ الأمور العظام التي تميَّزتْ بها الملةُ المصطَفَوِيَّةُ من سائر الملل، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "جُعِلت تربتُها لنا طَهورًا، إذا لم نجد الماءَ"

أقول:

[۱] إنما خُصَّ الأرضُ لأنها لاتكاد تُفْقَدُ، فهي أحقُّ ما يُرفَع به الحرجُ.

[۲] ولأنها طَهور في بعض الأشياء، كالخُفّ والسَّيْفِ، بدلاً عن الغسل بالماء.

[۳] ولأن فيه تذللاً، بمنزلة تعفير الوجه في التراب، وهو يناسب طلبَ العفو.

وإنما لم يُفَرَّقْ بين بدلِ الغُسل والوضوء، ولم يُشْرَع التمَرُّغ: لأن من حق مالايُعقل معناه بادئ الرأي: أن يُجعل كالمؤثَّر بالخاصية، دون المقدارِ، فإنه هو الذي اطمأنت نفوسُهم به في هذا الباب، ولأن التمَرُّغَ فيه بعضُ الحرج، فلايصلح رافعاً للحرج بالكلية.

وفي معنى المرض البردُ الضارُّ، لحديث عَمرو بن العاص؛ والسفر ليس بقيد، إنما هو صورةٌ لعدم وجدانِ الماء، يتبادر إلى الذهن.

وإنما لم يُؤمر بمسح الرِّجل بالتراب: لأن الرِّجل محلُّ الأوساخ، وإنما يؤمر بما ليس حاصلاً، ليحصل به التنبُّهُ.

ترجمہ: جب قوانینِ خداوندی میں سنتِ الٰہی میں تھا کہ آسانی کریں اللہ تعالیٰ لوگوں پر ہر اس کام میں جس کی وہ طاقت نہ رکھتے ہوں۔ اور آسانی کرنے کی انواع میں سب سے زیادہ حقدار یہ بات تھی کہ وہ ساقط کردیں اس کام کو

جس میں حرج ہے، جاتے ہوئے کسی بدل کی طرف، تا کہ لوگوں کے دل مطمئن ہوں۔ اور ان کے دل پراگندہ نہ ہوں اس چیز کو یکدم رائیگاں کرنے سے جس کا انھوں نے غایت درجہ التزام کر رکھا تھا۔ اور عادت بنالیں وہ ترکِ طہارت کی: پس ساقط کیا وضوء اور غسل کو، بیماری اور سفر میں، جاتے ہوئے تیمم کی طرف۔

اور جب تھی وہ بات ایسی، تو اُترا فیصلہ ملأ اعلیٰ میں تیمم کو وضوء اور غسل کی جگہ میں قائم کرنے کا۔ اور وجود میں آیا ایک وجودِ شبہی کہ تیمم منجملہ طہارات ایک طہارت ہے۔ اور یہ فیصلہ اُن امورِ عظام میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے ملتِ محمدیہ دیگر ملتوں سے ممتاز ہوئی ہے۔ اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''زمین کی مٹی ہمارے لئے پاکی کا سامان بنائی گئی ہے، جب ہم پانی نہ پائیں''

میں کہتا ہوں: (۱) زمین کو بس اس لئے خاص کیا ہے کہ بیشک وہ نہیں قریب ہے کہ گم کی جائے۔ پس وہ زیادہ حقدار ہے اس بات کی جس کے ذریعہ تنگی رفع کی جائے۔ (۲) اور اس لئے کہ وہ پاکی کا سامان ہے بعض چیزوں میں، جیسے چمڑے کا موزہ اور تلوار، پانی سے دھونے کے بدل کے طور پر (بدلاً کا تعلق طَھور سے ہے) (۳) اور اس لئے کہ اس میں خاکساری ہے، جیسے چہرہ کو مٹی میں آلودہ کرنا۔ اور خاکساری درگذر کی درخواست کے مناسب ہے۔

اور غسل اور وضو کے بدل کے درمیان بس اسی وجہ سے فرق نہیں کیا گیا، اور مٹی میں لوٹنا بس اسی وجہ سے مشروع نہیں کیا گیا کہ اس بات کے حق میں سے ہے جس کی وجہ سرسری نظر میں نہ سمجھی جائے کہ بنائی جائے وہ چیز خاصیت سے اثر انداز ہونے والی چیز کی طرح، نہ کہ مقدار سے (اثر انداز ہونے والی چیز کی طرح) پس بیشک اسی سے لوگوں کے دل مطمئن ہوتے ہیں اس باب میں۔ اور اس لئے کہ مٹی میں لوٹ لگانے میں کچھ پریشانی ہے، پس نہیں صلاحیت رکھتی وہ بالکلیہ تنگی کو اٹھانے کی ـــــ اور بیماری کے معنی میں ہے سخت نقصان رساں سردی، عمرو بن العاصؓ کی حدیث کی وجہ سے ـــــ اور سفر قید نہیں ہے (بلکہ) وہ پانی نہ پانے کی ایک صورت ہے، جو ذہن کی طرف سبقت کرتی ہے ـــــ اور مٹی سے پاؤں پر مسح کرنے کا حکم اسی وجہ سے نہیں دیا گیا کہ پاؤں میل کچیل کی جگہ ہیں۔ اور حکم اسی چیز کا دیا جاتا ہے جو حاصل نہ ہو، تا کہ اس کے ذریعہ تنبیہ حاصل ہو۔

☆ ☆ ☆

تیمّم کا طریقہ

(روایات میں اختلاف اور ان میں تطبیق)

تیمّم کا طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مروی ہے۔ قولی روایت میں بھی اختلاف ہے اور فعلِ نبوی بھی مختلف

مروی ہے۔ صحابہ کرام میں بھی اختلاف تھا۔ محدثین کا طریقہ رو بعمل آیا اس سے پہلے جمہور فقہاء کے نزدیک طریقہ یہ تھا کہ طہارت کی نیت سے زمین پر ہاتھ مارے جائیں، اور پورے چہرے پر پھیرے جائیں۔ بال برابر جگہ بھی باقی نہ رہے۔ پھر دوسری مرتبہ ہاتھ مارے جائیں، اور دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیرے جائیں، ذرا بھی جگہ باقی نہ رہے۔ یہی احناف اور شوافع کا مسلک ہے۔

اور اکثر محدثین کے نزدیک تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارے جائیں۔ اور ان کو پورے چہرے پر اور دونوں ہتھیلیوں پر، اوپر نیچے، پہنچوں تک پھیرا جائے۔ محدثین کے نزدیک یہ طریقہ مسنون ہے۔ اور پہلے طریقہ پر تیمم کرے تو وہ بھی جائز ہے۔ یہی امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کا مسلک ہے۔

احادیث: تیمم کے طریقہ کے بارے میں احادیث مختلف وارد ہوئی ہیں: بعض صحیح ہیں مگر صریح نہیں اور جو صریح ہیں وہ صحیح نہیں۔ یعنی جن کی سند صحیح ہے، وہ مسئلہ باب میں دوٹوک نہیں۔ ان میں تاویل کا احتمال ہے۔ اور جو صریح ہیں ان کی سندیں صحیح نہیں۔

صحیح ترین حدیث: حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جس کو محدثین نے لیا ہے۔ یہ درج ذیل حدیث ہے:

حدیث ——— حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ اور اس نے پوچھا کہ مجھے غسل کی حاجت ہوگئی، اور پانی مجھے ملا نہیں (تو کیا کروں؟) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نماز مت پڑھ۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے (جو وہاں موجود تھے) عرض کیا کہ آپ کو یاد نہیں: ایک دفعہ میں اور آپ سفر میں تھے اور ہم دونوں کو غسل کی حاجت ہوگئی تھی، تو آپ نے اس حالت میں نماز نہیں پڑھی تھی۔ اور میں نے زمین میں لوٹ لگائی تھی (یہ سمجھ کر کہ جنابت کا تیمم غسل کی طرح سارے جسم کا ہوتا ہوگا) پھر جب ہم سفر سے واپس آئے تو میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تمہارے لئے بس اتنا کرنا کافی تھا'' پھر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان میں پھونکا (تاکہ جو دھول لگی ہو وہ اڑ جائے، کیونکہ آپ کا مقصد تیمم کرنا نہیں تھا، صرف تیمم کا طریقہ سکھلانا مقصود تھا) پھر آپ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے پر اور اپنی دونوں ہتھیلیوں پر مسح کیا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۵۲۸)

اور مسلم شریف کی روایت میں یہ ساری قولی حدیث ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تمہارے لئے بس اتنا کرنا کافی تھا کہ تم اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارتے، پھر ان کو پھونک دیتے، پھر دونوں کو اپنے چہرے پر اور اپنی ہتھیلیوں پر پھیرتے'' (شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مسلم شریف کی روایت کے الفاظ لکھے ہیں)

دوسری حدیث ——— جس کو جمہور نے لیا ہے، وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تیمم زمین پر دو مرتبہ ہاتھ مارنا ہے: ایک مرتبہ چہرے کے لئے، اور ایک مرتبہ کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے" (رواہ الطبرانی فی الکبیر، وفیہ علی بن ظبیان، ضعفہ یحیی بن معین، فقال: کذاب خبیث و(ضعفہ) جماعۃ اھ مجمع الزوائد ۱ ۲۶۲)

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا عمل بھی مختلف مروی ہے۔ ابو الجہیم کی حدیث میں جس کی سند حسن ہے، مروی ہے کہ ایک بار آپؐ نے تیمم فرمایا: فمسح وجهه وذراعيه یعنی آپؐ نے اپنے چہرے پر اور اپنی دونوں کلائیوں پر مسح کیا۔ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں آپؐ نے صرف ہتھیلیوں پر مسح کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک مسح کرتے تھے۔ اور حضرت ابن عباسؓ صرف کفین پر مسح کے قائل تھے۔

صورتِ تطبیق: حدیث کے الفاظ إنما يكفيك سے واضح ہے یعنی ایک بار ہاتھ مارنا اور صرف کفین پر مسح کرنا ادنی درجہ ہے یعنی اتنا کم از کم ضروری ہے۔ اور جمہور والے طریقہ کے مطابق دو مرتبہ ہاتھ مارنا اور کہنیوں تک مسح کرنا مسنون طریقہ ہے۔

حدیث عمار کی تاویل: مذکورہ تطبیق محدثین کے طریقہ پر تو درست ہے، مگر جمہور فقہاء کے مذہب پر درست نہیں۔ ان کے نزدیک دو مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارنا اور کہنیوں تک مسح کرنا ضروری ہے۔ ان دو باتوں کے بغیر ان کے نزدیک تیمم درست نہیں۔ یہ حضرات حدیث عمار کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ آپؐ کا مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ غسل کا تیمم بھی وہی ہے جو وضو کا ہے۔ یہ بیان کرنا مقصود نہیں تھا کہ تیمم کرنے والا کن اعضاء پر ہاتھ پھیرے اور کتنی مرتبہ زمین پر ہاتھ مارے۔ اور إنما سے جو حصر کیا گیا ہے، وہ حصر اضافی ہے یعنی خاک میں لوٹنے کی بہ نسبت حصر کرنا مقصود ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی تیمم کے سلسلہ میں دو روایتیں ہیں۔ ایک اس وقت کا واقعہ ہے جب وضو کے لئے تیمم کا حکم نازل ہوا تھا۔ اور اس وقت لوگوں نے مختلف تیمم کیا تھا[1]۔ یہ واقعہ مقدم ہے۔ دوسری زیر بحث روایت ہے۔ اس موقعہ پر حضرت عمار رضی اللہ عنہ وضو کا تیمم تو جانتے تھے۔ مگر غسل کا تیمم نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے غسل کے تیمم کو وضوء تیمم پر قیاس کیا، اور زمین میں لوٹ لگائی اور سارے جسم پر مٹی ملی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتایا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی بس یہ کافی تھا، پھر اشارہ کیا اور بتایا کہ غسل کے لئے بھی وہی تیمم ہے جو وضوء کے لئے ہے۔ غسل کے تیمم میں سارے جسم پر مٹی نہیں لگائی جاتی۔ آپؐ کا مقصود تیمم کا طریقہ سکھلانا نہیں تھا۔ صرف حوالہ دینا مقصود تھا۔ پس محدثین کا اس روایت سے استدلال درست نہیں۔

شاہ صاحب کی رائے: یہ ہے کہ جمہور فقہاء کے طریقے کے مطابق ہی تیمم کرنا چاہئے۔ کیونکہ اسی صورت میں یقیناً

---

[1] رواہ ابوداود، مشکوۃ حدیث ۵۳۶

ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوگا یعنی بالاتفاق تیمم درست ہو جائے گا۔ اور حدیث میں ہے. دع ما یریبك إلى ما لا یریبك یعنی کھٹک والی بات چھوڑو، اور بے کھٹک بات اختیار کرو۔

جنابت میں بھی تیمم جائز ہے: حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے نزدیک جنابت میں تیمم جائز نہیں تھا۔ صرف حدث اصغر میں تیمم جائز تھا۔ وہ آیت ﴿ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ ﴾ میں لامس کو جو کہ باب مفاعلہ سے ہے لمس (مجرد) کے معنی میں لیتے تھے۔ اور آیت کو نواقض وضو کا بیان قرار دیتے تھے کہ عورت کو چھونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتی ہے۔ مگر درج ذیل دو حدیثوں سے جنابت میں بھی تیمم کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اسی پر اب امت کا اتفاق ہے۔

حدیث ـــــ حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپؐ نے نماز پڑھائی۔ جب آپؐ نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف پھرے تو ایک شخص کو علحدہ بیٹھا ہوا دیکھا، جو نماز میں شریک نہیں ہوا تھا۔ آپؐ نے اس سے دریافت کیا کہ تم نماز میں کیوں شامل نہیں ہوئے؟ اس نے کہا: مجھے جنابت لاحق ہوئی ہے، اور پانی نہیں ہے! آپؐ نے فرمایا: علیك بالصعید، فإنه یکفیك لازم پکڑو تو مٹی کو یعنی اس سے تیمم کر، پس تحقیق وہ تیرے لئے کافی ہے (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۲۷)

دوسری حدیث: حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی ہے جو ابھی اوپر گذر چکی ہے۔ ان روایات سے جنابت میں بھی تیمم کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

فقہ شافعی کے چند مسائل جو منصوص نہیں: شوافع کے نزدیک تیمم طہارت ضرور یہ ہے۔ طہارت کاملہ نہیں ہے، اس لئے ہر فرض نماز کے لئے تیمم کرنا واجب ہے ایک تیمم سے دو فرض نہیں پڑھ سکتے۔ نیز نماز کا وقت ہونے کے بعد تیمم ہو سکتا ہے۔ وقت آنے سے پہلے کئے ہوئے تیمم سے نماز درست نہیں۔ اور سفر معصیت میں بھی تیمم کی رخصت نہیں۔ مولی سے بھاگا ہوا غلام یا کسی کو قتل کرنے کے ارادہ سے سفر کرنے والا تیمم نہیں کر سکتا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سب استنباطی مسائل ہیں۔ کسی صحیح حدیث میں، میں نے ان کی صراحت نہیں پائی۔

أما صفة التيمم : فهو أحدما اختلف فيه طريقا التلقى عن النبى صلى الله عليه وسلم: فإن أكثر الفقهاء من التابعين وغيرهم— قبل أن تمهد طريقة المحدثين— على أن التيمم ضربتان: ضربة للوجه،وضربة لليدين إلى المرفقين.

وأما الأحاديث . فأصحها حديث عمار:" إنما كان يكفيك أن تضرب يديك الأرض، ثم تنفخ فيهما، ثم تمسح بهما وجهك وكفيك" وروى من حديث ابن عمر:" التيمم ضربتان: ضربة للوجه، وضربة لليدين إلى المرفقين" وقد روى عمل النبى صلى الله عليه وسلم

والصحابة على الوجهين.

ووجهُ الجمع ظاهر، يُرشد إليه لفظُ: " إنما يكفيك" فالأولُ أدنى التيمم، والثانى هو السنة؛ وعلى ذلك يمكن أن يُحمل اختلافُهم فى التيمم.

ولايبعد أن يكون تأويلُ فعله صلى الله عليه وسلم: أنه علَّم عماراً أن المشروع فى التيمم إيصالُ ما لَصِقَ باليدين بسبب الضربة، دون التمرغ، ولم يُرِدْ بيانَ قدرِ الممسوح من أعضاء المتيمم، ولا عددِ الضربة؛ ولا يبعد أن يكون قولُه لعمَّار أيضًا محمولاً على هذا المعنى؛ وإنما معناه: الحصرُ بالنسبة إلى التمرغ.

وفى مثل هذه المسألة لاينبغى أن يأخذَ الإنسانُ إلا بما يخرج به من العهدة يقينا.

وكان عمر وابنُ مسعود رضى الله عنهما لايريان التيمم عن الجنابة، وحملا الآيةَ على اللمس، وأنه يَنقضُ الوضوء، لكن حديث عمرانَ وعَمَّار يشهدُ بخلاف ذلك.

ولم أجد فى حديث صحيح تصريحا: بأنه يجب أن يُتَيَمَّمَ لكل فريضة، أولا يجوز التيمم للآبق، ونحوه، وإنما ذلك من التخريجات.

ترجمہ: رہا تیمم کا طریقہ: تو وہ ان مسائل میں سے ایک ہے جس میں نبی ﷺ سے دین اخذ کرنے کے دونوں طریقے مختلف ہوئے ہیں (دین اخذ کرنے کے دونوں طریقوں کی تفصیل مبحث ہفتم، باب سوم میں گذر چکی ہے) پس بیشک تابعین وغیرہ میں سے بیشتر فقہا ــــ محدثین کا طریقہ ہموار کئے جانے سے پہلے (تفصیل کے لئے دیکھیں تتمہ مبحث ہفتم، باب سوم) ــــ اس بات پر تھے کہ تیمم دو مرتبہ (زمین پر) ہاتھ مارنا ہے ایک مرتبہ چہرے کے لئے مارنا، اور ایک مرتبہ کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے مارنا۔

اور رہی حدیثیں: پس ان میں صحیح ترین عمارؓ کی حدیث ہے کہ: ''تیرے لئے بس یہ بات کافی تھی کہ مارتا تو اپنے دونوں ہاتھ زمین پر، پھر ان میں پھونکتا، پھر دونوں کو اپنے چہرے اور اپنی ہتھیلیوں پر پھیرتا'' اور ابن عمرؓ کی روایت میں مروی ہے کہ: ''تیمم دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا ہے: ایک مرتبہ چہرے کے لئے اور ایک مرتبہ کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لئے'' اور تحقیق روایت کیا گیا ہے نبی ﷺ اور صحابہ کا عمل دونوں ہی طرح سے۔

اور تطبیق کی صورت واضح ہے۔ راہ نمائی کرتا ہے اس کی طرف حدیث کا لفظ: ''تیرے لئے بس یہ بات کافی تھی'' پس اول (یعنی پہلی حدیث میں جو طریقہ ہے وہ) تیمم کا ادنی درجہ ہے۔ اور دُوم ہی سنت طریقہ ہے۔ اور اسی پر محمول کیا جاسکتا ہے صحابہ و تابعین کا تیمم میں اختلاف (یعنی کوئی ادنی درجہ پر عمل کرتا تھا اور کوئی سنت طریقہ پر)

اور بعید نہیں کہ ہو نبی ﷺ کے فعل کی (جو حدیث عمارؓ میں ہے) یہ تاویل کہ آپؐ نے عمارؓ کو سکھلایا ہے کہ تیمم میں

مشروع (مقصود) اس چیز (گرد وغبار) کو پہنچانا ہے جو ہاتھ کے ساتھ لگی ہے (زمین پر) ہاتھ مارنے کی وجہ سے۔ زمین میں لوٹنا مقصود نہیں ہے۔ اور نہیں ارادہ کیا آپؐ نے تیمم کرنے والے کے اعضاء میں سے ممسوح کی مقدار کو بیان کرنے کا، اور نہ ہاتھ مارنے کی تعداد کو بیان کرنے کا۔ اور بعید نہیں کہ آپؐ کا عمارؓ سے ارشاد (جس کا مسلم شریف کی روایت میں ذکر ہے) بھی اس بات پر محمول ہو۔ اور اس کے معنی خاک میں لوٹنے کی بہ نسبت حصر کرنا ہی ہیں۔

اور اس طرح کے مسئلہ میں مناسب نہیں ہے کہ لے آدمی مگر اس بات کو جس کے ذریعہ یقیناً ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے ——— اور عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما جنابت سے تیمم کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اور وہ دونوں آیت کو لمستم (چھونے) پر محمول کرتے تھے۔ اور اس بات پر محمول کرتے تھے کہ عورت کو چھونا ناقض وضوء ہے۔ لیکن عمران اور عمار کی حدیثیں اس کے برخلاف کی گواہی دیتی ہیں ——— اور میں نے کسی صحیح حدیث میں اس کی صراحت نہیں پائی کہ ہر فرض نماز کے لئے واجب ہے کہ تیمم کیا جائے یا بھاگے ہوئے غلام اور اس کے مانند کے لئے تیمم جائز نہیں ہے۔ یہ سب محض تخریجات (قواعد کلیہ پر مستنبط کردہ مسائل) ہیں۔

☆ ☆ ☆

زخمی کا غسل اور تیمم کو جمع کرنا

حدیث ——— حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سفر میں تھے۔ ہم میں سے ایک شخص کو پتھر لگا۔ جس سے اس کا سر زخمی ہو گیا۔ پھر اسے نہانے کی حاجت پیش آئی۔ اس نے ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا کہ میرے لئے تیمم جائز ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے نزدیک آپ کے لئے تیمم جائز نہیں، کیونکہ آپ پانی کے استعمال پر قادر ہیں۔ چنانچہ وہ نہایا پس وہ مر گیا۔ جب ہم آنحضرت ﷺ کے پاس واپس آئے تو یہ ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اُن لوگوں نے اسے مار دیا، اللہ انہیں مارے! جب وہ مسئلہ نہیں جانتے تھے تو انھوں نے پوچھا کیوں نہیں۔ مرضِ نادانی کی شفا تو پوچھنے ہی میں ہے۔ اس کے لئے بس یہ بات کافی تھی کہ وہ تیمم کرتا اور اپنے زخم پر کوئی کپڑا باندھ لیتا، پھر اس پر مسح کرتا، اور باقی تمام بدن دھوتا'' (رواہ ابوداؤد حدیث ۳۳۶ مشکوٰۃ حدیث ۵۳۱)[1]

---

[1] یہ حدیث بالاتفاق ضعیف ہے۔ اس کی سند میں زبیر بن خریق جزری ہے، جو مضبوط راوی نہیں ہے۔ بیہقی نے بھی سنن کبریٰ ۱ ۲۲۸ میں یہ حدیث زُبیر کی سند سے روایت کی ہے۔ سنن کبریٰ کے حاشیہ میں ابن الترکمانی نے دیگر وجوہ سے بھی اس کی تضعیف کی ہے۔ یہ حدیث تیمم اور باقی بدن کے دھونے کو جمع کرنے پر دلالت کرتی ہے۔ وقال البیهقی: لایثبت عن النبی صلی الله علیه وسلم فی هذا الباب شیئ یعنی باب المسح علی العصائب والجبائر ۱۲ مرقات۔ یہ حدیث ابوداؤد (نمبر ۳۳۷) اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے بھی روایت کی ہے۔ اور اس کی سند ٹھیک ہے، مگر وہ مختصر ہے، اس میں دھونے اور تیمم کرنے کا تذکرہ نہیں ہے ۱۲

تشریح: حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک اگر کسی عضو میں زخم یا پھوڑا ہو، اور اس پر پٹی بندھی ہو اور اس کو ہٹانے میں ہلاکت کا اندیشہ ہو یا زخم کھلا ہو اور اس کو دھونے میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، تو پٹی پر یا زخم پر مسح کرے اور ساتھ ہی تیمم بھی کرے اور جو بدن درست ہے اس کو دھوئے۔

اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک اگر بعض بدن زخمی ہو، اور بعض اچھا ہو، تو دیکھیں گے: اگر اکثر بدن اچھا ہے تو اس کو دھوئیں گے، اور زخم پر خواہ اس پر پٹی ہو یا کھلا ہو مسح کریں گے، اگر اس کو دھونے میں ہلاکت کا یا ضرر شدید کا اندیشہ ہو۔ اور اگر اکثر بدن زخمی ہے مثلاً چیچک نکلی ہوئی ہے تو صرف تیمم کریں گے، اور دھونا ساقط ہے۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے مذکورہ حدیث کو اس کے ضعف کے باوجود لیا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہونے کے علاوہ درایت کے بھی خلاف ہے، اس لئے انھوں نے نہیں لیا۔ اور یہ حدیث درایت کے خلاف اس طرح ہے کہ بدل اور مبدل منہ (تیمم اور غسل) کو جمع کرنا لازم آتا ہے، جو ضوابط کے خلاف ہے۔

شاہ صاحب قدس سرہ اس حدیث کی ایسی تشریح فرماتے ہیں کہ یہ حدیث درایت کے خلاف نہ رہے۔ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دو باتیں ہیں:

پہلی بات: تیمم جس طرح تمام بدن کے غسل کا بدل ہے، ایک عضو کے غسل کا بھی بدل ہے یعنی تیمم جس طرح تمام بدن کی جنابت کو دور کرتا ہے، ایک عضوی جنابت کو بھی دور کرتا ہے۔ کیونکہ تیمم مؤثر بالخاصہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تیمم میں کل اور جزء دونوں کی جنابت کو دور کرنے کی خاصیت رکھی ہے، پس مذکورہ صورت میں جو تیمم کیا گیا ہے وہ صرف زخمی عضو کی طہارت کے لئے ہے۔ اور باقی بدن کا دھونا اس کی طہارت کے لئے ہے۔ پس بدل اور مبدل منہ کو جمع کرنا لازم نہیں آتا۔

دوسری بات: ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب زخمی جگہ تیمم سے پاک ہوگئی تو اب اس پر مسح کرنے کا حکم کیوں ہے؟ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ زخم پر یا پٹی پر مسح کا حکم اُس مصلحت سے ہے جس کا تذکرہ پہلے مسح علی الخفین کے بیان میں گذر چکا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسح محض اس لئے ہے کہ اس جگہ کا دھونا یاد رہے، اور وہ مسح غسل کا نمونہ بنے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم في الرجل المشجوج: " إنما كان يكفيه أن يتيمم ويُعصِّب على جُرْحِه خِرْقَةً، ثم يَمْسَح عليها ويغسل سائر جسده"

أقول: فيه: أن التيمم هو البدل عن العضو، كتمام البدن، لأنه كالشيء المؤثر بالخاصية،

وفيه الأمرُ بالمسح، لما ذكرنا في المسح على الخفين.

ترجمہ:(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد (ترجمہ اوپر گذر چکا) میں کہتا ہوں: اس حدیث میں یہ بات ہے کہ تیمم جس طرح تمام بدن کا بدل ہے اسی طرح ایک عضو کا بھی بدل ہے، اس لئے کہ تیمم خاصیت سے اثر انداز ہونے والی چیز کی طرح ہے اور اس حدیث میں مسح کرنے کا حکم ہے، جس کی وجہ موزوں پر مسح کے بیان میں گذر چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

تیمم کامل طہارت ہے دل میں کچھ وسوسہ نہ لائے

حدیث ـــــ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پاک مٹی مسلمان کا سامان طہارت ہے، اگرچہ دس سال تک پانی نہ ملے۔ پس جب پانی پائے تو چاہئے کہ اس کو اپنے بدن پر لگائے۔ پس بیشک یہ (نہانا) بہتر ہے" (مشکوۃ حدیث ۵۳۰)

تشریح دس سال سے مراد کثرت ہے، عدد مراد نہیں۔ اور حدیث کا مقصد تعمق کا دروازہ بند کرنا ہے یعنی جب تک پانی نہ ملے وضو اور غسل کے لئے تیمم کرتا رہے۔ دل میں کچھ خیال اور وسوسہ نہ لائے۔ جتنی پاکی پانی سے ہوتی ہے اتنی ہی پاکی مٹی سے ہوتی ہے۔ یہ خیال نہ کرے کہ تیمم سے اچھی طرح پاکی نہیں ہوتی۔ ایسا خیال کرنا حدود سے تجاوز کرنا ہے اور رخصت شرعی کے بارے میں حکم الٰہی کی مخالفت ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ تیمم طہارتِ مطلقہ ہے۔ خروج وقت سے تیمم باطل نہیں ہوتا۔ اور ایک تیمم سے جتنے چاہے فرض اور نفل پڑھ سکتا ہے (مظاہر حق)

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " إن الصعيد الطيِّب وَضوء المسلم، وإن لم يجد الماءَ عشر سنين" أقول: المقصود منه سدُّ باب التعمُّق، فإن مثله يتعمَّقُ فيه المتعمقون، ويخالفون حكم الله في الترخيص.

ترجمہ۔(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: اس ارشاد سے مقصود تعمق (حد سے تجاوز کرنے) کا دروازہ بند کرنا ہے۔ پس بیشک اس قسم کی باتیں: حد سے تجاوز کرتے ہیں اس میں حد سے تجاوز کرنے والے، اور وہ رخصت شرعی کے بارے میں حکم الٰہی کی مخالفت کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۱۱

قضائے حاجت کے آداب

آداب. ادب کی جمع ہے۔ادب پسندیدہ باتوں کواور شائستہ کاموں کو کہتے ہیں۔مرقات میں ہے: استعمالُ ما یُحمَدُ قولاً و فعلاً اور خلاء کے معنی ہیں خالی جگہ۔مراد بیت الخلاء اور استنجے کی جگہ ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں اسی عنوان سے باب ہے۔اوراس میں بیالیس حدیثیں ذکر کی ہیں۔شاہ صاحب نے ان میں سے تین حدیثوں کی شرح تواس باب کے آخر میں مستقل طور پر کی ہے۔باقی تمام حدیثوں کی ایک ساتھ شرح کی ہے۔

قضائے حاجت کے آداب کا تعلق سات باتوں میں سے کسی ایک بات سے ہے:

پہلی بات: ـــ بیت اللہ کی تعظیم ـــ بعض احکام بیت اللہ کی عظمت کے پیش نظر دیئے ہیں۔درج ذیل حدیث اسی سلسلہ کی ہے:

حدیث ـــ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم قضائے حاجت کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ کی طرف منہ کرواور نہ پیٹھ کرو، بلکہ (مدینہ کی جہت میں) مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف رخ کرو'' (متفق علیہ) مسلم شریف کی روایت میں یہ اضافہ ہے: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر جب ہم ملکِ شام پہنچے تو ہم نے وہاں ایسے بیت الخلاء پائے جو قبلہ رخ بنے ہوئے تھے، پس ہم ایک جانب مائل ہو جاتے تھے اور استغفار کرتے تھے'' ـــ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استقبال واستدبار کی ممانعت بیت اللہ کی عظمت کی وجہ سے ہے۔یہ حکمت مثبت پہلو سے ہے۔

ایک دوسری حکمت: منفی پہلو سے یہ ہے کہ قضائے حاجت کرتے ہوئے بیت اللہ کی طرف منہ کرنا تعظیم کے منافی ہے۔اس لئے اس کی ممانعت کی گئی ہے ـــ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عبادت (نماز) کے وقت دل کو اللہ کی عظمت کی طرف متوجہ رکھنا ضروری ہے۔قلب غافل کی عبادت مقبول نہیں۔اور قلبی توجہ ایک مخفی امر ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کسی واضح چیز کو ـــ جو تعظیم کی احتمالی جگہ ہو یعنی اس چیز سے تعظیم بدست آسکتی ہو ـــ قلبی توجہ کا قائم مقام بنایا جائے۔ گذشتہ شریعتوں میں اُن عبادت گاہوں میں پہنچنے کو قلبی توجہ کا قائم مقام بنایا گیا تھا جو اللہ کی بندگی کے لئے بنائی جاتی تھیں اور جو شعائر اللہ میں شمار ہوتی تھیں اور جو اللہ کے دین کی خاص جگہیں تھیں۔چنانچہ اُن امتوں کے لئے عبادت گاہوں کے علاوہ دوسری جگہ میں نماز ادا کرنا جائز نہیں تھا ـــ اور ہماری شریعت میں قبلہ کی طرف منہ کر کے تکبیر کہنے کو ـــ تعظیم کا

مظنہ ہونے کی وجہ سے ـــــ توجہ قلبی کا قائم مقام بنایا گیا ہے۔اس لئے اس امت کیلئے ہر جگہ نماز پڑھنا جائز ہے۔عبادت (نماز) کے لئے مسجد شرط نہیں۔اور یہ اس ملت کا ایک امتیاز ہے جیسا کہ حدیث میں گذرا۔کیونکہ اس امت کو توجہ قلبی استقبال وتکبیر سے حاصل ہوجاتی ہے۔

اور جب صورت حال یہ ہے کہ استقبال قبلہ: اللہ کی تعظیم کی طرف دل کے متوجہ ہونے اور اللہ کے ذکر میں دل کے مگن ہونے کا قائم مقام ہے۔اور یہ قائم مقام ہونا بایں وجہ تھا کہ قبلہ کی طرف رخ پھیرنا ایک ایسی حالت ہے جس سے اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے،تو آنحضرت ﷺ نے اس سے یہ بات مستنبط کی کہ استقبال قبلہ کی حالت کو تعظیم کے ساتھ خاص کرنا ضروری ہے۔اور خاص کرنے کی صورت یہ تجویز کی کہ جو حالت نماز کے بالکلیہ منافی ہے یعنی قضائے حاجت اس حالت میں استقبال قبلہ کی قطعاً اجازت نہ دی جائے۔

اس حدیث کا دوسری دو حدیثوں سے تعارض،اور اس کا حل:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی متفق علیہ روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ کو قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے اور شام کی طرف منہ کر کے قضائے حاجت کرتے ہوئے دیکھا (مشکوۃ حدیث ۳۳۵) اور ترمذی شریف (ص۲) میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ کو وفات سے ایک سال پہلے کعبہ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرتے دیکھا۔ان حدیثوں میں اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں تعارض ہے۔رفع تعارض کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔شاہ صاحب ان میں سے دو طریقے بیان فرماتے ہیں:

پہلا طریقہ: ـــــ ائمہ ثلاثہ نے اختیار کیا ہے کہ ممانعت جنگل میں ہے یعنی وہاں ہے جہاں سامنے کوئی آڑ نہ ہو۔ اور اباحت (جواز) عمارت میں ہے۔یعنی وہاں ہے جہاں قضائے حاجت کرنے والے کے سامنے کوئی آڑ ہو۔حضرت ابن عمرؓ نے بھی یہی تطبیق دی ہے،(مشکوۃ حدیث ۳۷۳)

دوسرا طریقہ: ـــــ یہ ہے کہ ممانعت کو کراہت تنزیہی (خلاف اولی) پر محمول کیا جائے اور اباحت فی نفسہ ہو۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ بہتر ہے۔

فائدہ: احناف کے نزدیک اصل حضرت ابوایوبؓ کی حدیث ہے۔اور اُس حدیث میں جو مسلم شریف کی روایت میں اضافہ ہے،وہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ممانعت عمارت میں بھی ہے اور جواز کی روایات آنحضرت ﷺ کی خصوصیت پر محمول ہیں۔یا اُن کی کوئی اور مناسب تاویل کی جائے گی۔

دوسری بات: ـــــ خوب صفائی کرنا ـــــ اس مقصد سے دو حکم دیئے ہیں:

پہلا حکم: تین پتھروں سے کم سے استنجا نہ کیا جائے۔اور تین پتھروں سے مراد تین مرتبہ محل استنجاء کو پونچھنا ہے۔

اگرچہ ایک بڑا پتھر لیکر تین الگ الگ حصوں سے پونچھے۔ اور تین کا عدد اس لئے ہے کہ عام طور پر تین بار سے کم پونچھنے سے محل صاف نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی بڑے استنجاء کے لئے جائے تو اپنے ساتھ تین پتھر لے جائے، جن سے صفائی حاصل کرے فانہا تجزئ عنہ: پس تین پتھر اس لئے کافی ہوجائیں گے (مشکوۃ حدیث ۳۴۹)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تثلیث واجب نہیں، انقاء واجب ہے۔ اگر دو میں انقاء ہوجائے تو وہ بھی کافی ہیں۔ اور اگر انقاء تین میں بھی نہ ہو تو اور پتھر لینے ضروری ہیں۔

دوسرا حکم: پتھر اور پانی دونوں استعمال کرنا مستحب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانی بھی استعمال فرماتے تھے (مشکوۃ حدیث ۳۴۲ و ۳۶۰) اور سورۃ التوبہ آیت ۱۰۹ میں اہل قباء کی اسی بنیاد پر تعریف کی گئی ہے کہ وہ پانی سے بھی استنجاء کرتے تھے (مشکوۃ حدیث ۳۶۹)

فائدہ: اگر دونوں میں سے ایک استعمال کرے تو صرف پانی کا استعمال اولیٰ ہے، کیونکہ اس سے صفائی پتھر کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اور صرف ڈھیلوں کا استعمال بھی درست ہے، جبکہ صفائی ہوجائے یعنی اس کے بعد نماز درست ہے۔

تیسری بات: —— ضرر رساں چیزوں سے بچنا —— خواہ وہ دوسروں کے لئے ضرر رساں ہوں یا خود کے لئے۔ اس مقصد سے درج ذیل احکام دیئے ہیں

لوگوں کے سایے میں اور ان کے راستہ میں پائخانہ نہ کیا جائے۔ سایہ سے مراد: درخت وغیرہ کا سایہ ہے جس میں لوگ بیٹھا سویا کرتے ہوں۔ اور راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جس پر لوگ عام طور پر چلتے ہوں۔ وہ راستہ مراد نہیں جس پر لوگ کبھی کبھی گذرتے ہوں (مظاہر حق) مسلم شریف میں روایت ہے کہ وہ باعث لعنت چیزوں سے بچو۔ دریافت کیا گیا وہ کیا چیزیں ہیں؟ فرمایا: ''لوگوں کا سایہ اور ان کا راستہ'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۹) اور ابوداؤد اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ ''تین باعث لعنت چیزوں سے بچو یعنی پانی کی گھاٹوں میں، عام راستہ میں اور سایے میں پائخانہ کرنا'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۵)

اسی طرح جہاں بیٹھ کر لوگ باتیں کرتے ہوں یا دھوپ کھاتے ہوں، وہاں بھی استنجاء نہ کیا جائے۔ اسی طرح ٹھہرے ہوئے پانی میں جو بہتا نہ ہو پیشاب پاخانہ نہ کیا جائے۔ اسی طرح ہڈی سے استنجاء کرنا ممنوع ہے۔ اس سے صفائی نہیں ہوتی، اور وہ جنات کی خوراک ہے۔ اسی طرح ان تمام مقامات میں استنجاء کرنے سے بچنا چاہئے جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور اوپر جو حدیث ذکر کی گئی ہے کہ: ''وہ باعث لعنت چیزوں سے بچو'' اس سے ممانعت کی حکمت واضح ہوتی ہے یعنی لوگوں کی ایذا رسانی سے بچنا۔

اسی طرح ان جگہوں میں قضائے حاجت کرنے سے بچنا ضروری ہے جو خود اس کو ضرر پہنچا سکتی ہیں۔ جیسے بل میں پیشاب کرنا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے وہ سانپ کا یا کسی اور زہریلے جانور کا مسکن ہو۔ اس میں پیشاب کرنے سے وہ نکلے گا

اور ایذا پہنچائے گا۔

چوتھی بات: —— اچھی عادتیں اپنانا —— اس مقصد کے پیش نظر درج ذیل احکامات دیئے ہیں:

(۱) دائیں ہاتھ میں ڈھیلا لے کر اس سے محل نہ پونچھے (۲) دائیں ہاتھ سے اپنے پیشاب کے عضو کو نہ پکڑے (۳) لید گوبر سے استنجاء نہ کرے (۴) اور پتھر سے استنجاء کرنے میں طاق عدد کا خیال رکھے۔

نوٹ: عرب کی سرزمین میں مٹی کا ڈھیلا کم یاب ہے۔ وہاں کی مٹی میں سنگریزے ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے ڈھیلا پھر بھرا جاتا ہے۔ اس لئے احادیث میں حجر کا تذکرہ آیا ہے، مدر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حکم دونوں کا ایک ہے۔

پانچویں بات: —— پردے کا اہتمام کرنا —— اس مقصد سے درج ذیل احکام دیئے ہیں:

(۱) لوگوں سے دور جا کر قضائے حاجت کرے تاکہ لوگ آواز نہ سنیں اور بدبو نہ سونگھیں اور اس کا ستر کوئی نہ دیکھے (۲) اور اپنا کپڑا اسی وقت اٹھائے جب زمین سے قریب ہو جائے تاکہ دور سے کسی کی اس کے ستر پر نظر نہ پڑے (۳) کسی آڑ میں استنجاء کے لئے بیٹھے جس سے اس کا نیچے کا بدن چھپ جائے، جیسے کھجوروں کا جھنڈ یا جھاڑی وغیرہ اور اگر ایسی کوئی جگہ نہ ہو تو ریت جمع کر کے ڈھیری بنالے اور اس کی طرف پشت کر کے بیٹھے۔ کیونکہ شیطان انسانوں کی شرمگاہ سے کھلواڑ کرتا ہے یعنی لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے کہ وہ اس کا ستر دیکھیں۔ اور شیطان یہ حرکت اس لئے کرتا ہے کہ اس کا مزاج فاسد ہے، سوچ کا سد ہے اور حرکتیں ناشائستہ ہیں۔ اس کی تخلیق ہی ایسی ہوئی ہے۔

چھٹی بات: —— بدن اور کپڑوں کو نجاست سے بچانا —— مخالف ہوا میں اور سخت جگہ میں پیشاب نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے چھینٹیں بدن اور کپڑوں پر پڑ سکتی ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی پیشاب کرنا چاہے تو نرم جگہ تلاش کرے (مشکوۃ حدیث ۳۴۵)

ساتویں بات: —— وساوس سے بچنا —— اس مقصد سے غسل خانہ میں پیشاب کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ زیادہ تر وساوس اس سے پیدا ہوتے ہیں (مشکوۃ حدیث ۳۵۳)

﴿آداب الخلاء﴾

هي ترجع إلى معانٍ:

منها: تعظيمُ القبلة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا أَتَيْتُمُ الغائطَ فلا تستقبِلوا القبلةَ، ولاتَسْتَدْبِرُوْهَا".

وفيه حكمة أخرى: وهي أنه لما كان توجُّهُ القلب إلى تعظيم الله أمرًا خفياً، لم يكن بدٌّ من إقامة مظنّةٍ ظاهرةٍ مقامَه؛ وكان الشرائع المتقدِّمةُ تجعل تلك المظنة الحلول بالصوامع المبنيَّةِ

للّٰہ تعالی، التی صارت من شعائر اللّٰہ ودینہ، وجعلت شریعتنا المظنۃ استقبال القبلۃ والتکبیر، فلما جعل اللہ تعالی استقبال القبلۃ قائما مقام توجُّہِ القلب إلی تعظیم اللّٰہ، وجمعِ الخاطر فی ذکر اللّٰہ، وکان سببُ إقامتہ أن ھذہ الھیئۃ تُذَکِّرُ اللّٰہ: استنبط النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم من ھذا الحکم أنہ یجب أن یُجعل ھیئۃُ الاستقبال مختصۃ بالتعظیم؛ وذلک بأن لایُستعمل فی الھیأۃ المباینۃ للصلاۃ کلّ المباینۃ.

ورُوِیَ استقبالُہ واستدبارُہ، فَجُمع بتنزیل التحریم علی الصحراء، والإباحۃ علی البنیان، وجُمع بحمل النھی علی الکراھیۃ، وھو الأظھر.

ومنھا: تحقیق معنی التظیف، فورد النھی عن الاستنجاء بأقلَّ من ثلاثۃ أحجار، أی ثلاث مَسحاتٍ، لأنھا لاتُنقیٰ غالباً، واستحبابُ الجمع بین الحجر والماء.

ومنھا: الاحتراز عما یضر الناسَ، کالتخلی فی ظل الناس، وطریقھم، ومتحدَّثھم، والماء الدائم، والاستنجاءِ بالعظم، لأنہ طعام الجن، وکذا سائرِ ما یُنتفع بہ. وأفھم قولُہ صلی اللہ علیہ وسلم:" اتَّقُوْا اللاعِنَیْنِ" أن الحکمۃ الاحترار عن لعنھم، وتأذیھم، أوما یضر بنفسہ، کالبول فی الجُحر، فإنہ قد یکون مأوی حیۃٍ، أو مثلِھا، فیخرج، ویؤذی.

ومنھا :اختیار محاسن العادات، فلا یتمسّحُ بیمینہ، ولایأخذ ذَکرہ بیمینہ، ولا یستنجی برجیع، ویوتر فی الاستجمار.

ومنھا: رعایۃ السّتر، فینبغی أن یبعُد لئلا یُسمی منہ صوتٌ، أو یُشَمَّ منہ ریح، أو یُری منہ عورۃٌ، ولا یَرْفع ثوبَہ حتی یَدْنُو من الأرض، ویستَتِرُ بمثل حائشِ نخلٍ، مما یُواری أسافلَ بدنہ، فمن لم یجد إلا أن یجمع کثیبًا من رَّمْلٍ فلیستدبرہ، فإن الشیطان یلعب بمقاعدِ بنی آدم، وذلک: لأن الشیطان جُبل علی أفکار فاسدۃ وأعمال شنیعۃ.

ومنھا: الاحتراز من أن یُصیب بدنہ أو ثوبہ نجاسۃ، وھو قولہ صلی اللہ علیہ وسلم:" إذا أراد أحدکم أن یبول فَلْیَرْتَدْ لبولہ"

ومنھا: إزالۃ الوسواس، وھو قولہ صلی اللہ علیہ وسلم:" فلایبولن أحدکم فی مُسْتَحَمِّہ، فإن عامَّۃَ الوسواس منہ"

ترجمہ: قضائے حاجت کے آداب: یہ آداب چند باتوں کی طرف لوٹتے ہیں:

ان میں سے: قبلہ کی تعظیم ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب آؤ تم نشینی جگہ میں تو قبلہ کی طرف نہ منہ کرو اور نہ اس کی طرف پیٹھ کرو''

اور اس میں ایک حکمت اور ہے: اور وہ یہ ہے کہ جب دل کا تعظیم الٰہی کی طرف متوجہ ہونا ایک پوشیدہ امر تھا، تو چارہ نہیں تھا توجہ کی جگہ میں کسی مظنۂ ظاہرہ کو قائم کرنے سے۔ اور سابقہ شریعتیں بناتی تھیں یہ مظنہ (احتمالی جگہ) اُن گرجوں میں نازل ہونے کو جو اللہ کے لئے بنائے گئے تھے، جو اللہ اور اس کے دین کے شعائر میں سے ہو گئے تھے۔ اور ہماری شریعت نے مظنہ بنایا ہے قبلہ کی طرف رخ کرنے کو اور تکبیر کو۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے استقبالِ قبلہ کو قائم مقام بنایا اللہ کی تعظیم کی طرف دل کے متوجہ ہونے کا اور یادِ الٰہی میں دل کو لگانے کا۔ اور اس قائم مقام بنانے کا سبب یہ بات تھی کہ یہ حالت یاد دلاتی ہے اللہ تعالیٰ کو: تو نبی ﷺ نے اس حکم سے یہ بات مستنبط کی کہ ضروری ہے استقبال کی حالت کو تعظیم کے ساتھ مختص کرنا۔ اور وہ اختصاص بایں طور ہو کہ اس کا استقبال نہ کیا جائے اُس ہیئت میں جو نماز کی ہیئت کے بالکل مبائن ہے۔

اور دیکھا گیا آپ کا رخ کرنا اور پیٹھ پھیرنا: پس جمع کیا گیا تحریم کو اتارنے کے ذریعہ جنگل پر، اور اباحت کو عمارت پر۔ اور جمع کیا گیا ممانعت کو اتارنے کے ذریعہ کراہیت پر۔ اور وہ زیادہ ظاہر ہے۔

اور ان میں سے: صفائی کے معنی کو ثابت کرنا ہے۔ پس وارد ہوئی ممانعت تین پتھروں سے کم سے استنجاء کرنے کی۔ یعنی تین مرتبہ پونچھنا، اس لئے کہ وہ (تین مرتبہ سے کم پونچھنا) عام طور پر صاف نہیں کرتا۔ اور (وارد ہوا) پتھر اور پانی کے درمیان جمع کرنے کا استحباب۔

اور ان میں سے: ان چیزوں سے بچنا ہے جو لوگوں کو ضرر پہنچاتی ہیں: جیسے لوگوں کے سایے میں اور ان کی راہ میں اور ان کی باتیں کرنے کی جگہ میں اور رُکے ہوئے پانی میں استنجاء کرنا۔ اور (بچنا ہے) ہڈی سے استنجاء کرنے سے۔ اس لئے کہ وہ جنات کی خوارک ہے۔ اور اسی طرح (بچنا ہے) اُن تمام چیزوں سے جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد کہ: ''بچو تم دو پھٹکارنے والی چیزوں سے'' اس نے سمجھایا ہے کہ حکمت بچنا ہے لوگوں کی پھٹکار سے اور ان کی ایذا رسانی سے۔ یا بچنا ہے ان چیزوں سے جو خود کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ جیسے سوراخ میں پیشاب کرنا۔ پس بیشک سوراخ کبھی ہوتا ہے کسی سانپ کا یا اس کے مانند کا ٹھکانہ، پس نکلے وہ اور ایذا پہنچائے۔

اور ان میں سے: اچھی عادات کو اختیار کرنا ہے۔ پس نہ پونچھے وہ اپنے دائیں ہاتھ سے۔ اور نہ پکڑے وہ اپنے پیشاب کے عضو کو دائیں ہاتھ سے اور نہ استنجاء کرے وہ لید گوبر سے اور طاق کرے وہ پتھر کے طلب کرنے کو۔

اور ان میں سے: پردے کا اہتمام کرنا ہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ دور چلا جائے۔ پس نہ سنی جائے اس کی آواز یا نہ سونگھی جائے اس کی بدبو یا نہ دیکھا جائے اس کا ستر۔ اور نہ اٹھائے وہ اپنے کپڑے کو تا آنکہ زمین سے قریب ہو جائے۔

اور پردہ کرے وہ کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ کے مانند سے، ان چیزوں سے جو چھپائے اس کے بدن کے نیچے کے حصہ کو۔ پس جو نہ پائے مگر یہ کہ جمع کرے وہ ریت کا کوئی تودہ (تو ایسا کرے) پس چاہئے کہ اس کی طرف پشت کرے۔ پس بیشک شیطان کھیلتا ہے انسانوں کی بیٹھنے کی جگہ سے۔ اور وہ بات اس لئے ہے کہ شیطان پیدا کیا گیا ہے فاسد سوچ پر اور بری حرکتوں پر۔

اور ان میں سے: اس بات سے بچنا ہے کہ اس کے بدن یا اس کے کپڑوں کو کچھ ناپاکی پہنچے۔ اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''جب تم میں سے کوئی پیشاب کرنے کا ارادہ کرے تو چاہئے کہ وہ اپنے پیشاب کرنے کے لئے کوئی نرم جگہ تلاش کرے''

اور ان میں سے: وسوسوں کو دور کرنا ہے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''پس ہرگز پیشاب نہ کرے تم میں سے کوئی اپنے نہانے کی جگہ میں، کیونکہ زیادہ تر وسوسے اس سے پیدا ہوتے ہیں''

لغات: الغائط: پست زمین، پائخانہ کرنے کی جگہ رُوِیَ مجہول ہے رأی کا لا تُلْقِی: أَلْقَی الشیئ: نَظَّفه: صاف کرنا مُتَحَدَّثُ القوم: قوم کی باتیں کرنے کی جگہ .. الحائِش: النَّخل الملتفُّ المجتمع (نہایہ) کھجوروں کا جھنڈ۔ ارتاد ارتیاذا الشیئ: طلب کرنا۔ مادہ: رَوْد اِنْتَحَمَ: پانی سے غسل کرنا مُنْتَحَمٌ: غسل خانہ۔

☆ ☆ ☆

کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی ممانعت کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کھڑے ہوکر پیشاب کرتے دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ: ''کھڑے ہوکر پیشاب مت کرو'' چنانچہ میں نے پھر کبھی کھڑے ہوکر پیشاب نہیں کیا (رواہ الترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ حدیث ۳۶۳)

تشریح کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کو تین وجوہ سے ناپسند کیا گیا ہے: (۱) اس سے بدن اور کپڑوں پر چھینٹیں پڑ سکتی ہیں (۲) یہ طریقہ متانت اور وقار کے خلاف ہے اور اچھی عادات کے منافی ہے (۳) اس میں ستر کھلنے کا اندیشہ ہے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " لاتَبُلْ قائما"

أقول: إنما كره البولَ قائما لأنه يُصيبُهُ الرَّشاشُ، ولأنه ينافي الوقار ومحاسن العادات، وهو مَظِنَّةُ انكشاف العورة.

ترجمہ.(۱) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''نہ پیشاب کرتو کھڑے ہوکر'' میں کہتا ہوں: آپؐ نے کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کو ناپسند کیا، اس لئے کہ شان یہ ہے کہ اس پر چھینٹیں پڑیں گی اور اس لئے کہ وہ متانت اور اچھی عادات کے منافی ہے۔ اور وہ ستر کھلنے کی احتمالی جگہ ہے۔

☆ ☆ ☆

بیت الخلاء میں جانے اور نکلنے کی دعائیں اور ان کی حکمت

حدیث ——— زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بیشک یہ بیت الخلا شیاطین کے اڈے ہیں پس جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء جائے تو چاہئے کہ کہے: پناہ چاہتا ہوں میں اللہ کی مذکر ومؤنث شیاطین سے'' (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ، مشکوۃ حدیث ۳۵۷)

حدیث ——— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تھے تو کہتے تھے: خدایا! معاف فرما! (مشکوۃ حدیث ۳۵۹)

تشریح: متفق علیہ روایت میں بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ: بیت الخلاء میں جانے کی دعا کے یہ الفاظ مروی ہیں: اللھم إنی أعوذ بك من الخبث والخبائث۔ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھنا مستحب ہے۔ کیونکہ پائخانہ میں شیاطین جمع رہتے ہیں۔ ان کو ناپاکی پسند ہے۔ اور وہ منتظر رہتے ہیں کہ کوئی آئے تو اس کو ستائیں۔ کیونکہ وہاں وہ ستر کھول کر بیٹھتا ہے اور اللہ کا ذکر نہیں کرسکتا۔

اور جب بیت الخلاء سے باہر آئے تو کہے: غفرانك: خدایا! آپ سے معافی طلب کرتا ہوں۔ معافی طلب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آدمی جب تک پائخانہ میں رہتا ہے، زبان سے اللہ کا ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہنا چاہئے۔ مگر مجبوری میں جو ذکر چھوٹتا ہے وہ بھی آدمی کی کوتاہی ہے۔ نیز بیت الخلاء میں شیاطین سے اختلاط ہوتا ہے۔ اور یہ بھی مؤمن کے حق میں بری بات ہے۔ مؤمن کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ سچوں کا ساتھی بنے (التوبہ آیت ۱۱۹) اور ظالموں کے ساتھ اور برے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھے (الانعام آیت ۶۸) پس ان دونوں وجہوں پر اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کی جاتی ہے۔

فائدہ ایک حدیث میں بیت الخلاء سے نکلنے کی یہ دعا بھی مروی ہے۔ الحمد لله الذی أذهب عنی الأذی وعافانی تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے تکلیف دہ چیز دور کی یعنی پیشاب پائخانہ اور مجھے عافیت (آرام) بخشا (مشکوۃ حدیث ۳۷۴) پس دونوں میں سے کوئی بھی دعا پڑھ سکتا ہے اور دونوں کو جمع بھی کرسکتا ہے۔

[۲] قولہ صلی اللہ علیہ وسلم: " إن الْحُشُوْشَ مُحْتَضَرَةٌ، فإذا أتى أحدكم الخلاء فليقل: أعوذ بالله من الخبث والخبائث، وكان إذاخرج من الخلاء ، قال: غُفْرانك"

أقول : يستحب أن يقول عند الدخول: اللّٰهم إني أعوذ بك من الخُبُثِ والخَبائِث، لأن الحشوش محتضرة، يحضرها الشياطين، لأنهم يُحبُّون النجاسةَ، وعند الخروج: غفرانك، لأنه وقتُ تركِ ذكر اللّٰه، ومخالطة الشياطين.

ترجمہ: (۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد الخ (ترجمہ گذر چکا۔ شاہ صاحب نے دو حدیثوں کو جمع کیا ہے)

میں کہتا ہوں: مستحب یہ ہے کہ بیت الخلاء میں جاتے وقت کہے: "الٰہی! میں مذکر و مؤنث شیاطین سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں" اس لئے کہ بیت الخلاء اڈّے ہیں۔ جمع ہوتے ہیں ان میں شیاطین۔ اس لئے کہ وہ پسند کرتے ہیں ناپاکی کو۔ اور جب باہر نکلے تو کہے: "خدایا! معاف فرمایا" اس لئے کہ وہ اللہ کا ذکر چھوڑنے کا اور شیاطین سے اختلاط کا وقت ہے۔

لغات: الحشّ (بتثلیث الاول) باغ، کھجور کا جھنڈ، پائخانہ، جمع حُشُوْش اِحْتَضَر: حاضر ہونا۔ مُحْتَضَر: حاضر ہونے کی جگہ۔ الخُبُث: جمع الخبیث کی: گندہ آدمی، مراد مذکر شیاطین۔ الخبائث: جمع خبیثة کی: گندی عورت، مراد مؤنث جن۔ غفرانك: مفعول مطلق ہے فعلِ محذوف کا أی أسئل غفرانك. غفران مصدر ہے بمعنی بخشش۔

☆ ☆ ☆

پیشاب سے نہ بچنا اور آپس میں بگاڑ پھیلانا عذابِ قبر کا سبب ہے

حدیث ـــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، قبروں کے پاس سے گذرے، پس فرمایا کہ: "یہ دونوں عذاب میں مبتلا ہیں۔ اور کسی بڑی بات کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا" (جس سے بچنا مشکل ہو) اور ایک روایت میں ہے کہ "کیوں نہیں! ان کو ایک سنگین بات کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے" یعنی آخرت کے وبال کے اعتبار سے وہ بات سنگین ہے۔ رہا ان میں سے ایک تو وہ پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔ اور رہا دوسرا تو وہ چغلیاں کھایا کرتا تھا۔ پھر آپؐ نے کھجور کی ایک تر شاخ لی۔ پس اس کو آدھوں آدھ چیرا۔ پھر ہر قبر پر ایک ایک گاڑی۔ صحابہ نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے یہ عمل کیوں کیا؟ آپؐ نے فرمایا: "شاید ان کے عذاب میں تخفیف ہو۔ جب تک یہ خشک نہ ہوں" (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۳۳۹)

تشریح: اس حدیث میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں

پہلی بات: پیشاب کرنے کے بعد استبراء (پاکی طلب کرنا) واجب ہے۔ اور استبراء کا طریقہ یہ ہے کہ پیشاب سے فارغ ہو کر ٹھہرا رہے، اور عضو کو جھاڑے۔ یہاں تک کہ ظن غالب ہو جائے کہ نالی میں پیشاب بالکل باقی نہیں رہا۔

فائدہ: غیر مقلدین کہتے ہیں کہ ڈھیلے سے پیشاب خشک کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ پس پیشاب کے بعد ڈھیلا نہیں لینا چاہئے۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں۔ جس کا مزاج قوی ہو، اور قطرہ نہ آنے کا یقین ہو، اس کو تو پانی کافی ہے۔ مگر جس کا مثانہ کمزور ہو اور اس کو دیر تک قطرہ آتا رہتا ہو، جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے، وہ اگر ڈھیلا نہیں لے گا تو ضرور اس کا کپڑا گندہ ہوگا، اور اس کی نماز باطل ہوگی۔

اور شاید یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لئے ثابت نہیں کہ آپ کا مزاج قوی تھا۔ آپ کو اس کی حاجت نہ تھی۔ مگر جب آپ نے طہارت کی تاکید کی ہے۔ اور پیشاب سے نہ بچنے پر وعید سنائی ہے تو طہارت حاصل کرنے کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈھیلا لینا ثابت ہے اور صحابی کا، خاص طور پر خلفائے راشدین کا، فعل حجت ہے۔ اور وہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ اور شاہ صاحب نے ازالۃ الخفا میں لکھا ہے کہ اس پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ (یہ پورا فائدہ مظاہر حق سے مستفاد ہے۔ دیکھئے ۱ ۱۳۵ طبع قدیم)

دوسری بات: نجاست کے ساتھ اختلاط اور آپس میں بگاڑ پیدا کرنے والے کام عذاب قبر کو واجب کرتے ہیں۔

فائدہ: اور کھجور کی ٹہنی چیر کر ہر قبر پر اس لئے گاڑی تھی کہ آپ نے ان قبر والوں کے لئے سفارش کی تھی۔ جو موقت طور پر عذاب میں تخفیف کی قبول ہوئی تھی۔ ہمیشہ کے لئے عذاب موقوف کرنے کی یا ہمیشہ کے لئے عذاب میں تخفیف کرنے کی قبول نہیں ہوئی تھی۔ مسلم شریف کے آخر میں باب حدیث جابر الطویل (۱۹ ۱۳۴ مصری) ہے۔ اس میں آپ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ "میں دو قبروں کے پاس سے گذرا، جن کو عذاب ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی سفارش سے پسند کیا کہ ان دونوں کے لئے عذاب میں تخفیف کی جائے جب تک ٹہنیاں تر رہیں" پس جب آپ نے خود ٹہنیاں گاڑنے کی وجہ بیان فرما دی ہے تو اب قبر پر گل پاشی کرنے والوں کی بیان کی ہوئی وجہ کے لئے کیا وجہ جواز باقی رہتا ہے؟!

رہی یہ بات کہ ان دونوں کے لئے آپ کی سفارش ہمیشہ کے لئے قبول کیوں نہیں ہوئی؟ تو اس کی وجہ شاہ صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ وہ دونوں کافر تھے۔ مگر یہ وجہ قابل غور ہے۔ کیونکہ کافر کے لئے استغفار کی قرآن کریم میں مطلقاً ممانعت آئی ہے (التوبہ آیت ۱۱۳) اور شفاعت اور استغفار کی حقیقت ایک ہے۔ (تفصیل کے لئے معارف الحدیث ۱: ۲۵-۳۰ دیکھیں)

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: " أما أحدُهما فكان لايستبرئ من البول" الحديث.
أقول: فيه: إن الاستبراء واجب، وهو أن يمكُث وينثُر حتى يظُنّ أنه لم يبق في قصَبة

الذكر شيئ من البول وفيه: إن مخالطة النجاسة، والعمل الذى يؤدى إلى فساد ذات البين يوجب عذاب القبر.

أما شقُّ الجريدة والغرز فى كل قبر، فسِرُّهُ: الشفاعة المقيدة، إذ لم تمكن المطلقة لكفرهما.

ترجمہ: (۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''رہا اُن میں سے ایک تو وہ پیشاب سے پاکی حاصل نہیں کیا کرتا تھا'' حدیث پوری پڑھیں۔ میں کہتا ہوں: اس حدیث میں یہ حکم ہے کہ استبراء واجب ہے۔ اور استبراء یہ ہے کہ پیشاب کے بعد ٹھہرے اور جھاڑے تا آنکہ گمان کرے کہ نہیں باقی رہا نالی میں پیشاب میں سے کچھ۔ اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ نجاست سے اختلاط اور وہ کام کرنا جو پہنچاتا ہے آپس کے بگاڑ تک واجب کرتا ہے قبر کے عذاب کو۔

رہا کھجور کی ٹہنی کو چیرنا اور ہر قبر میں گاڑنا: تو اس کا راز شفاعتِ مقیدہ ہے، جبکہ ممکن نہ تھی شفاعتِ مطلقہ (کاملہ دائمہ) ان دونوں کے کفر کی وجہ سے۔

☆ ☆ ☆

باب ــــــ ۱۲

فطرت کی باتیں اور ان سے لگتی چیزیں

حدیث ــــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دس باتیں امور فطرت میں سے ہیں: (۱) مونچھ تراشنا (۲) ڈاڑھی بڑھانا (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی لے کر صفائی کرنا (۵) ناخن تراشنا (۶) انگلیوں کے جوڑوں کو دھونا (۷) بغل کے بال نوچنا (۸) زیر ناف مونڈنا (۹) پانی گھٹانا یعنی استنجاء کرنا۔ راوی کہتے ہیں: دسویں بات میں بھول گیا۔ اور میرا گمان ہے کہ وہ کلی کرنا ہے (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۳۷۹ باب السواک)

فطرت کی باتیں باب طہارت سے ہیں اور ملت ابراہیمی کا شعار ہیں:

مذکورہ دس باتیں طہارت ونظافت کے باب سے ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں۔ اور ابراہیمی طریقے پر چلنے والی حنفی امتوں میں عام طور پر ان باتوں کا رواج رہا ہے۔ یہ باتیں ان کے دلوں میں پیوست ہو چکی ہیں۔ اور ان کے خالص عقیدہ کا جزء لاینفک بن چکی ہیں۔ وہ قرنہا قرن سے یہ اعلان کرتے ہوئے جیتے اور مرتے رہے

ہیں۔اسی لئے ان باتوں کوفطرت یعنی کھٹی میں پڑی ہوئی باتیں کہا گیا ہے۔

اور مذکورہ باتیں ملتِ ابراہیمی کے شعائر (امتیازی علامتیں) ہیں۔اور شعائر ہر ملت کے لئے ضروری ہیں، جن کے ذریعہ ان کی شناخت ہو، اور جن میں کوتاہی کرنے پر ان کی دراوگیر کی جائے۔تا کہ لوگوں کی فرمانبرداری اور نافرمانی ایک امر محسوس بن جائے۔

شعار کیسی بات ہونی چاہئے؟

اور شعائر ایسی باتیں ہونی چاہئیں جو بکثرت پائی جاتی ہوں، جو نادر الوقوع نہ ہوں، اور واضح چیزیں ہوں۔اور ان میں بہت زیادہ فوائد ہوں۔اور جن کو لوگوں کے اذہان پوری طرح قبول کرلیں۔مذکورہ دس چیزیں ایسی ہی ہیں۔اس لئے وہ شعائر قرار پائی ہیں۔

امورِ فطرت کے سلسلہ میں جامع گفتگو:

امورِ فطرت کے بارے میں چند جامع اور مختصر باتیں درج ذیل ہیں:

پہلی بات: جسم میں کچھ بال ایسے اُگتے ہیں جو حدث (نجاستِ حکمی) کا کام کرتے ہیں یعنی ان سے دل منقبض ہوتا ہے۔اور سرور کافور ہو جاتا ہے۔یہ مونچھ، بغل اور زیر ناف کے بال ہیں۔ناخن بڑھنے کا بھی یہی حال ہے۔اسی طرح سر اور ڈاڑھی کا پراگندہ ہونا بھی طبیعت کی کبیدگی کا باعث ہوتا ہے۔اس لئے اُن کا کاٹنا اور ان کا سنوارنا مامور بہ ہوا۔ اطباء نے جلدی امراض چیچک اُچھلنے اور خارش وغیرہ کے بیان میں یہ بات لکھی ہے کہ ان سے دل مغموم ہوتا ہے اور نشاط ختم ہوتا ہے۔یہ بیماریاں بھی وہ ہیں جن کے آثار جسم پر نمودار ہوتے ہیں اور حدث کا کام کرتے ہیں۔اسی طرح کھال پر نمودار ہونے والے مذکورہ بال وغیرہ بھی حدث کا کام کرتے ہیں۔پس ان کا ازالہ باب طہارت سے ہے۔

سوال: جب ان بالوں وغیرہ کی صورت حال یہ ہے تو آخر یہ بال وغیرہ جسم میں پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں؟ یا بڑھتے کیوں ہیں؟

جواب: اس میں بہت حکمتیں ہیں۔مثلاً انگلیوں کے سروں پر ناخن پیدا کئے ہیں، تا کہ انگلیوں کے پورے سخت ہوں اور انسان ان سے کام لے۔اور انگلیوں پر حادثے بھی آتے رہتے ہیں۔پس زخم تو مندمل ہو جائیں گے مگر ناخن کیسے درست ہوں گے، وہ تو ایک ہڈی ہیں۔اس لئے قدرت نے ان میں بڑھوتری کی شان رکھی ہے۔خراب ناخن بڑھ جاتا ہے اور نیا ناخن نکل آتا ہے، جو ماؤف ناخن کا قائم مقام بن جاتا ہے۔پس مردہ ناخن کو کاٹ ڈالنا ضروری ہے ـــــ بغل اور زیر ناف کے بال تعفن کو دور کرتے ہیں۔ان کے نکلنے اور بڑھنے سے مسامات کھلتے ہیں اور عفونت زائل ہوتی ہے۔اس لئے بغل کا نوچنا مستحب ہے تا کہ مسامات خوب کھل جائیں اور فاسد مادہ جو بالوں کی جڑوں میں ہے وہ

بھی نکل جائے۔اور زیر ناف کا مونڈنا قوت باہ کو بڑھاتا ہے ـــــ اور مونچھوں کے بال اس لئے بڑھتے ہیں تا کہ لوگ اپنی پسند کی مونچھیں تراش لیں۔لوگوں کا مزاج مونچھوں کے بارے میں مختلف واقع ہوا ہے: کسی کو کیسی پسند ہیں اور کسی کو کیسی۔مگر مونچھوں کو بے اندازہ بڑھانا طہارت کے منافی ہے۔

دوسری بات: ڈاڑھی بڑھانے کا حکم چند حکمتوں سے دیا ہے (۱) ڈاڑھی سے بالغ اور نابالغ میں امتیاز ہوتا ہے (۲) ڈاڑھی مَردوں کا جمال ہے، بغیر ڈاڑھی کے آدمی بیجوا معلوم ہوتا ہے (۳) ڈاڑھی ہی سے مردانہ ہیئت کی تکمیل ہوتی ہے، اس لئے اس کا بڑھانا ضروری ہے (۴) ڈاڑھی مونڈنا مجوسیوں کا طریقہ تھا اور اب تو تمام غیر مسلموں کا طریقہ ہے۔ پس ڈاڑھی رکھنے سے ان سے مشابہت ختم ہوتی ہے (۵) ڈاڑھی مونڈنا اللہ کی بناوٹ کو بدلنا ہے جو اغوائے شیطانی کا نتیجہ ہے۔شیطان نے کہا تھا کہ ''میں ان کو تعلیم دونگا جس سے وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے'' (النساء ۱۱۹) (۶) اور سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مداروں اور بڑے لوگوں میں اور بازاری قسم کے لوگوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔سب ایک ہی تھیلے کے لٹو ہو کر رہ جاتے ہیں۔

تیسری بات: جس کی مونچھیں بڑھی ہوئی ہوتی ہے، وہ کھانے پینے کی چیزوں سے آلودہ ہوتی ہیں، نیز ان میں میل کچیل بھی اکٹھا ہوتا ہے، پس یہ بھی طہارت کے منافی ہے۔اور مونچھیں بڑھانا مجوسیوں کا طریقہ تھا۔ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے بھی مونچھیں تراشنا ضروری ہے۔اور مشابہت سے بچنے کا حکم درج ذیل حدیث سے ثابت ہے

حدیث ـــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مشرکین کی مخالفت کرو یعنی انکی مشابہت سے بچو، ان کے چہرے جیسا اپنا چہرہ مت بناؤ۔ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں پست کرو'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۴۲۱)

فائدہ عرب کے مشرکین سکھوں اور سادھوؤں کی طرح ڈاڑھی اور مونچھ دونوں بڑھاتے تھے۔اس لئے ان سے امتیاز پیدا کرنے کے لئے مذکورہ حکم دیا گیا ہے اور یہ حکم مونچھیں تراشنے کے حکم کے ساتھ مل کر ایک حکم ہے۔اور مونچھیں کاٹنا باب طہارت سے۔پس ڈاڑھی بڑھانے کے لئے بھی یہی بات کافی ہے۔

چوتھی بات: کلی کرنا، ناک صاف کرنا اور مسواک کرنا باب طہارت سے اس طرح ہے کہ ان سے ریحٹ اور کندہ دہنی کا ازالہ ہوتا ہے۔

پانچویں بات: قلفہ کی کھال (وہ چمڑی جو ختنہ میں کاٹی جاتی ہے) ایک زائد (بے ضرورت) عضو ہے۔اس میں میل کچیل اکٹھا ہوتا ہے۔اس کی موجودگی میں صفائی بھی اچھی طرح نہیں ہوسکتی۔کچھ پیشاب اندر رہ جانے کا احتمال رہتا ہے۔اور ختنہ نہ کرانے سے مرد اور عورت دونوں کی جماع کی لذت بھی کم ہو جاتی ہے۔اور انسانی جسم بھی بدنما معلوم ہوتا

ہے اس لئے ختنہ کرا کر اس کھال کا دور کرنا ضروری ٹھہرا۔

اور تورات میں ہے کہ ختنہ کرانا حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد پر اللہ تعالیٰ کی خاص نشانی ہے یعنی جس طرح بادشاہ اپنے مخصوص جانوروں پر نشان لگاتے ہیں تا کہ وہ ممتاز ہو جائیں۔ اور ان غلاموں پر نشان لگاتے ہیں جن کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا منظور ہوتا ہے۔ بیچنے یا آزاد کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ختنہ کرانا ملت ابراہیمی کی پیروی کرنے والوں کی امتیازی علامت ہے۔

پھر ختنہ ایک ایسا شعار ہے جس میں تبدیلی مشکل ہی سے ہو سکتی ہے اور دیگر شعائر میں تبدیلی اور دھوکہ دہی بہت آسان ہے۔ غیر مسلم بھی مسلمانوں جیسی ڈاڑھی رکھ لیتے ہیں۔ اور دھوکہ دیتے ہیں۔

نوٹ: ختنہ کا ذکر اس حدیث میں نہیں ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے جو آگے آرہی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ذہن اس کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

چھٹی بات: پانی گھٹانے سے مراد پانی سے استنجاء کرنا ہے۔

فائدہ: انتقاص کے معنی ہیں گھٹانا اور الماء سے مراد پیشاب ہے۔ اور اس کو گھٹانے کے لئے پانی سے استنجاء کرنا ضروری نہیں۔ ڈھیلے یا ٹھہرنے اور جھاڑنے کے ذریعہ بھی یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تعبیر سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ الماء سے مراد استنجاء کا پانی ہے حالانکہ الماء سے مراد پیشاب ہے۔ اس لئے مناسب یہ تھا کہ شاہ صاحب یوں فرماتے کہ پانی گھٹانے سے مراد استبراء ہے۔

﴿ خِصال الفطرة وما يتّصِل بها ﴾

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: " عَشْرٌ من الفطرة: قَصُّ الشارب، وإعْفاءُ اللِّحْيَةِ، والسِّواك، والاستنشاقُ بالماء، وقص الأظفار، وغسْلُ البَراجِم، ونَتْفُ الإبِط، وحلق العانة، وانتقاص الماء يعني الاستنجاء، قال الراوی: ونسيتُ العاشرة، إلا أن تكون المضمضةُ"

أقول: هذه الطهاراتُ منقولةٌ عن إبراهيم عليه السلام، متداولةٌ فی طوائف الأمم الحنيفية، أُشْرِبَتْ فی قلوبهم، ودخلتْ فی صَمِيْمِ اعتقادِهم، عليها مَحْياهم، وعليها مَماتهم، عصرًا بعد عصر، ولذلك سميت بالفطرة.

وهذه شعائرُ الملة الحنيفية، ولابدلكل ملةٍ من شعائر، يُعرفون بها، ويؤاخَذون عليها، ليكون طاعتُها وعصيانُها أمرًا محسوسًا.

وإنما ينبغی أن يُجعل من الشعائر: ما كثُر وجودُه، وتكرر وقوعُه، وكان ظاهرًا، وفيه فوائدُ

جَمَّةً، تقبله أذهانُ الناس أشدَّ قبولٍ.

والجملة فى ذلك:

[١] أن بعض الشُّعور النابتة من جسد الإنسان يفعل فعلَ الأحداث فى قبض الخاطر، وكذا شَعْثُ الرأس واللحية، ولْيَرْجع الإنسانُ فى ذلك إلى ما ذكره الأطباءُ فى الشَّرى والحكَّة وغيرهما من الأمراض الجِلْدِيَّة: أنها تُحْزِنُ القلبَ، وتُذْهِبُ النَّشاطَ.

[٢] واللِّحية هى الفارقةُ بين الصغير والكبير، وهى جمال الفحول، وتمامُ هيأتهم، فلا بد من إعفائها، وقَصُّها سنةُ المجوس، وفيه تغييرُ خَلْقِ اللّٰهِ، ولحوقٌ أهل السؤدد والكبرياء بالرُّعَاعِ.

[٣] ومن طالت شواربُه تعلّق الطعام والشرابُ بها، واجتمع فيها الأوساخُ، وهو من سنة المجوس، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم:" خالِفُوا المشركين: قُصُّوا الشوارب، واعْفوا اللُّحى"

[٤] وفى المضمضة والاستنشاق والسواك إزالةُ المُخاط،والبَخَر.

[٥] والغُرْلَةُ عضو زائد، يجتمع فيها الوسخ، ويمنع الاستبراءَ من البول، وينْقص لذّة الجماع.

وفى التوراة: إن الختانَ مِيسَمُ اللّٰه على إبراهيم وذريته، معناه: أن الملوك جَرَتْ عادتُهم بأن يَسِمُوا ما يَخُصُّهم من الدواب، لتتميز عن غيرها، والعبيدَ الذين لايريدون إعتاقَهم، فكذلك جُعل الختانُ مِيسَمًا عليهم.

وسائرُ الشعائر يمكن أن يدخلها تغيير وتدليسٌ، والختانُ لايتطَرَّقُ إليه تغييرٌ إلا بجُهْدٍ.

[٦] وانتقاص الماء كناية عن الاستنجاء به.

ترجمہ: فطرت کی باتیں اور وہ امور جو ان کے ساتھ جڑتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دس باتیں (ترجمہ اوپر گذر چکا) میں کہتا ہوں: پاکیاں ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں۔ حنفی امتوں کے گرہوں میں رائج ہیں۔ وہ ان کے دلوں میں پلا دی گئی ہیں۔ اور ان کے خالص عقیدے میں داخل ہوگئی ہیں۔ اُن پر اُن کا جینا اور ان کا مرنا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ ''فطرت'' کہلاتی ہیں —— اور یہ ملت ابراہیمی کے شعائر ہیں۔ اور ہر ملت کے لئے ایسے شعائر ضروری ہیں جن کے ذریعہ وہ پہچانے جائیں۔ اور جن پر اُن سے مؤاخذہ کیا جائے۔ تاکہ اس ملت کی فرمان برداری اور نافرمانی ایک محسوس چیز بن جائے —— اور مناسب یہ ہے کہ شعائر وہی باتیں بنائی جائیں جن کا پایا جانا زیادہ ہو۔ اور جن کا وقوع بار بار ہوتا ہو۔ اور جو واضح چیز ہو۔ اور اس میں ڈھیر سے فائدے ہوں۔ جس کو لوگوں کے ذہن پوری طرح قبول کرلیں۔

اوران کے بارے میں مختصراور جامع بات:

(۱) یہ ہے کہ کچھ بال جوانسان کے جسم میں اُگنے والے ہیں، وہ حدثوں کا کام کرتے ہیں، دل کے منقبض کرنے میں۔ اوراسی طرح سراور ڈاڑھی کا پراگندہ ہونا۔ اور چاہئے کہ لوٹے انسان اس سلسلہ میں اس بات کی طرف جواطباء نے ذکر کی ہے پتّی اُچھلنے کی بیماری میں اور خارش میں اوران دونوں کے علاوہ میں جلدی امراض میں سے کہ وہ دل کو مغموم کرتے ہیں اور نشاط کوختم کرتے ہیں۔ (۲) اور ڈاڑھی ہی جدائی کرنے والی ہے چھوٹے اور بڑے کے درمیان۔ اور وہ مَردوں کا جمال ہے۔ اور وہ مَردانہ ہیئت کی تکمیل کرتی ہے۔ پس ضروری ہے اس کا بڑھانا۔ اوراس کا تراشنا مجوسیوں کا طریقہ ہے۔ اوراس میں اللہ کی بناوٹ کو بدلنا ہے۔ اور سرداروں اور بڑے لوگوں کا رذیلوں کے ساتھ ملنا ہے۔ (۳) اور وہ شخص جس کی مونچھیں لمبی ہوجاتی ہیں۔ ان کے ساتھ کھانا اور پینا لگتا ہے۔ اوران میں میل کچیل اکٹھا ہوتا ہے۔ اور وہ مجوسیوں کے طریقے میں سے ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''مشرکین کی مخالفت کرو: مونچھیں تراشو اور ڈاڑھی بڑھاؤ'' (۴) اور کلّی کرنے میں اور ناک صاف کرنے میں اور مسواک کرنے میں رینٹ اور گندہ دہنی کا ازالہ ہے۔ (۵) اور قُلفہ (وہ چمڑی جو ختنہ میں کاٹی جاتی ہے) ایک زائد عضو ہے۔ اس میں میل اکٹھا ہوتا ہے۔ اور وہ پیشاب کی صفائی کو روکتی ہے۔ اور جماع کی لذت کو کم کرتی ہے ——— اور تورات میں ہے کہ: ''ختنہ کرنا ابراہیم اوران کی اولاد پر اللہ تعالیٰ کی خاص نشانی ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہوں کی عادت جاری ہے کہ وہ نشانی لگاتے ہیں اُن جانوروں پر جوان کے مخصوص ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کے علاوہ سے ممتاز ہوجائیں۔ اور (نشان لگاتے ہیں) اُن غلاموں پر جن کو آزاد کرنا منظور نہیں ہوتا۔ پس اسی طرح ختنہ کرنا اولاد ابراہیم پر نشانی بنایا گیا ہے ——— اور دیگر شعائر: ممکن ہے کہ ان میں کچھ تبدیلی اور دھوکہ دہی داخل ہو۔ اور ختنہ کرنا: اس میں تبدیلی راہ نہیں بناتی ہے مگر انتہائی کوشش سے۔ (۶) اور پانی کا گھٹانا کنایہ ہے پانی سے استنجاء کرنے سے۔

لغات. البُرْجمة: انگلیوں کے جوڑ اوران کی پشت۔ جمع بَراجِم الشَّرىٰ بروزن عَلىٰ: پتّی اچھلنے کی بیماری۔ پت کے فساد کا بدن پر ظاہر ہونا۔ صفراء کے بگاڑ کا جسم پر نمایاں ہونا الرُّعاع: کمینے اور رذیل لوگ۔ مفرد: رُعاعة..... مِیْسَم: نشان۔ داغ۔ جمع میاسم۔

☆ ☆ ☆

چار اور سنتیں جو بابِ طہارت سے ہیں

حدیث ——— حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''چار باتیں رسولوں (بڑے نبیوں) کی سنتوں میں سے ہیں: حیا ——— اور ایک روایت میں حیا کی جگہ ختنہ کرانے کا تذکرہ ہے

—— اور خوشبو لگانا اور مسواک کرنا اور شادی کرنا'' (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ حدیث ۳۸۲)

تشریح: شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ چاروں باتیں بھی باب طہارت سے ہیں.

حیا: تو بے شرمی، فحش گوئی اور برے کاموں کو چھوڑنے کا نام ہے۔ اور یہ سب گندگیاں ہیں، جن سے نفس ملوث اور طبیعت مکدر ہوتی ہے، پس ان کی ضد طہارت ہے۔ اور خوشبو لگانا: ایک فرحت بخش عمل ہے۔ اُس سے نفس کو سرور اور قلب کو انشراح حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی طہارت کی حقیقت ہے۔ نیز وہ پاکی کی صفت سے بھی خوب آگاہ کرتا ہے۔ جب کسی کے کپڑے گندے اور بدن میلا ہوتا ہے اور کوئی عطر پیش کرتا ہے تو آدمی کہتا ہے. کپڑے چرکیں ہیں، بدن میلا ہے، کیا عطر لگاؤں؟! معلوم ہوا کہ خوشبو سامنے آتے ہی صفتِ طہارت یاد آتی ہے۔ اور نکاح: باطن کو پاک صاف کرتا ہے۔ نفس میں جو عورتوں کی طرف اشتیاق ہوتا ہے، اور جماع کے سلسلہ میں جو خیالات دماغ میں گھومتے رہتے ہیں، نکاح سے ان کا علاج ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ بھی باب طہارت سے ہے اور ختنہ اور مسواک کا باب طہارت سے ہونا ابھی اوپر گذر چکا ہے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " أربع من سنن المرسلين: الحياءُ —— ويُروى الختانُ —— والتعطُّر، والسواكُ، والنكاحُ"

أقول: أُرى أن هذه كلها من الطهارة. فالحياءُ ترك الوقاحة والبذاء والفواحش، وهي تُلَوِّثُ النفسَ وتُكدِّرُها؛ والتعطُّرُ يُهَيِّجُ سرور النفس وانشراحها، وينبّهُ على الطهارة تنبيها قويا، والنكاحُ يُطهِّر الباطن من التَوْقان إلى النساء، ودوران أحاديث تميل إلى قضاء هذه الشهوة.

ترجمہ: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: '' چار چیزیں '' —— میں کہتا ہوں: میرا گمان یہ ہے کہ یہ سب چیزیں طہارت کے قبیل سے ہیں۔ پس حیا: بے شرمی اور فحش گوئی اور برے کاموں کو چھوڑنا ہے۔ اور یہ امور نفس کو ملوث اور اس کو مکدر کرتے ہیں۔ اور خوشبو لگانا: نفس کے سرور کو اور اس کے انشراح کو ابھارتا ہے۔ اور پاکی سے چوکنا کرتا ہے، خوب اچھی طرح سے چوکنا کرنا۔ اور نکاح: باطن کو پاک کرتا ہے عورتوں کے اشتیاق سے اور ایسی باتوں کے دماغ میں گھومنے سے جو اس (جماع) کی خواہش کو پورا کرنے کی طرف مائل ہیں۔

لغات: أُرىٰ (معروف) آنکھ سے دیکھنا۔ أُرىٰ (مجہول) دماغ سے دیکھنا یعنی خیال کرنا التوقان: باب نصر کا مصدر ہے تاق إليه: شائق ہونا۔

☆ ☆ ☆

مسواک کو تنگی کے خیال سے ضروری قرار نہیں دیا

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میری امت کے لئے دشواری نہ ہوتی تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۳۷۶)

تشریح: حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اگر تنگی کا اندیشہ نہ ہوتا تو وضوء کی طرح مسواک کو بھی نماز کے لئے شرط ٹھہرایا جاتا۔ کیونکہ بطور استحباب تو مسواک مأمور بہ ہے۔ حدیث میں جو انداز بیان ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ اس انداز پر اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ مثلاً: لولا ان أشُقَّ علی امتی لأمرتهم بتأخیر العشاء اس میں عشاء کی تاخیر کے ضروری ہونے کی نفی ہے۔ بطور استحباب تو تاخیر مامور بہ ہے۔

اس حدیث سے اور اس انداز کی دوسری حدیثوں سے تین باتیں اور بھی صراحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہیں:

پہلی بات: احکاماتِ شرعیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کا کچھ دخل ہے یعنی بعض احکام آپؐ اجتہاد سے دیتے ہیں۔ اور نبی کا اجتہاد وحی ہوتا ہے، بایں طور کہ اگر نبی سے اجتہاد میں چوک ہو جاتی ہے تو وحی سے اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ اور یہ بات اس حدیث سے اس طرح معلوم ہوئی کہ مسواک کا ضروری ہونا اگر حکم الٰہی ہوتا تو آپؐ اس کو روک نہیں سکتے تھے۔

دوسری بات: احکاماتِ شرعیہ کے پیچھے مقاصد و مصالح کارفرما ہیں۔ احکام بس یونہی الل ٹپ نہیں دیئے گئے۔ اور یہ بات اس طرح ثابت ہوئی کہ مسواک کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے مگر وہ حق اللہ ہے اور امت کی تنگی حق العبد ہے۔ اور بوقت تعارض حق العبد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لئے مسواک کو نماز کے لئے شرط نہیں ٹھہرایا۔

تیسری بات: اس حدیث سے یہ ثابت ہوئی کہ تیسیر یعنی دین میں آسانی کرنا اور تنگی کو رفع کرنا ایک اصولِ شرعی ہے جس کا احکام شرعیہ میں لحاظ رکھا گیا ہے۔

> [۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " لولا أن أشُقَّ على أمتي لأمرتُهم بالسواك عند كل صلاةٍ"
> أقول: معناه: لولا خوفُ الحرج لجعلتُ السواكَ شرطاً للصلاة، كالوضوء؛ وقدورد بهذا الأسلوب أحاديثُ كثيرةٌ جدا، وهي دلائلُ واضِحةٌ على أن لاجتهاد النبي صلى الله عليه وسلم مَدْخَلاً في الحدود الشرعية، وأنها مَنُوْطَةٌ بالمقاصد، وأن رفعَ الحرج من الأصول التي بُني عليها الشرائع.

ترجمہ: (۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''اگر میری امت پر دشواری نہ ہوتی تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا'' میں کہتا ہوں: اس کا مطلب: اگر تنگی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں مسواک کو نماز کے لئے، وضوء کی طرح،

شرط قرار دیتا۔ اور تحقیق آئی ہیں اس انداز پر بہت ہی زیادہ حدیثیں۔ اور وہ واضح دلیلیں ہیں اس بات کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کے لئے کچھ دخل ہے احکاماتِ شرعیہ میں۔ اور اس بات کی کہ احکاماتِ شرعیہ معلّق ہیں مقاصد (مصالح) کے ساتھ۔ اور اس بات کی کہ تنگی کو دور کرنا اُن اصولوں میں سے ہے جن پر احکام کا مدار رکھا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

منہ کے آخری حصہ تک کرنے مسواک کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا۔ آپؐ مسواک فرما رہے تھے۔ مسواک آپؐ کے ہاتھ میں تھی اور کہہ رہے تھے: ''اُع اُع'' درانحالیکہ مسواک آپؐ کے منہ میں تھی۔ گویا آپ قئے کر رہے ہیں'' (رواہ البخاری وغیرہ جامع الاصول ۸:۹۴)

تشریح: مناسب یہ ہے کہ مسواک منہ کے آخری حصہ تک کرے، تاکہ گلے اور سینے کا بلغم نکل جائے۔ اور منہ میں خوب اندر تک مسواک کرنے سے منہ میں اور زبان پر جو پھنسیاں ہوتی ہیں وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ اور آواز صاف اور منہ خوشبودار ہوتا ہے۔

[۳] قولُ الراوی فی صفةِ تَسَوُّکِهِ صلی اللہ علیه وسلم: "یقول: أُعْ أُعْ، کأنه یَتَهَوَّعُ"
أقول: ینبغی للإنسان أن یبلُغ بالسواك أقاصِیَ الفم، فَیُخرِجُ بلاغِمَ الحلق والصدر.
والاستقصاءُ فی السواك یُذْهِبُ بالقُلاَعِ، ویصفِّی الصوتَ، ویطیِّبُ النکهة.

ترجمہ: (۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مسواک کرنے کی کیفیت میں راوی کا کہنا کہ: ''آپؐ کہہ رہے تھے اُع اُع گویا آپؐ قئے کر رہے ہیں'' میں کہتا ہوں: انسان کے لئے مناسب یہ ہے کہ پہنچائے وہ مسواک کو منہ کے آخری حصہ تک۔ پس نکالے وہ گلے اور سینے کے بلغم کو۔ اور خوب اندر تک مسواک کرنا مرضِ قُلاع (پھنسیاں جو منہ یا زبان پر ہوں) کو ختم کرتا ہے۔ اور آواز کو صاف کرتا ہے۔ اور منہ کو خوشبودار کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆

ہفتہ میں ایک بار نہانے دھونے کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ثابت ولازم ہے ہر مسلمان پر کہ نہائے وہ ہر ہفتہ میں ایک دن یعنی جمعہ کے دن۔ دھوئے وہ اس میں اپنا سر اور اپنا بدن (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۳۹ باب الغسل المسنون)

تشریح: ہفتہ میں ایک مرتبہ نہانا ایک مستقل سنت ہے۔ پس جس پر جمعہ نہیں ہے اس کو بھی نہانا چاہئے۔ اور اس سنت کا مقصد میل کچیل کو دور کرنا اور نفس کو صفتِ طہارت پر چوکنا کرنا ہے۔ اور حدیثوں میں جو جمعہ کے دن کی اور نماز جمعہ کی تخصیص آئی ہے، وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ نماز جمعہ اور غسل میں سے ہر ایک کی دوسری سے تکمیل ہوتی ہے۔ نماز جمعہ کی وجہ سے اس دن نہانے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور نہا کر جمعہ ادا کرنے سے نماز جمعہ کو مزیت حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس تعیین میں نماز جمعہ کی تعظیم بھی پیش نظر ہے۔

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " حقٌّ على كل مسلم أن يغتسل في كل سبعة أيام يومًا، يَغْسِلُ فيه جسَده ورأسَه"

أقول: هذا يدل على أن الاغتسال في كل سبعة أيام سنةٌ مستقلة، شُرعتْ لدفع الأوساخ والأدران، وتنبيهِ النفس لصفة الطهارة. وإنما وُقِّت لصلاة الجمُعة: لأن كل واحد منهما يُكَمِّلُ بالآخر، وفيه تعظيم صلاة الجمعة.

ترجمہ: (۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "ہر مسلمان پر لازم ہے کہ نہائے وہ ہر سات دنوں میں ایک دن: دھوئے وہ اس میں اپنا بدن اور اپنا سر" میں کہتا ہوں: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر ہفتہ نہانا ایک مستقل سنت ہے (کیونکہ اس حدیث میں جمعہ کے دن کی یا جمعہ کی نماز کی تخصیص نہیں کی گئی) مشروع کی گئی ہے یہ سنت میل کچیل دور کرنے کے لئے اور نفس کو صفتِ طہارت پر چوکنا کرنے کے لئے (یعنی نہانا اُسے یاد رہے، اس کو بھول نہ جائے) اور جمعہ کی نماز کے لئے اس کی تعیین (دیگر روایات میں) اس لئے کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک مکمل ہوتا ہے دوسرے کے ذریعہ۔ اور اس تعیین میں نماز جمعہ کی تعظیم ہے۔

☆ ☆ ☆

پچھنے لگوانے سے اور میت کو نہلانے سے غسل کرنے کی حکمت

حدیث ——— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چار چیزوں کی وجہ سے نہایا کرتے تھے: جنابت کی وجہ سے اور جمعہ کے دن اور پچھنے لگوانے کی وجہ سے اور میت کو نہلانے کی وجہ سے" (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ حدیث ۵۴۲)[1]

تشریح: پچھنے لگوانے کے بعد نہانے کی دو وجہیں ہیں:

[1] یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی مصعب بن شیبہ ہے جو جمہور کے نزدیک ضعیف ہے اور مرقات میں میرک شاہ کا قول نقل کیا ہے کہ آپؐ کے بارے میں یہ بات منقول نہیں ہے کہ آپؐ نے کبھی کسی میت کو نہلایا ہو ۱۲

پہلی وجہ: سینگی لگوانے سے بارہا خون جسم پر پھیل جاتا ہے۔اور ہر ہر چھینٹ کا علحدہ علحدہ دھونا دشوار ہوتا ہے۔ پس اگر نہالیا جائے تو سارا جسم پاک ہوجائے گا۔

دوسری وجہ: جب سینگی کے ذریعہ خون چوسا جاتا ہے تو جسم کے ہر حصہ سے خون کھینچا چلا آتا ہے۔اور جب عمل پورا ہوجاتا ہے تو اس جگہ سے تو خون نکلنا بند ہوجاتا ہے جہاں سینگی لگائی گئی تھی۔مگر اندر اندر خون کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔اس لئے ایک عضو سے خون کا بند ہونا مفید نہیں اور نہالیا جائے تو خون کا انجذاب رک جائے گا۔اور زخم سے دوبارہ خون بہنے کا اندیشہ ختم ہوجائے گا۔جیسے مذی نکلنے کے بعد مذاکیر کو دھولیا جائے تو مذی کی آمد کا سلسلہ رک جاتا ہے اور مدی کا جانور دودھ والا ہو تو اس کے تھن پر ٹھنڈا پانی چھڑکنے سے دودھ کی آمد کا سلسلہ موقوف ہوجاتا ہے۔

اسی طرح میت کو نہلانے کے بعد نہانے کی بھی دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: میت کو نہلاتے وقت بدن پر چھینٹیں پڑتی ہیں۔اور وہ ناپاک ہوسکتی ہیں۔اور کہاں کہاں پڑی ہیں اس کا اندازہ نہیں۔اس لئے نہلانے والا نہالے تو جسم پاک ہوجائے گا۔

دوسری حکمت: جو لوگ میت کو نہلانے کے عادی نہیں ہوتے، وہ کسی میت کو نہلاتے ہیں تو ان پر خوف اور گھبراہٹ طاری ہوتی ہے۔نہالینے سے یہ حالت بدل جاتی ہے اور وساوس منقطع ہوجاتے ہیں۔اس سلسلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنا ایک مشاہدہ بیان کیا ہے کہ آپ ایک بار ایک ایسے شخص کے پاس بیٹھے جو سکرات میں مبتلا تھا۔آپ نے دیکھا کہ جو فرشتے روحوں کو قبض کرنے پر مقرر ہیں، وہ حاضرین کی روحوں کو بھی عجیب طرح سے مجروح کررہے ہیں۔ یعنی مرنے والا تو مر ہی رہا تھا، حاضرین بھی خوف سے نیم جاں ہورہے تھے۔اس وقت شاہ صاحب کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ میت کو نہلانے سے بھی نہلانے والوں کی روح مجروح ہوتی ہے۔ان پر خوف ودہشت طاری ہوتی ہے۔پس اس حالت کو بدلنا ضروری ہے۔چنانچہ فارغ ہوکر نہلانے والے نہالیں تو نفس کو سابقہ حالت کے برخلاف دوسری حالت یاد آجائے گی یعنی وہ سابقہ کیفیت زائل ہوجائے گی۔

[٥] كان النبي صلى الله عليه وسلم يغتسل من أربع: من الجنابة، ويومَ الجمعة، ومن الْحِجامة، ومن غُسْلِ الميت.

أقول: أما الْحِجَامةُ: فلأن الدم كثيرًا مّا ينتشر على الجسد، ويَتَعَسَّرُ غَسْلُ كلِّ نُقطة على حِدَتِها، ولأن المَصَّ بالملازم جاذب للدم من كل جانب، فلا يفيد نقصُ الدم من العضو، والغسلُ يزيل السيلانَ، ويمنع انجذابه.

وأما غسل الميت: فلأن الرُّشاش ينتشر في البدن؛ وجلستُ عند محتضر: فرأيتُ أن

الملائكة المُوَكَّلة بقبض الأرواح، لها نِكاية عجيبة في أرواح الحاضرين، ففهمتُ أنه لابد من تغيير الحالة، لِتَنَبَّهَ النفسُ لمخالفها.

ترجمہ:(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم چار چیزوں سے نہایا کرتے تھے: جنابت سے اور جمعہ کے دن اور پچھنے لگوانے سے اور مردے کو نہلانے سے'' میں کہتا ہوں: رہا پچھنے لگوانا (۱) پس اس لئے کہ خون بار ہا جسم پر پھیل جاتا ہے۔ اور ہر چھینٹ کو الگ الگ دھونا دشوار ہوتا ہے (۲) اور اس لئے کہ سینگی کے ذریعہ چوسنا خون کو کھینچنے والا ہے ہر جانب سے۔ پس مفید نہیں ہوگا خون کا گھٹنا ایک عضو سے۔ اور نہانا بہاؤ کو بند کرتا ہے اور اس کے انجذاب کو روکتا ہے۔

اور رہا میت کو نہلانا: (۱) پس اس لئے کہ چھینٹیں پھیل جاتی ہیں بدن میں (۲) اور میں ایک قریب المرگ کے پاس بیٹھا۔ پس میں نے دیکھا کہ وہ فرشتے جو روحوں کو قبض کرنے پر مقرر ہیں: ان کے لئے عجیب خراش ہے حاضرین کی روحوں میں۔ پس سمجھ لیا میں نے کہ ضروری ہے اس حالت کو بدلنا، تا کہ نفس چوکنا ہو جائے اس حالت کے برخلاف حالت سے۔

☆ ☆ ☆

اسلام قبول کرنے پر نہانے کی حکمت

حدیث ـــــــ حضرت قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں سے نہالیں (مشکوٰۃ حدیث ۵۴۳)

حدیث ـــــــ کُلیب کے ابا خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں، تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ: ''کفر کے زمانہ کے بال کٹوا ڈالو'' (رواہ ابوداؤد حدیث ۳۵۶)

تشریح. صابن سے نہا لینے میں اور بال کٹوا دینے میں حکمت یہ ہے کہ نومسلم کی نگاہوں کے سامنے یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح ہو کر آجائے کہ وہ کفر سے نکل آیا ہے اور اسلام میں داخل ہو گیا ہے۔ ورنہ مسئلہ کی رو سے اگر نومسلم جنابت کی حالت میں نہیں ہے تو نہانا ضروری نہیں۔ نہ بال کٹوانا ضروری ہے۔

[٦] أمر صلى الله عليه وسلم من أسلم بأن يغتسل بماء وسدر، وقال لآخر: "ألْقِ عنك شعر الكفر"

أقول: سرُّه أن يتمثل عنده الخروج من شيئ أصرحَ ما يكون، والله أعلم.

ترجمہ:(۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو حکم دیا جو اسلام لایا تھا کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں سے نہائے۔ اور آپؐ

نے ایک دوسرے شخص سے فرمایا کہ: ''ڈال تو اپنے سے کفر کے بال'' میں کہتا ہوں: اس میں حکمت یہ ہے کہ متمثل ہو (محسوس طور پر پایا جائے) اس کے نزدیک ایک چیز سے نکلنا زیادہ سے زیادہ واضح طور پر جو ممکن ہو۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۱۳

پانی کے احکام

رُکے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے اور نہانے کی ممانعت کی وجہ

حدیث ـــــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ہرگز پیشاب نہ کرے ٹھہرے ہوئے پانی میں، جو بہتا نہیں ہے۔ پھر نہائے وہ اس میں'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۴۷۴)

حدیث ـــــــ اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ: ''تم میں سے کوئی ٹھیرے ہوئے پانی میں نہ نہائے درانحالیکہ وہ جنبی ہو'' لوگوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: پھر کس طرح نہائے؟ آپؓ نے فرمایا: ''اس میں سے کسی طرح پانی لے'' پھر علحدہ نہائے (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۴)

حدیث ـــــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۴۷۵)

تشریح: شاہ صاحب رحمہ اللہ پہلی حدیث کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی بھی ممانعت ہے اور نہانے کی بھی۔ اور یہ حدیث اس حدیث کی طرح ہے جس میں آیا ہے کہ: ''نہ نکلیں دو آدمی، درانحالیکہ جا رہے ہوں وہ پائخانہ کے لئے، کھولنے والے ہوں وہ اپنی شرمگاہوں کو، باتیں کر رہے ہوں وہ آپس میں، پس بیشک اللہ تعالیٰ اس سے غضبناک ہوتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۶) یعنی ایک دوسرے کا ستر دیکھنا اور ننگے ہونے کی حالت میں آپس میں باتیں کرنا: دونوں باتیں مکروہ اور باعثِ غضبِ الٰہی ہیں ـــــــ نیز اس کی وضاحت دوسری اور تیسری روایت سے ہوتی ہے۔ دوسری میں صرف نہانے کی ممانعت ہے اور تیسری میں صرف پیشاب کرنے کی ممانعت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں باتیں ممنوع ہیں۔

فائدہ. مسئلہ کی رو سے تو شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات صحیح ہے۔ مگر آپ نے پہلی حدیث کا جو مطلب بیان کیا ہے، وہ غور طلب ہے۔ کیونکہ اس حدیث کا مقصد استبعاد کا اظہار ہے کہ عقلمند سے یہ بات بعید ہے کہ پہلے وہ اس پانی میں

پیشاب کرے، پھراسی سے نہائے (مظاہرحق) یا مقصد پیشاب کرنے کے نقصان کی طرف ذہن کو متوجہ کرنا ہے کہ ابھی تو وہ اس میں پیشاب کررہا ہے مگر بہت ممکن ہے کہ آگے اس کو اسی سے نہانا پڑے۔ حدیث میں جو لفظ ثم ہے وہ اس مطلب کا واضح قرینہ ہے اور فعل مضارع بمعنی استقبال ہے (فائدہ تمام ہوا)

اور پیشاب کرنے اور نہانے کی ممانعت کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ وہ پانی دو حال سے خالی نہیں: یا تو قلیل ہوگا، تو وہ اسی وقت ناپاک ہوجائے گا۔ یا کثیر ہوگا، تو یہ حرکتیں ناپاکی کا باعث بنیں گی، بایں طور کہ دوسرے لوگ بھی اس کے دیکھا دیکھی یہی حرکتیں کرنے لگیں گے۔ پس رفتہ رفتہ پانی ناپاک ہوجائے گا۔ غرض یہ ممانعت پانی کو ناپاک ہونے سے بچانے کے لئے ہے (اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی صورت میں ممانعت کی وجہ پانی کو ناپاک ہونے سے بچانا ہو، اور دوسری صورت میں پانی کو نظیف رکھنا ہو)

دوسری وجہ: یہ ہے کہ پانی میں پیشاب کرنا یا نہانا لوگوں کے لئے ضرر رساں ہے۔ پس یہ حدیث بمنزلہ اس حدیث کے ہے، جس میں فرمایا ہے کہ: ''دو باعثِ لعنت چیزوں سے بچو'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۹) کیونکہ ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا یا نہانا بھی باعثِ لعنت امر ہے۔ یہ پانی سب لوگوں کے لئے ہے۔ پس جو یہ حرکت کرے گا اس پر لوگ پھٹکار بھیجیں گے۔

مسئلہ. اگر پانی بہت زیادہ ہو یا جاری ہو تو اس میں نہانا جائز ہے۔ اور اس میں پیشاب کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ مگر احتراز بہرحال اولی ہے۔

﴿أحكامُ المِياه﴾

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " لايبولنَّ أحدُكم فى الماء الدائم الذى لا يجْرِى، ثم يغتسل فيه"

أقول. معناه: النهى عن كل واحدمن البول فى الماء، والغُسل فيه، مثل حديث: " لايخرج الرَّجلان يضربانِ الغائطَ، كاشفَيْنِ عن عورتهما،يتحدّثان، فإن اللّه يمْقُتُ على ذلك" ويبيِّنُ ذلك روايةُ النهي عن البول فى الماء فقط، وروايةُ أخرى فى النهى عن الاغتسال فقط.

والحكمة: أن كلَّ واحد منهما لايخلو من أحد أمرين: إما أن يغيِّر الماء بالفعل، أو يُفضى إلى التغيير، بأن يراه الناسُ يفعل، فَيَتَابَعُوْا، وهو بمنزلة اللاَعِنَيْن. اللّهم إلا أن يكون الماءُ مستبحرًا او جاريًا، والعفافُ أفضلُ كلَّ حال.

ترجمہ: پانی کے احکام: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''ہرگز پیشاب نہ کرے تم میں سے کوئی ہمیشہ رہنے والے پانی میں جو بہتا نہیں ہے، پھر نہائے وہ اس میں'' میں کہتا ہوں: اس کا مطلب: روکنا ہے ہر ایک سے: پانی میں پیشاب کرنے سے اور اس میں نہانے سے، جیسے حدیث: ''نہ نکلیں دو آدمی، جا رہے ہوں وہ پائخانہ کے لئے، کھولے والے ہوں وہ اپنی شرمگاہوں کو، آپس میں باتیں کر رہے ہوں وہ، پس بیشک اللہ تعالیٰ غضبناک ہوتے ہیں اس سے'' اور اس کی وضاحت کرتی ہے پانی میں صرف پیشاب کرنے کی ممانعت کی روایت۔ اور ایک دوسری روایت: صرف نہانے کی ممانعت کی۔

اور حکمت: (۱) یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک: دو باتوں میں سے ایک بات سے خالی نہیں: یا تو یہ کہ بدل دیگا وہ پانی کو اُسی وقت، یا مُفضی ہوگا وہ تغیر کی طرف، بایں طور کہ دیکھیں گے اس کو لوگ یہ کام کرتا ہوا۔ پس پے بہ پے کرنے لگیں گے وہ یہ کام (۲) اور وہ بمنزلہ دو لعنت کرنے والی چیزوں کے ہے —— اے اللہ! مگر یہ کہ ہو وہ پانی بہت ہی زیادہ یا بہتا ہوا۔ اور بچنا ہر حال میں بہتر ہے۔

لغت: مُستَجِرًا (اسم فاعل) بہت زیادہ استَجر فی العلم او المال: وسیع العلم یا کثیر المال ہونا۔

☆ ☆ ☆

ماءِ مستعمل پاک ہے مگر پاک کرنے والا نہیں

اگر وضوء کرنے والے اور غسل کرنے والے کے بدن پر کوئی حسی نجاست نہ ہو تو جو پانی وضوء یا غسل میں استعمال کیا گیا ہے، وہ جسم سے جدا ہونے کے بعد مستعمل ہو جاتا ہے۔ اور وہ پاک تو ہے مگر پاک کرنے والا نہیں۔ پس اس سے دوبارہ وضوء اور غسل درست نہیں۔ اس مسئلہ میں کوئی صریح حدیث نہیں ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا جہاں میں کوئی بھی مستعمل پانی کو طہارت میں استعمال نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ متروک ومہجور چیز کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسی حال پر باقی رکھا یعنی دوبارہ اس کو طہارت میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بارے میں صاف کچھ ارشاد بھی نہیں فرمایا۔ البتہ اس میں کوئی شک کی بات نہیں کہ وہ فی نفسہ پاک ہے، پس اس کے چھینٹے کپڑوں وغیرہ پر پڑیں تو وہ ناپاک نہیں ہوگا۔

[۲] وأما الماءُ المستعمل فما كان أحدٌ من طوائف الناس يستعملُه في الطهارة، وكان كالمهجور المطرود، فأبقاه النبيُّ صلى الله عليه وسلم على ما كان عندهم، ولاشك أنه طاهر.

ترجمہ: (۲) اور رہا مستعمل پانی: پس نہیں استعمال کیا کرتا تھا اس کو لوگوں کی جماعتوں میں سے کوئی طہارت میں۔

اور تھا وہ چھوڑی ہوئی دُھتکاری ہوئی چیز کی طرح۔ پس باقی رکھا اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت پر جو تھی لوگوں کے نزدیک۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پاک ہے۔

☆ ☆ ☆

حدیث قلتین کا مطلب

حدیث ——— حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پانی کے بارے میں دریافت کیا گیا جو وسیع بیابان میں ہوتا ہے، اور اس پر نوبت بنوبت چار پائے اور درندے آتے ہیں یعنی وہ آکر اس میں سے پیتے ہیں اور وہاں پیشاب وغیرہ کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "جب پانی دو مشکے ہو جائے تو وہ ناپاکی کو نہیں اٹھاتا" یعنی ناپاک نہیں ہوتا (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۷ باب المیاہ)

تشریح: حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات شروع کرنے سے پہلے تین باتیں عرض ہیں۔

پہلی بات ظاہریہ (ظاہر حدیث پر عمل کرنے والے یعنی غیر مقلدین) کہتے ہیں کہ پانی میں نجاست کے گرنے سے پانی مطلقاً ناپاک نہیں ہوتا۔ پانی خواہ جاری ہو یا ٹھہرا ہوا۔ اور خواہ کم ہو یا زیادہ۔ اور خواہ رنگ، بو یا مزہ بدلے یا نہ بدلے۔ پانی کی ذات پاک ہے۔ وہ ناپاک نہیں ہو سکتی۔ معلوم نہیں ان کے نزدیک پیشاب کیوں ناپاک ہے۔ وہ بھی تو اصل میں پانی ہے؟!

اور تمام محدثین وفقہاء کہتے ہیں کہ اگر پانی کثیر ہے تو ناپاک نہیں ہوگا۔ البتہ اگر پانی کا کوئی وصف بدل جائے تو ناپاک ہو جائے گا اور اگر پانی تھوڑا ہے تو ناپاک ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کا کوئی وصف نہ بدلے، پھر ائمہ اربعہ میں قلیل وکثیر کی تحدید میں اختلاف ہے:

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر ناپاکی گرنے سے پانی کا کوئی وصف نہ بدلے تو وہ کثیر ہے۔ اور اگر کوئی وصف بدل جائے تو وہ قلیل ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک قلتین کی مقدار کثیر ہے، اور اس سے کم قلیل ہے۔ اور احناف کے نزدیک اگر پانی کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ ایک طرف کے ہلانے سے دوسری طرف کا پانی نہیں ہلتا تو وہ کثیر ہے۔ اور اس سے کم ہے تو قلیل ہے۔ پھر بعد میں اس کی تحدید دہ در دہ سے کی گئی۔ یعنی یہ اصل مذہب نہیں ہے۔ بلکہ مذہب کی تفصیل وتقدیر ہے۔

دوسری بات: امام مالک رحمہ اللہ نے قلتین کی حدیث کو نہیں لیا۔ ان کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور اس اعتبار سے شاذ بھی ہے کہ بہت بعد میں ظاہر ہوئی ہے۔ صحابہ وتابعین کے دور میں یہ حدیث معروف نہیں تھی۔ حالانکہ محدثین کے خیال کے مطابق یہ حدیث برتن اور حوض کے پانی سے متعلق ہے، جو ایک عامۃ الورود مسئلہ ہے پھر یہ حدیث

مخفی کیوں رہی؟ ——— اوراحناف کے نزدیک یہ حدیث ایسی ضعیف نہیں ہے کہ قابل اخذ نہ ہو۔ مگر یہ حدیث برتنوں، کنوؤں اور کھڈوں کے پانی سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ بہتے ہوئے پانی سے متعلق ہے یعنی جنگلات میں جو چشمے اور آبشاریں ہیں ان سے اس حدیث کا تعلق ہے۔ حدیث کے شان ورود میں اس کی صراحت ہے کہ ان پانیوں پر دن میں لوگوں کے جانور پینے کے لئے پہنچتے ہیں، اور رات میں جنگل کے درندے وارد ہوتے ہیں۔ اور سوال جواب میں لوٹایا جاتا ہے۔ پس بلغ الماء میں الف لام عہدی ہے۔ اور آپ ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ پانی بتدریج جمع ہوتا ہوا دو مٹکے ہو جائے [1] (بلغ کا یہی مفہوم ہے) اور بہنے لگے تو اس میں جو ناپاکی (لعاب پیشاب وغیرہ) کرے گی وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہ جائے گی۔ پانی کی سطح پر نہیں ٹھیرے گی (ناپاکی کو سر پر نہ اٹھانے کا یہی مطلب ہے) اور جب ناپاکی گرتے ہی بہ گئی تو اس چشمہ اور آبشار کا پانی ناپاک نہ ہوگا ——— اور چونکہ چشموں اور آبشاروں کا مسئلہ بہت کم لوگ دریافت کرتے ہیں، اس لئے یہ حدیث عرصہ تک مخفی رہی۔ پھر جب تدوین حدیث کا دور آیا تو یہ حدیث عام وخاص کے سامنے آئی۔

اور محدثین کرام (شوافع اور حنابلہ) نے اس حدیث کا مصداق برتنوں اور کھڈوں کے پانی کو بنایا ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے انہی کی رائے کے مطابق حدیث کی شرح کی ہے۔

تیسری بات: احناف صرف پانی کے پھیلاؤ کا اعتبار کرتے ہیں۔ مقدار کا اعتبار نہیں کرتے۔ اور احناف نے قلیل وکثیر پانی کے درمیان حدّ فاصل غدیر عظیم کی روایت کو بنایا ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار کے پہلے باب میں، شروع ہی میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ ایک تالاب میں مردار پڑا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے دوسری جانب سے پانی استعمال کرنے کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں مشکوٰۃ شریف میں بھی حوضوں کے سلسلہ میں دو روایتیں ہیں (حدیث ۴۸۶، ۴۸۸) یہ سب احناف کے مستدل ہیں ——— اور شوافع اور حنابلہ پانی کی مقدار کا بھی اعتبار کرتے ہیں اور پھیلاؤ کا بھی۔ دو قلّے یعنی پانچ مشکیں یعنی ۵۰۰ رطل یعنی ۲۰۳ کلو پانی ان کے نزدیک ماء کثیر ہے۔ اور چاروں طرف سے سوا سوا ہاتھ پانی ان کے نزدیک حوض کا ادنی درجہ ہے۔

ان تین ضروری باتوں کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی بات شروع کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جب پانی دو مٹکوں کی بقدر ہو، تو اس میں وضوء اور غسل کرنے سے، یا اس میں ناپاکی گرنے سے وہ معنوی گندگی کو نہیں اٹھاتا یعنی ناپاک نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ حسّی طور پر گندہ معلوم ہو، اور لوگ عرف وعادت میں اس کو گندہ تصور کریں۔ مگر شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ناپاک نہیں ہے۔ البتہ اگر اس میں ناپاکی اتنی گر جائے

[1] ایک روایت میں دو مٹکے یا تین مٹکے آیا ہے اور ایک روایت میں چالیس مٹکے آیا ہے یہ اختلاف سائل کے علاقہ میں پائے جانے والے چشموں اور آبشاروں کے چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ سے ہے ۱۲

کہ پانی میں تبدیلی آجائے اور ناپاکی کمیت یا کیفیت کے اعتبار سے زیادہ ہوجائے تو وہ پانی ناپاک ہوجائے گا۔ ایسا پانی حدیث کا مصداق نہیں ہے۔ کمیت یعنی مقدار کے اعتبار سے زیادہ ہوجائے جیسے ایک کلو غیر مستعمل پانی میں سوا کلو مستعمل پانی مل جائے۔ اور کیفیت یعنی پانی کا وصف بدل جائے۔ چاہے نجاست مقدار میں کم ہو۔

تنبیہ: جو لوگ حوض سے وضو کرتے ہیں وہ یہ بے احتیاطی کرتے ہیں کہ کلی بھی حوض میں ڈالتے ہیں۔ ناک بھی اسی میں صاف کرتے ہیں۔ اور پیروں کا میل بھی اسی میں گراتے ہیں۔ اور سمجھایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ حوض ناپاک نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے ناپاک نہیں ہوتا، مگر گندہ تو ہوتا ہے۔ اس لئے یہ طریقہ مناسب نہیں۔ اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ عام طور پر حوض کے ساتھ نالی بنائی جاتی ہے۔ اس کو استعمال کرنا چاہئے۔ واللہ الموفق!

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا بلغ الماءُ قُلّتين لم يحمِلْ خَبَثًا"

أقول: معناه: لم يحمل خبثا معنويا، إنما يحكم به الشرع، دون العرفِ والعادةِ، فإذا تغيّر أحدُ أوصافه بالنجاسة، وفحشت النجاسة كمًّا أو كيفًا، فليس مما ذكر.

ترجمہ. (۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "جب پانی دو مٹکوں کو پہنچ جائے تو وہ گندگی کو نہیں اٹھاتا" میں کہتا ہوں: اس کا مطلب: وہ معنوی گندگی کو نہیں اٹھاتا۔ اس کے بارے میں شریعت ہی فیصلہ کرتی ہے، نہ کہ عرف وعادت ——— پس جب بدل جائے اس کے اوصاف میں سے کوئی وصف ناپاکی کی وجہ سے، اور زیادہ ہوجائے ناپاکی کمیت یا کیفیت کے اعتبار سے تو نہیں ہے وہ اس میں سے جو ذکر کیا گیا۔

☆ ☆ ☆

قلّتین کو قلیل وکثیر پانی کے درمیان حدّ فاصل کیوں مقرر کیا؟

قلیل وکثیر پانی کے درمیان دو قُلّوں کو حد فاصل ایک ایسی اہم وجہ سے مقرر کیا ہے جس کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ یہ تحدید زبردستی کی بات اور اٹکل پچو کا فیصلہ نہیں ہے۔ اور اسی طرح شریعت نے جو دیگر مقداریں متعین کی ہیں ان کی بھی کوئی اہم وجہ ہوتی ہے۔ مثلاً چاندی کا نصاب دوسو درہم مقرر کیا ہے تو اس کی وجہ ہے (دیکھئے رحمۃ اللہ الواسعہ ۲ ۲۱۴)

اور اس کی تفصیل: یہ ہے کہ پانی کی دو جگہیں ہیں: ایک: منبع (پانی کا سرچشمہ) دوسری: برتن۔ منبع: کنویں اور چشمے ہیں۔ اور سیلاب کے نالے کھڈے ان کے ساتھ ملحق ہیں۔ اور برتن: چمڑے کی مشکیں، مٹکے، لگن، ٹب اور چھاگل ہیں۔ اور دونوں میں تین وجوہ سے فرق ہے:

پہلی وجہ: پانی کا منبع اگر ناپاک ہوجائے تو لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے اور ان کا پانی نکالنے میں بہت پریشانی ہوتی ہے

اور برتنوں کا حال اس سے مختلف ہے۔ وہ روز بھرے جاتے ہیں اور ان کا پانی پھینک دینے میں کوئی پریشانی نہیں۔

دوسری وجہ: منبع کا سرپوش نہیں ہوتا اور اس کو لید گوبر سے اور درندوں کے منہ ڈالنے سے بچانا بھی ممکن نہیں۔ اور برتنوں کو ڈھانکنے میں اور ان کی حفاظت کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ——— ہاں ہر وقت گھر میں آنے جانے والے لوگوں کا اور جانوروں کا معاملہ الگ ہے۔

تیسری وجہ: منبع میں پانی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بہت سی ناپاکیاں تو اس میں اثر انداز ہی نہیں ہوتیں۔ اور برتنوں کا پانی کم ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں ناپاکی اثر انداز ہوتی ہے۔

غرض مذکورہ وجوہ سے ضروری ہے کہ منبع کا حکم برتنوں کے حکم سے مختلف ہو۔ اور منبع میں وہ سہولت دی جائے جو برتنوں میں نہیں دی جاتی۔

اور منبعوں اور برتنوں میں حد فاصل بننے کی صلاحیت صرف دو قلوں میں ہے۔ اس لئے کہ کنوؤں اور چشموں کا پانی دو مٹکوں سے یقیناً کم نہیں ہوتا۔ اور جس برساتی نالے یا کھڈے میں اس سے کم پانی ہوتا ہے وہ حوض اور گڑھا نہیں کہلاتا، بلکہ اس کو چھوٹا کھڈا کہتے ہیں ——— اور پانی کے برتنوں میں سب سے بڑا برتن مٹکا ہے۔ اس سے بڑا برتن عربوں کے معاشرہ میں نہیں پایا جاتا تھا۔ اور مٹکے سب یکساں نہیں ہوتے۔ کوئی مٹکا بڑا ہوتا ہے جو چھوٹے ڈیڑھ مٹکے کے برابر ہوتا ہے، کوئی سوا مٹکے کے برابر اور کوئی پونے دو مٹکوں کے برابر۔ مگر کوئی بڑا مٹکا چھوٹے دو مٹکوں کے برابر نہیں ہوتا۔ اس لئے دو مٹکے ایک ایسی حد ہیں جس تک عام طور پر برتن نہیں پہنچتے اور جس سے کم پانی کسی منبع میں نہیں ہوتا، اس لئے دو مٹکوں کو کثیر و قلیل کے درمیان حد فاصل بنایا گیا ہے۔

خلاصہ: یہ ہے کہ پانی کی وہ مقدار جس کی کسی برتن میں سمائی نہیں وہ منبع کا پانی ہے۔ اور جس کی کسی برتن میں گنجائش ہے، وہ برتنوں کا پانی ہے۔ اول میں آسانی کی گئی ہے۔ ثانی میں آسانی نہیں کی گئی۔

فائدہ: (۱) جب دو مٹکے پانی کسی ہموار زمین میں ہو تو وہ عموماً سات بالشت لمبا اور پانچ بالشت چوڑا ہوتا ہے (۷×۵=۳۵ بالشت مربع اور ایک بالشت نو انچ کا ہوتا ہے) اور یہ (شوافع اور حنابلہ کے نزدیک) حوض کا ادنیٰ درجہ ہے۔

فائدہ: (۲) جو لوگ قلتین سے پانی کی تحدید نہیں کرتے، ان کو بھی ایسی ہی کوئی اور چیز ماء کثیر کو منضبط کرنے کے لئے ماننی پڑتی ہے۔ جیسے حنفیہ کو ذوذ و ردو کا قائل ہونا پڑا ہے۔ اور مالکیہ کو جنگلات کے کنوؤں میں اونٹوں کی مینگنیوں جیسی ناپاکی کی مطلقاً اجازت دینی پڑی ہے۔ پس ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے سے بہتر یہ ہے کہ قلتین کی حدیث کو معیار مان لیا جائے۔

فائدہ: (۳) حدود شرعیہ کے معاملہ کو اچھی طرح بوجھنا چاہئے۔ شریعت نے جو بھی مقدار متعین کی ہے وہ ایک ایسی ضروری حد ہے کہ اس کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ اور عقلاً اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہیں۔

نوٹ: یہ تینوں فائدے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت میں موجود ہیں۔ البتہ پہلا فائدہ درجِ کلام میں آ گیا ہے۔

ملحوظہ: پہلے یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ احناف: غدیر عظیم کی روایت سے مائے کثیر کی تحدید کرتے ہیں۔ اور مالکیہ تحدید کے قائل نہیں۔ اور جنگلات کے کنوؤں میں سہولت تو سبھی فقہاء دیتے ہیں۔ نیز قلتین کی روایت مائے جاری سے متعلق ہے۔ پھر اس سے تحدید کیسے ممکن ہے؟!

[٤] وإنما جُعل القلتين حدًّا فاصلاً بين الكثير والقليل لأمر ضروري لابدَّ منه، وليس تحكما ولا جُزافًا، وكذا سائرُ المقادير الشرعية.

وذلك: أن للماء محلّين. معدنٌ وأوانٍ. أما المعدن فالآبار والعيون، ويلحق بها الأودية، وأما الأواني فالقربُ، والقلالُ، والجفان، والمخاضبُ، والإداوةُ؛ وكان المعدنُ يتضررون بتنجُّسه، ويُقاسون الحرج في نزحه؛ وأما الأواني فتُملأ في كل يوم، ولا حرج في إراقتها؛ والمعدن: ليس لها غطاء، ولايمكن سترُها من رَوْث الدواب وولْغ السباع، وأما الأواني: فليس في تغطيتها وحفظها كثيرُ حرج، اللهم إلا من الطوافين والطوافات؛ والمعدنُ كثيرٌ غزيرٌ، لا يؤثّر فيه كثيرٌ من النجاسات، بخلاف الأواني. فوجب أن يكون حكمُ المعدِن غيرَ حكم الأواني، وأن يُرخّص في المعدن مالا يُرخّص في الأواني.

ولايصلح فارقًا بين حدّ المعدن وحد الأواني إلا القلتان، لأن ماء البئر والعين لايكن أقلَّ من القلتين ألبتّة، وكلُّ مادون القلتين من الأودية لايسمى حوضا ولا جوبةً، وإنما يقال له حُفيْرةٌ، وإذا كان قدرُ قلتين في مستوٍ من الأرض يكون غالبًا سبعة أشبارٍ في خمسةِ أشبارٍ، وذلك أدنى الحوض.

وكان أعلى الأواني القلّةُ، ولايُعرف أعلى منها عندهم آنيةٌ، وليست القلال سواءً، فقلّةٌ عندهم تكون قلة ونصفًا، وقلةً وربعا، وقلةً وثلثا، ولا تُعرف قلةٌ تكون كقلتين، فهذا حدٌّ لا تبلُغه الأواني، ولا ينزل منه المعدنُ، فضُرب حدا فاصلا بين الكثير والقليل.

ومن لم يقل بالقلتينِ اضْطرّ إلى مثلهما في ضبط الماء الكثير، كالمالكية، أو الرخصةِ في آبار الفلوات من نحو أبْعار الإبل، فمن هنا ينبغي أن يَعْرف الإنسانُ أمْر الحُدودِ الشرعية، فإنها نازلةٌ على وجه ضروري، لايجدون منه بدًّا، ولا يجوِّز العقلُ غيرَها.

ترجمہ: (۴) اور دو مٹکے ہی حد فاصل بنائے گئے ہیں کثیر و قلیل کے درمیان ایک ایسے ضروری امر کی وجہ سے جس

سے کوئی چارہ نہیں۔اور نہیں ہے وہ زبردستی کی بات اور نہ انکل پچو کا تیر۔اور اسی طرح دیگر مقادیر شرعیہ (شریعت کے مقرر کئے ہوئے اندازے) ہیں۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ پانی کے لئے دو جگہیں ہیں: معدِن (منبع) اور برتن۔رہا منبع: تو وہ کنویں اور چشمے ہیں۔ اور برساتی نالے کھڈے ان کے ساتھ ملائے جائیں گے۔اور رہے برتن: تو وہ مشکیں اور مٹکے اور لگن اور ٹب اور چھاگل ہیں ـــــ (۱) اور لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے منبعوں کے ناپاک ہونے سے۔اور تنگی برداشت کرتے ہیں وہ اس کا پانی کھینچنے میں۔اور رہے برتن: تو وہ روزانہ بھرے جاتے ہیں۔اور کوئی پریشانی نہیں ہے ان کا پانی بہانے میں ـــــ (۲) اور منبع: نہیں ہے اس کے لئے سرپوش۔اور نہیں ممکن ہے اس کو چھپانا جانوروں کی لید گوبر اور درندوں کے منہ ڈالنے سے۔اور رہے برتن: پس نہیں ہے ان کے ڈھانکنے میں اور ان کی حفاظت میں کوئی پریشانی۔اے اللہ! مگر ہر وقت آنے جانے والے لوگوں اور جانوروں سے ـــــ (۳) اور منبع میں بہت ہی زیادہ پانی ہوتا ہے۔اس میں اثر انداز نہیں ہوتیں بہت سی ناپاکیاں، برخلاف برتنوں کے ـــــ پس ضروری ہے کہ منبع کا حکم برتنوں کے حکم کے علاوہ ہو۔اور یہ (ضروری ہے) کہ اجازت دی جائے منبع میں اس بات کی جس کی اجازت نہیں دی جاتی برتنوں میں۔

اور نہیں صلاحیت رکھتے منبع اور برتنوں کی حدوں کے درمیان فاصل بننے کی مگر دو مٹکے۔اس لئے کہ کنویں اور چشمہ کا پانی یقیناً دو مٹکوں سے کم نہیں ہوتا۔اور ہر وہ چیز جو دو مٹکوں سے کم ہے برساتی نالوں کھڈوں میں سے، نہیں کہلاتی وہ حوض اور گڑھا۔اور اسے صرف چھوٹا کھڈا ہی کہا جاتا ہے ـــــ اور جب دو مٹکوں کی مقدار کسی ہموار زمین میں ہو تو وہ عموماً سات بالشت مضروب پانچ بالشت ہوتی ہے۔اور یہ حوض کا ادنی درجہ ہے (یہ پہلا فائدہ ہے)

اور پانی کے برتنوں میں سب سے بڑا برتن مٹکا تھا۔اس سے بڑا برتن عربوں کے نزدیک معروف نہیں تھا۔اور مٹکے یکساں نہیں ہیں۔پس کوئی مٹکا تو عربوں کے نزدیک ڈیڑھ مٹکے کے بقدر ہوتا تھا، اور کوئی سوا مٹکے کے بقدر، اور کوئی پونے دو مٹکوں کے بقدر۔اور نہیں معروف تھا کوئی مٹکا جو دو مٹکوں کے بقدر ہو۔پس یہ (دو مٹکے) ایک ایسی حد ہیں جس تک برتن نہیں پہنچتے۔اور جس سے منبعے نیچے نہیں اترتے۔پس وہ حد فاصل بنائی گئی قلیل وکثیر کے درمیان۔

اور جو شخص قلتین کا قائل نہیں ہے، مجبور ہوتا ہے وہ قلتین کے مانند کی طرف ماء کثیر کو منضبط کرنے میں۔جیسے مالکیہ یا اجازت دینے کی طرف جنگلات کے کنوؤں میں اونٹوں کی مینگنیوں جیسی چیزوں سے (یہ دوسرا فائدہ ہے) ـــــ پس یہاں سے مناسب ہے کہ آدمی پہچانے حدود شرعیہ کے معاملہ کو۔پس بیشک وہ اترنے والی ہیں ایک ایسی ضروری حد پر جس سے کوئی چارہ نہیں۔اور نہیں جائز قرار دیتی عقل اس کے علاوہ کو (یہ تیسرا فائدہ ہے)

تصحیح: تمام نسخوں میں کالمالکیة ہے۔مگر یہ سبقتِ قلم معلوم ہوتی ہے۔صحیح کالحنفیة ہے۔

☆ ☆ ☆

حدیث بیر بُضاعہ کا مطلب

حدیث ـــــ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا: ''یارسول اللہ! کیا ہم بیر بضاعہ سے وضو کریں درانحالیکہ وہ ایک ایسا کنواں ہے جس میں حیض کے چیتھڑے، کتوں کا گوشت اور بدبودار چیزیں ڈالی جاتی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک (بیر بضاعہ کا) پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۸)

حدیث ـــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی کسی بیوی نے ایک بڑے پیالے سے غسل کیا۔ پھر آپؐ نے اس سے وضو کرنا چاہا تو بیوی صاحبہ نے عرض کیا کہ میں جنبی تھی، تو آپؐ نے فرمایا: ''بیشک پانی جنبی نہیں ہوتا'' (مشکوۃ حدیث ۴۵۷)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بحالتِ جنابت آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی۔ آپؐ نے ان کا ہاتھ پکڑا۔ وہ آپؐ کے ساتھ چلتے رہے۔ جب آپؐ کسی جگہ تشریف فرما ہوئے تو وہ کھسک گئے۔ اپنے ڈیرے میں گئے، نہائے اور حاضر خدمت ہوئے، آپؐ ابھی تک تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے دریافت کیا: ''کہاں چلے گئے تھے؟'' انھوں نے صورت حال عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا: ''بیشک مؤمن ناپاک نہیں ہوتا'' (مشکوۃ حدیث ۴۵۱)

حدیث ـــــ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وفدِ ثقیف کو مسجد نبوی میں اتارا دیا تا کہ ان کے دل پسیجیں۔ آپؐ سے اس سلسلہ میں عرض کیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہیں۔ آپؐ نے ان کو مسجد میں ٹھیرایا ہے! آپ نے فرمایا: ''بیشک زمین ناپاک نہیں ہوتی۔ ناپاک انسان ہی ہوتا ہے'' (سنن بیہقی ۲:۴۴۵)

نوٹ: البدن لاینجس کے لفظ سے حدیث یاد نہیں پڑتی۔ اور سرسری تلاش میں ملی بھی نہیں۔

تشریح: بُضاعہ: ایک عورت کا نام ہے۔ یہ عورت اسلام سے پہلے گذری ہے۔ اس نے مدینہ منورہ میں ایک کنواں بنایا تھا۔ جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک موجود تھا۔ اس کنویں سے آپؐ کے استعمال کے لئے پانی لایا جاتا تھا۔ اور لوگ بھی اس کا پانی استعمال کرتے تھے۔ یہ کنواں مدینہ کے ڈھلان میں واقع تھا۔ برسات میں شہر کا پانی اس پر سے گذرتا تھا۔ اور شہر کا سارا کوڑا اس میں گرتا تھا۔ برسات کے بعد اس سے پانچ باغات کی سینچائی شروع ہوتی تھی۔ جب کنویں کا پانی سارا نکل جاتا تھا تو اس کا پانی لوگ استعمال کرنے لگتے تھے۔ اس کے بارے میں پہلی حدیث میں دریافت کیا گیا ہے۔ اور آپؐ نے مذکورہ جواب ارشاد فرمایا ہے۔

حدیث بیر بضاعہ کو مالکیہ اور ظاہریہ نے لیا ہے۔ وہ الـمـاء میں اَلْ استغراقی مانتے ہیں یعنی دنیا کا ہر پانی پاک

ہے۔البتہ مالکیہ اس حدیث کے ساتھ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ملاتے ہیں۔اور اس کو استثناء قرار دیتے ہیں کہ اگر پانی کا کوئی وصف بدل جائے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔اور ابوامامہؓ کی حدیث ابن ماجہ نے روایت کی ہے (حدیث نمبر ۵۲۱) اصحاب ظواہر اس کو نہیں لیتے۔وہ کہتے ہیں کہ اس کا ایک راوی رِشدین بن سعد ضعیف ہے۔

اور جمہور کے نزدیک حدیث بیر بضاعہ میں اَل استغراقی نہیں ہے، بلکہ عہدی ہے۔اور یہ ارشاد صرف بیر بضاعہ کے پانی سے متعلق ہے، تمام پانیوں کے بارے میں نہیں ہے۔شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مذکورہ تمام حدیثوں میں مخصوص نجاست کی نفی ہے۔جو حالی یا مقالی قرائن سے سمجھ میں آتی ہے۔پس:

۱ــــ پانی ناپاک نہیں ہوتا یعنی منبع (سرچشمہ) میں ناپاکی گر جائے، اور وہ نکال دی جائے، اور پانی کا کوئی وصف نہ بدلے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔

۲ــــ بدن ناپاک نہیں ہوتا یعنی بدن دھو ڈالا جائے تو پاک ہو جاتا ہے (یہ حدیث نہیں ملی)

۳ــــ زمین ناپاک نہیں ہوتی یعنی اس پر بارش یا دھوپ پڑے یا اس کو پیر سے رگڑ دیں، اور ناپاکی کا اثر بالکلیہ زائل ہو جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔(یہ مطلب سیاق حدیث کے خلاف ہے)

۴ــــ پانی جنبی نہیں ہوتا یعنی جنبی کے نہانے کے بعد برتن میں بچا ہوا پانی ناپاک نہیں ہے۔

۵ــــ مؤمن ناپاک نہیں ہوتا یعنی جیسا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سمجھ رہے ہیں ایسا ناپاک نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے ساتھ مصافحہ بھی نہ کر سکے اور نہ وہ کسی کے ساتھ بیٹھ سکے۔

۶ــــ زمین ناپاک نہیں ہوتی۔انسان ہی ناپاک ہوتا ہے یعنی مشرک کے عقیدے کی گندگی اس کی ذات تک منحصر ہے۔زمین پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

نوٹ:۴-۶ شارح کا اضافہ ہے۔آگے فرماتے ہیں:

سوچئے! کیا یہ بات قابل تصور ہے کہ بضاعہ نامی کنویں میں مذکورہ ناپاکیاں پڑی رہتی ہوں، اور لوگ پانی استعمال کرتے ہوں؟ ہرگز نہیں! بلکہ صورت حال یہ تھی کہ مذکورہ ناپاکیاں بلا ارادہ اس کنویں میں پڑتی تھیں۔ان کو اس میں کوئی ڈالتا نہیں تھا۔جیسا کہ ہم اپنے زمانہ کے کنوؤں میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔پھر وہ ناپاکیاں نکال دی جاتی تھیں۔اور اس کا پانی استعمال کیا جاتا تھا۔

پھر جب اسلام کا زمانہ آیا تو لوگوں نے اس کا شرعی حکم پوچھا کہ کیا وہی پاکی کافی ہے جو لوگ سمجھتے ہیں یا شریعت میں اس سلسلہ میں کچھ زائد حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کے نزدیک جو طہارت ہے وہی کافی ہے، اس سے زائد کچھ مطلوب نہیں۔

سوال: اگر اصحاب ظواہر کہیں کہ حدیث پر عمل کا یہ طریقہ ہمیں نہیں بتایا گیا، حدیث کو ظاہر سے پھیرنا ہے، جو جائز نہیں۔

جواب: یہ زبردستی کا مطلب نہیں ہے، نہ حدیث کو ظاہر سے پھیرنا ہے۔ یہ عربوں کا انداز کلام ہے۔ مثلاً:

۱۔۔۔ سورۃ الانعام آیت ۱۴۵ میں ہے: ''آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں، ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے، بجز یہ کہ وہ مردار ہو، یا یہ کہ بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے، یا جو جانور شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو'' اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بس یہی جانور حرام ہیں۔ کیونکہ اس کے علاوہ جانور بھی حرام ہیں۔ بلکہ مخصوص حرمت کی نفی مقصود ہے یعنی جن جانوروں میں تم اختلاف کرتے ہو، جن کا تذکرہ اوپر کی آیات میں آیا ہے، وہ مجھ پر نازل شدہ وحی میں حرام نہیں ہیں۔

۲۔۔۔ کسی حکیم سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے، اور وہ کہے کہ اس کا استعمال جائز نہیں تو یہ جواز کی نفی عام نہیں ہے، بلکہ بدن کی تندرستی کے اعتبار سے ہے۔

۳۔۔۔ کسی مفتی سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے، اور وہ کہے کہ جائز نہیں تو اس سے شرعی جواز ہی کی نفی مقصود ہوتی ہے۔

۴۔۔۔ سورۃ النساء آیت ۲۳ میں ہے: ''تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں'' یعنی ان سے نکاح حرام کیا گیا۔

۵۔۔۔ سورۃ المائدہ آیت ۳ میں ہے: ''تم پر مردار حرام کیا گیا'' یعنی اس کا کھانا حرام کیا گیا۔

۶۔۔۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''نہیں ہے نکاح مگر ولی کے ذریعہ'' یعنی شرعاً وہ نکاح درست نہیں۔ وجود خارجی کی نفی نہیں کی گئی۔

لطیفہ: ایک عالم نے مسئلہ بیان کیا کہ وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ ایک صاحب نے کہا: '' چرا نمی شود، من بارہا خواندم وشد!'' کیوں نہیں ہوتی، میں نے بارہا پڑھی ہے اور ہوگئی ہے۔ حالانکہ عالم نے شرعاً صحت کی نفی کی تھی۔ اور اُن صاحب نے وجود خارجی کی نفی سمجھ لی!

الغرض: اس قسم کی چیزیں بہت ہیں۔ وردہ از قبیل تاویل نہیں ہیں۔ (یہ بات رحمۃ اللہ الواسعہ ۲:۵۵۴ میں بھی گذر چکی ہے)

[٥] قوله صلى الله عليه وسلم: " الماءُ طَهور لا يُنجِّسه شيء" وقوله صلى الله عليه وسلم: "الماءُ لايُجنِبُ" وقوله صلى الله عليه وسلم: " المؤمن لاينجسُ" ومثلُه مافي الأخبار: من أن

البدن لاينجَسُ، والأرض لا تنجَسُ.

أقول: معنى ذلك كلّه يرجع إلى نفى نجاسة خاصة، تدل عليه القرائن الحالية والقالية. فقوله:" الماء لاينجَسُ" معناه. المعادن لا تنجسُ بملاقاة النجاسةِ، إذا أُخرجت ورُميت، ولم يتغير أحدُ أوصافه،ولم تفحُشْ، والبدنُ يُغسل فيطْهُر، والأرضُ يُصيبها المطر والشمس وتدلُكها الأرجُلُ فتطْهر.

وهل يمكن أن يُظنَّ ببئر بُضاعة: أنها كانت تستقر فيها النجاسات؟! كيف، وقد جرت عادةُ بنى آدم بالاجتناب عما هذا شأنه . فكيف يستقى بها رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ بل كانت تقع فيها النجاسات من غير أن يقصد إلقاؤ ها، كما نشاهد من آبار زماننا، ثم تخرج تلك النجاساتُ، فلما جاء الإسلام، سألوا عن الطهارة الشرعية الزائدة على ما عندهم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" الماء طهور، لاينجسه شيئ" يعنى لاينجَسُ نجاسةً غير ما عندكم.

وليس هذا تأويلا، ولا صرفًا عن الظاهر، بل هو كلام العرب: فقوله تعالى:﴿ قُلْ: لَّا أَجِدُ فِيما أُوْحِي إِلَيَّ مُحرَّمًا على طَاعِمٍ﴾ الآية، معناه: مما اختلفتم فيه، وإذا سئل الطبيب عن شيئ، فقال: لايجوز استعماله، عُرف أن المراد نفى الجواز باعتبار صِحَّةِ البدن، وإذا سئل فقيهٌ عن شيئ، فقال: لايجوز، عُرف أنه يريد نفى الجواز الشرعى. قوله تعالى:﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ﴾ وقوله تعالى:﴿ حُرِّمْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ فالأول فى النكاح، والثانى فى الأكل. قوله صلى الله عليه وسلم:" لانكاح إلا بولى" نفى للجواز الشرعى، لا لِلوجودِ الخارجى، وأمثالُ هذا كثيرة، وليس من التأويل.

ترجمہ:(۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:" پانی پاک کرنے والا ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی" اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد:" پانی جنبی نہیں ہوتا" اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد:" مؤمن ناپاک نہیں ہوتا" اور اس کے مانند وہ ہے جو روایات میں آیا ہے یعنی بدن ناپاک نہیں ہوتا اور زمین ناپاک نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں: ان سب کے معنی لوٹتے ہیں مخصوص نجاست کی نفی کی طرف۔ جس پر حالی اور مقالی قرائن دلالت کرتے ہیں۔ پس آپ کا ارشاد:" پانی ناپاک نہیں ہوتا" اس کا مطلب: منبعے ناپاک نہیں ہوتے ناپاکی کے ملاقات کرنے سے، جب وہ ناپاکی نکال دی جائے اور پھینک دی جائے اور پانی کا کوئی وصف نہ بدلے۔ اور ناپاکی بہت زیادہ نہ ہو ـــــ اور بدن دھویا جاتا ہے پس پاک ہو جاتا ہے اور زمین پہنچتی ہے اس کو بارش اور دھوپ اور رگڑتے ہیں اس کو پیر پس پاک ہو جاتی ہے۔

اور کیا ممکن ہے کہ گمان کیا جائے بُضاعہ نامی کنویں کے بارے میں کہ ناپاکیاں اس میں پڑی رہا کرتی تھیں؟ کیونکر یہ گمان کیا جاسکتا ہے، حالانکہ انسانوں کی عادت جاری ہے بچنے کی ان چیزوں سے جو اس قسم کی ہیں، پس کیسے اس کا پانی منگواتے تھے رسول اللہ ﷺ؟ بلکہ پڑا کرتی تھیں اس میں ناپاکیاں، بغیر اس کے کہ ان کو ڈالنے کا ارادہ کیا جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں اپنے زمانہ کے کنوؤں کو۔ پھر نکال دی جاتی تھیں وہ ناپاکیاں۔ پس جب آیا اسلام تو پوچھا لوگوں نے اس شرعی پاکی کے بارے میں جو اس پاکی پر زائد ہے جو لوگوں کے نزدیک ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانی پاک کرنے والا ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی'' مراد لے رہے ہیں آپ کہ نہیں ناپاک ہوتا ہے اس ناپاکی کے علاوہ جو لوگوں کے پاس ہے۔

اور یہ تاویل (زبردستی کا مطلب) نہیں ہے اور نہ ظاہر سے پھیرنا ہے، بلکہ عربوں کا انداز کلام ہے۔ پس اللہ کا ارشاد: ''کہہ دیجئے: نہیں پاتا میں اس میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی حرام چیز کسی کھانے والے پر'' اس کا مطلب: ان چیزوں میں سے جن میں تم اختلاف کرتے ہو۔ اور جب کسی حکیم سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، پس وہ کہتا ہے: ''اس کا استعمال جائز نہیں'' تو پہچانی جاتی ہے یہ بات کہ مراد جواز کی نفی ہے بدن کی تندرستی کے اعتبار سے اور جب کسی فقیہ سے کسی چیز کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے، پس وہ کہتا ہے: ''جائز نہیں'' تو پہچانا جاتا ہے کہ وہ مراد لے رہا ہے شرعاً جواز کی نفی کو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''حرام کی گئی تم پر تمہاری مائیں'' اور اللہ پاک کا ارشاد: ''حرام کیا گیا تم پر مردار'' پس اول نکاح کے تعلق سے ہے اور ثانی کھانے کے سلسلہ میں ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نکاح نہیں ہے مگر ولی کے ذریعہ'' یہ شرعاً جواز کی نفی ہے، وجود خارجی کی نفی نہیں۔ اور اس قسم کی چیزیں بہت ہیں۔ اور وہ از قبیل تاویل نہیں ہیں۔

☆ ☆ ☆

ماءِ مقید سے حدث زائل نہیں ہوتا، خَبَث زائل ہوتا ہے

پانی کی دو قسمیں ہیں: مطلق اور مقید۔ ماء مطلق: وہ پانی ہے جو لفظ ''پانی'' بولنے سے ذہن میں آتا ہے۔ جیسے بارش، چشمہ اور سمندر کا پانی۔ مطلق کے معنی ہیں: جو صرف پانی کی ذات سے بحث کرے۔ اس میں جو اضافت ہوتی ہے وہ صرف تعریف کے لئے ہوتی ہے۔ اور ماء مقید: وہ پانی ہے جو لفظ ''پانی'' بولنے سے ذہن میں نہ آئے جیسے گلاب کا پانی (عرقِ گلاب) اس میں جو مضاف الیہ ہوتا ہے وہ پانی کی صفت سے بحث کرتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ماء مقید سے وضوء اور غسل کرنا: ایک ایسی بات ہے جس کو سرسری نظر ہی میں ملت کی تعلیمات دفع کر دیتی ہیں یعنی یہ بات ملت کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ہاں اس سے نجاستِ حقیقیہ زائل کی جاسکتی ہے، بلکہ یہی راجح ہے۔

پس اگر بدن یا کپڑا ناپاک ہو جائے اور عرق گلاب وغیرہ سے اس کو دھولیا جائے تو وہ پاک ہو جائے گا۔

[٦] وأما الوضوء من الماء المقيّد، الذى لا يُطلقُ عليه اسمُ الماء بلا قيد، فامرٌ تدفعُهُ الملةُ بادى الرأى،نعم، إزالةُ الخُبثِ به محتمل، بل هو الراجح.

ترجمہ:(٦)اور رہا وضو کرنا، مقید سے جس پر بغیر قید کے لفظ ''پانی'' نہیں بولا جاتا: تو وہ ایک ایسی بات ہے جس کو سرسری نظر ہی میں ملت دفع کرتی ہے۔ ہاں اس کے ذریعہ نجاست کا ازالہ محتمل ہے۔ بلکہ وہی راجح ہے۔

تصحیح: لایُطلق تمام نسخوں میں لایطلق تھا۔ یہ تصحیف ہے۔ میں نے گمان سے تصحیح کی ہے۔

☆ ☆ ☆

فقہ حنفی کے تین مسائل جو منصوص نہیں

احناف نے تین مسائل میں جزئیات پھیلانے میں دراز نفسی سے کام لیا ہے۔ ایک: کنویں میں جانور کے مرنے کا مسئلہ۔ دوسرا: دہ در دہ حوض کا مسئلہ اور تیسرا: ماء جاری کا مسئلہ۔ حالانکہ ان تینوں مسائل میں قطعاً کوئی مرفوع حدیث موجود نہیں ہے۔ اور صحابہ وتابعین سے جو آثار مروی ہیں: مثلاً زمزم کے کنویں میں ایک حبشی گر کر مر گیا، تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کنویں کا سارا پانی نکلوایا تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چوہے کے بارے میں فرمایا کہ (جب وہ پھول گیا ہو تو) سارا پانی نکالا جائے۔ اور امام عامر شعبی اور حضرت ابراہیم نخعی رحمہما اللہ نے بلی جیسے جانور کے کنویں میں مرنے کی صورت میں چالیس تا ستر ڈول نکالنے کا حکم دیا[1] ان تمام آثار کی صحت پر محدثین کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ نہ قرنِ اول کے لوگوں نے ان کو متفقہ طور پر مانا ہے۔

اور اگر ان آثار کی صحت تسلیم کر لی جائے تو احتمال ہے کہ پانی نکلوانا تطییبِ خاطر کے لئے اور پانی کی نظافت کے لئے ہو، وجوب شرعی کے طور پر نہ ہو۔ یہ احتمال مالکیہ کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس احتمال کو ختم کئے بغیر اثبات مدعی کا خیال خاردار ٹہنی کو مٹھی میں لے کر سونتنے کے برابر ہے!

حاصل کلام: یہ ہے کہ ان مسائل میں کوئی ایسی معتبر بات نہیں جس پر شرعاً عمل کرنا واجب ہو۔ اور قلتین کی حدیث اس سلسلہ میں بلاشبہ ایک پختہ بات ہے (پس اسی پر مسائل کی تفریع ہونی چاہئے) اور یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مسائل میں کوئی ایسی چیز مشروع کریں جن کی اہمیت لازمی ارتفاقات سے زیادہ ہو، جو کثیر الوقوع ہوں اور جس میں ابتلاء عام ہو، پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں کوئی صریح حکم بیان نہ فرمائیں۔ اور صحابہ وتابعین میں وہ بات

[1] یہ تمام آثار امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار کے پہلے باب کے آخر میں روایت کئے ہیں ۱۲

شہرت یافتہ نہ ہو، اور ایک بھی شخص کی روایت اس سلسلہ میں موجود نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے؟!

فائدہ:(۱) قلتین کی روایت پر مسائل کی تفریع اس طرح کی جائے گی کہ اگر کنویں میں پانی دو قلّے یا زیادہ ہے، تو اس میں حیوان کے مرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پانی پاک ہے۔ ہاں اگر حیوان پھول پھٹ جائے اور پانی کا کوئی وصف بدل جائے تو کنواں ناپاک ہو جائے گا۔ اس کا سارا پانی نکالنا ہوگا۔

فائدہ:(۲) ابھی اوپر یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ دو در دہ احناف کا اصل مذہب نہیں۔ اصل مذہب یہ ہے کہ پانی کا پھیلاؤ اتنا ہونا چاہئے کہ ایک طرف پانی ہلانے سے دوسری طرف نہ ہلے۔ اور اس کی دلیل غدیر کی حدیث ہے، جو ابن ماجہ میں ہے (حدیث نمبر ۵۲۰ باب الحیاض) اور دہ در دہ تو لوگوں کی سہولت کے لئے مقرر کیا ہوا ایک اندازہ ہے۔ جیسے شوافع اور حنابلہ نے بھی قلتین کی حدیث سے حوض کا اندازہ مقرر کیا ہے۔

اور شاہ صاحب کا یہ فرمانا کہ: ''قلتین کی حدیث أثبت (زیادہ مضبوط) ہے'' یہ بات اول تو مالکیہ نے رد کر دی ہے۔ انھوں نے اس حدیث کی تضعیف کی ہے۔ ثانیاً: احناف کے نزدیک وہ پانی کی تحدید سے متعلق نہیں۔ مائے جاری سے متعلق ہے۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے اور یہ بعد کے احناف کی تاویل نہیں۔ بلکہ خود صاحب مذہب سے مروی ہے۔ تفصیل کے لئے معارف السنن کی مراجعت کریں۔

فائدہ:(۳) صحابہ و تابعین کے آثار کی شہرت نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک آہستہ آہستہ آثار کی اہمیت کم ہوتی تھی۔ اور تدوین حدیث کے تیسرے دور میں تو یہ طے کر دیا گیا تھا کہ آثار صحابہ و تابعین کو حدیث کی کتابوں میں نہ لیا جائے۔ صرف مرفوع روایات لی جائیں۔ اس لئے وہ صحاح و سنن میں موجود نہیں ہیں۔ ورنہ یہ ذہن بننے سے پہلے یہ سب آثار مشہور تھے۔ اور حدیث کی قدیم کتابوں میں موجود ہیں۔

فائدہ:(۴) مالکیہ نے صحابہ و تابعین کے آثار میں جو احتمال پیدا کیا ہے وہ محض بے دلیل ہے۔ اگر اس قسم کے احتمالات کا اعتبار کیا جائے کہ تو کتے کے جھوٹے کو بھی پاک ماننا پڑے گا!

فائدہ:(۵) اور یہ سوال کہ جب چوہا مرنے سے کنواں ناپاک ہو گیا، تو سارا ہی ناپاک ہو گیا۔ پس اس میں سے دس بیس ڈول نکالنے سے کنواں کیسے پاک ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پانی نکالنا مؤثر بالخاصہ ہے یعنی شریعت نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ اتنی مقدار نکال دی جائے تو باقی سارا پانی پاک ہو جائے گا اور مؤثر بالخاصہ کی بات خود شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تیمم کے بیان میں ارشاد فرمائی ہے۔

[۷] وقد أطال القومُ فی فروع موت الحیوان فی البئر، والعشر فی العشر، والماء الجاری، ولیس فی کل ذلك حدیثٌ عن النبی صلی اللہ علیه وسلم ألبتة، وأما الآثار

المنقولة عن الصحابة والتابعين، كأثر ابن الزبير فى الزَّنجِيِّ، وعليٍّ رضى الله عنه فى الفأرة، والنخعيِّ والشعبيِّ فى نحوِ السِّنَّوْرِ، فليست مما يشهد له المحدثون بالصحَّة، ولامما اتفق عليه جمهورُ أهل القرون الأولى، وعلى تقدير صِحَّتِها يمكن أن يكون ذلك تطييبًا للقلوب، وتنظيفًا للماء، لا من جهة الوجوب الشرعى، كما ذُكر فى كتب المالكية، ودونَ نفي هذا الاحتمال خَرْطُ القَتاد!

وبالجملة : فليس فى هذا الباب شيئ يُعتد به، ويجب العملُ عليه، وحديثُ القلتين أثبت من ذلك كلّه بغير شبهة، ومن المحال أن يكون الله تعالى شرع فى هذه المسائل لعباده شيئًا، زيادةً على مالا ينفكون عنه من الارتفاقات، وهى مما يكثر وقوعه، ويعم به البلوى، ثم لايَنُصُّ عليه النبى صلى الله عليه وسلم نصًا جليا، ولا يستفيض فى الصحابة ومن بعدهم، ولا حديثُ واحدٍ فيه، والله أعلم.

ترجمہ:(۷)اور تحقیق دراز نفسی سے کام لیا ہے قوم نے یعنی احناف نے: کنویں میں جانور کے مرنے اور دہ دردہ اور آبِ جاری کی جزئیات میں۔ حالانکہ بالکل نہیں ہے اُن سب مسائل میں نبی ﷺ سے منقول کوئی حدیث۔ اور رہے وہ آثار جو صحابہ وتابعین سے منقول ہیں. جیسے ابن زبیر کا اثر حبشی کے سلسلہ میں، اور علی رضی اللہ عنہ کا اثر چوہے کے بارے میں، اور نخعی اور شعبی کے آثار بلّی کے مانند جانور کے سلسلہ میں۔ پس نہیں ہیں وہ آثار ان روایات میں سے جن کے لئے محدثین صحت کی گواہی دیتے ہوں (یعنی وہ آثار سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں) اور نہ اُن روایات میں سے ہیں جن پر قرونِ اولی کے لوگ عام طور پر متفق ہوں۔ اور ان کی صحت کی تقدیر پر ممکن ہے کہ ہوں وہ آثار دلوں کو خوش کرنے کے لئے اور پانی کی پاکیزگی کے لئے۔ نہ کہ وجوبِ شرعی کے اعتبار سے، جیسا کہ مالکیہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور اس احتمال کی نفی کئے بغیر خاردار ڈالی کو مٹھی میں لے کر سونتا ہے یعنی مدعی ثابت ہونا مشکل ہے۔

اور حاصل کلام: پس نہیں ہے اس سلسلہ میں کوئی ایسی چیز جو قابل لحاظ ہو، اور جس پر عمل ضروری ہو۔ اور قلتین کی روایت بلاشبہ ان سب سے زیادہ پکی بات ہے۔ اور امر محال میں سے ہے یہ بات کہ اللہ تعالی نے مشروع فرمائی ہو ان مسائل میں اپنے بندوں کے لئے کوئی چیز، جو زائد ہو ان معاشی مفید تدابیر سے جن سے لوگ جدا نہیں ہوتے (یعنی جو باتیں از قبیل ارتفاقات لازمہ ہیں ان کے سلسلہ میں تو نص وارد ہونا ضروری نہیں۔ ان کو تو لوگوں کے علوم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مگر جو باتیں اُن سے زائد ہیں اور لوگ از خود ان کو نہیں سمجھ سکتے) اور وہ ان باتوں میں سے ہیں جن کا وقوع بکثرت ہوتا ہے، اور جن میں ابتلا عام ہے، پھر نبی ﷺ اس کی صاف صاف صراحت نہ کریں، اور صحابہ اور ان کے بعد کے لوگوں میں وہ باتیں مشہور نہ ہوں، اور اس سلسلہ میں ایک شخص کی بھی روایت نہ ہو (یہ بات کیسے ممکن ہے؟!) باقی

اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: خرَطَ (ن ض) خرْطَ الورق: ہاتھ سے مار کر پتے جھاڑنا۔ القتاد: ایک درخت ہے جس کے کانٹے سوئی کے مانند ہوتے ہیں۔ پس خرْطَ القتاد کے معنی ہیں: خاردار ڈالی کو مٹھی میں لے کر سوتنا، جس سے ہاتھ کے زخمی ہونے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور یہ محاورہ ہے یعنی بڑی مشکل سے یہ امر حاصل ہوسکتا ہے۔ درخت قتاد کے کانٹے سوتنا اس سے آسان ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۱۴

نجاستوں کو پاک کرنے کا بیان

نجاست کی تعریف: نجاست ہر وہ پلید چیز ہے جس سے سلیم طبیعتوں کو گھن آتی ہے، جس سے لوگ بچتے ہیں، اور اگر وہ بدن یا کپڑوں پر لگ جائے تو اس کو دھوتے ہیں۔ جیسے پاخانہ، پیشاب اور خون۔

ماٰخذ: تطہیر نجاسات کی بات بنیادی طور پر سلیم الطبع لوگوں کی عادات سے لی گئی ہے۔ اور جو باتیں ان کے نزدیک مشہور و مسلّم تھیں اُن سے یہ طریقہ مستنبط کیا گیا ہے۔

لید کا حکم: گھوڑے گدھے کی لید ناپاک ہے۔ دلیل درج ذیل حدیث ہے:

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑے استنجاء کے لئے چلے، تو مجھے حکم دیا کہ میں آپؐ کیلئے تین پتھر مہیا کروں۔ مجھے دو پتھر ملے، تیسرا تلاش کیا مگر نہ ملا، تو میں نے ایک لید لے لی۔ اور انکو آپؐ کے پاس لایا۔ آپؐ نے دو پتھر لے لئے اور لید پھینک دی، اور فرمایا "یہ تو ناپاک ہے" (رواہ البخاری وغیرہ جامع الاصول ۸:۶۷)

ماکول اللحم جانور کا پیشاب: ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب فی نفسہٖ تو ناپاک ہے۔ اس سے سلیم طبیعتوں کو گھن آتی ہے۔ اور عُرنیین کے واقعہ میں جو اونٹوں کا پیشاب پینے کے لئے فرمایا تھا وہ صرف علاج کی ضرورت سے تھا۔ اور امام مالک، امام احمد اور امام محمد رحمہم اللہ جو اس کو پاک کہتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ جو اس کو ناپاک کہتے ہیں، مگر نجاستِ خفیفہ مانتے ہیں، نجاست غلیظہ نہیں مانتے یہ سب باتیں صرف بر بنائے حرج ہیں۔ کیونکہ جن چیزوں میں ابتلا عام ہوتا ہے اُن میں معافی دینا یا تخفیف کرنا شرعی اصولوں میں سے ایک ہے۔

شراب کیوں ناپاک ہے: شراب پر نجاست کی تعریف صادق نہیں آتی۔ لوگ شوق سے اس کو نوش کرتے ہیں۔ تاہم اللہ پاک نے شراب کو نجاست کے ساتھ لاحق کیا ہے، اور اس کو اپنے اس ارشاد سے ناپاک قرار دیا ہے کہ: "وہ

گندی چیز، شیطانی کام ہے" (سورۃ المائدۃ آیت ۹۰) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے شراب کو حرام قرار دیا اور نہایت مؤکد طور پر حرام کیا، تو حکمت خداوندی نے چاہا کہ شراب کو پاخانہ اور پیشاب کے بمنزلہ کر دیا جائے، تاکہ شراب کی برائی لوگوں کی نگاہوں کے سامنے پیکر محسوس بن کر آجائے۔ اور اس کا ناپاک ہونا لوگوں کے نفوس کو شراب سے باز رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرے۔

﴿تطهير النجاسات﴾

النجاسة: كلُّ شيئ يستَقْذِرُه أهلُ الطبائع السليمة، ويتحَفَّظون عنه، ويغسلون الثيابَ إذا أصابها، كالعَذِرَة والبول والدَّم، وأما تطهير النجاسات فهو مأخوذ عنهم، ومستنبطٌ مما اشتهر فيهم، والروثُ رِكْسٌ لحديث ابن مسعود. وبولُ مايؤكل لحمُه: لاشبهة في كونه خَبَثًا، تستَقْذِرُه الطبائع السليمةُ، وإنما يرخَّص في شربه لضرورة الاستشفاء؛ وإنما يُحكم بطهارته، أو بخِفَّةِ نجاسته لدفع الحرج، وألحقَ الشارع بها الخمْر، وهو قوله تعالى: ﴿رِجْسٌ مِّنْ عمل الشَّيْطَانِ﴾ لأنه حَرَّمها، وأكَّد تحريمها، فاقتضت الحكمة أن يجعلها بمنزلة البول والعَذِرَة، ليتمثَّلَ قبحُها عندهم، ويكون ذلك أكْبَح لنفوسهم عنها.

ترجمہ: نجاستوں کو پاک کرنا: نجاست: ہر وہ چیز ہے جس سے سلیم طبیعتیں گھن کرتی ہیں، اور جس سے لوگ بچتے ہیں۔ اور جب وہ کپڑوں کو لگ جاتی ہے تو ان کو دھوتے ہیں۔ جیسے پاخانہ اور پیشاب اور خون —— اور رہا نجاستوں کو پاک کرنا: تو وہ لیا گیا ہے سلیم الطبع لوگوں سے، اور نکالا ہوا ہے اس بات سے جو ان میں مشہور ہے —— اور لید ناپاک ہے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے —— اور ان جانوروں کا پیشاب جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ کوئی شک نہیں اس کے گندہ ہونے میں، اس سے سلیم طبیعتیں گھن کرتی ہیں۔ اور اس کے پینے کی صرف علاج کی ضرورت سے اجازت دی جاتی ہے۔ اور اس کی پاکی کا اور اس کی ناپاکی کے ہلکا ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے صرف تنگی کو رفع کرنے کے لئے (یعنی یہ عارضی احکام ہیں۔ اصل اس کا ناپاک ہونا ہے) —— اور شارع نے نجاست کے ساتھ شراب کو ملایا ہے۔ اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: "گندگی، شیطان کے عمل سے ہے" (یعنی اس ارشاد کے ذریعہ شارع نے شراب کو نجاست کے ساتھ لاحق کیا ہے) اس لئے کہ شارع نے شراب کو حرام کیا ہے اور پختہ کیا ہے اس کی تحریم کو۔ پس حکمت خداوندی نے چاہا کہ گردانیں اللہ پاک شراب کو بمنزلہ پیشاب اور پاخانہ کے، تاکہ شراب کی برائی لوگوں کے سامنے متمثل ہو اور وہ ناپاک ہونا لوگوں کے نفوس کو شراب سے زیادہ باز رکھنے والا ہو۔

☆ ☆ ☆

کتّے کا جھوٹا ناپاک کیوں ہے؟

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں پیئے، تو چاہئے کہ وہ اس کو سات مرتبہ دھوئے (متفق علیہ) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ. ''تم میں سے ایک کے برتن کی پاکی جب کتا اس میں منہ ڈالدے، یہ ہے کہ اس کو سات مرتبہ دھوئے۔ ان کا پہلا مٹی کے ساتھ'' یعنی پہلی مرتبہ مٹی سے مانجھ کر دھوئے (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۰)

تشریح سوال: کتا ایک نیم پالتو جانور ہے۔ اور پالتو جانوروں کے جھوٹے میں ضرورت کی وجہ سے پاکی کا حکم ہونا چاہئے یا کم از کم تخفیف ہونی چاہئے۔ جیسا کہ بلی کے جھوٹے کا معاملہ ہے۔ حالانکہ کتے کا جھوٹا ناپاک اور نجاست غلیظہ ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب. یہ ہے کہ یہ مسئلہ استحسانی ہے۔ قیاس جلی کا تقاضا تو بیشک وہ ہے جو سائل نے بیان کیا۔ اور استحسان کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کے جھوٹے کو ناپاکیوں کے ساتھ لاحق کیا ہے اور اس کو نجاست غلیظہ قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کتا شریعت کی نگاہ میں ایک ملعون جانور ہے، فرشتے اس سے نفرت کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے فرشتے نہیں جاتے (مشکوۃ حدیث ۴۶۳) اور بے ضرورت کتے کو پالنا اور اس سے خلاء میں رکھنا روزانہ ایک قیراط ثواب گھٹا دیتا ہے (مشکوۃ حدیث ۴۰۹۹ باب ذکر الکلب، کتاب الصید)

اور ان سب باتوں کا راز: یہ ہے کہ کتے کی فطرت شیطان کے مشابہ ہے۔ کھیل کود، غصہ، ناپاکیوں میں لتھڑنا اور لوگوں کو ستانا اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اور وہ شیطان کے الہامات قبول کرتا ہے۔ اب دو باتیں ہیں

پہلی بات. نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ لوگ کتوں سے باز نہیں رہتے، اور ان سے احتیاط نہیں برتتے۔ ان سے احتراز میں تساہل سے کام لیتے ہیں یعنی باوجود ایسا ملعون جانور ہونے کے لوگ ان کے پالنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

دوسری بات: کھیتی اور مویشی کی حفاظت کے لئے، چوکی داری کے لئے اور صید افگنی کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ اس لئے ان کے پالنے کی مطلقاً ممانعت کرنا بھی مشکل ہے۔

اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تدبیر یہ نکالی کہ سات مرتبہ برتن کے دھونے کو ایک لازمی شرط قرار دیا۔ اور ایک مرتبہ مٹی سے مانجھنے کا حکم دیا تاکہ لوگ کچھ پریشان ہوں۔ یہ دونوں حکم مل کر لوگوں کو کتوں سے باز رکھنے میں کفارہ کا کردار ادا کریں گے۔

ایک سوال مقدر کا جواب: سوال یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ تو کتے کے جھوٹے کو پاک کہتے ہیں۔ وہ ظرف کو سات مرتبہ دھونے کا حکم تو دیتے ہیں مگر مظروف کو پاک کہتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کو معلوم نہیں کہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ دونوں حکم تشریعی نہیں ہیں، بلکہ ایک طرح کی تاکید ہیں یعنی ہمیں ان کے قول کی دلیل معلوم نہیں۔ مگر

دوسرے حضرات کا مختار یہ ہے کہ یہ احکام تشریعی ہیں ان کے نزدیک ظاہر حدیث کی رعایت اَولی ہے یعنی حدیث سے بہ ظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے اور نجاستِ غلیظہ ہے۔ اور احتیاط بہر حال جمہور کے مذہب میں ہے۔

فائدہ: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سات مرتبہ دھونا برتن کی پاکی کے لئے شرط ہے اور ایک مرتبہ مٹی سے مانجھنا مستحب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی تقریباً یہی مذہب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تین مرتبہ دھونے سے برتن پاک ہو جاتا ہے۔ راوی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہی فتوی ہے۔ اور سات مرتبہ دھونا اور ایک مرتبہ مٹی سے مانجھنا دونوں استحبابی حکم ہیں۔

[۱] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: " إذا شرب الكلبُ فی إناء أحدكم فلْيَغْسِلْهُ سبع مرات" وفی روایة: "أُولاهُنَّ بالتراب"

أقول: ألحَقَ النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم سؤرَ الكلب بالنجاسات، وجعله من أشدِّها، لأن الكلب حَيَوَانٌ ملعون، تتنفَّر منه الملائكة،ويَنْقُصُ اقْتِنَاؤُه والمخالطةُ معه بلاعذر من الأجر كلَّ يوم قيراطاً.

والسر فی كل ذلك : أنه يُشْبِهُ الشيطان بجبلّته، لأن دَيْدَنه لَعِبٌ، وغضَبٌ، واطِّراحٌ فی النجاسات، وإيذاءٌ للناس،ويقبل الإلهامَ من الشياطين، فرأى منهم صدوداً وتهاوناً، ولم يكن سبيلٌ إلى النهی عنه بالكلية لضرورة الزرع والماشيةِ والحِراسةِ والصيد، فعالَج ذلك باشتراط أتم الطهارات وأوكدِها، وما فيها بعضُ الحرج، ليكون بمنزلة الكفارة فی الرَّدْع والمنع

واستشعر بعضُ حملة الملة بأن ذلك ليس بتشريع، بل نوعُ تاكيدٍ؛ واختار بعضُهم رعاية ظاهرِ الحديث؛ والاحتياطُ أفضل.

ترجمہ: (۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں پیئے تو چاہئے کہ وہ اس کو سات مرتبہ دھوئے" اور ایک روایت میں ہے کہ "ان میں سے پہلی مرتبہ مٹی سے"

میں کہتا ہوں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کے جھوٹے کو ناپاکیوں کے ساتھ ملایا ہے۔ اور اس کو سخت ناپاکیوں سے گردانا ہے۔ اس لئے کہ کتا ایک معون جانور ہے۔ اس سے فرشتے نفرت کرتے ہیں۔ اور اس کا بغیر عذر کے پالنا اور اس سے ملنا جلنا روزانہ ایک قیراط کو ثواب میں سے کم کر دیتا ہے۔

اور ان سب میں راز: یہ ہے کہ کتا اپنی فطرت سے شیطان کے مشابہ ہے۔ اس لئے کہ اس کی عادت: کھیل کود، غصہ، ناپاکیوں میں لتھڑنا اور لوگوں کو ستانا ہے۔ اور وہ شیاطین سے الہام قبول کرتا ہے۔ پس: (۱) دیکھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے باز رہنا اور سستی برتنا (۲) اور نہیں تھی کوئی راہ کتے سے بالکلیہ روکنے کی، کھیتی، مویشی، چوکیداری اور شکار کرنے کی ضرورت کی

وجہ سے ـــــ پس علاج کیا آپؐ نے اس کا پاکیوں میں زیادہ تام اور زیادہ مؤکد کو شرط قرار دینے کے: ذریعہ (یعنی سات مرتبہ دھونا ضروری قرار دیا) اور اس چیز کے ذریعہ جس میں کچھ مشقت ہے (یعنی ایک مرتبہ مٹی سے مانجھنے کا حکم دیا تا کہ لوگ کچھ پریشان ہوں) تا کہ ہوئے وہ (یعنی دونوں باتیں مل کر) بمنزلہ کفارہ کے باز رکھنے اور روکنے میں۔

اور بعض علم برداروں کو (یعنی امام مالک رحمہ اللہ کو) احساس ہوا کہ وہ (سات مرتبہ دھونا) کوئی تشریعی امر نہیں ہے، بلکہ ایک طرح کی تاکید ہے۔ اور پسند کیا ان کے بعض نے حدیث کے ظاہر کی رعایت کرنے کو۔ اور احتیاط بہتر ہے۔

لغت: اطَّرَحَه: پھینک دینا۔ تصحیح: والسر فی کل ذلك میں لفظ کل مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

ناپاک زمین پر بہت پانی ڈالنے سے پاک ہو جاتی ہے

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک گنوار کھڑا ہوا پس اس نے مسجد نبوی میں پیشاب کیا۔ پس لے دے کی اس کو لوگوں نے۔ آپؐ نے ان صحابہ سے فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو، اور اس کے پیشاب پر پانی کا ایک بڑا ڈول ڈالو'' (مشکوۃ حدیث ۴۹۱۔ یہ پوری حدیث رحمۃ اللہ الواسعہ ۲ ۵۵ پر گذر چکی ہے)

تشریح: ناپاک زمین پر اگر بہت سارا پانی ڈالا جائے۔ اور وہ زمین میں اتر جائے اور ناپاکی کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو زمین پاک ہو جائے گی۔ اور اس حکم کا مدار اس بات پر ہے جو سبھی لوگوں کے نزدیک مسلّم ہے کہ بہت بارش سے زمین پاک ہو جاتی ہے۔ اور بہت سارا پانی ڈالنے سے بدبو بھی ختم ہو جاتی ہے اور پیشاب بے نشان ہو جاتا ہے۔

فائدہ: امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار کے باب اول میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے گنوار کے پیشاب کرنے کی یہ روایت بیان کی ہے۔ اس میں یہ بات زائد ہے کہ آپ ﷺ کے حکم سے پہلے وہ جگہ کھود ڈالی گئی تھی۔ پھر اس پر پانی ڈالا گیا تھا۔ اب اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو ناپاک مٹی کھود کر باہر ڈال دی گئی تھی تو پانی ڈالنے کا مقصد صرف بدبو ختم کرنا ہے۔ یا کھود کر مٹی نرم کی گئی تھی پھر اس پر پانی ڈالا تھا تو یہ کھودنا اس لئے تھا کہ سارا پیشاب پانی ڈالنے سے زمین میں اتر جائے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " هَرِيقُوْا على بوله سَجْلاً من ماءٍ"

أقول: البول على الأرض: يُطَهِّره مكاثَرَةُ الماء عليه، وهو مأخوذ مما تقرر عند الناس قاطبةً: أن المطر الكثير يطَهِّرُ الأرض، وأن المكاثرة تذهب بالرائحة المنتنة، وتجعل البول متلاشيا كأن لم يكن.

ترجمہ: (۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بہاؤ اس کے پیشاب پر پانی کا ایک بڑا ڈول'' میں کہتا ہوں: زمین پر

پیشاب: پاک کرتا ہے اس کو بہت زیادہ پانی ڈالنا اس پر۔ اور یہ حکم ماخوذ ہے اس بات سے جو ثابت ہے سارے ہی لوگوں کے نزدیک کہ بہت بارش زمین کو پاک کر دیتی ہے، اور یہ کہ بہت زیادہ پانی ڈالنا بدبو کو ختم کرتا ہے اور پیشاب کو مضمحل کرتا ہے، گویا وہ تھا ہی نہیں۔

لغات: هَرَق (ف) هرقًا وأهرق الماء: پانی گرانا السَّجْل: بڑا ڈول جس میں پانی ہو مکاثرة کثرت میں غالب آنا تَلاشَ الشیئ: معدوم ہونا لاشیئ بنانا، مضمحل کرنا۔

☆ ☆ ☆

نجاست کا اثر زائل ہونے سے پاکی حاصل ہوتی ہے

حدیث ـــــ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک خاتون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر کسی عورت کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے تو وہ کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کے کپڑے پر حیض کا خون لگے تو وہ اس کو چٹکیوں سے ملے، پھر پانی سے دھوئے پھر اس میں نماز پڑھے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۴۹۳)

تشریح: جب نجاست اور اس کا اثر (رنگ، بو، مزہ) زائل ہو جائے تو پاکی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لئے کوئی مخصوص طریقہ نہیں۔ اوپر روایت میں جو طریقہ بتایا ہے یا فقہ کی کتابوں میں جو لکھا ہے کہ تین بار کپڑے کو دھوئے۔ اور ہر بار نچوڑے، یہ سب ایسی صورتوں کا بیان ہے جن سے ناپاکی اور اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ سرسری دھونے سے خون اگرچہ نکل جائے گا مگر اس کا اثر (دھبہ) رہ جائے گا۔ اس لئے چٹکیوں سے ملنے کا حکم دیا۔ یہ ایک تنبیہ ہے، شرط نہیں ہے۔ شرط نجاست اور اس کے اثر کا ازالہ ہے۔ الا یہ کہ اثر کا ازالہ دشوار ہو، کپڑا نجاست کا رنگ پکڑ لے تو پھر رنگ کا ازالہ ضروری نہیں۔

> [۳] قوله صلى الله عليه وسلم " إذا أصاب ثوب إحداكن الدمُ من الحيضة فلتقرُصْهُ، ثم لتنضحْهُ بماء، ثم لتصلِّ فيه"
>
> أقول: تحصل الطهارةُ بزوال عين النجاسة وأثرها، وسائرُ الخصوصيات بيانٌ لصورة صالحة لزوالهما، وتنبيهٌ على ذلك، لا شرط

ترجمہ: (۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ''جب پہنچے تم میں سے کسی ایک کے کپڑے کو حیض کا خون، پس چاہئے کہ (بھٹکا کر) اس کو چٹکیوں سے ملے، پھر چاہئے کہ دھوئے وہ اس کو پانی سے، پھر چاہئے کہ نماز پڑھے وہ اس میں'' یعنی اب کپڑا بالکل پاک ہو گیا۔ اس میں نماز پڑھ سکتی ہے۔

میں کہتا ہوں: پاکی حاصل ہوتی ہے نجاست کی عین اور اس کے اثر کے زائل ہونے سے۔ اور دیگر خصوصیات

(یعنی دھونے کے طریقے) بیان ہیں ایک مناسب صورت کا ان دونوں چیزوں کے زائل ہونے کے لئے۔ اور تنبیہ ہیں اس پر شرط نہیں ہیں۔

لغات: الحیضة (بکسر الحاء المهملة) حیض کو بھی کہتے ہیں اور حیض کے چیتھڑے کو بھی۔ یہاں اول معنی مراد ہیں ۔ قرصَ (ن) قرصًا الثوب بالماء: انگلیوں کے پوروں سے دھونا نضح (ف، ض) نَضْحًا البیت بالماء: پانی چھڑکنا۔ مگر اس حدیث میں بالاتفاق دھونا مراد ہے۔

☆ ☆ ☆

منی ناپاک ہے مگر خشک منی کُھرچ دینے سے کپڑا پاک ہوجاتا ہے

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک منی پاک ہے یعنی اس کے ساتھ نماز ہوجاتی ہے۔ اور اس کا ازالہ ایسا ہے جیسا بلغم اور رینٹ کا ازالہ۔ اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک منی ناپاک ہے۔ پھر امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بدن اور کپڑے کو پاک کرنے کے لئے دھونا ہی ضروری ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک بدن کو تو دھونا ہی ضروری ہے۔ مگر کپڑے پر اگر منی خشک ہوجائے اور وہ جسم دار ہو یعنی پیشاب کی طرح پتلی نہ ہو تو اس کو اچھی طرح کھرچ ڈالنے سے بھی کپڑا پاک ہوجاتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اظہر[1] یہ ہے کہ منی ناپاک ہے۔ کیونکہ اس سے سلیم طبیعتیں گھن کرتی ہیں۔ اور لوگ اس سے بچتے ہیں۔ اور اگر وہ بدن یا کپڑوں پر لگ جاتی ہے تو اس کو دھوتے ہیں۔ اور یہی نجاست کی تعریف ہے جو پہلے گذر چکی ہے یعنی امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کی رائے دلیل کے اعتبار سے مرجوح ہے۔ کیونکہ کسی حدیث میں یہ بات نہیں آئی کہ آپؐ نے کبھی کسی ایسے کپڑے میں نماز پڑھی ہو جس میں منی لگی ہو۔ اور نہ تو اس کو دھویا ہو اور نہ ہی کھرچ کر صاف کیا ہو۔ اگر منی پاک ہوتی تو بیانِ جواز کے لئے ایک ہی بار سہی، ایسا عمل ضرور ہوتا۔ اور یہ بات بھی اظہر ہے کہ خشک منی کو جبکہ وہ جسم دار ہو کھرچ دینے سے بھی کپڑا پاک ہوجاتا ہے یعنی امام مالک رحمہ اللہ کی رائے بھی دلیل کے اعتبار سے مرجوح ہے۔ کیونکہ مسلم شریف کی روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؐ نے ایک بار ایسے کپڑے میں نماز ادا فرمائی ہے جس پر سے منی دھوئی نہیں گئی تھی، صرف کھرچ دی گئی تھی۔

[٤] وأما المني: فالأظهر أنه نَجَسٌ لوجود ما ذكرنا في حد النجاسة، وأن الفرك يُطَهِّرُ يابِسه إذا كان له جِرْمٌ.

[1] اظہر فتوی کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے دلیل کے اعتبار سے راجح۔ اس کا مقابل ظاہر ہے یعنی دلیل کے لحاظ سے مرجوح ۱۲

ترجمہ: (۴) اور رہی منی: سو اظہر یہ ہے کہ وہ ناپاک ہے۔ اس بات کے پائے جانے کی وجہ سے جس کو ہم نے ذکر کیا ہے نجاست کی تعریف میں۔ اور اظہر یہ ہے کہ کھرچنا پاک کر دیتا ہے خشک منی کو جبکہ اس کے لئے جرم ہو۔

☆ ☆ ☆

شیر خوار بچے اور بچی کے پیشاب کا حکم

حدیث ـــــ حضرت ابوالسمح رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لڑکی کے پیشاب سے (کپڑا) دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جاتا ہے'' (رواہ ابوداؤد حدیث ۳۷۶ والنسائی، مشکوۃ حدیث ۵۰۲)

تشریح: بچہ جب تک شیر خوار ہے یعنی اس نے باہر کی غذا دودھ وغیرہ لینی شروع نہیں کی تو بھی اس کا پیشاب بالاتفاق ناپاک ہے۔ مگر پاک کرنے کے طریقے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک لڑکے کے پیشاب پر اتنا چھینٹا دے دینا کافی ہے کہ کپڑا بھیگ جائے۔ دھونا ضروری نہیں۔ اور لڑکی کے پیشاب کو بڑے آدمی کے پیشاب کی طرح دھونا ضروری ہے۔ اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں کے پیشاب کو دھونا ضروری ہے۔ البتہ لڑکی کے پیشاب کو مبالغہ کے ساتھ یعنی اچھی طرح، دیگر نجاستوں کی طرح، دھونا ضروری ہے۔ اور لڑکے کے پیشاب کو ہلکا دھونا بھی کافی ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں:

لڑکی اور لڑکے کے پیشاب میں فرق کرنا ایک ایسی بات ہے جو زمانۂ جاہلیت سے مسلّم چلی آ رہی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو باقی رکھا ہے۔ اور یہ فرق بچند وجوہ ہے۔

پہلی وجہ: لڑکا جب کپڑے پر پیشاب کرتا ہے تو عضو باہر ہونے کی وجہ سے اور ہلنے کی وجہ سے پیشاب اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتا ہے اور ازالہ دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے شریعت نے اس کے معاملہ میں تخفیف کی ہے۔ اور لڑکی کی صورت حال مختلف ہے، اس لئے اس کا پیشاب ایک جگہ گرتا ہے اور اس کا دھونا آسان ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت نے اس کے معاملہ میں آسانی نہیں کی (یہ وجہ قابلِ غور ہے)

دوسری وجہ: لڑکی کا پیشاب نسبۃً زیادہ گاڑھا اور زیادہ بدبودار ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت نے دونوں کے طریقۂ تطہیر میں فرق کیا ہے۔

تیسری وجہ: لڑکے کو لوگ ہر وقت اٹھائے پھرتے ہیں، اور لڑکی سے احتراز کرتے ہیں۔ اس لئے ابتلائے عام کی وجہ سے اول میں تخفیف کی اور ثانی میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مذکورہ حدیث کو اہل مدینہ (شافعی واحمد) اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ نے لیا ہے۔ اور احناف کے یہاں مشہور یہ ہے کہ

دونوں کے پیشاب میں کوئی فرق نہیں۔مگر یہ صحیح نہیں۔امام محمد رحمہ اللہ نے موطا میں اس مسئلہ میں یہ بات بڑھادی ہے یعنی ڈھیلی کردی ہے۔وہ فرماتے ہیں: قد جاءت رخصةٌ في بول الصبي إذا كان لم يأكل الطعام، وأُمرَ بغسل بول الجارية، وغَسلهما جميعًا أحب إلينا، وهو قولُ أبي حنيفة رحمه الله یعنی لڑکے نے جب تک کھانا نہیں کھایا،اس کے پیشاب میں سہولت آئی ہے۔اور لڑکی کے پیشاب کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔فرماتے ہیں.اور دونوں کو دھونا ہمیں زیادہ پسند ہے۔اور یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے ہے یعنی دونوں پیشاب یکساں دھونا یہ صرف احتیاط کی بات ہے اور استحباب کا درجہ ہے۔پس احناف میں جو مشہور ہے اس سے دھوکا نہ کھایا جائے۔

فائدہ: مگر شریعت نے رخصت غَسلِ خفیف کی دی ہے۔چھینٹا دینے کی اجازت نہیں دی۔خود امام محمد رحمہ اللہ نے مذکورہ عبارت کے بعد ایک اور حدیث روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بچہ لایا گیا۔اس نے آپؐ کے کپڑے پر پیشاب کردیا۔آپؐ نے پانی منگوایا۔اور اس کو پیشاب کے پیچھے کیا یعنی پانی پیشاب پر ڈالا۔تاکہ پیشاب دوسری طرف نکل جائے۔اس حدیث کو لکھ کر امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قال محمد: بهذا نأخذ، نُتبِعُه إياه غسلاحتى تُنَقِّيَه، وهو قولُ أبي حنيفة رحمه الله (موطا محمد باب الغسل من بول الصبی۔ص۶۵ مع حاشیہ ابی الحسنات) یعنی امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث پر ہمارا عمل ہے۔تو پانی پیشاب کے پیچھے کر دھونے کے طور پر، یہاں تک کہ صاف کردے تو پیشاب کو۔اور یہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے ہے۔اس عبارت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رخصت غَسلِ خفیف کی ہے۔صرف چھینٹا دینے سے کپڑا پاک نہ ہوگا۔

[٥] قوله صلى الله عليه وسلم: "يُغسل من بول الجارية، ويُرَشُّ من بول الغلام"

أقول: هذا أمر كان قد تقرر في الجاهلية، وأبقاه النبي صلى الله عليه وسلم، والحامل على هذا الفرق أمورٌ:

منها: أن بول الغلام ينتشر فيَعْسُرُ إزالتُه، فيناسبه التخفيف، وبولَ الجارية يجتمع فيسهُل إزالتُه.

ومنها: أن بول الأنثى أغلظ وأنتن من بول الذكر.

ومنها: أن الذكر ترْغَبُ فيه النفوسُ، والأنثى تَعافُها.

وقد أخذ بالحديث أهل المدينة، وإبراهيم النخعي، وأضجع فيه القولَ محمدٌ، فلا تَغْتَرَّ بالمشهور بين الناس.

ترجمہ:(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:"(کپڑا اچھی طرح) دھویا جائے لڑکی کے پیشاب سے،اور پانی چھڑکا جائے (یا ہلکا دھویا جائے) لڑکے کے پیشاب سے" میں کہتا ہوں: یہ ایک ایسی بات ہے جو طے شدہ تھی زمانۂ جاہلیت

میں۔اور باقی رکھا اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے۔اور اس فرق پر ابھارنے والی چند باتیں ہیں:

ان میں سے: یہ ہے کہ لڑکے کا پیشاب پھیل جاتا ہے۔پس دشوار ہوتا ہے اس کا ازالہ، پس تخفیف اس کے مناسب ہے۔اور لڑکی کا پیشاب مجتمع ہوتا ہے، پس آسان ہے اس کا ازالہ۔اور ان میں سے: یہ ہے کہ لڑکی کا پیشاب لڑکے کے پیشاب سے زیادہ گاڑھا اور زیادہ بدبودار ہوتا ہے۔اور ان میں سے: یہ ہے کہ لڑکے میں نفوس رغبت کرتے ہیں۔اور لڑکی سے نفوس احتراز کرتے ہیں۔

اور تحقیق لیا ہے حدیث کو اہل مدینہ نے اور ابراہیم نخعی نے۔اور لٹایا ہے اس مسئلہ میں بات کو امام محمد نے۔پس نہ دھوکا کھا تو لوگوں (احناف) کے درمیان مشہور بات سے۔

إفادات: قال العلامة السندي رحمه الله: قوله: والأنثى تعافُّها: بتشديد الفاء، أي: تمتنع النفوس من الأنثى، وتحتزر منها، لعدم ترعه فيها بالنسبة إلى الذكر، فغلّظ في بولها لعدم البلوى۔ قوله: وأضجع فيه القول محمدٌ: الإضجاع بالسين وسنت كردن أي لم يغلّظ ولم يشدّد في بول الغلام، بل أجرى الكلام فيه بنحوٍ يُفهم منه مافُهم من الحديث بالتصريح، فلا تغترَّ بالمشهور بين الناس: من أن بول الغلام نجاسة غليظة كبول الجارية عند الأحناف بلاخلاف اهـ وقال: الناس أي: الحنفية اهـ (تقریر قلمی)

☆ ☆ ☆

دباغت سے چمڑا پاک ہونے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''کچا چمڑا جب رنگ دیا جائے، تو وہ یقیناً پاک ہو جاتا ہے'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۴۹۸)

تشریح: یہ حکم بھی قدیم عادات سے ماخوذ ہے۔حیوانات کے رنگے ہوئے چمڑوں کے استعمال کا لوگوں میں عام رواج تھا۔اور پاکی کی وجہ یہ ہے کہ دباغت سے چمڑے کی سڑاند اور بدبو دور ہو جاتی ہے۔

جوتے موزے مٹی میں رگڑ جانے سے پاک ہو جاتے ہیں

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے چپل سے ناپاکی کو روندے تو مٹی بیشک اس کے لئے پاکی کا سامان ہے'' (یعنی ناپاکی لگنے کے بعد جب وہ پاک جگہ میں چلے گا اور وہ ناپاکی صاف ہو جائے گی تو چپل پاک ہو جائے گا) (مشکوٰۃ حدیث ۵۰۲)

تشریح: جوتے چپل اور موزے پر جسم دار ناپاکی جیسے پاخانہ گوبر وغیرہ لگ جائے اور ان کو مٹی سے رگڑ دیا جائے تو

وہ پاک ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ٹھوس اجسام ہیں۔ ناپاکی ان میں سرایت نہیں کرتی۔ پس ناپاکی خواہ تر ہو یا خشک ظاہر یہ ہے کہ وہ پاک ہوجائیں گے۔

نوٹ: وہ ناپاکیاں جو جسم دار نہیں ہیں جیسے پیشاب، شراب وغیرہ ان کا دھونا ہی ضروری ہے۔

[٦] قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا دُبِغ الإهابُ فقد طَهُرَ"

أقول: استعمالُ جلود الحيوانات المدبوغةِ أمر شائع مسلمٌ عند طوائف الناس. والسِّرُّ فيه: أن الدباغ يُزيل النتنَ والرائحة الكريهة.

[٧] قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا وطِئ أحدُكم بنَعله الأذى، فإن التراب له طَهور"

أقول: النعل والخف: يطْهُرَان من النجاسة التى لها جرْمٌ بالدلك، لأنه جسم صلب لايتخلل فيه النجاسة، والظاهر أنه عام فى الرطبة واليابسة.

ترجمہ: (٦) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "کچا چمڑا جب رنگ دیا گیا تو وہ یقیناً پاک ہوگیا" میں کہتا ہوں: حیوانات کے رنگے ہوئے چمڑوں کا استعمال: لوگوں کی تمام جماعتوں کے نزدیک شائع اور ایک مسلّم امر تھا۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ دباغت سڑاند اور بدبو کو زائل کرتی ہے۔

(٧) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "جب تم میں سے کوئی اپنے چپل سے ناپاکی کو روندے تو بیشک مٹی اس کے لئے پاکی کا سامان ہے"۔

میں کہتا ہوں: چپل اور موزہ: دونوں پاک ہوجاتے ہیں اس ناپاکی سے جس کے لئے جسم ہے رگڑنے سے۔ اس لئے کہ وہ (یعنی ہر ایک) سخت جسم ہے، اس میں ناپاکی نہیں گھستی۔ اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم تر اور خشک ناپاکی کو عام ہے۔

☆ ☆ ☆

"بلّی ناپاک نہیں" کا مطلب

حدیث ـــــ حضرت ابوقتادہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے بلی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے: إنّها ليستْ بِنَجسٍ؛ إنها من الطوافين عليكم أو الطوافات یعنی بلی کا جھوٹا یا خود بلی ناپاک نہیں ہے۔ بیشک وہ تمہارے پاس آنے جانے والوں اور آنے جانے والیوں میں سے ہے (مشکوۃ حدیث ۴۸۲ و ۴۸۳)

تشریح: اس حدیث کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں: پہلا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں مجاز بالحذف ہے: إنها أي إن سؤرها یعنی بلی کا جھوٹا ناپاک نہیں ہے۔ اس صورت میں حدیث کے دوسرے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ بلی

اگرچہ ناپاکیوں میں منہ ڈالتی ہے اور چوہے مارتی ہے، مگر اس کے جھوٹے کو پاک قرار دینے کی ضرورت ہے۔ پس رفع ضرورت کے لئے ـــــ جو ایک شرعی اصل ہے ـــــ بلی کے جھوٹے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا مطلب: یہ ہے کہ بلی خود ناپاک نہیں۔ اگر وہ کپڑوں پر بیٹھے یا جسم سے لگے تو کوئی حرج نہیں۔ (اس صورت میں حدیث میں کچھ محذوف نہیں ہوگا) اور حدیث کے آخری حصہ کا مطلب یہ ہے کہ بلی کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنا چاہئے۔ کیونکہ شریعت نے ہر جاندار کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ایک شخص نے پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی تو اللہ نے اس کو جزائے خیر دی تھی اور اس کی بخشش فرمادی تھی۔ جب آپؐ نے یہ بات بیان کی تو صحابہ نے دریافت کیا: کیا چوپایوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: فی کلّ کبدٍ رَطْبةٍ أجْر (بخاری حدیث ۲۳۶۳) یعنی ہر تر جگر والی مخلوق (جاندار) کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں ثواب ہے۔

فائدہ: طوافین اور طوافات سے مراد مانگنے والے مرد وزن ہیں۔ آپؐ نے بلی کو ان کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم في الهرة: " إنها من الطوافين عليكم أو الطوافات"

أقول: معناه على قولٍ: إن الهرة وإن كانت تَلغُ في النجاسات وتقتل الفأرة، فهنالك ضرورة في الحكم بتطهير سؤرها؛ ودفعُ الحرج أصلٌ من أصول الشرع. وعلى قولٍ آخر: حثٌ على الإحسانِ على كل ذاتِ كَبِدٍ رَطْبةٍ، وشبَّهها بالسائلين والسائلات، والله أعلم.

ترجمہ: (۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بلی کے بارے میں ارشاد: ''بیشک وہ تمہارے پاس آنے جانے والوں اور آنے جانے والیوں میں سے ہے'' میں کہتا ہوں اس کا مطلب ایک قول پر (یعنی ان لوگوں کے قول پر جو بلی کا جھوٹا پاک کہتے ہیں) یہ ہے کہ بلی اگرچہ ناپاکیوں میں منہ ڈالتی ہے اور چوہے مارتی ہے، پس وہاں ضرورت ہے حکم کرنے کی اس کے جھوٹے کی پاکی کا۔ اور تنگی کو رفع کرنا اصولِ شرع میں سے ایک اصل ہے۔ اور دوسرے قول پر (یعنی ان لوگوں کے قول پر جو بلی کا جھوٹا مکروہ کہتے ہیں) ترغیب دینا ہے احسان کرنے کی ہر تر جگر والے کے ساتھ ـــــ اور تشبیہ دی ہے آپؐ نے بلی کو مانگنے والوں اور مانگنے والیوں کے ساتھ۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(الحمدللہ! آج ۶ ذی قعدہ ۱۴۲۲ھ کو ابواب الطہارۃ کی شرح مکمل ہوئی)

دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حِکم کا بیان

کتاب الصلاۃ

باب (۱) نماز کے سلسلہ کی ایک اصولی بات
باب (۲) نماز کی فضیلت کا بیان
باب (۳) نماز کے اوقات
باب (۴) اذان کا بیان
باب (۵) مساجد کا بیان
فصل : آداب مسجد کا بیان
باب (۶) نمازی کا لباس
باب (۷) قبلہ کا بیان
باب (۸) سُترہ کا بیان
باب (۹) نماز میں ضروری امور
باب (۱۰) نماز کے اذکار اور مستحب ہیئتیں
باب (۱۱) وہ امور جو نماز میں جائز نہیں اور سجدۂ سہو و تلاوت
فصل اول: سجدۂ سہو کی حکمت
فصل دوم: سجود تلاوت کا بیان
باب (۱۲) نوافل کا بیان
باب (۱۳) عبادت میں میانہ روی کا بیان
باب (۱۴) معذوروں کی نماز کا بیان
باب (۱۵) جماعت کا بیان
باب (۱۶) جمعہ کا بیان
باب (۱۷) عیدین: عید الفطر اور عید الاضحیٰ
باب (۱۸) جنائز کا بیان
فصل : جنائز سے متعلق احادیث کی شرح

باب ـــــــ ۱

نماز کے سلسلہ کی ایک اصولی بات

یہ بات جان لینی چاہئے کہ نماز تمام عبادتوں میں ایک عظیم الشان عبادت ہے۔ وہ آدمی کے ایمان کی واضح دلیل ہے حدیث میں ہے کہ جو بندہ اہتمام سے نماز ادا کرے گا، تو قیامت کے دن وہ نماز اس کے لئے نور ہوگی، اور دلیل ہوگی، اور اس کی نجات کا ذریعہ بنے گی (مشکوٰۃ حدیث ۵۷۸) اور نماز لوگوں میں مشہور و معروف عبادت ہے اور نفس کی اصلاح کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش چیز ہے۔ چنانچہ شارع علیہ السلام نے اس کی فضیلت، اس کے اوقات و شروط اور ارکان و آداب کی تعیین اور اس کی رخصتوں اور نفل نمازوں کے بیان کا ایسا اہتمام کیا ہے جیسا اہتمام دیگر طاعات کا نہیں کیا۔ اور شارع نے اس کو اہم شعائر دین میں سے قرار دیا ہے۔ اور نماز یہود و نصاریٰ، مجوس اور ملت اسماعیل پر باقی ماندہ لوگوں میں ایک مسلمہ عبادت تھی۔ اس لئے شارع علیہ السلام نے اس کے اوقات کی تعیین میں اور اس سے تعلق رکھنے والی دیگر باتوں میں انہی باتوں کو پیش نظر رکھا ہے جو لوگوں میں یا تو متفق علیہ تھیں یا اُن پر جمہور متفق تھے۔

اور جو باتیں از قبیل تحریفات تھیں: مثلاً یہود موزوں اور جوتوں میں نماز کو جائز نہیں کہتے تھے، ایسی باتوں کے سلسلہ میں ضروری تھا کہ ان کے ترک کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے، تاکہ مسلمانوں کا طریقہ ان کے طریقہ سے ممتاز ہو جائے۔ اسی طرح مجوس نے سارا ہی دین بگاڑ لیا تھا۔ وہ سورج کی پرستش کرنے لگے تھے، اس لئے ملت اسلامیہ کو ان کی ملت سے بھی پوری طرح ممتاز کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کو ان کی عبادت کے اوقات میں نماز کی ممانعت کر دی گئی۔

ملحوظہ: چونکہ نماز کے احکام بہت پھیلے ہوئے ہیں اور جن اصولوں پر اس کا مدار ہے وہ بھی بہت ہیں، ۱۲ لئے یہاں کتاب الصلوٰۃ کے شروع میں اُن اصولوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ کتاب الطہارہ وغیرہ کتابوں کے شروع میں ان کے اصولوں کو ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر فصل کی اصل کو اس فصل کے شروع میں ذکر کیا جائے گا۔

﴿من أبواب الصلاة﴾

اعلم: أن الصلاةَ أعظمُ العبادات شأنا، وأوضحُها برهانا، وأشهرها فی الناس، وأنفعُها فی

النفس، ولذلك اعتنى الشارعُ ببيانِ فضلِها، وتعيينِ أوقاتها وشروطِها وأركانها وآدابها ورُخَصِها ونوافِلِها اعْتِناءً عظيمًا لم يفعل مثلَه فى سائر أنواع الطاعات؛ وجَعَلَها من أعظمِ شعائرِ الدين، وكانت مسلمةً فى اليهود والنصارى والمجوس وبقايا الملة الإسماعيلية، فوجب أن لايَذْهَبَ فى توقيتها وسائرِ ما يتعلَّق بها إلا إلى ما كان عندهم من الأمور التى اتفقوا عليها، أو اتفق عليها جمهورُهم.

وأما ماكان من تحريفهم، ككراهيةِ اليهود الصلاةَ فى الخفاف والنعال ونحو ذلك، فمن حقِّه: أن يُسَجَّلَ على تركه، وأن يُجْعَلَ سنةُ المسلمين غيرَ سنةِ هؤلاء. وكذلك كان المجوس حَرَّفوا دِينَهم، وعبدُوا الشمس، فوجب أن تُمَيَّزَ ملةُ الإسلام من ملَّتهم غايةَ التمييز، فَنُهِىَ المسلمون عن الصلاة فى أوقات صلواتهم أيضًا.

ولاتِّساعِ أحكامِ الصلاة، وكثرةِ أصولها التى تُبنى عليها، لم نَذْكُرِ الأصولَ فى فاتحةِ كتاب الصلاة، كما ذكرنا فى سائر الكتب، بل ذكرنا أصلَ كلِّ فصل فى ذلك الفصل.

ترجمہ: نماز کے تمام ابواب سے متعلق ایک اصولی بات: جان لیں کہ نماز تمام عبادتوں میں بڑی ہے شان کے اعتبار سے اور زیادہ واضح ہے دلیل کے اعتبار سے۔ اور عبادات میں سب سے زیادہ مشہور ہے لوگوں میں۔ اور ان میں سب سے زیادہ مفید ہے نفس کے لئے۔ اور اسی وجہ سے شارع نے اہتمام کیا ہے اس کی فضیلت اور اس کے اوقات وشروط اور اس کے ارکان وآداب اور اس کی رخصتوں اور نفلوں کو بیان کرنے کا، ایسا اہتمام کرنا کہ نہیں کیا ہے اس کے مانند طاعات کی دیگر انواع میں۔ اور اس کو دین کے اہم شعائر میں سے گردانا ہے۔ اور نماز ایک مسلمہ عبادت تھی یہود ونصاری، مجوس اور ملت اسماعیلی پر باقی ماندہ لوگوں میں۔ پس ضروری ہوا کہ نہ جائے شارع اس کے اوقات کی تعیین میں اور اُن دیگر باتوں میں جو نماز سے تعلق رکھتی ہیں، مگر اس بات کی طرف جو ان کے پاس تھی اُن امور میں سے جن پر وہ متفق تھے یا اُن پر اُن کے جمہور متفق تھے۔

رہی وہ باتیں جو ان کی تحریف سے تھیں، جیسے یہود کا موزوں، چپلوں اور اس قسم کی چیزوں میں نماز کو ناپسند جاننا، تو اس کے حق میں سے یہ بات تھی کہ اس کے چھوڑنے کا فیصلہ کردیا جائے۔ اور یہ کہ گردانا جائے مسلمانوں کا طریقہ ان کے طریقہ کے علاوہ۔ اور اسی طرح مجوس نے اپنے دین میں تحریف کرڈالی تھی اور وہ سورج کی پوجا کرنے لگے تھے۔ پس ضروری ہوا کہ ممتاز کردیا جائے ملت اسلامیہ کو ان کی ملت سے پوری طرح ممتاز کرنا، چنانچہ روکے گئے مسلمان ان کی نماز کے اوقات میں نماز پڑھنے سے بھی۔

اور نماز کے احکام کے وسیع ہونے کی وجہ سے، اور اس کے اصولوں کی کثرت کی وجہ سے جن پر نماز کا مدار رکھا گیا ہے: نہیں ذکر کیا ہم نے اصولوں کو کتاب الصلوٰۃ کے شروع میں، جیسا ذکر کیا ہے ہم نے دیگر کتابوں میں۔ بلکہ ذکر کریں گے ہم ہر فصل کی اصل کو اُسی فصل میں۔

تصحیح: لم یفعل مثلہ میں مثلہ اور أو اتفق میں أو مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے، پہلے واو تھا۔

☆ ☆ ☆

سات سال کی عمر میں نماز کا حکم اور دس سال کی عمر میں سختی کرنے کی وجہ

حدیث ——— حضرت عبداللہ بن عمر ورضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی اولاد کو جب وہ سات سال کے ہو جائیں نماز کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز (چھوڑنے) پر ان کو مارو۔ اور خوابگاہوں میں ان کو جدا کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۷۲)

تشریح: سوال: بچہ بالغ پندرہ سال میں ہوتا ہے۔ یا جب اس سے پہلے بلوغ کی علامت پائی جائے بالغ ہوتا ہے۔ بہر حال لڑکا بارہ سال سے پہلے بالغ نہیں ہوتا۔ پھر سات سال کی عمر میں نماز کا حکم اور دس سال کی عمر میں نماز کے سلسلہ میں اس پر سختی کیوں کی گئی، جبکہ ابھی وہ مکلف نہیں ہوا؟

جواب: انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے: عقل اور جسم۔ اصل جوہر عقل ہے، جسم تو جانوروں کو بھی ملا ہے، مگر اس کی بھی ایک اہمیت ہے۔ اور شعور کی ابتداء عام طور پر سات سال کی عمر میں ہوتی ہے۔ اور دس سال کی عمر میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور پندرہ سال میں عقل و جسم میں پختگی آتی ہے۔ غرض بچہ تین مرحلوں سے گذر کر مرد بنتا ہے: ابتدائی مرحلہ سات سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے، اور آخری مرحلہ پندرہ سال کی عمر ہے۔ اور درمیانی مرحلہ دس سال ہیں ——— اِدھر نماز قرب خداوندی کا ذریعہ اور جہنم سے بچانے والی عبادت ہے۔ اور اسلام کا ایک ایسا لازمی شعار ہے جس سے کبھی صرف نظر نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے شعور سنبھالتے ہی نماز کا حکم دیا گیا، تاکہ انسان پہلی فرصت میں اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کی سعی اور جہنم سے بچنے کا سامان شروع کر دے۔ اور اس کو مکلف آخری مرحلہ میں بنایا گیا جبکہ اس کی عقل و جسم میں پختگی آجاتی ہے۔ روزہ، زکوٰۃ کی طرح نماز بھی اسی مرحلہ میں لازم ہوتی ہے۔ اور درمیانی مرحلہ (دس سال کی عمر) چونکہ ذو جہتین ہے، اس لئے اس کے لئے دونوں مرحلوں سے حصہ رکھا گیا۔ اس عمر میں نماز کا فرض نہ ہونا یہ ابتدائی مرحلہ کا اثر ہے، اور کوتاہی پر پٹائی یہ آخری مرحلہ کا نصیب ہے۔

یہ شاہ صاحب قدس سرہ کی بات کا نچوڑ ہے۔ اب یہی بات شاہ صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

بچہ کا بلوغ دو مرحلوں میں ہوتا ہے:

ابتدائی مرحلہ: نفسیاتی تندرستی اور بیماری کی صلاحیت پیدا ہونے کا زمانہ ہے۔ بچہ میں عقل کا پیدا ہونا نفسیاتی تندرستی ہے۔ اور اس کا بے عقل رہ جانا نفسیاتی بیماری ہے۔ اور سات سال ظہور عقل کی علامت ہیں۔ اس عمر میں بچہ کی حالت میں واضح تبدیلی آتی ہے۔ اور دس سال عقل کی تکمیل کی علامت ہیں۔ اگر بچہ کا مزاج صحیح سالم ہو تو وہ دس سال کی عمر میں عقلمند ہو جاتا ہے۔ اپنا نفع ونقصان سمجھنے لگتا ہے۔ اور تجارت وغیرہ کاموں میں ہوشیار ہو جاتا ہے۔

آخری مرحلہ: وہ ہے جب بچہ میں جہاد کرنے کی اور حدود انگیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اور اس پر دارو گیر درست ہوتی ہے، جس مرحلہ میں وہ پورا مرد بن جاتا ہے اور مردوں کی طرح مشقتیں اور تکالیف برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، اور ملکی اور ملی معاملات میں اس کا حال قابلِ لحاظ ہو جاتا ہے مثلاً ووٹ دینے اور امامت کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور صراط مستقیم پر گامزن کرنے کے لئے اس پر زبردستی کی جاسکتی ہے۔ بلوغ کے اس مرحلہ کا مدار عقل کے کمال اور جسم کے مضبوط ہونے پر ہے۔ اور یہ بات عام طور پر پندرہ سال کی عمر میں حاصل ہو جاتی ہے ——— اور اگر بچہ کی عمر معلوم نہ ہو تو احتلام اور زیر ناف اُگنے سے اس کے بلوغ کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ چیزیں بھی منجملہ علامات بلوغ ہیں۔

اور نماز کی بھی دو جہتیں ہیں:

پہلی جہت: نماز قرب خداوندی کا ذریعہ ہے۔ اور جہنم کے کھڈ میں گرنے سے بچانے والی عبادت ہے۔ اس لئے بلوغ کے ابتدائی مرحلہ ہی میں اس کا حکم دیا گیا۔

دوسری جہت: نماز اسلام کا ایک ایسا شعار ہے جس میں کوتاہی پر لوگوں کی دارو گیر کی جاتی ہے۔ اور ان کو اُن شعائر پر مجبور کیا جاتا ہے، خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ اس اعتبار سے نماز کا معاملہ دیگر معاملات (روزے زکوٰۃ) کی طرح ہے۔ یعنی نماز فرض پندرہ سال مکمل ہونے پر ہوتی ہے، جیسے دیگر عبادات اسی عمر میں فرض ہوتی ہیں۔

اور دس سال کی عمر بلوغ کے دونوں مرحلوں کے درمیان کا مرحلہ ہے۔ اور یہ مرحلہ دونوں جہتوں کے لئے جامع ہے۔ اس لئے اس مرحلہ کے لئے دونوں مرحلوں میں سے حصہ رکھا گیا ہے۔

فائدہ: اور خوابگاہیں جدا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ آغاز جوانی کا زمانہ ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ ہم خوابی مجامعت کی خواہش پیدا کرے۔ اس لئے معاملہ بگڑنے سے پہلے ہی فساد کی راہ بند کر دینی ضروری ہے۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: "مُرُوا أولادَكم بالصلاة وهم أبناءُ سبعِ سنين، واضربوهم عليها وهم أبناءُ عشر سنين، وفرِّقُوا بينهم فى المضاجع"

أقول: بلوغُ الصبى على وجهين:

[الف] بلوغٌ فی صلاحيةِ السَّقَمِ والصِّحَّةِ النفسانيّتين، ويتحقّق بالعقل فقط؛ وأمارةُ ظهور العقلِ السبعُ، فابنُ السبع ينتقل فيها لامحالة من حالة إلى حالة انتقالاً ظاهرًا؛ وأمارةُ تمامه العشْرُ، فابنُ العشر عند سلامة المزاج يكون عاقلاً، يعرف نفعَه من ضرره، ويَحْذِقُ فی التجارة وما يُشْبِهُها.

[ب] و بلوغٌ فی صلاحيةِ الجهادِ والحدود، والمؤاخذةِ عليه، وأن يصير به من الرجال الذين يُعانون المكابدَ، ويُعتبر حالُهم فی السياسات المَدَنية والمِلّية، ويُجبرون قَسْرًا على الصراط المستقيم؛ ويَعْتمِدُ على كمال العقل، وتمامِ الْجُثّة، وذلك بخمس عشرة سنةً فی الأكثر؛ ومن علاماتِ هذا البلوغ: الاحتلام، وإنباتُ العانةِ.

والصلاةُ لها اعتباران:

فباعتبارِ كونها وسيلةً فيما بينه وبين مولاه، مُنْقِذةً عن التَردّی فی أسفل السافلين: أُمِرَ بها عند البلوغ الأول.

وباعتبار كونها من شعائر الإسلام، يُؤاخذون بها، ويُجبرون عليها، أشاؤا أم أبوا: حكمُها حكمُ سائر الأمور.

ولما كان سنُّ العشر برزخًا بين الحدَّين، جامعًا بين الجهتين، جعل له نصيبًا منهما.

وإنما أُمر بتفريق المضاجع: لأن الأيام أيامُ مراهقة، فلا يبْعُدْ أن تُفضيَ المضاجَعةُ إلى شهوة المجامعة، فلا بد من سدِّ سبيل الفسادِ قبل وقوعه.

ترجمہ: (ا) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''حکم دو تم اپنی اولاد کو نماز کا درانحالیکہ وہ سات سال کے ہوں۔ اور مارو ان کو نماز پر درانحالیکہ وہ دس سال کے ہوں۔ اور جدائی کرو ان کے درمیان خوابگاہوں میں''

میں کہتا ہوں۔ بچے کا بالغ (باشعور) ہونا دو طرح سے ہے:

(الف) نفسیاتی تندرستی اور نفسیاتی بیماری کی قابلیت میں بالغ ہونا۔ اور پایا جاتا ہے یہ بلوغ صرف عقل کے ذریعہ۔ اور عقل کے ظاہر ہونے کی نشانی سات سال ہیں۔ پس سات سال کا بچہ: منتقل ہوتا ہے وہ سات سال کی عمر میں یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف واضح طور پر منتقل ہونا۔ اور عقل کے پورا ہونے کی نشانی دس سال ہیں۔ پس دس سال کا بچہ ـــــ مزاج کی سلامتی کی صورت میں ـــــ عقل مند ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے اپنے نفع کو نقصان سے۔ اور ہوشیار ہو جاتا ہے تجارت میں اور اس کے مشابہ چیزوں میں۔

(ب) اور بالغ ہونا جہاد اور حدود کی قابلیت میں، اور اس پر داروگیر کے معاملہ میں۔ اور اس بات میں کہ ہو جاتا ہے

وہ اس بلوغ کی وجہ سے اُن مردوں میں سے جو تکالیف برداشت کرتے ہیں۔اوران کے حال کا اعتبار کیا جاتا ہے عمرانی اور ملّی معاملات میں۔اور مجبور کئے جاتے ہیں وہ زور جبر سے صراط مستقیم پر۔اور مدار ہے اس بلوغ کا عقل کے کمال پر اور جسم کے مضبوط ہونے پر۔اور یہ چیز اکثری احوال میں پندرہ سال میں حاصل ہو جاتی ہے۔اور اس بلوغ کی نشانیوں میں سے: احتلام اور زیر ناف کا اُگنا ہے۔

اور نماز کے لئے دو اعتبار ہیں:

(الف) پس اس کے وسیلہ (ذریعہ) ہونے کے اعتبار سے بچے اور اس کے آقا (اللہ تعالیٰ) کے درمیان (اور) چھڑانے والا ہونے کی وجہ سے اسفل السافلین میں گرنے سے: حکم دیا گیا بچہ نماز کا بلوغ کے پہلے مرحلہ میں۔

(ب) اور اس کے اسلام کے شعائر میں سے ہونے کے اعتبار سے۔دار و گیر کئے جاتے ہیں لوگ ان شعائر کی وجہ سے۔اور مجبور کئے جاتے ہیں وہ ان شعائر پر، خواہ وہ چاہیں یا انکار کریں۔نماز کا حکم دیگر امور کی طرح ہے۔

اور جب دس سال کی عمر بلوغ کی دو حدوں کی درمیانی چیز تھی، دونوں جہتوں کے درمیان جامع تھی، تو بنایا شارع نے اس کے لئے ایک ایک حصہ دونوں حدود میں سے۔

اور خواب گاہوں میں جدا کرنے کا حکم: صرف اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ زمانہ آغاز جوانی کا زمانہ ہے۔پس بعید نہیں ہے کہ ہم خوابی مجامعت کی خواہش تک پہنچا دے۔پس ضروری ہے فساد کی راہ بند کرنا فساد کے وقوع سے پہلے۔

تصحیح: اس عبارت میں دو تصحیحیں مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہیں: (۱) أمارةُ ظهور العقل السبع میں السبع نکرہ تھا (۲) علی کمال العقل میں کمال کے بجائے تمام تھا۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــــ ۲

نماز کی فضیلت کا بیان

نماز گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے

آیت پاک سورۂ ہود آیت ۱۱۴ میں ارشاد پاک ہے ''بیشک نیک کام برے کاموں کو مٹا دیتے ہیں'' اس آیت کی تفسیر میں دو حدیثیں مروی ہیں۔پہلی حدیث یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی اجنبی عورت کو چوما۔اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔اس شخص نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ آیت میرے ہی لئے

ہے؟ آپؐ نے فرمایا: لجمیع أمتی کلّھم. نہیں یہ میری ساری امت کے لئے ہے (مشکوۃ حدیث ۵۶۶)

دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے کسی عورت کو چھیڑا۔ اور صحبت کے علاوہ فائدہ اٹھایا۔ وہ سزایابی کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کو یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ کسی نے پوچھا: اے اللہ کے نبی! کیا یہ اسی شخص کے لئے خاص ہے؟ آپؐ نے فرمایا: بل للناس کافۃً: نہیں، تمام لوگوں کے لئے عام ہے (مشکوۃ حدیث ۵۷۵)

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! میں حد کو پہنچا ہوں یعنی میں نے قابلِ تعزیر گناہ کیا ہے پس آپ مجھ پر حد جاری کریں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپؐ نے اس سے موجبِ حد کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اور نماز کا وقت ہوگیا۔ اس نے آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد وہ کھڑا ہوا اور اس نے پہلی بات دوہرائی۔ آپؐ نے دریافت کیا: کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ اس نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: ''تو اللہ نے تیرا گناہ معاف کردیا'' (مشکوۃ حدیث ۵۶۷)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بتاؤ، اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر بہتی ہو، جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے میل میں سے کچھ باقی رہے گا؟'' صحابہ نے جواب دیا اس کے میل میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ پانچوں نمازوں کی مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ گناہوں کو معاف فرماتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۵۶۵)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ نمازیں اور جمعہ تا جمعہ اور رمضان تا رمضان ان گناہوں کو مٹادیتے ہیں جو ان کے درمیان ہوئے ہیں، جب گناہ کبیرہ نہ کئے ہوں (اس آخری جملہ کے دو مطلب سمجھے گئے ہیں: پہلا مطلب یہ ہے کہ نماز سے گناہوں کی معافی کے لئے کبیرہ گناہوں سے پاک ہونا شرط ہے۔ اگر کسی نے کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے تو اب نماز سے اس کے صغیرہ گناہ بھی معاف نہ ہوں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نماز سے صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ کبیرہ گناہ معاف نہیں ہوتے۔ ان کی معافی کے لئے توبہ شرط ہے)

تشریح: نماز صفت طہارت اور صفت اخبات کے لئے جامع ہے یعنی نمازی بندہ پاکی کا اہتمام کرتا ہے اور بارگاہ خداوندی میں نیازمند بنا رہتا ہے اور پاکیزگی اور نیازمندی نماز کے ذریعہ بدست آتی ہیں۔ اور نماز نفس کو پاک کرکے فرشتوں کی دنیا تک پہنچادیتی ہے۔

اور نفس کی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ کسی صفت کے ساتھ پوری طرح متصف ہوتا ہے اور وہ صفت اس میں گھر کرلیتی ہے تو اس کی ضد سے بالکل کنارہ کش ہوجاتا ہے۔ اور اس ضد سے ایسا دور ہوجاتا ہے: جیسے وہ کوئی قابل تذکرہ چیز ہی نہیں ہے۔ مثلاً جب وہ عدل وسخاوت کے ساتھ متصف ہوگا تو ظلم وبخل کا اس میں نام ونشان تک نہ رہے گا۔ اور اسی طرح اس کا برعکس۔ پس جب نماز نمازی میں طہارت اور اخبات کی صفات پیدا کردے گی تو نجاست اور

استکبار کا بندہ میں نام ونشان تک نہ رہے گا۔

غرض جب مؤمن بندہ اہتمام اور فکر کے ساتھ نماز اچھی طرح ادا کرے گا۔ اور نماز کی روح اور اس کی حقیقت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، تو وہ ضرور بحر رحمت میں غوطہ زن ہوگا۔ اور دریائے رحمت اس کی خطاؤں کو دھودے گا۔

﴿فضل الصلاة﴾

قوله تعالى: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾

وقوله صلى الله عليه وسلم لمن صلّى فى الجماعة بعد الذنب: " فإن الله قد غفر لك ذنبك"

وقوله صلى الله عليه وسلم: " أرأيتم لو أنّ نهرًا بباب أحدِكم، يغتسلُ فيه كلَّ يوم خمسًا، هل يبقى من دَرنه شيئ؟" قالوا: لا يبقى من درنه شيئ! قال: " فذلك مَثَلُ الصلوات الخمس. يَمْحُو اللّٰهُ بهنَّ الخطايا"

وقولُه صلى الله عليه وسلم: " الصلواتُ الخمس، والجمعةُ إلى الجمعة، ورمضانُ إلى رمضانَ: مكفِّراتٌ لما بينهن، إذا اجْتُنِبَت الكبائرُ"

أقول: الصلاةُ جامعةٌ للتنظيف والإخبات، مُقدّسَةٌ للنفس إلى عالَم الملكوت؛ ومن خاصية النفس: أنها إذا اتصفَتْ بصفةٍ رفضَتْ ضِدّها، وتباعدتْ عنه، وصار ذلك منها كأن لم يكن شيئًا مذكورًا؛ فمن أدّى الصلوات على وجهها، وأحسنَ وضوءَ هن، وصلاهنَّ لوقتهنّ، وأتم ركوعهن وخشوعهن وأذكارهن و هيئاتهن، وقصدَ بالأشْبَاح أرواحَهَا، وبالصُّوَرِ معانيها، لابد أنه يخوض فى لُجَّةٍ عظيمةٍ من الرحمة، ويمحو الله عنه الخطايا.

ترجمہ: آیت اور روایات کا ترجمہ گذر چکا۔ میں کہتا ہوں: نماز پاکیزگی اور بارگاہ خداوندی میں نیاز مندی کے لئے جامع ہے (وہ) نفس کو پاک کرنے والی، فرشتوں کی دنیا کی طرف پہنچانے والی ہے یعنی انسان کو فرشتہ صفت بنادیتی ہے ـــــ اور نفس کی خصوصیات میں سے یہ بات ہے کہ جب وہ کسی صفت کے ساتھ متصف ہوتا ہے تو وہ اس کی ضد کو چھوڑ دیتا ہے، اور وہ اس ضد سے دور ہو جاتا ہے۔ اور وہ ضد اس نفس سے ایسی ہو جاتی ہے گویا وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نہیں تھی ـــــ پس جو شخص نمازوں کو صحیح طریقہ پر ادا کرے اور اچھی طرح سے وضو کرے اور وقت پر ان کو پڑھے۔ اور رکوع اور خشوع کا اہتمام کرے، اور ان کے اذکار اور اشکال کو تام کرے۔ اور ان کے پیکروں سے ان کی ارواح کا اور ان کی صورتوں سے ان کے حقائق کا ارادہ کرے، تو ضروری ہے کہ وہ رحمت الٰہی کے بڑے دریا میں غوطہ لگائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی خطائیں مٹادیں (مقدسہ میں رافعۃ کی تضمین ہے)

نوٹ: نصوص میں بعض الفاظ ان کے مصادر سے بڑھائے ہیں۔اور بعض الفاظ کی تصحیح بھی کی ہے۔

☆ ☆ ☆

ترکِ نماز ایمان کے منافی اور کافرانہ عمل ہے

حدیث ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندے اور کفر کے درمیان (پُل) نماز چھوڑنا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۵۹۶)

تشریح: نماز چھوڑ دینا ایمان کے منافی اور کافرانہ عمل دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: نماز دین کا عظیم ترین شعار ہے۔اور مسلمانوں کی ایسی علامت ہے کہ اگر وہ نہ رہے تو گویا اسلام ہی نہ رہا۔کیونکہ دونوں میں گہرا تعلق ہے۔

دوسری وجہ: اسلام کے معنی ہیں: احکام الٰہی کے سامنے سر جھکا لینا۔اور یہ معنی نماز ہی کے ذریعہ جلوہ گر ہوتے ہیں۔پس جس کا نماز میں کوئی حصہ نہیں اس کا اسلام سے تعلق بس برائے نام ہے۔

قوله صلى الله عليه وسلم: '' بين العبد وبين الكفر تركُ الصلاة''

أقول: الصلاةُ من أعظم شعائر الإسلام، وعلاماته التي إذا فُقِدَتْ ينبغي أن يُحْكَمَ بفقده، لقوة الملابسة بينها وبينه، وأيضًا: الصلاةُ هي المُحَقِّقَةُ لمعنى إسلام الوجه لله، ومن لم يكن له حَظٌّ منها، فإنه لم يَبُؤْ من الإسلام إلا بمالا يُعْبَأُ به.

ترجمہ: آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''بندے کے درمیان اور کفر کے درمیان (جوڑنے والی چیز) نماز کا چھوڑنا ہے''

میں کہتا ہوں: نماز اسلام کے عظیم ترین شعائر میں سے ہے۔اور اس کی اُن علامتوں میں سے ہے کہ جب وہ گم ہو جاتی ہے تو مناسب ہے کہ حکم لگایا جائے اسلام کے گم ہونے کا، تعلق کے مضبوط ہونے کی وجہ سے نماز اور اسلام کے درمیان۔اور نیز: نماز ہی اچھی طرح ثابت کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے کے معنی کو۔اور وہ شخص جس کے لئے نماز میں سے کوئی حصہ نہیں، تو بیشک وہ نہیں لوٹا اسلام سے مگر ایسی چیز کے ساتھ جس کا کچھ اعتبار نہیں۔

لغات: بَاءَ يَبُوْءُ بَوْءاً إليه: لوٹنا.... عَبَأَ (ف) عَبْأً المتاعَ: سامان کرنا۔ عَبَأَ به: پروا کرنا لا يُعْبَأُ به: اس کی پرواہ نہیں۔وہ قابل لحاظ نہیں۔

ترکیب: بين العبد خبر مقدم ہے اور ظرف بين کا متعلق محذوف ہے۔اور وہ وُصْلَة (پُل، ملانے والی چیز) ہے اور ترك الصلاة مبتدا مؤخر ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۳

نماز کے اوقات

وقتے وقتے سے نمازیں رکھنے کی حکمت

نماز سے جو منفعت وابستہ ہے ـــــ یعنی شہود وحضور کے سمندر میں غوطہ زن ہونا یعنی قُرب خداوندی کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونا۔ اور ملائکہ کی لڑی میں منسلک ہونا یعنی پوری طرح سے فرشتہ صفت بن جانا ـــــ وہ اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب زندگی کے تمام لمحات نماز کی نذر کر دیئے جائیں۔ آدمی ہر وقت نماز سے چمٹا رہے۔ اور اتنی کثرت سے نمازیں پڑھے کہ گناہوں کے بوجھ سے سبکدوش ہو جائے۔ مگر انسان کو کوئی ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا جس سے دنیا کے دوسرے ضروری کام ٹھپ ہو جائیں، اور وہ مادیت کے تقاضوں سے بالکلیہ دامن جھاڑ لے۔ اس لئے حکمت خداوندی نے چاہا کہ لوگوں کو وقفہ وقفہ سے نماز کی نگہداشت اور دیکھ بھال کا حکم دیا جائے۔ تاکہ نماز سے پہلے نماز کا انتظار اور نماز کے لئے تیاری اور نماز کے بعد اس کا باقی رنگ اور بچا ہوا نور نماز کے حکم میں ہو جائے۔ اور درمیانی وقفہ جو غفلت کا وقت ہے چونکہ اس میں بھی اس کی نگاہ یادِ الٰہی کی طرف اٹھی رہے گی اور دل طاعت الٰہی سے جڑا رہے گا، اس لئے وہ بھی نماز کے ساتھ ملایا ہوا ہو جائے گا۔ غرض مؤمن کا حال اس گھوڑے جیسا ہے جس کی پچھاڑی بندھی ہوئی ہو۔ دو ایک بار کودے پھاندے، پھر اپنے تھان پر آ کھڑا ہو۔ اسی طرح مؤمن کا دل نماز سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ کچھ وقت مشاغل میں گذار کر، پھر نماز کے لئے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور کوتاہیوں اور غفلت کی تاریکی اس کے دل کی تھاہ میں گھسنے نہیں پاتی۔ اور یہی (حکمی) مداومت آسان ہے۔ جب حقیقی مداومت ممکن نہیں تو یہی سہی!

خلاصہ: یہ ہے کہ پانچوں نمازیں ایک ساتھ نہ رکھنے میں یا بے ضرورت نمازوں کو جمع کرنے کی اجازت نہ دینے میں حکمت یہ ہے کہ یہ دنیا دارِ غفلت ہے۔ یہاں ذرا دیر میں دل پر غفلت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ پس چاہئے تو یہ تھا کہ بندہ ہمہ وقت اپنے خالق و مالک کی یاد میں مشغول رہتا۔ مگر جب یہ بات دنیوی جھمیلوں کی وجہ سے ممکن نہ تھی، تو ترکیب یہ نکالی گئی کہ وقفہ وقفہ سے نمازیں رکھ دیں۔ تاکہ نماز سے پہلے کچھ وقت نماز کے انتظار اور تیاری میں گذرے، اور نماز کے بعد کچھ دیر تک اس کا اثر باقی رہے۔ اور ایک مختصر وقفہ کے بعد آدمی پھر اگلی نماز کے لئے کھڑا ہو جائے اور اس طرح سارا ہی وقت ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ تمام نمازیں ایک ساتھ پڑھ لینے میں یا دو نمازوں کو جمع کرنے میں یہ مصلحت فوت ہو جاتی ہے۔ طویل وقفہ کرنے میں دل اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور غفلت دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اور بندہ اپنے مولیٰ سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔

﴿أوقاتُ الصلاة﴾

لما كانت فائدةُ الصلاة — وهي الخوض في لُجّةِ الشهود، والانسلاكُ في سِلك الملائكة — لاتحصل إلا بمداومةٍ عليها، وملازمةٍ بها، وإكثارٍ منها، حتى تَطْرح عنهم أثقالَهم، ولايمكن أن يُؤْمرُوْا بما يُفضي إلى ترك الارتفاقات الضرورية، والانسلاخ عن أحكام الطبيعة بالكلية: أوجبت الحكمةُ الإلٰهيةُ: أن يُؤْمرُوْا بالمحافظة عليها، والتعهُّد لها، بعد كل بُرْهةٍ من الزمان، ليكون انتظارُهم للصلاة، وتَهيُّؤُهُمْ لها قبل أن يفعلوها، وبقيةُ لونها وصُبابةُ نورها بعد أن يفعلوها في حكم الصلاة، وتكونُ أوقاتُ الغفلة مضمومةً بطمحِ بصرٍ إلى ذكر الله، وتعلُّقِ خاطرٍ بطاعة الله، فيكون حالُ المسلم كحال حصانٍ مربوطٍ بآخِيَةٍ، يَسْتنُّ شرفًا أو شرفين، ثم يرجع إلى آخيَته، ويكون ظلمةُ الخطايا والغفلة لاتدخل في جذر القلوب؛ وهذا هو الدوامُ الْمُتيَسِّرُ عند ما امْتَنَعَ الدوامُ الحقيقي.

ترجمہ: **نماز کے اوقات کا بیان**: جب نماز کا فائدہ — اور وہ شہود کے سمندر میں گھسنا اور فرشتوں کی لڑی میں منسلک ہونا ہے — نہیں حاصل ہوتا تھا مگر نماز کی مداومت کرنے سے، اور نماز کے ساتھ چمٹے رہنے سے، اور بکثرت نماز پڑھنے سے یہاں تک کہ نماز لوگوں سے ان کے بوجھوں کو ڈال دے۔ اور نہیں ممکن ہے کہ لوگ حکم دیئے جائیں ایسی بات کا جو پہنچائے ضروری تدابیرات نافعہ کو تج دینے تک اور مادیت کے احکام سے پوری طرح نکل جانے تک: تو واجب کیا حکمت خداوندی نے کہ لوگ حکم دیئے جائیں نماز کی نگہداشت کرنے کا اور نماز کی دیکھ بھال کرنے کا زمانہ کے ہر ایک حصہ کے بعد یعنی وقفہ وقفہ سے، تاکہ ان کا نماز کے لئے انتظار کرنا، اور نماز کے لئے ان کا تیاری کرنا، نماز کو ادا کرنے سے پہلے اور اس کے رنگ کا باقی ماندہ اور اس کے نور کا تھوڑا سا بچا ہوا، نماز کو ادا کرنے کے بعد: نماز کے حکم میں ہو یعنی حکماً یہ بھی نماز شمار ہو۔ اور غفلت کے اوقات (دو نمازوں کے درمیان کا وقفہ) ملائے ہوئے ہوں (نماز کے ساتھ) نگاہ کے اٹھانے کی وجہ سے اللہ کی یاد کی طرف، اور دل کے جڑنے کی وجہ سے اللہ کی اطاعت کے ساتھ۔ پس مسلمان کا حال اس گھوڑے کے حال جیسا ہے جو ایک کھونٹی سے بندھا ہوا ہو۔ کودے پھاندے ایک قدم یا دو قدم، پھر لوٹ آئے اپنے کھونٹے کی طرف اور نہ داخل ہو خطاؤں اور غفلت کی تاریکی دلوں کی تھاہ میں۔ اور یہی وہ آسان مداومت ہے، مداومت حقیقی ممکن نہ ہونے کی صورت میں۔

لغات: اللُّجّة: پانی کا بڑا حصہ۔ الصُبابة: برتن میں بچا ہوا پانی الأخِيّة والآخِيَة: وہ رسی جس کے دونوں سرے زمین میں گاڑ دیتے ہیں، اور اوپر کو حلقہ سا نکلا ہوا ہوتا ہے جس میں جانوروں کو باندھتے ہیں۔ اِسْتنَّ الفرسُ:

گھوڑے کا بھاگنا، کودنا پھاندنا..... الشَّرَف: ٹیلہ، بلند جگہ۔

☆ ☆ ☆

نمازوں کے لئے مناسب اوقات

مذکورہ بالا مصلحت سے جب نمازوں کو وقفہ وقفہ سے رکھنا ضروری ہوا، تو اب تعیین اوقات کا مسئلہ پیش آیا۔ مبحث ششم کے باب ہشتم میں یہ بات تفصیل سے گذر چکی ہے کہ روحانیت کے پھیلنے کے اوقات چار ہیں۔ ان اوقات میں رحمتِ الٰہی کا فیضان ہوتا ہے۔ فرشتے اترتے ہیں، اللہ کے سامنے بندوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں، بندوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، اور وہ اوقات تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک ایک مسلمہ امر کی طرح ہیں۔ یہ اوقات دونوں جانب شب و روز کے اجتماع اور دونوں کے آدھا ہونے کے اوقات ہیں یعنی فجر کا وقت، غروب کا وقت، زوال کا وقت اور آدھی رات کا وقت۔ مگر آدھی رات میں لوگوں کو نماز کا مکلف بنانا باعث پریشانی ہے۔ جس کو ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے نمازوں کے لئے تین اوقات بچے: ایک: صبح کا وقت۔ دوسرا: عشی یعنی زوال کے بعد سے شروع ہونے والا وقت اور تیسرا: جب رات آجائے۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۸ میں ان کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہے:

''اہتمام کر تو نماز کا سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک، اور فجر میں قرآن کا پڑھنا۔ بیشک فجر میں قرآن پڑھنا ہوتا ہے (فرشتوں کے) روبرو''

تفسیر: سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک چار نمازیں وقفہ وقفہ سے رکھی گئی ہیں یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ اور فجر میں قرآن پڑھنا یعنی فجر کی نماز ادا کرنا۔ اور اس تعبیر میں اشارہ ہے کہ فجر کی نماز میں لمبی قراءت مطلوب ہے۔ اور فجر میں قرآن پڑھنا روبرو ہوتا ہے یعنی فرشتوں کے روبرو ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ عصر اور فجر میں رات اور دن کے فرشتے جمع ہوتے ہیں۔ اور نماز پڑھ کر اور قرآن سن کر جن کی ڈیوٹی ختم ہونی ہے، وہ آسمان پر چڑھ جاتے ہیں اور دوسرے کام پر لگ جاتے ہیں۔ (مشکوٰۃ حدیث ۶۲۶ و ۶۳۵)

فائدہ: ''رات کے اندھیرے تک'' اس لئے فرمایا کہ زوال سے نمازوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہ بلا فصل رات چھانے تک چلتا رہتا ہے۔ اور چونکہ یہ نمازیں ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں اس لئے بوقت ضرورت ظہر و عصر کے درمیان اور مغرب و عشاء کے درمیان جمع کرنا جائز ہے۔ اور یہ آیت جوازِ جمع کی ایک دلیل ہے —— لیکن غور کیا جائے تو اس آیت کا دو نمازوں کو جمع کرنے کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اگر اس آیت سے جمع کرنے کا اشارہ نکالا جائے گا، تو دو نہیں چار نمازوں کو جمع کرنے کی مشروعیت نکلے گی (فوائد عثمانی)

ثم لما آلَ الأمْرُ إلى تعيين أوقات الصلاة: لم يكن وقتٌ أحقَّ بها من الساعات الأربع التى تنتشرُ فيها الروحانيةُ، وتنزِل فيها الملائكةُ،ويُعرض فيها على الله أعمالهم، ويُستجابُ دعاؤهم، وهى كالأمر المسلَّمِ عند جمهور أهل التلقِّى من الملأ الأعلى، لكن وقتَ نصفِ الليل لايمكن تكليفُ الجمهور به، كما لايخفى، فكانت أوقاتُ الصلاة فى الأصل ثلاثة: الفجر، والعشىُّ، وغسَقُ الليل؛ وهو قوله تبارك وتعالى: ﴿أقم الصلوه لدلوك الشمس إلى غسق الليل وقرآن الفجر، إن قرآن الفجر كان مشهودا﴾

وإنما قال: ﴿إلى غسق الليل﴾ لأن صلاة العشىِّ ممتدّةٌ إليه حكمًا، لعدم وجود الفصل، ولذلك جاز عند الضرورة الجمعُ بين الظهر والعصر، وبين المغرب والعشاء؛ فهذا أصلٌ.

ترجمہ: اور جب معاملہ نماز کے اوقات کی تعیین کی طرف لوٹا: تو نہیں تھا کوئی وقت نمازوں کا زیادہ حقدار اُن چار اوقات سے جن میں روحانیت (رحمت) پھیلتی ہے اور جن میں فرشتے اترتے ہیں۔ اور جن میں اللہ کے سامنے بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ اور بندوں کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ اور وہ اوقات ایک مسلمہ امر کی طرح ہیں ملأ اعلیٰ سے علوم حاصل کرنے والے عام حضرات کے نزدیک یعنی انبیاء کرام کے نزدیک مگر آدھی رات کا وقت ممکن نہیں تھا عام لوگوں کو اس کا مکلف بنانا، جیسا کہ مخفی نہیں ہے، پس نماز کے اوقات درحقیقت تین رہے: صبح کا وقت، شام کا وقت اور رات کے چھانے کا وقت۔ اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''نمازیں ادا کیجئے آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کا اندھیرا ہونے تک اور صبح کی نماز بھی۔ بیشک صبح کی نماز حاضر ہونے کا وقت ہے''

اور ''رات کا اندھیرا ہونے تک'' صرف اس وجہ سے فرمایا کہ شام کی نمازوں کا سلسلہ دراز ہے رات کے چھانے تک، فصل نہ ہونے کی وجہ سے۔ اور اس وجہ سے جائز ہے بوقتِ ضرورت ظہر اور عصر اور مغرب وعشاء کے درمیان جمع کرنا، پس یہ ایک بنیاد ہے (جواز جمع کی)

☆ ☆ ☆

نمازوں کے اوقات کی تشکیل

پہلے دو باتیں سمجھ لی جائیں:

پہلی بات: دو نمازوں کے بیچ میں فاصلہ نہ تو بہت زیادہ ہونا چاہئے، نہ بہت کم۔ بہت زیادہ فصل کا نقصان یہ ہے کہ نماز کی نگہداشت کا حکم بے معنی ہو جائے گا۔ اور سابقہ نماز سے اللہ تعالیٰ کی جو یاد دل میں پیدا ہوئی تھی بندہ اس کو بھول

جائے گا۔ یہ دنیا بھول نگری ہے۔ کچھ وقت کے بعد آدمی بات بھول جاتا ہے۔ اور بہت کم فصل ہونے کا نقصان یہ ہے کہ لوگوں کو کاروبار کا وقت نہیں ملے گا۔ حالانکہ نمازوں کے درمیان میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ وقت ملنا چاہئے۔ اور نمازوں کی حد بندی ایسے معتد بہ وقت کے ذریعہ کرنی چاہئے جو واضح اور محسوس ہو، جس کو عام وخاص لوگ جان سکتے ہوں۔ اگر دو نمازوں کے درمیان بہت کم وقت ہوگا تو عام لوگ دو نمازوں میں فصل نہیں پہچان سکیں گے۔ اور وہ معتد بہ وقت: اوقات کا اندازہ کرنے کے سلسلہ میں عرب وعجم میں مستعمل اجزائے وقت میں سے جو ''بہت وقت'' ہے: وہ ہونا چاہئے۔ بشرطیکہ وہ بہت ہی زیادہ نہ ہو۔ لوگ کم وقت کا اندازہ: لمحہ بھر، تھوڑی دیر، ایک گھنٹہ وغیرہ سے کرتے ہیں۔ اور بہت زیادہ وقت کا اندازہ: دن بھر، سال بھر وغیرہ سے کرتے ہیں۔ اور معتد بہ مقدار کا اندازہ: گھنٹوں سے کرتے ہیں۔ پس دو نمازوں میں معتد بہ فاصلہ کرنے کے لئے چوتھائی دن یعنی تین گھنٹے مناسب ہیں۔ کیونکہ رات دن کو بارہ بارہ گھنٹوں میں تقسیم کرنے کا عام معمول ہے۔ جس پر معتدل ممالک کے تمام لوگ متفق ہیں۔

دوسری بات: آرام کا اور کاروبار کا وقت مستثنیٰ رکھنا چاہئے۔ اس میں کوئی نماز فرض نہیں کرنی چاہئے، تاکہ لوگ پریشانی سے دوچار نہ ہوں۔ عشاء کے بعد سے فجر تک چونکہ عام طور پر لوگ آرام کرتے ہیں۔ اس لئے اس وقت میں کوئی نماز فرض نہیں کی گئی۔ البتہ تہجد کی نماز بطور استحباب رکھی گئی اور اس کی خوب ترغیب دی گئی۔ اوّابین (اللہ کی طرف لو لگانے والے بندے) اس کی قدر پہچانتے ہیں۔ اسی طرح فجر کی نماز کے بعد سے دوپہر تک کا وقت خالی رکھا گیا، تاکہ لوگ لمبے کام اس وقت میں نمٹالیں۔ اس وقت میں بھی کوئی نماز فرض نہیں کی گئی۔ البتہ چاشت کی نماز بطور استحباب رکھی گئی اور اس کی بھی خوب ترغیب دی گئی، تاکہ نیک بندے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

کھیتی باڑی والے اور تجارت پیشہ لوگ، اسی طرح صنعت وحرفت والے اور نوکری پیشہ لوگ اپنے مشاغل صبح سے دوپہر تک میں نمٹاتے تھے[1]۔ یہ روزی تلاش کرنے کا وقت ہے۔ نقلی اور عقلی دلائل سے یہ بات مؤید ہے۔

نقلی دلیل: سورۃ النساء آیت گیارہ میں ارشاد پاک ہے: ''اور بنایا ہم نے دن کو معاش (رزق) کا وقت'' یعنی عموماً کاروبار اور کمائی کے دھندے دن میں کئے جاتے ہیں۔ اور اللہ پاک نے دن اسی مقصد سے بنایا ہے۔ اور سورۃ القصص آیت ۷۳ میں ارشاد پاک ہے: ''اور اللہ نے اپنی مہربانی سے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا، تاکہ تم رات میں آرام کرو، اور تاکہ (دن میں) اس کی روزی تلاش کرو، اور تاکہ تم شکر بجالاؤ''

عقلی دلیل: کام دو طرح کے ہیں ایک وہ جو مختصر وقت میں نمٹائے جاسکتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے لئے لمبا وقت

---

[1] اس وقت دنیا میں کافروں کا جاری کیا ہوا، گیٹ ٹائم اور آفس ٹائم رائج ہے۔ جو صبح نو دس بجے سے شام پانچ چھ بجے تک جاری رہتا ہے۔ اس لئے کاروباری لوگوں کو نمازوں کی ادائیگی میں دشواری پیش آتی ہے۔ اسی طرح رات میں سونے کا اور صبح میں اٹھنے کا نظام بھی غلط ہوگیا ہے۔ اس لئے فجر کی ادائیگی بھی لوگوں کے لئے دشوار ہوگئی ہے۔ یہ بگڑے ہوئے ماحول کے اثرات ہیں فالی اللہ المشتکی!

درکار ہے۔ پہلی قسم کے کام تو نمازوں کے درمیانی وقفوں میں بھی نمٹائے جاسکتے ہیں۔ مگر دوسری قسم کے کاموں کے لئے لمبا وقت درکار ہے۔ کیونکہ ان کاموں کے درمیان نماز کے لئے وقت نکالنا اور نماز کے لئے تیاری کرنا سبھی لوگوں کے لئے تنگی کا باعث ہے۔ اس لئے صبح کا وقت ان لمبے کاموں کے لئے فارغ رکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی نماز فرض نہیں کی گئی۔

پس نمازوں کے اوقات کی تشکیل: اس طرح کی گئی ہے کہ رات کا وقت آرام کے لئے اور صبح کا وقت کاروبار کے لئے خالی رکھا گیا۔ اور زوال کے بعد سے رات چھانے تک کا وقت اولاً دو حصوں میں تقسیم کیا گیا: ایک شام کا وقت یعنی زوال سے سورج غروب ہونے تک کا وقت۔ دوسرا غروب کے بعد سے رات چھانے تک کا وقت۔ پھر ہر ایک کو دو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، اور ہر حصہ میں ایک نماز رکھی گئی. زوال کے بعد پہلے تین گھنٹوں میں ظہر، اور اس کے بعد کے تین گھنٹوں میں عصر، اور غروب کے بعد مغرب پھر اس کے بعد عشاء۔ اور صبح تڑکے فجر کی نماز رکھی گئی۔ اور آرام اور کاروبار کے اوقات کے درمیان میں تہجد اور چاشت کی نمازیں بطور استحباب رکھی گئیں[1]۔

فائدہ: چونکہ زوال سے رات تک کی چاروں نمازوں کی اوقات بندی کردی گئی ہے اس لئے ان میں سے کسی بھی دو کے درمیان جمع کرنا جائز نہیں۔ کوئی بھی دو نمازیں ایک وقت میں پڑھی جائیں گی تو تعیین اوقات میں جو مصلحت ہے وہ باطل ہوجائے گی۔ سورۃ النساء آیت ۱۰۳ میں خوف کی نماز کے بعد ارشاد ہے. ''پھر جب تم مطمئن ہوجاؤ تو نماز کو قاعدے کے موافق پڑھنے لگو۔ بیشک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے''۔

اس کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہاں اگر کوئی ضرورت پیش آئے کہ جمع کئے بغیر چارہ ہی نہ ہو تو ظہر وعصر میں اسی طرح مغرب وعشاء میں جمع کرنا جائز ہے کیونکہ یہ نمازیں ایک وقت کی دو پھانکوں میں رکھی گئی ہیں۔ پس مجبوری کی صورت میں ان کو جمع کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ جواز جمع کی ایک اور دلیل ہے۔ (اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو صلوۃ المعذورین میں آئے گی)

ولايجوز أن يكون الفصلُ بين كلِّ صلاتين كثيرًا جدًا، فيفوتُ معنى المحافظة، ويَنسى ما كسبه أولَ مرةٍ؛ ولاقليلاً جدًا، فلا يتفرَّغون لابتغاء معاشِهم؛ ولايجوز أن يُضرب في ذلك إلا حدًا ظاهرًا محسوسًا، يَتبيَّنُهُ الخاصَّةُ والعامةُ، وهو كثيرةُ ما للجزء المستعمَل عند العرب والعجم في باب تقدير الأوقات، وليست بالكثرة المُفرَطَة، ولايصلح لهذا إلا ربعُ النهار، فإنه ثلاثُ ساعاتٍ، وتجزِئَةُ الليل والنهار إلى ثِنتَي عشرة ساعةً أمرٌ أجمع عليه أهل الاقاليم الصالحة. وكان أهل الزِّراعة والتجارة والصِّناعة وغيرُهم يعتادون غالباً أن يتفرَّغوا لِأشغالهم من

[1] اور اشراق کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ فقہاء محدثین کے نزدیک اشراق وچاشت ایک ہی نماز ہیں۔ اگر سورج نکلنے کے بعد جلدی پڑھ لی جائے تو اس کا نام اشراق (سورج چمکنے کے وقت کی نماز) ہے اور دن چڑھے پڑھی جائے تو اس کا نام صلوۃ الضحیٰ ہے ۱۲

البُكرة إلى الهاجرة، فإنه وقتُ ابتغاءِ الرزق، وهو قوله تعالىٰ: ﴿وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾ وقوله تعالى: ﴿لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ﴾

وأيضًا: فكثير من الأشغال يَنجَرُّ إلى مدة طويلة، ويكون التَّهَيُّؤُ للصلاة والتفرُّغُ لها من الناس أجمَعِهم في أثناء ذلك حرجًا عظيمًا، فلذلك أَسْقَطَ الشارعُ الضُّحىٰ، ورغَّب فيها ترغيبًا عظيمًا من غير إيجاب.

فوجب أن تُشْتَقَّ صلاةُ الْعَشِيِّ إلى صلاتين، بينهما نحوٌ من ربع النهار، وهما الظهر والعصر، وغَسَقِ الليل إلى صلاتين، بينهما نحوٌ من ذلك، وهما المغرب والعشاء.

ووجب أن لايُرَخَّصَ في الجمع بين كلٍّ من شِقَّي الوقتين إلا عند ضرورة، لايجد منها بُدًّا، وإلا لبطلت المصلحةُ المعتبرةُ في تعيين الأوقات؛ وهذا أصلٌ آخر.

ترجمہ: اور جائز نہیں کہ ہر دو نمازوں کے درمیان بہت زیادہ فصل ہو، پس فوت ہو جائیں نگہداشت کے معنی۔ اور بھول جائے وہ اس چیز کو جس کو اس نے پہلی بار میں حاصل کیا ہے۔ اور نہ بہت ہی تھوڑا (فصل ہو) پس نہ فارغ ہوں لوگ اپنی معاش تلاش کرنے کے لئے۔ اور جائز نہیں کہ مقرر کی جائے اس سلسلہ میں مگر کوئی واضح محسوس حد، جس کو معلوم کرلیں عام وخاص۔ اور وہ اس جزء کا ''بہت'' (معتد بہ) ہے جو اوقات کا اندازہ کرنے کے سلسلہ میں عرب وعجم کے نزدیک استعمال ہونے والا ہے، درانحالیکہ نہ ہو وہ حد سے بڑھی ہوئی زیادتی۔ اور نہیں مناسب ہے اس کے لئے مگر چوتھائی دن، پس بیشک وہ تین گھنٹے ہے۔ اور رات دن کو بارہ گھنٹوں میں تقسیم کرنا ایک ایسی بات ہے جس پر قابل رہائش خطوں کے باشندوں نے اتفاق کیا ہے۔

اور کاشتکاری اور تجارت اور کاریگری والے اور ان کے علاوہ لوگوں کا دستور تھا کہ فارغ ہو جائیں وہ اپنے مشاغل کے لئے صبح سے دوپہر تک۔ پس بیشک وہ روزی تلاش کرنے کا وقت ہے۔ اور وہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''اور بنایا ہم نے دن کو معاش کا وقت'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''تاکہ (دن میں) اس کی روزی تلاش کرو''

اور نیز: پس بہت سے مشاغل کھنچ جاتے ہیں ایک لمبی مدت تک۔ اور ہوتا ہے نماز کے لئے تیاری کرنا اور نماز کے لئے وقت نکالنا سارے ہی لوگوں کے لئے اس کے درمیان: بڑی تنگی۔ پس اس وجہ سے شارع نے چاشت کی نماز کو ختم کردیا۔ اور اس کی ترغیب دی بہت زیادہ ترغیب دینا، واجب کئے بغیر۔

پس ضروری ہوا کہ شام کی نماز کو دو نمازوں میں تقسیم کیا جائے۔ دونوں کے درمیان تقریباً چوتھائی دن ہو، اور وہ ظہر اور عصر ہیں۔ اور رات کے آنے کو دو نمازوں میں تقسیم کیا جائے، ان کے درمیان بھی تقریباً اتنا ہی وقت ہو، اور وہ مغرب اور عشاء ہیں۔

اور ضروری ہوا کہ نہ اجازت دی جائے دونوں وقتوں کی دو پھانکوں میں سے ہر ایک کے درمیان جمع کرنے کی، مگر ایسی ضرورت کے وقت کہ نہ پائے وہ اس سے کوئی چارہ۔ ورنہ یقیناً باطل ہو جائے گی وہ مصلحت جس کا اوقات کی تعیین میں اعتبار کیا گیا ہے۔ اور یہ ایک اور اصل ہے۔

لغات: اِنْجَرَّ: کھنچنا تَهَيَّأَ تَهَيُّؤًا للأمر: تیار ہونا، آمادہ ہونا، مستعد ہونا اشْتَقَّ الشيءَ من الشيء: مشتق کرنا، نکالنا۔ العَشِيّ: امام راغب نے اس کے معنی: زوال سے لے کر صبح صادق تک کا وقت لکھا ہے: العَشِيُّ: من زوال الشمس إلى الصَّباح اھ

ترکیب: ولا قليلا جدًا کا عطف كثيرًا جدًا پر ہے۔ كثيرةُ ما میں اضافت ہے اور ما موصولہ ہے۔... حرجًا عظيمًا خبر ہے يكون کی۔ غسق الليل کا عطف العَشِيّ پر ہے۔

تصحیح: وهو كثيرةُ ما اصل میں اور مخطوطہ پٹنہ میں وهو كثرة ما اور مخطوطہ برلین میں كثيره ما تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے وأيضًا: فكثير من الأشغال اصل میں واتصاف كثير من الأشغال تھا، تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

نمازوں کے تین خاص اوقات

معتدل ممالک کے باشندے اور معتدل مزاج والے عام لوگ ——— جن کو احکام کی تشریع میں پیش نظر رکھا گیا ہے ——— ہمیشہ سے صبح تڑکے بیدار ہوتے ہیں اور رات گئے تک کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ اور وہ اوقات جن کا بہت زیادہ حق ہے کہ ان میں نمازیں ادا کی جائیں: تین ہیں:

ایک: جب دل و دماغ معاشی مشاغل سے خالی ہوں ——— معاشی مصروفیات اللہ کی یاد کو بھلا دیتی ہیں۔ اور جس وقت دماغ خالی ہو اور دل فارغ ہو، نماز ادا کی جائے تو اللہ کی یاد دل میں جگہ بنائے گی اور وہ قلب پر بہت زیادہ اثر انداز ہوگی۔ چنانچہ صبح اٹھتے ہی نماز فرض کی گئی۔ ارشاد پاک ہے: ''اور (اہتمام کرتو) فجر کے پڑھنے کا یعنی فجر کی نماز کا۔ بیشک فجر کا پڑھنا حضوری کا وقت ہے''

دوم: سونے سے پہلے ——— تاکہ اللہ کی یاد ان گناہوں کا کفارہ بن جائے جو دن بھر میں سرزد ہوئے ہیں۔ اور دل کا زنگ دور ہو جائے۔ حدیث میں ہے: ''جس نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی تو وہ شروع کی آدھی رات نوافل پڑھنے کی طرح ہے۔ اور جس نے عشاء اور فجر دونوں نمازیں باجماعت ادا کیں، تو وہ پوری رات نوافل پڑھنے کی طرح ہے'' (ترمذی ۱:۳۰ مگر اس میں الأول نہیں ہے)

سوم: جب کاروبار خوب زوروں پر ہو، جیسے دن چڑھے کا وقت ـــــ اس وقت نماز پڑھنا دنیا میں انہماک کو گھٹاتا ہے۔ اور دنیا کے زہر کے لئے تریاق کا کام کرتا ہے۔ مگر یہ نماز لوگوں پر لازم نہیں کی جا سکتی۔ ایسا کیا جائے گا تو لوگ یا تو کام چھوڑ دیں گے یا نماز۔ پہلی صورت میں دنیا کا نقصان ہوگا اور دوسری صورت میں دین کا ـــــ اور یہ بھی ایک دلیل ہے جمع بین الصلاتین کے جواز کی۔ کیونکہ مجبوری میں آدمی کسی نماز کو ضرور قضا کرے گا۔ پس اس سے بہتر یہ ہے کہ دونوں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھ لیا جائے۔

ملحوظہ: لیکن جب قرآن کریم نے صراحت کر دی ہے کہ نمازوں کے اوقات محدود ہیں۔ یعنی ہر نماز کا وقت الگ الگ تجویز کیا گیا ہے، تو اب کسی صحیح صریح حدیث ہی سے جمع کا جواز پیدا ہوگا جیسا کہ عرفات اور مزدلفہ میں حاجیوں کے لئے جمع کی روایات ہیں۔ مگر دیگر مواقع میں ایسی کوئی روایت نہیں۔ پس محض عقلی اصولوں سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے نقلی دلیل درکار ہے (تفصیل آگے آئے گی)

وكان جمهورُ أهل الأقاليم الصالحة والأمزجة المعتدلة ـــ الذين هم المقصودون بالذات في الشرائع ـــ لا يزالون متيقظين متردِّدين في حوائجهم من وقت الإسفار إلى غسق الليل. وكان أحقَّ ما يُؤدَّى فيه الصلاةُ

[١] وقتُ خلوِّ النفس عن ألوان الأشغال المعاشية المُنْسية ذكر الله، ليُصادف قلبا فارغا فتمكنُ منه، ويكون أشد تأثيرا فيه، وهو قوله تعالى: ﴿وقرآن الفجر، إنّ قرآن الفجر كان مشهودا﴾

[٢] ووقتُ الشروع في اللوم ليكون كفارةً لما مضى، وتضئيلاً للضدا، وهو قوله صلى الله عليه وسلم "من صلى العشاء في جماعة كان كقيام نصف الليل الأول، ومن صلى العشاء والفجر في جماعةٍ كان كقيام ليلة"

[٣] ووقتُ اشتغالهم كالضُحى، ليكون مُهوِّنا للانهماك في الدنيا، وترياقا له، غير أن هذا لا يجوز أن يُخاطبَ به الناسُ جميعًا، لأنهم حينئذ بين أمرين: إما أن يتركوا هذا أوذاك، وهذا أصلٌ آخرُ

ترجمہ: اور قابل رہائش خطوں کے اور معتدل مزاج والے عام لوگ ـــــ جو کہ وہی بالذات احکام کی تشریع میں پیش نظر رہتے ہیں ـــــ ہمیشہ سے بیدار ہوتے ہیں اور اپنے کاروبار میں مصروف ہوتے ہیں صبح کاذب کے پھیلنے کے وقت سے رات کی تاریکی چھانے تک۔ اور تھا زیادہ حقدار اس بات کا کہ اس میں نماز ادا کی جائے۔

(۱) نفس کے فارغ ہونے کا وقت طرح طرح کی معاشی مصروفیات سے، جو بھلانے والی ہیں اللہ کی یاد کو۔ تا کہ

. ۔ ۔ ۔

کی روایت میں ہے: إن الناس قد صلّوا وناموا. لوگ نماز پڑھ پڑھ کر سو گئے۔ اس میں گذشتہ امتوں کا ذکر نہیں ہے۔ اور صحیحین ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے: ولا یُصلّٰی یومئذ إلا بالمدینة: اس وقت مدینہ ہی میں یہ نماز پڑھی جاتی تھی۔ کیونکہ ابھی تک اسلام کی اشاعت عام نہیں ہوئی تھی۔ مدینہ کے علاوہ جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی بستی نہیں تھی۔ اس روایت میں بھی گذشتہ امتوں کا ذکر نہیں ہے۔ پس یہ روایت بالمعنی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کونسے ہیں یہ بات متعین نہیں، اس لئے اشکال بے معنی ہے (اس اشکال کے اور بھی جوابات دیئے گئے ہیں)

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ جمع بین الصلاتین کی ایک اور دلیل ہے۔ اس کی شرح یہ ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز تہائی رات تک مؤخر کی یعنی مغرب وعشاء کے درمیان تین گھنٹوں کا فاصلہ کیا۔ مگر عام طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کو مقدم کیا کرتے تھے، مغرب اور عشاء کے درمیان اتنا وقفہ نہیں کیا کرتے تھے۔ پس اگر بوقت ضرورت مطلق فصل نہ کیا جائے اور دونوں کو ایک ساتھ پڑھ لیا جائے تو یہ بھی درست ہے۔ اور یہی حکم ظہر وعصر کا ہے (مگر یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ عشاء کو مغرب سے قریب کرنے کا معمول تو تھا۔ مگر اس کو مغرب کے حد وقت میں داخل کرنے کا کوئی ثبوت نہیں۔ پس اس سے اگر ثابت ہوتی ہے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بوقت ضرورت جمع صوری کر سکتے ہیں۔ جمع حقیقی کا جواز ثابت نہیں ہوتا)

وأيضًا: لاأحقَّ في باب تعيين الأوقات من أن يُذهب إلى المأثور من سُنن الأنبياء المقرّبين من قبل، فإنه كالمُنبِّه للنفس على اداء الطاعة تنبيها عظيمًا، والمُهيِّج لها على منافسة القوم، والباعث على أن يكون للصالحين فيهم ذكرٌ جميلٌ، وهو قول جبريل عليه السلام: "هذا وقتُ الأنبياء من قبلك"

لايقال: ورد في حديث معاذ في العشاء: "ولم يصلّها أحد قبلكم" لأن الحديث رواه جماعة، فقال بعضهم: "إن الناس صلوا ورقدوا" وقال بعضهم: "ولايُصلّيها أحد إلا بالمدينة،" ونحوُ ذلك. فالظاهر أنه من قِبل الرواية بالمعنى، وهذا أصلٌ آخرُ.

ترجمہ: اور نہیں ہے (کوئی چیز) اوقات کی تعیین کے سلسلہ میں زیادہ حقدار اس بات سے کہ جایا جائے سابقہ انبیائے مقربین سے منقول طریقوں کی طرف۔ پس بیشک وہ چوکنا کرنے والی چیز کی طرح ہے نفس کو عبادت کے ادا کرنے پر بہت زیادہ چوکنا کرنا۔ اور ابھارنے والی چیز کی طرح ہے نفس کو قوم کی منافست پر۔ اور برانگیختہ کرنے والی چیز کی طرح ہے اس بات پر کہ ہو نیک لوگوں کے لئے لوگوں کے درمیان ذکر خیر۔ اور وہ جبرئیل علیہ السلام کا قول ہے "یہ آپ سے پہلے گذرے ہوئے انبیاء کا وقت ہے"

اعتراض: نہ کیا جائے کہ نماز عشاء کے بارے میں معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے: "اور نہیں پڑھی عشاء کی

نمازتم سے پہلے کسی نے'' اس لئے کہ روایت کیا ہے اس حدیث کو صحابہ کی ایک جماعت نے، پس کہا ان میں سے بعض نے: '' بیشک لوگ نماز پڑھ چکے اور سو گئے'' اور کہا ان میں سے بعض نے: '' اور نہیں پڑھتا تھا اس کو کوئی مگر مدینہ میں'' اور اس قسم کی باتیں۔ پس ظاہر یہ ہے کہ یہ بات (حضرت معاذ کی تعبیر) روایت بالمعنیٰ کی جانب سے آئی ہے۔ اور یہ ایک اور دلیل ہے (جمع بین الصلاتین کے جواز کی)

☆ ☆ ☆

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ نمازوں کے لئے تعیینِ اوقات میں بہت سی دقیق حکمتیں ہیں۔ اور نمازوں کے لئے اوقات کی نہایت درجہ اہمیت ہے۔ اسی لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے خود آ کر نہایت اہتمام سے اوقات کی تعلیم دی ہے۔ اور ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ ضرورت کے وقت نمازوں کے درمیان جمع کرنا جائز ہے۔ اور اس بات کی وجہ بھی معلوم ہوگئی جو بعض حضرات نے ذکر کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء پر تہجد اور چاشت کی نمازیں واجب تھیں۔ اور امت کے لئے مستحب ہیں۔ اور نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کی نہایت تاکید کیوں ہے؟ ان سب باتوں کی وجوہ معلوم ہوگئیں۔

سوال: جب اوقات کی اس قدر اہمیت ہے تو سب لوگوں کے لئے ایک ہی وقت میں نمازیں ادا کرنا کیوں ضروری قرار نہیں دیا؟ جیسے روزے: تمام مسلمان ایک ساتھ رکھتے ہیں اور ایک ساتھ کھولتے ہیں، نمازیں ایک ہی وقت میں ادا کرنا کیوں ضروری نہیں؟

جواب: نمازوں کے اوقات موسّع ہیں، روزوں کی طرح مضیق نہیں۔ یعنی بالکلیہ آزادی بھی نہیں ہے کہ جب چاہیں نمازیں ادا کریں۔ بلکہ نمازوں کے اوقات کا اول و آخر متعین ہے۔ مگر ایک ہی وقت میں اور ایک ہی ساتھ نمازوں کی ادائیگی بھی ضروری نہیں، کیونکہ ایسا حکم دینے میں نہایت تنگی ہے۔ اس لئے فی الجملہ گنجائش رکھی گئی ہے۔ اور اول و آخر کی تعیین کی گئی ہے۔ یہی قانون سازی کا تقاضا ہے۔ تشریع عام کے لئے ضروری ہے کہ نمازوں کے لئے ایسے واضح اور محسوس پیکر مقرر کئے جائیں جن کو سب عرب یکساں طور پر جان سکیں کہ نماز کا وقت آ گیا اور نماز کا وقت گذر گیا۔ پس وہ وقت ہوتے ہی نمازوں کی ادائیگی کی فکر کریں۔ اور وقت ختم ہونے سے پہلے ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائیں۔

وبالجملة: ففي تعيين الأوقات سرٌّ عميقٌ من وجوه كثيرة، فتمثّل جبريلُ عليه السلام، وصلّى بالنبي صلى الله عليه وسلم، وعلّمه الأوقات.

ولِمَا ذكرنا: ظهر وجهُ مشروعيةِ الجمع بين الصلاتين في الجملة، وسببُ وجوب التهجد والضُّحى على النبي صلى الله عليه وسلم والأنبياءِ، على ما ذكروا، وكونها نافلةً للناس،

وسببُ تأكيدِ أداء الصلوات على أوقاتها، واللّٰهُ أعلم.

ولما كان في التكليف بأن يُصلّيَ جميعُ الناس في ساعة واحدة بعينها، لايتقدمون ولايتاخرون: غايةُ الحرج، وُسّع في الأوقات توسعةً ما.

ولما كان لايصلح للتشريع إلا المظِنّاتُ الظاهرةُ عند العرب، غير الخفية على الأداني والأقاصي، جُعل لأوائل الأوقات وأواخرها حدوداً مضبوطةً محسوسةً.

ترجمہ: اور حاصل کلام: پس اوقات کی تعیین میں گہرا راز ہے بہت سی وجوہ سے پس تشریف لائے جبرئیل اور نبی ﷺ کو نماز پڑھائی اور آپ کو اوقات کی تعلیم دی اور ظاہر ہوئی اس بات کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی. فی الجملہ (کسی درجہ میں یعنی بوقتِ ضرورت) دو نمازوں کے درمیان جمع کرنے کے جواز کی وجہ اور تہجد اور چاشت کے وجوب کی وجہ نبی ﷺ پر اور دیگر انبیاء پر، جیسا کہ علماء نے ذکر کیا ہے۔ اور ان کے نفل ہونے کی وجہ لوگوں کے لئے اور نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کی تاکید کی وجہ۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(سوال مقدر کا جواب) اور جب انتہائی تنگی تھی اس بات کا مکلف بنانے میں کہ تمام لوگ نماز ادا کریں ایک معین گھڑی میں، نہ آگے بڑھیں اور نہ پیچھے رہیں، تو گونہ گنجائش رکھی گئی اوقات میں ـــــ اور جب قابل نہیں تھے قانون سازی کے لئے مگر عربوں کے نزدیک پیکر ہائے محسوس، جو مخفی نہ ہوں قریب والوں پر اور دور والوں پر، تو بنائی گئیں نماز کے اوقات کی ابتداء کے لئے اور ان کی انتہاء کے لئے منضبط اور محدود حدیں۔

☆ ☆ ☆

اسباب میں تزاحم اور نمازوں کے چار اوقات

اسباب میں تزاحم ہے۔ ہر سبب دوسرے کو ہٹا کر خود آگے آنا چاہتا ہے۔ مثلاً:

۱ـــــ نمازوں کے اوقات محدود ہیں اس لئے دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا جائز نہیں۔ اور بندوں کی مجبوریاں متقاضی ہیں کہ فی الجملہ اس کی اجازت ہو، گو جمع صوری ہی سہی!

۲ـــــ امر کا مقتضی یہ ہے کہ مامور بہ کا امتثال اولین فرصت میں کیا جائے۔ نیز ﴿لِدُلُوكِ الشَّمْسِ﴾ میں اشارہ بھی ہے کہ ظہر کی نماز اول وقت میں ادا کی جائے۔ مگر سخت گرمیوں میں ظہر کے اول وقت میں کچھ خرابی ہوتی ہے، جیسا کہ آگے آئے گا۔ پس اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت میں نماز نہ پڑھی جائے۔

۳ـــــ جب نماز کا اول و آخر ہے تو آخر وقت تک نماز پڑھنا درست ہونا چاہئے، جیسے فجر میں۔ مگر عصر کے آخری

وقت میں سورج کی پرستش شروع ہوجاتی ہے، اس لئے اس وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

۴ ـــــ مطلوب یہ ہے کہ مامور بہ کو بروقت ادا کیا جائے، مگر کبھی آدمی نماز بھول جاتا ہے یا سوتا رہ جاتا ہے۔ ایسی نادانستہ کوتاہیوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں سہولت دی جائے۔

۵ ـــــ ﴿إلى غسق الليل﴾ میں اشارہ ہے کہ عشاء کی نماز دیر سے پڑھی جائے، مگر حق مصلیان (نمازیوں کی پریشانی) کی وجہ سے عشاء جلدی ادا کی جاتی ہے۔

غرض اسباب میں اس طرح کے تزاحم کے نتیجہ میں نمازوں کے لئے چار اوقات حاصل ہوئے۔ جن کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

پہلا وقت: وقتِ مختار

مختار: یعنی پسندیدہ وقت۔ یہ وہ وقت ہے جس میں بغیر کراہیت کے نماز پڑھنا درست ہے۔ اور اس میں معتمد علیہ دو حدیثیں ہیں: ایک: امامتِ جبرئیل کی حدیث: جبرئیل علیہ السلام نے دو دن آنحضرت ﷺ کو نماز پڑھائی تھی[1]۔

دوسری: حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث. اس میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے نمازوں کے اوقات دریافت کئے تھے تو آپؐ نے دو دن اول و آخر نماز پڑھا کر اس کو اوقات کی تعلیم دی تھی[2]

ضابطہ ترجیح: اگر مذکورہ روایتوں میں کسی بات میں اختلاف ہو، تو جو واضح ہو وہ ناطق ہوگی۔ مبہم کو نہیں لیا جائے گا۔ اور دونوں واضح ہوں تو حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو لیا جائے گا، کیونکہ اس میں جو واقعہ مذکور ہے وہ مدینہ منورہ کا ہے۔ اور امامتِ جبرئیل کا واقعہ مکہ کا ہے جبکہ پانچ نمازیں فرض ہوئیں تھیں۔ اور الأولُ فالأولُ کی طرح الآخِرُ فالآخر بھی ایک ضابطہ ترجیح ہے یعنی واقعات کی تاریخیں متعین ہوں تو بعد کی روایت لی جائے گی۔

مذکورہ روایات میں دو باتوں میں اختلاف ہے:

پہلی بات: مغرب کا وقت غروب شفق تک رہتا ہے۔ یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوسرے دن مغرب کی نماز شفق غائب ہونے سے پہلے پڑھی تھی۔ اور حضرت عبداللہ

---

[1] یہ حدیث تفصیل سے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے اور مشکوۃ باب المواقیت میں حدیث نمبر ۵۸۳ ہے۔ صحیحین میں بھی امامت جبرئیل علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ مگر اس میں اوقات کی تفصیل نہیں ہے۔ مشکوۃ حدیث نمبر ۵۸۴

[2] یہ روایت مسلم شریف میں ہے۔ مشکوۃ حدیث ۵۸۲ ان کے علاوہ ایک قولی روایت اور بھی ہے جو اوقات کے سلسلہ میں اہم ہے، جس کو امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے۔ اور جو مشکوۃ میں حدیث ۵۸۱ ہے۔ اور امام ترمذی نے اس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں خود آنحضرت ﷺ نے اوقات نماز کی تحدید کی ہے۔ آگے قولی روایت سے یہی روایت مراد ہے ۱۲

بن عمرو کی قولی حدیث میں ہے: وقتُ صلاۃِ المغرب مالم یغب الشمسُ۔ مگر امامتِ جبرئیل کی حدیث میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے دونوں دن سورج ڈوبتے ہی مغرب کی نماز پڑھائی تھی۔ یعنی مغرب کا بس ایک ہی وقت ہے۔ وقت موسّع نہیں ہے اس مسئلہ میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث لی جائے گی۔ اور امامتِ جبرئیل کی حدیث کی تاویل کی جائے گی۔

اور تاویل: یہ ہے کہ بعید نہیں حضرت جبرئیل نے دوسرے دن مغرب کی نماز بس کچھ ہی تاخیر سے پڑھائی ہو۔ اور وقت کے مختصر ہونے کی وجہ سے راوی نے کہہ دیا ہو کہ: ''دونوں دن ایک ہی وقت میں مغرب کی نماز پڑھائی'' پس یہ یا تو راوی کی اجتہادی چوک ہے۔ یا راوی کا مقصد انتہائی قلت کو بیان کرنا ہے۔

دوسری بات: بہت سی روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر فقہاء کا اتفاق بھی ہے کہ عصر کا آخری وقتِ جواز یہ ہے کہ دھوپ میں تغیر آجائے۔ حضرت عبداللہ کی قولی روایت میں ہے: ووقتُ العصر مالم تَصْفَرَّ الشمسُ۔ مگر امامتِ جبرئیل کی روایت میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے دوسرے دن عصر کی نماز دو مثل پر پڑھائی تھی۔ پس اس کی تاویل کی جائے گی۔ اور تاویلیں دو ہیں:

پہلی تاویل: یہ کہا جائے کہ شاید امامت جبرئیل کی روایت میں مستحب وقت کے آخر کا بیان ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ شاید شریعت نے اور رأیہ دیکھا ہو کہ عصر کو ظہر سے الگ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دو نمازوں میں تقریباً چوتھائی دن (تین گھنٹوں) کا فصل ہو جائے، کیونکہ اگر عصر کو ظہر سے الگ نہیں کیا جائے گا تو ظہر اور مغرب کے درمیان چوتھائی دن سے زیادہ فصل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ظہر کا وقت ایک مثل تک تھا۔ اور اس کے بعد مغرب تک تین گھنٹوں سے زیادہ وقت ہے۔ اس لئے عصر کا آخری وقت دو مثل تک قرار دیا، تاکہ عصر اور مغرب کے درمیان چوتھائی دن کا فصل رہے، پھر لوگوں کی حاجتیں اور مشاغل سامنے آئے تو عصر کی آخری حد میں اضافہ کر دیا گیا۔ اور سورج پیلا پڑنے تک اس کا وقت جواز دراز کیا گیا۔

فائدہ: اور ممکن ہے جب عصر کا آخری وقت بڑھا دیا ہو تو ظہر کا آخری وقت بھی ایک مثل سے بڑھا کر دو مثل کر دیا گیا ہو۔ کیونکہ بہت سی روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ظہر کا وقت ایک مثل کے بعد بھی رہتا ہے جیسا کہ حدیث ابراد کے ذیل میں آرہا ہے۔

دوسری تاویل. دو مثل کا ادراک مشکل ہے۔ اس کے لئے غور و فکر کی، سایہ زوال کو محفوظ رکھنے کی، اور بڑھتے ہوئے سایہ کو برابر دیکھتے رہنے کی ضرورت ہے۔ اور عوام کو ایسا حکم دینا مناسب نہیں جس کا ادراک مشکل ہو۔ عام لوگوں کو تو حکم ایسا ہی دینا چاہئے جو محسوس اور واضح ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ آپ عصر کا آخری وقت سورج کے بدلنے کو یا دھوپ کے پیلا پڑنے کو قرار دیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

فائدہ: عصر کا وقت تو مغرب سے اُس وجہ سے متصل ہو گیا جو اوپر گذری۔ اور ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کے درمیان

چوتھائی دن کا فصل اس لئے نہیں کہ یہ ایک وقت کی دو پھانکیں ہیں۔ جیسا کہ تفصیل سے گذرا ہے۔

ولِتَزَاحُمِ هذه الأسباب حصل للصلوات أربعة أوقات:

[۱] وقت الاختيار، وهو الوقتُ الذى يجوز أن يُصلّى فيه من غير كراهية؛ والعمدةُ فيه حديثان: حديثُ جبريل، فإنه صلى بالنبى صلى الله عليه وسلم يومين، وحديثُ بُريدة، ففيه: أنه صلى الله عليه وسلم أجابَ السائلَ عنها، بأن صلّى يومين؛ والمفسَّرُ منهما قاضٍ على المبهم، وما اختلف يُتَّبَعُ فيه حديثُ بريدة، لأنه مدنى متأخّر، والأولُ مكى متقدّم، وإنما يُتَّبَعُ الآخرُ فالآخرُ.

وذلك: أن آخر وقتِ المغرب: هو ما قبل أن يغيب الشفقُ، ولايبعد أن يكون جبريلُ أخَّرَ المغرب فى اليوم الثانى قليلاً جدًّا لقِصَر وقته، فقال الراوى:" صلّى المغرب فى يومين فى وقت واحد"، إما لخطأ فى اجتهاده، أو بيانًا لغاية القلّة، والله أعلم.

وكثير من الأحاديث يدل على أن آخِر وقت العصر: أن تتغير الشمسُ، وهو الذى أطبق عليه الفقهاءُ، فلعل المثلين بيانٌ لآخر الوقت المختار، والذى يُستحب فيه، أو نقول: لعل الشرعَ نظر أولاً إلى أن المقصودَ من اشتقاق العصر: أن يكونَ الفصلُ بين كلّ صلاتين نحوًا من ربع النهار، فجعل الأمدَ الآخِرَ بلوغَ الظل إلى المثلين، ثم ظهر من حوائجهم وأشغالهم ما يوجب الحكم بزيادة الأمد.

وأيضًا: معرفةُ ذلك الحد تحتاج إلى ضرب من التأمل، وحفظٍ للفَيْءِ الأصلى، ورصدٍ، وإنما ينبغى أن يُخاطب الناس فى مثل ذلك بما هو محسوس ظاهر، فنفث الله فى رُوعه صلى الله عليه وسلم أن يَجعلَ الأمد تَغَيُّرَ قُرْصِ الشمس أو ضوئها، والله أعلم.

ترجمہ: اور ان اسباب کے ایک دوسرے کو ڈھکیلنے کی وجہ سے نمازوں کے لئے چار اوقات حاصل ہوئے:

(۱) مختار (پسندیدہ) وقت: اور وہ وہ وقت ہے کہ جائز ہے کہ اس میں نماز پڑھی جائے بغیر کسی کراہت کے۔ اور معتمد علیہ اس میں دو حدیثیں ہیں: جبرئیل کی حدیث: پس بیشک انھوں نے نماز پڑھائی تھی دو دن۔ اور بُریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: پس اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوقات کے بارے میں پوچھنے والے کو جواب دیا بایں طور کہ آپؐ نے نماز پڑھی دو دن۔ اور اُن دونوں میں سے جو واضح ہے وہ فیصلہ کن ہے مبہم پر۔ اور اگر مختلف ہوں تو اس اختلاف میں پیروی کی جائے گی بُریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی۔ اس لئے کہ وہ مدنی متأخر ہے۔ اور پہلی حدیث مکی متقدم ہے۔ اور پیروی بعد والی کی کی جاتی ہے پھر اس کے بعد والی کی۔

اوراس (اختلاف) کی تفصیل یہ ہے کہ مغرب کا آخر وقت. وہ وہ ہے جو شفق غائب ہونے سے پہلے ہے۔اور بعید نہیں کہ جبرئیل نے مغرب کو مؤخر کیا ہو دوسرے دن میں بہت ہی تھوڑا۔اس کے وقت کے مختصر ہونے کی وجہ سے۔پس کہا راوی نے: ''مغرب کی نماز پڑھی دونوں دنوں میں ایک ہی وقت میں'' یا تو اپنے اجتہاد میں چوکنے کی وجہ سے یا انتہائی کمی کو بیان کرنے کے لئے۔باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

اور بہت سی حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عصر کے وقت کا آخر یہ ہے کہ سورج میں تغیر آجائے۔اور یہی وہ قول ہے جس پر تمام فقہاء متفق ہیں۔پس شاید دو مثل بیان ہے پسندیدہ وقت کے آخر کا اور اس وقت کا جس میں عصر پڑھنا مستحب ہے (عطف تفسیری ہے) یا کہیں ہم: شاید شریعت نے دیکھا ہو پہلے اس بات کی طرف کہ عصر کو مشتق کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہر دو نمازوں میں تقریباً چوتھائی دن کی جدائی ہو۔پس مقرر کی آخری حد دو مثل تک سایہ کے پہنچنے کو۔پھر ظاہر ہوئی لوگوں کی حاجتوں اور مشاغل میں سے وہ بات جس نے آخری حد کے بڑھانے کے فیصلہ کو واجب کیا۔

اور نیز اس حد (متلین) کا پہچاننا محتاج ہے ایک طرح کے غور کی طرف، اور اصلی سایہ زوال کو محفوظ رکھنے کی طرف، اور گھات میں بیٹھنے کی طرف، اور مناسب بات یہی ہے کہ لوگوں کو مخاطب بنایا جائے اس قسم کی چیزوں میں اُس بات کا جو کہ وہ محسوس (اور) واضح ہو۔پس پھونکا اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کہ بنائیں آپ آخری مدت سورج کی ٹکیہ کی یا دھوپ کی تبدیلی کو۔باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

دوسرا وقت: وقتِ مستحب

مستحب وقت: وہ ہے جس میں نماز پڑھنا افضل ہے۔اور وہ دو نمازوں کو مستثنیٰ کر کے اوائل اوقات ہیں یعنی نمازوں کو وقت ہوتے ہی پڑھ لینا بہتر ہے۔اور وہ دو وقت یہ ہیں:

پہلا وقت: ـــــ عشاء کی نماز ـــــ عشاء میں اصل مستحب تاخیر کرنا ہے۔اور اس کی وجہ وہ ہے جو پہلے گذر چکی ہے کہ تین اوقات اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان میں نماز ادا کی جائے۔ان میں سے ایک سونے کا وقت ہے۔انسان کی فطری حالت یہی ہے کہ جب تمام کاموں سے فارغ ہو جائے اور سونے کا وقت ہو جائے تو نماز ادا کر کے سو جائے۔درج ذیل حدیث میں اس اصلی مستحب کا بیان ہے۔

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میری امت کے لئے دشواری نہ ہوتی تو میں ان کو حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز تہائی رات یا آدھی رات تک مؤخر کریں'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۱۱)

تاخیر سے عشاء پڑھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ دن بھر کی مصروفیات جو اللہ کی یاد کو بھلانے والی ہیں اُن کے اثرات سے باطن صاف ہو جائے گا۔ اور جلدی پڑھے گا تو عشاء کے بعد بھی کام کرے گا۔ اور دل کا حال پھر ویسا ہی ہو جائے گا۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ باتیں کرنے کا موقعہ نہیں رہے گا۔ فوراً ہی پڑ کر سو جائے گا۔ اور عشا جلدی پڑھے گا تو چونکہ ابھی سونے کا وقت نہیں ہوا اس لئے گپ شپ میں لگ جائے گا۔ اور معلوم نہیں اس کا سلسلہ کب تک دراز ہو۔

مگر تاخیر کرنے میں یہ نقصان بھی ہے کہ جماعت میں لوگوں کی حاضری گھٹ جائے گی اور لوگ بدک جائیں گے۔ اور معاملہ برعکس ہو جائے گا، کیونکہ جماعت سے نماز پڑھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ شریکِ نماز ہوں۔ اس لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ معمول نبوی مروی ہے کہ: ''جب لوگ زیادہ تعداد میں آجاتے تھے، تو آپؐ جلدی نماز عشاء پڑھ لیتے تھے۔ اور جب لوگ کم ہوتے تھے تو دیر کر کے پڑھتے تھے'' (مشکوۃ حدیث ۵۸۸)

دوسرا وقت:—— گرمیوں کے ظہر —— جب جھلسا دینے والی گرمی پڑ رہی ہو تو ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنا مستحب ہے۔ درج ذیل حدیث اس کی دلیل ہے:

حدیث —— حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب گرمی سخت ہو تو ظہر کو ٹھنڈے وقت پڑھا کرو۔ کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی وسعت سے ہے'' یعنی جہنم کے اثرات پھیلتے ہیں (رواہ البخاری۔ مشکوۃ حدیث ۵۹۱)

تشریح دنیا میں ہم جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اس کے کچھ تو ظاہری اسباب ہیں۔ جنھیں ہم جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اور کچھ باطنی اسباب ہیں جو ہمارے احساس وادراک کی دسترس سے ماوراء ہیں۔ اس حدیث میں باطنی سبب کی طرف اشارہ ہے۔ گرمی کی شدت کا ظاہری سبب آفتاب ہے، مگر عالم غیب میں اس کا تعلق جہنم سے بھی ہے اور یہ حقائق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ ہی معلوم ہو سکتے ہیں۔

درحقیقت ہر راحت ولذت کا مرکز اور سرچشمہ جنت ہے۔ اور ہر تکلیف ومصیبت کا اصل خزانہ اور سرچشمہ جہنم ہے۔ اس دنیا میں جو بھی راحت یا تکلیف ہے یا جو بھی اچھی یا بری چیز ہے وہ وہیں کی ہواؤں کا جھونکا یا بھبوکا ہے۔ اور جہنم غضب خداوندی کا مظہر ہے اور خنکی رحمتِ خداوندی کی لہر ہے۔ اس لئے جب گرمی کی شدت سے فضا جہنم بن رہی ہو تو ظہر کی نماز کچھ تاخیر کر کے ایسے وقت پڑھی جائے جب گرمی کی شدت ٹوٹ جائے۔ اور وقت کچھ ٹھنڈا ہو جائے (ماخوذ از معارف الحدیث ۱:۱۲۸)

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی اپنی مختصر شرح میں یہی بات فرمائی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ جنت وجہنم ہی اس چیز کا مرکز ومنبع ہیں جس کا اس عالم میں فیضان کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ کیفیات مناسبہ یعنی راحت ولذت کی باتیں ہوں، یا کیفیت نامناسبہ یعنی رنج وتکلیف کی چیزیں ہوں۔ اور تاریخی روایات میں جو آیا ہے کہ کاسنی کے پتوں پر روزانہ جنت کا

قطرہ گرتا ہے۔اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ کاسنی کا اس مرکز ومنبع سے تعلق ہے[1]

فائدہ:(۱) یہ جو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عشا میں مستحبِ اصلی تاخیر کرنا ہے۔ یہ بات مذکورہ روایت سے نہیں نکلتی۔اور شاہ صاحب نے جو تاخیر عشاء کے فوائد بیان کئے ہیں، وہ بھی عارضی استحباب پر دلالت کرتے ہیں ـــــ اصل بات یہ ہے کہ تمام نمازیں شروع اوقات ہی میں ادا کرنا مستحب ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔اور اول وقت کی فضیلت میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں سے کوئی صریح روایت صحیح نہیں ہے۔ جیسے یہ روایت کہ نماز کا اول وقت اللہ کی خوشنودی کا وقت ہے۔اور آخر وقت اللہ کے درگذر کا وقت ہے (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ حدیث ۶۰۶) یہ روایت نہایت ضعیف ہے، بلکہ بعض نے تو اس کو موضوع کہا ہے۔مگر یہ مسئلہ عقلی ہے۔امر کا امتثال اولین فرصت میں کرنا ایک معقول بات ہے۔نماز کا وقت ہوتے ہی اقیموا الصلاۃ کا خطاب متوجہ ہوتا ہے۔پس اس کا حق یہ ہے کہ فوراً نماز ادا کی جائے۔اور یہ حق اللہ ہے۔مگر جب تین حقوق میں سے کوئی اس سے معارض یا موافق ہوجاتا ہے تو فضیلت آگے پیچھے ہوتی ہے۔اور وہ تین حقوق یہ ہیں. حق مصلیان، حقِ وقت اور حق صلوٰۃ۔

عشا، فجر اور جمعہ میں جب لوگ اول وقت میں جمع ہوجائیں تو حق اللہ اور حق مصلیان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ یہ نمازیں جلدی ادا کرلی جائیں۔تاکہ فوراً امر کا امتثال بھی ہوجائے اور لوگ پریشانی سے بھی بچ جائیں۔اور فجر اور عشا میں لوگ اول وقت میں جمع نہ ہوں یا نہ ہوسکتے ہوں تو حق مصلیان کی وجہ سے تاخیر مستحب ہے۔اور یہ تاخیر اصلی مستحب نہیں، عارضی حکم ہے۔اور اسفار کا حکم ایسی ہی صورت میں دیا گیا ہے۔کیونکہ جب حق اللہ اور حق البعد متعارض ہوتے ہیں تو اللہ کے مستغنی ہونے کی وجہ سے اور بندوں کے محتاج ہونے کی وجہ سے حق العبد کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اور سخت گرمیوں میں چونکہ ظہر کے اول وقت میں کچھ خرابی ہے۔وہ وقت غضب خداوندی کے مظہر جہنم کی وسعت اور اس کے اثرات کے پھیلنے کا ہے اس لئے حق وقت کی وجہ سے ظہر کی نماز میں تاخیر کرنا مستحب ہے۔اور یہ بھی اصلی حکم نہیں، عارضی استحباب ہے۔اصلی ہوتا تو سردیوں میں بھی تاخیر مستحب ہوتی۔

اور عصر میں چونکہ فرض ادا کرنے کے بعد نوافل ممنوع ہیں اور فرض مختصر پڑھے جاتے ہیں اس لئے جب عصر مجمع میں پڑھی جائے تو ہمیشہ عصر کی نماز تھوڑی تاخیر سے پڑھنا مستحب ہے۔تاکہ جن لوگوں کو نوافل پڑھنے ہیں، وہ فرضوں سے پہلے پڑھ لیں۔اور یہ تاخیر کا استحباب حق صلوٰۃ (نوافل) کی وجہ سے ہے۔حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے زمانہ کے لوگوں سے فرمایا تھا: ''رسول اللہ ﷺ آپ لوگوں سے بہت جلدی ظہر پڑھتے تھے یعنی آپ لوگ ظہر میں دیر

[1] کاسنی کے بارے میں روایات ابن القیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد (۴ ۴۰۰) میں یہ کہہ کر ذکر کی ہیں کہ: هٰذا: وردفيها ثلاثة أحاديث، لاتصحُّ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولايثبت مثلها، بل هي موضوعة اس لئے شاہ صاحب نے الأحاديث کے بجائے لفظ الأخبار استعمال کیا ہے ۱۲

کرتے ہیں اور آپ لوگ عصر میں آنحضرت ﷺ سے زیادہ جلدی کرتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۱۹) ظاہر ہے یہ حضرات عصر کی نماز وقت ہونے کے بعد ہی پڑھتے ہوں گے۔ مگر اس کو ام سلمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کے وقت سے جلدی پڑھنا قرار دے رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ معمولِ نبوی ہمیشہ عصر میں کچھ تاخیر کرنے کا تھا۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: (۲) اس روایت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ظہر کا وقت ایک مثل کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ کیونکہ عرب میں وقت ٹھنڈا اس وقت ہوتا ہے، جب سمندر کی طرف سے ہوائیں چلنی شروع ہوتی ہیں۔ مشہور ثقہ تابعی: محمد بن کعب قُرَظِی (ولادت ۴۰ھ وفات ۱۲۰ھ) فرماتے ہیں: نحن نكون في السفر، فإذا فاءتِ الأفياءُ، وهَبَّتِ الأرواحُ، قالوا: أبردتُم فالرَّواحُ: ترجمہ: جب ہم سفر میں ہوتے ہیں۔ پس جب سایے پلٹ جاتے ہیں یعنی مشرق کی طرف خوب لمبے ہو جاتے ہیں۔ اور ہوائیں چلنے لگتی ہیں، تو اعلان کیا جاتا ہے کہ وقت ٹھنڈا ہو گیا اب شام کا سفر شروع کرو۔

اور میں نے خود مکہ مکرمہ میں بارہا تجربہ کیا ہے، اور ہر شخص وہاں پہنچ کر خود تجربہ کر سکتا ہے۔ وہاں سمندر کی جانب سے خنک ہوائیں مثل اول کے ختم تک نہیں چلتیں۔ مثل ثانی شروع ہونے کے بعد ہی چلتی ہیں۔ جب وہاں لوگ عصر کی نماز سے بھی فارغ ہو جاتے ہیں۔

ایک سوالِ مقدر کا جواب: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے صرف دو نمازوں کا استثناء کیوں کیا، فجر کی نماز کا بھی استثناء کرنا چاہئے کیونکہ اس کا بھی اسفار میں پڑھنا مستحب ہے۔ اور درج ذیل حدیث اس کی دلیل ہے:

حدیث ـــــ حضرت رافع بن خَدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز فجر اسفار میں پڑھو (یعنی صبح کا اُجالا پھیل جانے پر فجر کی نماز پڑھو) کیونکہ اس میں زیادہ اجر و ثواب ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۱۴)

جواب: شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے مطلقاً فجر کی نماز میں تاخیر کا استحباب ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس حدیث کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔

پہلا مطلب: اس حدیث میں ان لوگوں سے خطاب ہے جن کو اندیشہ ہو کہ اگر سویرے فجر کی نماز پڑھی جائے گی تو جماعت میں بہت ہی کم لوگ شریک ہوں گے ایسی صورت میں حکم دیا گیا ہے کہ اُجالا ہونے کا انتظار کیا جائے۔ مطلقاً یہ حکم نہیں ہے۔

دوسرا مطلب: یا یہ ایسی بڑی مسجد والوں سے خطاب ہے جہاں بوڑھے، کمزور اور بچے بھی نماز میں شریک ہوتے ہوں ایسی مسجد میں اسفار میں نماز پڑھنے کا حکم نمازیوں کے ساتھ تخفیف کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث میں امام کو ہلکی نماز پڑھانے کا حکم دیا گیا ہے:

حدیث ـــــ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنے امام کی شکایت کی کہ وہ لمبی نماز پڑھاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نماز میں شریک نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ نے اس دن نہایت غصہ میں وعظ فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا

کہ: ''تم میں سے کچھ لوگ مقتدیوں کو متنفر کرنے والے ہیں! پس تم میں سے جو نماز پڑھائے چاہئے کہ ہلکی پڑھے۔ کیونکہ جماعت میں ضعیف، بوڑھے اور حاجت مند ہوتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۱۳۲ باب ما علی المأموم)

تیسرا مطلب: یا یہ مطلب ہے کہ نماز شروع تو کی جائے تاریکی میں مگر لمبی کی جائے تا آنکہ وہ اسفار میں ختم ہو۔ جیسا کہ حضرت ابوبرزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہی معمول نبوی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز سے پھرتے تھے جب آدمی اپنے ہم نشین کو پہچانتا تھا۔ اور آپ ساٹھ آیتوں سے سو آیتوں تک پڑھتے تھے (مشکوۃ حدیث ۵۸۷)

غرض اس روایت سے مطلقاً اسفار کا استحباب نہیں نکلتا کہ ہمیشہ اور ہر جگہ اُجالا کر کے فجر کی نماز پڑھی جائے اور اجالے ہی میں شروع بھی کی جائے۔ پس اس حدیث میں اور غلس (اندھیرے) کی روایت میں کوئی تعارض نہیں۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ کی مذکورہ بالا تاویلات تشفی بخش نہیں۔ تشفی بخش بات یہ ہے کہ حضرت رافع رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے مطابق افضل تو اسفار ہی میں نماز پڑھنا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلس میں فجر پڑھنے کا معمول اس لئے تھا کہ اس زمانہ میں زیادہ تر لوگ تہجد پڑھتے تھے۔ اور ایسے ہی لوگ مسجد نبوی میں جمع ہوتے تھے اس وقت مسجد نبوی مدینہ شریف کی عام آبادی سے ہٹ کر ایک طرف قبرستان کے قریب واقع تھی۔ اور مدینہ کے محلوں میں نو مساجد علحدہ تھیں حضرت رافع کی حدیث میں خطاب انہی مساجد کے لوگوں سے ہے اور جو لوگ تہجد گذار تھے اور اپنے محلوں سے چل کر مسجد نبوی میں آکر تہجد پڑھتے تھے۔ اور ان کا اصل مقصد فجر کی نماز میں شرکت کرنا ہوتا تھا۔ ان حضرات کی سہولت اسی میں تھی کہ نماز فجر تاخیر سے نہ پڑھی جائے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز زیادہ تر سویرے غلس ہی میں ادا فرماتے تھے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی ایسا اندھیرا رہتا تھا کہ نماز پڑھ کر گھر واپس جانے والی خواتین پہچانی نہیں جاتی تھیں۔

غرض جس طرح آپ عشا عموماً سویرے پڑھتے تھے اور سخت گرمیوں میں بھی جمعہ اول وقت ادا فرماتے تھے حالانکہ مستحب تاخیر تھی اسی طرح فجر میں بھی لوگوں کی سہولت کے لئے اندھیرے میں پڑھتے تھے، اگرچہ افضل اجالے میں پڑھنا تھا۔ پس اگر نمازی فجر میں اول وقت ہی میں جمع ہو جائیں جیسا کہ رمضان میں لوگ سحری کھا کر مسجد میں آجاتے ہیں تو اس وقت اول وقت میں نماز پڑھنا افضل ہے، کیونکہ دیر کرنے میں تقلیل جماعت کا اندیشہ ہی نہیں، مشاہدہ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

[۲] ووقتُ الاستحباب الذی یُستحب أن یصلّی فیه، وهو أوائل الأوقات:

[الف] إلا العشاء، فالمستحب الأصلی تأخیرها، لما ذکرنا من الوضع الطبیعی، وهو قوله صلی الله علیه وسلم: "لو لا أن أشقّ علی أمتی لأمرتُهم أن یؤخروا العشاء" ولأنه أنفعُ فی تصفیة الباطن من الأشغال المُنْسیة ذکر الله، وأقطعُ لمادة السمر بعد العشاء، لکن التأخیر ربما یُفضی إلی تقلیل الجماعة، وتنفیر القوم، وفیه قلب الموضوع، فلهذا کان النبی صلی الله علیه وسلم إذا کَثُرَ الناسُ عَجَّلَ، وإذا قَلُّوا أَخَّرَ.

[ب] وإلا طُهْرَ الصيفِ، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا اشتَدَّ الْحَرُّ فابردوا بالظهر، فإن شدة الحر من فَيْحِ جَهَنَّم"

أقول: معناه: معدِن الجنة والنار هو معدِن ما يُفَاضُ فى هذا العالم من الكيفيات المناسبة والمنافرة، وهو تأويل ما ورد فى الأخبار فى الْهِنْدَ بَاءِ وغيره.

قوله صلى الله عليه وسلم:" أَسْفِرُوْا بالفجر، فإنه أعظم للأجر"

أقول: هذا خطاب لقوم خَشُوا تقليلَ الجماعة جدًّا: أن ينتظروا إلى الإسفار؛ أو لأهل المساجد الكبيرة التى تَجمع الضعفاءَ والصبيانَ وغيرهم، كقوله صلى الله عليه وسلم:" أيُّكم صلّى بالناس فلْيُخَفِّفْ، فإن فيهم الضعيفَ" الحديث؛ أو معناه: طَوِّلُوا الصلاةَ حتى يقع آخِرُها فى وقت الإسفار، لحديث أبى برزةَ:" كان يَنْفَتِلُ فى صلاة الغداة حين يعرف الرجل جليسَه، ويقرأ بالستين إلى المائة" فلامنا فاةَ بينه وبين حديثِ الغَلَس.

ترجمہ: (۲) اور مستحب وقت: وہ وقت جو کہ مستحب ہے کہ اس میں نماز پڑھی جائے۔ اور وہ اوائل اوقات ہیں:

(الف) مگر عشاء: پس اصلی مستحب اس میں تاخیر ہے۔ اس بات کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی فطری حالت سے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''اگر میری امت کے لئے دشواری نہ ہوتی تو میں ان کو حکم دیتا کہ وہ عشاء کو مؤخر کریں'' اور اس لئے کہ تاخیر زیادہ نافع ہے باطن کو صاف کرنے میں، اُن مشاغل سے جو اللہ کی یاد کو بھلانے والے ہیں۔ اور وہ عشاء کے بعد قصہ گوئی کے عنصر کو زیادہ کاٹنے والی ہے۔ مگر تاخیر کبھی پہنچاتی ہے جماعت کو کم کرنے کی طرف اور لوگوں کو بد کانے کی طرف۔ اور اس میں معاملہ برعکس ہو جاتا ہے۔ پس اسی وجہ سے جب لوگ زیادہ (جمع) ہو جاتے تھے تو نبی ﷺ جلدی کرتے تھے۔ اور جب لوگ کم ہوتے تھے تو تاخیر کرتے تھے۔

(ب) اور مگر گرمی کے ظہر۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب گرمی سخت ہو جائے تو ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھو، پس بیشک گرمی کی شدت جہنم کی وسعت (اثرات کے پھیلنے) سے ہے''

میں کہتا ہوں: اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت و جہنم کا سرچشمہ ہی اس چیز کا سرچشمہ ہے، جس کا اس عالم میں فیضان کیا جاتا ہے، موافق اور ناموافق احوال میں سے۔ اور یہی مطلب ہے اس کا جو خبروں میں آیا ہے کاسنی وغیرہ کے بارے میں۔

(سوالِ مقدر کا جواب) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''اُجالا کر کے فجر پڑھا کرو (یعنی مسجد نبوی کے معمول کے مطابق غلَس میں نہ پڑھو) پس بیشک وہ زیادہ بڑا ہے ثواب کے لئے (یعنی اسفار کر کے پڑھنے میں جماعت بڑی ہوگی۔ اور جنتی جماعت بڑی ہوگی، ثواب زیادہ ہوگا)

میں کہتا ہوں: یہ ایسے لوگوں سے خطاب ہے جو ڈرتے ہیں جماعت کے بہت ہی کم ہو جانے سے کہ انتظار کریں وہ

اُجالا ہونے کا ـــــ یا ایسی بڑی مساجد والوں سے خطاب ہے جو اکٹھا کرتی ہیں کمزوروں کو اور بچوں کو اور ان کے علاوہ کو۔ جیسے آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''تم میں سے جو لوگوں کو نماز پڑھائے، پس چاہئے کہ وہ ہلکی نماز پڑھے۔ پس بیشک لوگوں میں کمزور ہیں'' آخر حدیث تک ـــــ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو دراز کرو تا آنکہ اس کا آخر واقع ہو، اسفار کے وقت میں، ابو برزہؓ کی حدیث کی وجہ سے کہ: ''آپ ﷺ صبح کی نماز سے پھرا کرتے تھے جب پہچانتا تھا آدمی اپنے ہم نشیں کو۔ اور آپ ساٹھ سے سو آیتوں تک پڑھا کرتے تھے'' ـــــ پس کوئی تضاد نہیں اسفار کی حدیث اور غلس کی حدیث کے درمیان۔

☆ ☆

تیسرا وقت: وقتِ ضرورت

وقت ضرورت: وہ ہے جس تک نماز کو بغیر عذر کے مؤخر کرنا جائز نہیں۔ درج ذیل تین حدیثوں میں اسی کا تذکرہ ہے:

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے صبح کی ایک رکعت پائی سورج نکلنے سے پہلے تو یقیناً اس نے صبح پالی۔ اور جس نے عصر کی ایک رکعت پائی سورج ڈوبنے سے پہلے تو یقیناً اس نے عصر پالی'' (مشکوۃ حدیث ۶۰۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس نے کسی نماز کے وقت کے آخر میں صرف ایک رکعت پائی اس نے وہ نماز پالی، پس وہ اس نماز کو پورا کرے۔ مگر ظاہر ہے کہ نماز میں اتنی تاخیر کرنا بغیر عذر کے درست نہیں! اور عذر یہ ہے کہ آدمی ایسے ہی وقت میں بیدار ہو یا نماز یاد آئے۔

فائدہ: اس حدیث کا یہ مطلب بھی سمجھا گیا ہے کہ یہ حدیث اس شخص کے حق میں ہے جو کسی نماز کے وقت کے آخر میں نماز کا اہل ہوا ہو۔ مثلاً حائضہ پاک ہوئی ہو یا بچہ بالغ ہوا ہو، یا غیر مسلم ایمان لایا ہو تو اگر وہ نماز کا اتنا وقت پائے کہ طہارت حاصل کر کے ایک رکعت یا ایک سجدہ یعنی ایک رکن وقت میں ادا کر سکتا ہو تو اس پر وہ نماز واجب ہو گئی۔

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ منافق کی نماز ہے: بیٹھا رہا، سورج کی نگرانی کرتا رہا، یہاں تک کہ جب سورج پیلا پڑ گیا اور شیطان کے دو سینگوں کے درمیان چلا گیا تو اٹھا اور چار ٹھونگیں مار لیں۔ یاد نہیں کرتا وہ نماز میں اللہ تعالیٰ کو مگر تھوڑا سا'' (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۵۹۳) اس روایت سے معلوم ہوا کہ سورج پیلا پڑنے کے بعد بھی عصر کا وقت باقی رہتا ہے۔ مگر یہ وقت ضرورت ہے۔ بے ضرورت اتنی تاخیر مکروہ تحریمی ہے۔

حدیث ـــــ مسلم، ترمذی اور موطا مالک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کے درمیان جمع کیا: **فی غیر خوف ولا سفر** (**وفی حدیث وکیع:**) **ولا مطرٍ** یعنی نہ تو دشمن کا کوئی ڈر تھا، نہ سفر تھا اور نہ ہی بارش تھی۔ حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا کہ آپؐ نے یہ

عمل کیوں کیا؟ ابن عباسؓ نے فرمایا: أراد ان لایحرج أحدا من أمته یعنی آپؐ نے یہ عمل اس لئے کیا تھا کہ امت میں سے کسی کے لئے تنگی نہ ہو یعنی آپؐ نے یہ عمل بیان جواز کے لئے کیا تھا (مسلم باب صلاۃ المسافرین ۲۱۵.۵ مصری) ظاہر ہے کہ یہ جمع حقیقی بوقتِ ضرورت ہی جائز ہے۔ اور ضرورت: سفر، بیماری اور بارش ہے۔ اور عشاء میں وقتِ ضرورت نصف رات کے بعد سے صبح پو پھٹنے تک کا وقت ہے۔ مجبوری کی صورت ہی میں عشاء کو اس وقت تک مؤخر کرنا چاہئے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جمع حقیقی پر محمول کیا ہے۔ مگر آپ نے جمع حقیقی کے جواز کے لئے جو تین اعذار بیان فرمائے ہیں، ان میں سے کوئی عذر اُس جمع میں موجود نہیں تھا۔ پھر جمع کیسے جائز ہوا؟ صحیح بات یہ ہے کہ وہ جمع صُوری تھی اور بیان جواز کے لئے آپ نے وہ عمل کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

چوتھا وقت: وقتِ قضاء

اگر کوئی نماز بھول جائے یا سوتا رہ جائے اور نماز فوت ہو جائے یعنی ہاتھ سے نکل جائے تو جب یاد آئے یا آنکھ کھلے اس نماز کی قضاء واجب ہے اور یہی وقتِ قضاء ہے، درج ذیل حدیث سے یہ بات ثابت ہے۔

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص کوئی نماز بھول گیا یا اس سے سو گیا پس اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب وہ یاد آئے (یا جب بیدار ہو) اس نماز کو پڑھ لے'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۶۰۳)

تشریح: فوت شدہ نماز کی قضا کیوں ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں جامع مختصر بات یہ ہے کہ دو وجہ سے اس کی قضا ضروری ہے: **ایک**: اس وجہ سے کہ اگر قضا واجب نہیں کی جائے گی تو نفس بے لگام ہو جائے گا اور وہ خواہشات کے ساتھ بہتا چلا جائے گا اور نماز چھوڑنے کا عادی ہو جائے گا۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ قضا پڑھنے سے وہ فوائد حاصل ہو جائیں گے جو ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

فائدہ: تفویت یعنی جان بوجھ کر نماز چھوڑنے کی صورت میں بھی قضا واجب ہے۔ علماء نے تفویت کو فوت کے حکم میں رکھا ہے۔ کیونکہ جب نماز فوت ہونے کی صورت میں قضا کے ذریعہ اس کی تلافی ضروری ہے تو تفویت تو اس سے سنگین گناہ ہے۔ اس کی تلافی تو بدرجہ اولی ضروری ہوگی۔ اور یہ دلالۃ النص سے استدلال ہے۔ جیسے اُف کہنے کی ممانعت سے ضرب وشتم کی تحریم ثابت کی گئی ہے۔

[۳] ووقتُ الضرورة، وهو ما لايجوز التأخير إليه إلا بعذر، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " من أدرك ركعةً من الصبح قبل أن تطلع الشمسُ فقد أدرك الصبح، ومن أدرك ركعةً من العصر قبلَ أن تغرُبَ الشمسُ فقد أدرك العصر" وقوله: صلى الله عليه وسلم: " تلك صلاة

المنافق: يرْقُبُ الشمس حتى إذا اصفرّتْ" الحديث، وهو حديثُ ابن عباس في الجمع بين الظهر والعصر، وبين المغرب والعشاء؛ والعذرُ: مثلُ السفر والمرض والمطر؛ وفي العشاء إلى طلوع الفجر، والله أعلم.

[٤] ووقتُ القضاء: إذا ذكر، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" من نَسِيَ صلاةً. أو نام عنها، فَلْيُصَلِّها إذا ذكرها"

أقول: والجملةُ في ذلك: أن لا تسْتَرْسِلَ النفسُ بتركها، وأن يُدْرِكَ مافاته من فائدة تلك الصلاة، وألْحَقَ القومُ التفويت بالفوتِ، نظرًا إلى أنه أحقُّ بالكفارة.

ترجمہ: (۳) اور وقت ضرورت اور وہ وہ ہے کہ جائز نہیں اس تک تاخیر مگر کسی عذر کی وجہ سے (اس کے بعد تین حدیثیں ذکر فرمائی ہیں جن کا ترجمہ اوپر گذر چکا) اور عذر: جیسے سفر اور بیماری اور بارش۔ اور عشاء میں (وقت ضرورت) پو پھٹنے تک ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(۴) اور قضاء کا وقت: جب اس کو نماز یاد آجائے (اس کے بعد حدیث ذکر فرمائی ہے جس کا ترجمہ گذر چکا ہے)

میں کہتا ہوں: اور مختصر جامع بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ نفس نہ بہتا جائے اس کو چھوڑنے کے ساتھ۔ اور یہ کہ پالے وہ اس چیز کو جو اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے اس نماز کے فائدہ میں سے ——— اور علماء نے ملایا ہے نماز فوت کرنے کو نماز فوت ہونے کے ساتھ۔ اس بات کی طرف نظر کرتے ہوئے کہ فوت کرنا کفارہ کا زیادہ حقدار ہے (یعنی حدیث میں قضا کو فوت شدہ نماز کا کفارہ کہا گیا ہے۔ پس نماز کو فوت کرنے کی صورت میں یہ کفارہ بدرجہ اولیٰ ضروری ہے)

☆ ☆ ☆

نماز قضا کی جارہی ہو اور آدمی بے بس ہو تو کیا کرے؟

حدیث ——— حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''تیرا کیا حال ہوگا جب تجھ پر ایسے سردار مسلط ہوں گے جو نماز کو ماردیں گے؟!'' یعنی قضاء کر کے پڑھیں گے۔ یا یہ فرمایا کہ: ''نماز کو اس کے وقت سے پیچھے ڈال دیں گے؟!'' حضرت ابوذر غفاریؓ نے دریافت کیا کہ ایسے وقت کے لئے مجھے کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو وقت پر نماز پڑھ لینا۔ پھر اگر تو اس نماز کو امیر کے ساتھ پائے تو (دوبارہ) پڑھ لینا۔ پس بیشک وہ تیرے لئے نفل ہے'' (مشکوۃ حدیث ۶۰۰)

تشریح: جب اس نے وقت پر نماز پڑھ لی تو اب امیر کے ساتھ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

نماز میں دو اعتبار ہیں یعنی دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے: ایک: اللہ اور بندہ کے درمیان وسیلہ ہونے کا۔ اس اعتبار سے ضروری ہے کہ بروقت نماز ادا کی جائے تا کہ اللہ پاک ناراض نہ ہوں۔ اور دوسرا اعتبار یہ ہے کہ نماز دین کا ایک ایسا شعار ہے جس کے ترک پر سرزنش کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ضروری ہے کہ امیر کے ساتھ بھی پڑھ لی جائے، تا کہ اس کی طرف سے کوئی گزند نہ پہنچے۔

اختیار کی صورت میں نماز مکروہ وقت میں پڑھنا کیسا ہے؟

حدیث ـــــ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت برابر بھلائی پر ـــــ یا فرمایا کہ فطرت پر یعنی طریقۂ اسلام پر ـــــ رہے گی، جب تک وہ مغرب کی نماز میں ستاروں کے گنجان ہونے تک دیر نہیں کرے گی'' (مشکوۃ حدیث ۶۰۹)

تشریح: اختیاری احوال میں نماز مکروہ وقت میں پڑھنا احکام شرعیہ میں لاپرواہی برتنا ہے، جو تحریف ملّت کا باعث ہے۔ کیونکہ اس طرح لوگ احکام شرعیہ میں لاپرواہی برتتے رہیں گے تو ملت اسلامیہ کے نقوش مٹ جائیں گے۔

تین نمازوں کی نگہداشت کا حکم کیوں دیا؟

آیت کریمہ: سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۸ میں ارشاد پاک ہے: '' نگہداشت کرو تم تمام نمازوں کی اور درمیانی نماز کی''۔ درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ جیسا کہ ابن مسعود اور سَمُرۃ بن جندب کی مرفوع روایت میں آیا ہے (مشکوۃ حدیث ۶۳۴)

حدیث ـــــ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دو ٹھنڈے وقتوں کی نمازیں (فجر اور عصر) پڑھیں وہ جنت میں داخل ہوگا'' (مشکوۃ حدیث ۶۲۵)

حدیث ـــــ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کے اعمال یقیناً باطل ہو گئے'' (مشکوۃ حدیث ۵۹۵)

حدیث ـــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص جس کی عصر کی نماز فوت ہوگئی، تو گویا اس کی آل اور مال پر حادثہ پڑ گیا'' (مشکوۃ حدیث ۵۹۴)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''منافقین پر فجر اور عشاء سے زیادہ بھاری کوئی نماز نہیں۔ اور اگر وہ جان لیں اس ثواب کو جو اُن میں ہے تو وہ ضرور اُن میں آئیں، خواہ گھسٹ کر ہی آنا پڑے'' (مشکوۃ حدیث ۶۲۹)

تشریح: مذکورہ بالا نصوص میں عصر، عشاء اور فجر کی نمازوں کی نگہداشت کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور ان میں کوتاہی پر

وعید سنائی گئی ہیں۔سوال یہ ہے کہ نمازیں تو پانچ فرض ہیں۔پھر تین ہی نمازوں کی نگہداشت کی تاکید کیوں کی گئی؟ جواب یہ ہے کہ یہ نمازیں سستی اور لاپرواہی کی احتمالی جگہیں ہیں۔فجر اور عشا سونے کے وقت میں پڑھی جاتی ہیں۔اس وقت نرم گرم لحاف گدے کو چھوڑ کر اور مزے دار نیند اور غنودگی کو قربان کر کے نماز کے لئے متقی مؤمن ہی کھڑا ہوتا ہے۔اور عصر کا وقت: بازاروں کے عروج اور خرید وفروخت میں مشغولیت کا وقت ہے۔اور زراعت پیشہ لوگ اس وقت تھکن سے چور چور ہوتے ہیں۔اس لئے ان نمازوں میں کوتاہی کا احتمال تھا اس لئے ان کی حفاظت کی خصوصی تاکید فرمائی۔

اسلامی اصطلاحات کی حفاظت ضروری ہے

حدیث ـــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہرگز تم پر گنوار غالب نہ آئیں، تمہاری نمازِ مغرب کے نام پر'' اور ایک دوسری حدیث میں ہے: ''ہرگز تم پر گنوار غالب نہ آئیں: تمہاری نماز عشاء کے نام پر۔پس بیشک وہ کتاب اللہ میں عشاء ہے۔اور اَعراب رات تاریک ہونے کے بعد اونٹ دوہتے تھے''

(مشکوۃ حدیث ۶۳۱ و ۶۳۲)

تشریح: عرب کے گنوار مغرب کے وقت کو عشاء کہتے تھے۔اور عشاء کے وقت کو عَتَمَۃ کہتے تھے عتم عتما کے معنی ہیں: رات تاریک ہونے کے بعد اونٹ دوہنا۔چونکہ وہ رات تاریک ہونے کے بعد اونٹوں کا دودھ نکالتے تھے، اس لئے وہ عشاء کے وقت کو عتمہ کہتے تھے۔اگر ان کی یہ اصطلاح چل پڑی تو نصوص فہمی میں دشواری پیش آئے گی۔سورۃ النور آیت ۵۸ میں ہے ﴿مِنْ بَعْدِ صلوۃ الْعِشَاءِ﴾ اس کا مفہوم غلط سمجھا جائے گا۔اس لئے اسلامی اصطلاحات کی حفاظت ضروری ہے۔شاہ صاحب فرماتے ہیں:

قرآن وحدیث میں جن چیزوں کے جو نام آئے ہیں ان میں تبدیلی کرنا اور ان کے دوسرے نام رکھنا مکروہ ہے۔نئے نام رکھے جائیں گے تو پرانے نام متروک ہوجائیں گے اور لوگوں پر دین کی باتیں مشتبہ ہوجائیں گی اور قرآن وحدیث مبہم ہوجائیں گے یعنی ان کا سمجھنا دشوار ہوجائے گا۔

[۱] ووَصّى صلى الله عليه وسلم أبا ذَرٍّ إذا كان عليه أُمَرَاءُ يُميتون الصلاةَ: '' صَلِّ الصلاةَ لوقتها، فإن أدركتها معهم فصلِّها، فإنها لك نافلة''

أقول: رَاعى فى الصلاة اعتبارين: اعتبارَ كونها وسيلةً بينه وبين الله، وكونها من شعائر الله يُلام على تركها.

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: '' لاتزال أمتى بخيرٍ مالم يؤخِّروا المغربَ إلى أن تَشْتَبِكَ النجومُ''

أقول: هذا إشارة إلى أن التهاون فى الحدود الشرعية سببُ تحريف الملّةِ.

[۳] قال اللّٰه تعالى: ﴿حافِظُوْا على الصَّلوات والصَّلاةِ الْوُسْطى﴾ والمراد بها العصر. وقوله صلى الله عليه وسلم:" من صَلَّى الْبَرْدَيْن دخل الجنة" قوله صلى اللهعليه وسلم:" من ترك صلاة العصر حَبِطَ عملُه" وقوله صلى الله عليه وسلم:" الذى تفوتُه صلاةُ العصر فكأنما وُتِرَ أهلَه ومالَه" وقوله صلى الله عليه وسلم:" ليس صلاةٌ أثقلَ على المنافقين من الفجر والعشاء، ولو يعلمون مافيهما لأتوهما ولو حَبْوًا"

أقول: إنما خصَّ هذه الصلواتِ الثلاث بزيادة الاهتمام ترغيبًا وترهيبًا، لأنها مظنّةُ التهاون والتكاسل: لأن الفجر والعشاءَ وقتُ النوم، لا ينتهضُ إليه من بين فراشه ووطائه عند لذيذِ نومه ووَسنِه إلا مؤمنٌ تقيٌّ؛ وأما وقتُ العصر: فكان وقتُ قيام أسواقهم، وإشتغالهم بالبيوع،وأهلُ الزراعة أتعبُ حالِهم هذه.

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم:" لايَغْلِبَنّكم الأعرابُ على اسم صلاتكم المغرب" وفى حديث آخر:" على اسمِ صلاةِ العشاءِ"

أقول: يكره تسميةُ ماورد فى الكتاب والسنة مسمًّى بشيءٍ:اسما آخرَ، بحيث يكون ذريعةً لهجر الاسم الأول، لأن ذلك يُلبِّسُ على الناس دينهم، ويُعجمُ عليه كتابهم.

ترجمہ:(۱)اور تاکید فرمائی آنحضرت ﷺ نے ابوذر کو جب ہوں ان پر ایسے سردار جو نماز کو مار دیں کہ:"پڑھ تو نماز کو اس کے وقت میں، پھر اگر پائے تو اس کو ان کے ساتھ تو (دوبارہ) پڑھ لے اس کو، پس بیشک وہ تیرے لئے نفل ہے" میں کہتا ہوں: آپؐ نے نماز میں دو اعتبار ملحوظ رکھے ہیں: اس کے وسیلہ ہونے کا اعتبار بندہ اور اللہ کے درمیان اور اس کے اللہ کے دین کے ایسے شعائر میں سے ہونے کا اعتبار، جس کے ترک پر سرزنش کی جاتی ہے۔

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ احکام شرعیہ میں لاپروائی ملت (کی تعلیمات) کے بگاڑنے کا سبب ہے۔

(۳) (پانچ نصوص ذکر فرمائی ہیں، جن کا ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: ان تین نمازوں کو آپؐ نے خاص کیا زیادہ اہتمام کے ساتھ ترغیب اور ترہیب کے طور پر، صرف اس وجہ سے کہ وہ نمازیں لاپروائی اور سستی برتنے کی احتمالی جگہ ہیں۔ اس لئے کہ فجر اور عشا سونے کا وقت ہے۔ نہیں کھڑا ہوتا اس کی طرف اپنے بستر اور اپنے گدے کے بیچ سے، اپنی مزہ دار نیند اور اپنی غنودگی کے وقت میں، مگر پرہیزگار مؤمن۔ اور رہا عصر کا وقت: تو وہ ان کے بازاروں کے عروج کا اور ان کے خرید وفروخت میں مشغول ہونے کا وقت ہے۔ اور کھیتی والے ان کی تھکن کی سب سے بُری حالت اس وقت میں ہوتی ہے۔

(۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: مکروہ ہے کوئی دوسرا نام رکھنا اس چیز کا جو وارد

ہوئی ہے قرآن وحدیث میں کسی چیز کے ساتھ نام رکھی ہوئی، بایں طور کہ ہوئے وہ ذریعہ پہلے نام کو چھوڑ دینے کا۔ اس لئے کہ یہ بات مشتبہ کردے گی لوگوں پر ان کے دین کو۔ اور مبہم کردے گی ان پر ان کی کتاب کو۔

لغات: وتَرَ یَتِرُ وَتْرًا وترۃً مالہ: گھٹا دینا اور وُتر (مجہول) بمعنی اُصیب ہے یعنی حادثہ پیش آنا۔ اور اھلہ ومالہ مفعول ثانی ہیں .. حبا(ن) حبوًا الصبیُّ: چوتڑوں کے بل گھسٹنا . عجم علیہ الکلامُ: دشوار ہونا، مبہم ہونا۔

☆ ☆ ☆

باب ——— ۴

اذان کا بیان

اذان کی تاریخ، اہمیت اور معنویت

جب صحابہ کے علم میں یہ بات آئی کہ جماعت سے نماز ادا کرنا مطلوب ومؤکد ہے۔ اور ایک وقت میں اور ایک جگہ میں اعلان وآگہی کے بغیر سب لوگوں کا جمع ہونا آسان نہیں، تو انھوں نے باہم مشورہ کیا۔ کسی نے رائے دی کہ بگل بجایا جائے، جیسے یہود بجاتے ہیں۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ ناقوس (نقارہ) بجایا جائے، جیسے عیسائی بجاتے ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب تجاویز کو رد فرمادیا۔ کیونکہ ان میں غیروں سے مشابہت تھی۔ اس گفتگو پر مجلس برخاست ہوگئی اور سب لوگ منتشر ہوگئے۔ چند دن بعد حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ نے اذان واقامت کے بارے میں خواب دیکھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا ''یہ برحق خواب ہے!''[1]

اذان کے اس واقعہ سے درج ذیل پانچ باتیں ثابت ہوئیں:

۱ ——— احکام مصالح کی بنا پر ہی مشروع کئے جاتے ہیں۔ یعنی اذان واقامت میں حکمتیں تھیں اس لئے ان کو خواب کے ذریعہ مشروع کیا گیا۔

۲ ——— اجتہاد نبوی کے لئے احکام شرعیہ میں کچھ دخل ہے یعنی بعض احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی جلی کے بغیر اجتہاد سے مقرر فرماتے ہیں۔

---

[1] شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اذان واقامت کی تاریخ نہایت اختصار سے بیان کی ہے۔ اس کی مکمل تفصیل جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند کی کتاب ''آداب اذان واقامت'' میں ہے۔ شائقین اس کی مراجعت کریں ۱۲

۳ ـــــ دین میں آسانی کرنا شریعت کا ایک بنیادی ضابطہ ہے اسی ضابطہ کی رو سے اذان مشروع کر کے نماز کے لئے جمع ہونا آسان کیا گیا ہے۔

۴ ـــــ شعائر میں ایسے لوگوں کی مخالفت کرنا جو عرصۂ دراز سے گمراہی کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں مطلوب ومستحسن ہے۔ اس لئے کہ شعائر ہی سے دین وملت کا امتیاز قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ تمام تجاویز رد فرمادیں جو غیروں کا شعار تھیں۔

۵ ـــــ غیر نبی بھی خواب یا الہام کے ذریعہ اللہ کی مراد سے واقف ہوسکتا ہے۔ مگر وہ شرعاً حجت نہیں، جب تک کہ نبی کی اس کو تائید حاصل نہ ہوجائے پس اذان واقامت کی مشروعیت صرف خواب سے نہیں ہوئی، بلکہ تائید نبوی سے ہوئی ہے۔ پھر قرآن کریم نے سورۃ الجمعہ کی آیت ۹ میں اس حکم کی توثیق کردی۔

اذان کی اہمیت ومعنویت: اذان مشروع کرتے ہوئے حکمت خداوندی نے یہ بھی چاہا کہ اذان صرف اعلان وآگہی کا ذریعہ نہ ہو، بلکہ وہ دین کا ایک شعار بھی ہو۔ اور وہ اس طرح کہ جب کس وناس کے سامنے اذان کی صدا بلند کی جائے گی تو اس سے دین کی شان بلند ہوگی۔ اور جب لوگ اذان سن کر نماز کے لئے آئیں گے تو وہ دین کی تابعداری کی ایک علامت ہوگی۔ اس لئے اذان اللہ کی کبریائی کے اعلان سے شروع کی جاتی ہے۔ پھر اسلام کے وہ بنیادی عقیدوں (توحید ورسالت محمدی) کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور یہ اعلان گواہی کی شکل میں کیا جاتا ہے، جس میں دوسروں کو ترغیب دینا ہے کہ وہ بھی یہ گواہیاں دیں۔ پھر اسلام کی بنیادی عبادت نماز کی طرف لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے اور ساتھ ہی اس کا فائدہ بھی بتایا جاتا ہے کہ دارین کی کامیابی نماز میں مضمر ہے۔ پھر آخر میں دوبارہ اللہ کی عظمت وکبریائی اور توحید کا اعلان کر کے اذان پوری کی جاتی ہے تاکہ اذان کا جو مقصد ہے اس کو اذان پوری صراحت کے ساتھ بیان کردے۔

﴿الأذان﴾

لَمَّا علمتِ الصحابةُ أن الجماعة مطلوبةٌ مؤكدةٌ، ولايتيسر الاجتماع في زمان واحد ومكان واحد بدون إعلام وتنبيهٍ: تكلّموا فيما يحصل به الإعلامُ، فذكروا النار، فردّها رسولُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم لمشابهة المجوس؛ وذكروا القرنَ، فردّه لمشابهة اليهود؛ وذكروا الناقوس، فردّه لمشابهة النصارى، فرجعوا من غير تعيين، فأُرِي عبدُ الله بنُ زيد الأذانَ والإقامةَ في منامه، فذكر ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم، فقال: "رؤيا حقٌّ!"

وهذه القصةُ دليل واضح على أن الأحكام إنما شُرعت لأجل المصالح، وأن للاجتهاد فيها مدخلاً، وأن التيسير أصل أصيل، وأن مخالفةَ أقوام تمادوْا في ضلالتهم فيما يكون من شعائر

الدين: مطلوبٌ، وأن غير النبي صلى الله عليه وسلم قد يطّلعُ بالمنام أو النفث في الرُّوع على مراد الحق، لكن لا يُكلَّفُ الناسُ به، ولا تنقطع الشبهةُ حتى يُقرِّرَهُ النبي صلى الله عليه وسلم.

واقتضتِ الحكمةُ الإلٰهيةُ أن لايكون الأذان صِرْف إعلامٍ وتنبيهٍ، بل يُضمُّ مع ذلك: أن يكون من شعائر الدين، بحيث يكونُ النداءُ به على رءوس الخامل والنبيه تنويها بالدين، ويكونُ قبولُه من القوم آية انقيادهم لدين الله، فوجب أن يكون مركبًا من ذكر الله ومن الشهادتين والدعوة إلى الصلاة، ليكون مُصرِّحًا بما أريد به

ترجمہ: اذان کا بیان: جب صحابہ نے جان لیا کہ جماعت مطلوب ومؤکد ہے۔اور ایک وقت میں اور ایک جگہ میں اعلان وآگہی کے بغیر اکٹھا ہونا آسان نہیں تو انھوں نے گفتگو کی اس طریقہ کے بارے میں جس کے ذریعہ اعلان حاصل ہوجائے۔پس تذکرہ کیا انھوں نے آگ کا۔پس نامنظور فرمایا اس کو رسول اللہ ﷺ نے مجوس کی مشابہت کی وجہ سے۔اور تذکرہ کیا انھوں نے نرسنگھے کا۔پس نامنظور کیا اس کو رسول اللہ ﷺ نے یہود کی مشابہت کی وجہ سے۔اور تذکرہ کیا انھوں نے ناقوس (گھنٹے) کا، پس نامنظور فرمایا اس کو رسول اللہ ﷺ نے عیسائیوں کی مشابہت کی وجہ سے۔پس لوٹے لوگ بغیر کوئی بات طے کئے ہوئے۔پس دکھلائے گئے عبداللہ بن زید اذان، اقامت خواب میں۔پس تذکرہ کیا انھوں نے اس کا نبی ﷺ سے۔پس آپ نے فرمایا ''سچا خواب ہے!''

اور یہ واقعہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ احکام مصالح کی بنا پر ہی مشروع کئے جاتے ہیں۔اور اس بات کی کہ اجتہاد کے لئے احکام میں کچھ دخل ہے، اور اس بات کی کہ آسانی کرنا ایک مضبوط ضابطہ ہے اور اس بات کی کہ ایسے لوگوں کی مخالفت کرنا جو اپنی گمراہی میں عرصہ دراز سے مبتلا ہیں، ان باتوں میں جو شعائر دین سے ہیں مطلوب ہے۔ اور اس بات کی کہ نبی ﷺ کے علاوہ کوئی اور بھی، کبھی خواب کے ذریعہ یا دل میں بات ڈالنے کے ذریعہ، اللہ کی مراد سے واقف ہوسکتا ہے۔لیکن لوگوں کو اس کا مکلف نہیں کیا جاسکتا۔اور (خیال یا القائے شیطانی ہونے کا) شبہ ختم نہیں ہوسکتا تا آنکہ نبی ﷺ اس کی تائید کریں۔

اور حکمت خداوندی نے چاہا کہ اذان صرف اعلان وآگہی نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ یہ بات ملائی جائے کہ اذان دین کے شعائر میں سے ہو۔بایں طور کہ اس کے ذریعہ بانگ لگانا ہر کس وناکس کے سامنے دین کی شان بلند کرنا ہو۔اور لوگوں کا اس کو قبول کرنا ان کی اللہ کے دین کی تابعداری کی علامت ہو۔پس ضروری ہوا کہ اذان مرکب ہو اللہ کے ذکر سے اور دو شہادتوں سے اور نماز کی دعوت سے، تا کہ اذان اس مقصد کو صراحت کے ساتھ بیان کرنے والی ہو جو اس سے مقصود ہے۔

لغات: تَمَادیٰ فی غَیِّہٖ :اصرار کرنا الخامل: گمنام، بے قدر النبیہ: سمجھدار، شریف.. نوّہَ تنویھًا: شان بلند کرنا۔

☆ ☆ ☆

اذان واقامت کے کلمات کی تعداد

کلماتِ اذان: امام شافعی ۱۹ کلمات (شروع میں تکبیر میں تربیع اور شہادتین میں ترجیع کے ساتھ) امام مالک: ۱۷ کلمات (شروع میں تکبیر میں تثنیہ یعنی صرف دومرتبہ اللہ اکبر کہا جائے اور شہادتین میں ترجیع کے ساتھ) امام ابوحنیفہ اور امام احمد: ۱۵ کلمات (تکبیر میں تربیع اور بغیر ترجیع کے) امام ابو یوسف: ۱۳ کلمات (بغیر تربیع اور بغیر ترجیع) اور فجر کی اذان میں بالاتفاق دومرتبہ الصلاۃ خیر من النوم بڑھایا جائے۔

کلماتِ اقامت: مالک: ۱۰ کلمات (شروع اور آخر میں اللہ اکبر دومرتبہ۔ باقی ہر کلمہ ایک مرتبہ، حتی کہ قد قامت الصلاۃ بھی ایک مرتبہ) شافعی واحمد: ۱۱ کلمات (قد قامت الصلاۃ دومرتبہ باقی مثلِ مالک) ابوحنیفہ: ۱۷ کلمات (اقامت مثلِ اذان ہے مع اضافہ دومرتبہ قد قامت الصلاۃ)

شاہ صاحب قدس سرہ نے یہ مسئلہ بہت ہی مختصر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

اذان واقامت کے چند طریقے ہیں یعنی ائمہ مجتہدین کی آراء میں اختلاف ہے۔ سب نے الگ الگ طریقے تجویز کئے ہیں۔ اور دلیل سے قوی وہ طریقہ ہے جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ان کی اذان میں پندرہ کلمات اور تکبیر میں گیارہ کلمات تھے۔ پھر وہ طریقہ ہے جو حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ان کی اذان میں انیس کلمات اور تکبیر میں سترہ کلمات تھے۔ ان کو اسی طرح اذان واقامت رسول اللہ ﷺ نے سکھائی تھی۔ اس اختلاف میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اختلاف: اختلاف مباح ہے یعنی جواز وعدم جواز کا اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ہر طرح اذان واقامت کہنا درست ہے۔ اختلاف صرف افضل صورت میں ہے۔ اور اس کی نظیر سات قراءتیں ہیں۔ جس طرح ان میں سے ہر قراءت جائز ہے اور کافی شافی ہے اسی طرح اذان واقامت کے طریقوں کو سمجھنا چاہئے (شاہ صاحب کی بات پوری ہوئی)

مگر مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر قدرے تفصیل ناگزیر ہے۔ درحقیقت یہ اختلاف: اختلافِ ادلہ کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ یہ نصوص فہمی کا اختلاف ہے۔ اور دو جگہوں میں اختلاف ہوا ہے:

پہلی جگہ. آنحضور ﷺ نے ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو شہادتین میں ترجیع کروائی تھی یعنی مکرر کہلوائی تھیں۔ اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ مگر اختلاف اس میں ہوا ہے کہ یہ ترجیع سنتِ اذان تھی یا کسی عارضی مصلحت سے کروائی تھی۔ امام

مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ یہ سنتِ اذان تھی۔ اور ابو محذورہ بھی یہی کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اذان انیس کلمات سکھائی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ ترجیع سنت اذان نہیں تھی۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادتین مکرر اس لئے کہلوائی تھیں کہ ان کے دل سے توحید و رسالت محمدی کی نفرت ختم ہو، اور ایمان کی محبت پیدا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا: شہادتین کی یہ تکرار ان کے ایمان کا سبب بن گئی۔

اور بات قرین صواب یہی ہے کیونکہ ملک نازل کی اذان میں ترجیع نہیں تھی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان میں بھی ترجیع نہیں تھی۔ اگر اذان میں اس سنت کا اضافہ ہوا ہوتا تو آپ حضرت بلال کو بھی ترجیع کرنے کا حکم دیتے۔ حالانکہ ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ اور وہ آخر تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں بغیر ترجیع کے اذان دیتے رہے۔ اور اب اس اختلاف کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں، کیونکہ مالکیہ اور شافعیہ نے عملاً ترجیع ختم کر دی ہے۔ اب وہ حضرات بغیر ترجیع کے اذان دیتے ہیں۔

دوسری جگہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: أُمِر بلالٌ أن يَشْفَع الأذان ويُوْتِر الإقامة یعنی حضرت بلال کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان دُوہری اور اقامت اکہری کہیں (مسلم شریف ۱۶۴۱) اس حدیث کا مطلب ائمہ ثلاثہ یہ سمجھتے ہیں کہ اقامت میں ہر کلمہ ایک ایک مرتبہ کہا جائے۔ بجز تکبیر کے، شروع میں اور آخر میں۔ وہ دو دو بار کہی جائے۔ پھر امام مالک فرماتے ہیں کہ قد قامت الصلاة بھی ایک ہی مرتبہ کہا جائے۔ اس لئے ان کے نزدیک اقامت میں دس کلمات ہیں۔ اور شافعی و احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ قد قامت الصلاة دو مرتبہ کہا جائے۔ اس لئے ان کے نزدیک اقامت میں گیارہ کلمات ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ مذکورہ روایت میں إلا الإقامة کا استثناء آیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ استثناء متکلم فیہ ہے[1]۔ اور ان حضرات نے جو مذکورہ حدیث کا مطلب سمجھا ہے اس کا قرینہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ: ''دورِ نبوی میں اذان دو دو بار اور اقامت ایک ایک بار تھی۔ البتہ مؤذن قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة کہا کرتا تھا'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۴۳)

اور احناف کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا تھا کہ اذان میں وہ متماثل کلمات کو دو سانس میں کہا کریں اور تکبیر میں ایک ہی سانس میں کہیں۔ مگر قد قامت الصلاة کو دو الگ الگ سانسوں میں کہیں کہ یہی اقامت میں مقصود جزء ہے۔ اور فرق کی وجہ یہ ہے کہ اذان میں ترسّل (ٹھیر ٹھیر کر کہنا) مطلوب ہے۔ کیونکہ اذان کا مقصد اُن غائبین کو اطلاع دینا ہے جو مشاغل میں منہمک ہیں۔ اور اقامت کا مقصد حاضرین کو آگاہ کرنا ہے، جو پہلے سے تیار بیٹھے ہیں۔

---

[1] بخاری شریف میں جو إلا الإقامة کا استثناء آیا ہے اس پر ابن مندہ نے اعتراض کیا ہے کہ یہ ایوب سختیانی کا قول ہے، جس کو انھوں نے حدیث میں داخل کر دیا ہے۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ نے فتح (۲:۸۳) میں اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے ۱۲

اوراحناف نے حدیث کا جومطلب سمجھا ہے اس کے تین قرائن ہیں:

پہلاقرینہ: ترمذی (۱:۲۷) میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: قال: كان أذانُ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم شفْعًا شفْعًا في الأذان والإقامة: رسول اللہ ﷺ کی اذان دُوہری دُوہری تھی: اذان بھی اوراقامت بھی ـــــــ اب اِس حدیث میں اوراُس حدیث میں جمع کی صورت یہی ہے کہ ایتار کلماتی مراد نہ لیا جائے، بلکہ ایتار صوتی مراد لیا جائے۔

دوسرا قرینہ: اوپر یہ روایت گذر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو اقامت سترہ کلمات سکھلائی تھی (مشکوٰۃ حدیث ۶۴۴) اور شاہ صاحب رحمہ اللہ ابھی یہ قاعدہ بیان کر چکے ہیں کہ: المفسَّر قاضٍ على المبهم: جوحدیث واضح ہو وہ مبہم کے مقابل میں فیصلہ کن ہوتی ہے۔ حضرت ابومحذورہؓ کی روایت میں عددِ خاص مذکور ہے۔ جس میں کوئی تاویل ممکن نہیں، پس وہی ناطق ہوگی۔

تیسرا قرینہ: ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک اقامت کے شروع میں بھی اور آخر میں بھی تکبیر دو دو مرتبہ ہے۔ اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ ایتار کے منافی ہے؟ حافظ رحمہ اللہ نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ دو مرتبہ اللّٰہ اکبر ایک ہی سانس میں کہا جاتا ہے، اس لئے یہ ایک ہی کلمہ شمار ہوگا۔ پس ایتار صوتی مراد لینا تاویل بعید نہیں ہے۔ دوسرے حضرات بھی بوقتِ ضرورت یہ تاویل کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

الغرض: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث کا مطلب سمجھنے میں اختلاف ہوا ہے۔ اس لئے اقامت کے کلمات کی تعداد میں اختلاف ہوا ہے۔

وللأذان طُرُقٌ:
أصحها: طريقةُ بلالٍ رضى الله عنه، فكان الأذانُ على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم مرتين مرتين، والإقامةُ مرةً مرةً، غير أنه كان يقول: قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة. ثم: طريقةُ أبي محذورةَ: علَّمه النبي صلى الله عليه وسلم الأذان تسع عشرة كلمةً، والإقامةَ سبعَ عشرةَ كلمةً؛ وعندي: أنها كأحرف القرآن، كلُّها شافٍ كافٍ.

ترجمہ: اوراذن کے لئے چند طریقے ہیں: ان میں صحیح ترین: بلال رضی اللہ عنہ کا طریقہ ہے، پس تھی اذان رسول اللہ ﷺ کے عہد میں دو دو مرتبہ، اوراقامت ایک ایک مرتبہ۔ البتہ بلالؓ قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة کہا کرتے تھے (یہ بعینہٖ حضرت ابن عمرؓ کے الفاظ ہیں۔ مشکوٰۃ حدیث ۶۴۳) پھر: ابومحذورہ کا طریقہ ہے: نبی ﷺ نے ان کو اذان انیس کلمات اوراقامت سترہ کلمات سکھلائے ہیں (یہ بھی بعینہٖ حدیث کے الفاظ ہیں، مشکوٰۃ حدیث ۶۴۴) اور

میرے نزدیک: یہ بات ہے کہ وہ طریقے قرآن کی قراءتوں کی طرح ہیں۔ سب کے سب کافی شافی ہیں۔

☆ ☆ ☆

فجر کی اذان میں اضافہ کی وجہ

حدیث ـــــ ابوداؤد شریف میں حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو اذان کی تعلیم کی روایت (حدیث ۵۰۰) ہے۔ اس میں ہے: ''پھر اگر صبح کی نماز ہو تو آپ کہیں: الصلاة خير من النوم، الصلاة خير من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے!)

تشریح: چونکہ فجر کا وقت نیند اور غفلت کا وقت ہے اور اس وقت نماز کا محض فائدہ بتانا کافی نہیں۔ اس سے زیادہ قوی تنبیہ کی ضرورت ہے، اس لئے فجر کی اذان میں اس جملہ کا اضافہ پسند کیا گیا۔ (اور اس جملہ کو کہنا بھول جائے اور اذان ختم کرنے سے پہلے یاد آجائے تو بہتر یہ ہے کہ یہ جملے کہہ کر اللہ أكبر اللہ أكبر، لا إله إلا اللہ کو بھی دہرالے۔ اور اگر اذان ختم کرنے کے بعد دیر سے یاد آئے تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں فتاوی رحیمیہ ۴: ۲۹۷)

اقامت: اذان کہنے والے کا حق کیوں ہے؟

حدیث ـــــ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیاد صُدائی کو فجر میں اذان کہنے کا حکم دیا (حضرت بلال موجود نہیں تھے) انھوں نے اذان کہی۔ جب جماعت کا وقت ہوا تو حضرت بلال نے اقامت کہنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے فرمایا: ''صُدائی آدمی نے اذان کہی ہے، اور جو اذان کہے وہی اقامت کہے (مشکوۃ حدیث ۶۴۸)

تشریح: اذان واقامت ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ اور ہر ایک کو ان کے کہنے کا حق ہے۔ حضرت مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: إذا سافرتما فأذنا وأقيما (مشکوۃ حدیث ۶۸۲) اس حدیث میں جو تثنیہ ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ اذان واقامت کہنے کا حق ہر ایک کو ہے۔

اور اموالِ مباحہ کے سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جس کا قبضہ اس پر پہلے ہو جائے وہی اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی ضابطہ ہے کہ جو مباح مال لینے سے قریب ہو جائے، اخلاقاً دوسرے کو اس سے مزاحمت نہیں کرنی چاہئے۔ جیسے شادی میں چھوہارے لٹائے جائیں۔ اور کوئی چھوہارا کسی کی گود میں پڑے۔ اور وہ دیکھ لے اور لینے کا ارادہ کرے تو اب دوسرے کے لئے اس کا اٹھالینا مناسب نہیں۔ کیونکہ پہلا اگرچہ اس کا مالک نہیں ہوا، مالک اس وقت ہوگا جب اس پر قبضہ کرلے یعنی ہاتھ میں لے لے یا سمیٹ لے، مگر وہ لینے سے قریب ہو گیا ہے، اس لئے دوسرے کو اس میں مزاحمت نہیں کرنی چاہئے۔

اسی ضابطہ سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ: ''آدمی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی نہ ڈالے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۴۴) یعنی جب ایک

کی شادی کی بات چل پڑی تو اب دوسرے کو بیچ میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہئے۔ یہ بات اخلاق ومروّت کے خلاف ہے اور آپس میں رنجش کا باعث ہے۔

اسی طرح جب ایک شخص نے اذان کی ابتدا کی تو شریعت نے اقامت کہنے کا حق اسی کو دیدیا۔ کیونکہ وہ اقامت سے قریب ہوگیا۔ پس دوسرے کو اس میں مزاحمت نہیں کرنی چاہئے (البتہ اگر مؤذن غیر حاضر ہو یا اس کی صراحۃً یا دلالۃً اجازت سے دوسرا شخص اقامت کہے تو بلا کراہت جائز ہے)

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " فإن كانَ صلاةُ الصبح قلتَ: الصلاة خير من النوم، الصلاة خير من النوم"

أقول: لما كان الوقتُ وقتَ نوم وغفلة، وكانت الحاجةُ إلى التنبيه القوى شديدةً: استُحِبَّ زيادةُ هذه اللفظة.

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: " من أذَّنَ فهو يُقيم"

أقول: سِرُّه: أنه لما شَرَعَ فى الأذان وجب على أخوانه أن لايزاحموه فيما أراد من المنافع المباحة، بمنزلة قوله عليه الصلاة والسلام: " لايَخْطُبُ الرجلُ على خِطْبة أخيه"

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''پس اگر صبح کی نماز ہو تو آپ کہیں: **الصلاة خير من النوم، الصلاة خير من النوم**''

میں کہتا ہوں: جب وہ وقت نیند اور غفلت کا وقت تھا اور قوی تنبیہ کی سخت ضرورت تھی تو اس لفظ کا اضافہ پسند کیا گیا۔

(۲) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''جس نے اذان کہی، پس وہ اقامت کہے'' میں کہتا ہوں: اس کا راز: یہ ہے کہ جب کسی نے اذان کی ابتدا کی تو ضروری ہوا اس کے (دینی) بھائیوں کے لئے کہ نہ مزاحمت کریں وہ اس سے اُن مباح فوائد میں جن کا اس نے ارادہ کیا ہے۔ جیسے آنحضرت ﷺ کا ارشاد: ''نہ منگنی بھیجے آدمی اپنے بھائی کی منگنی پر''

☆ ☆ ☆

فضائلِ اذان کی بنیادیں

احادیث میں اذان دینے کے جو فضائل وارد ہوئے ہیں، ان کی دو بنیادیں ہیں:

پہلی بنیاد: اذان اسلام کا ایک امتیازی نشان ہے۔ اس کی وجہ سے ملک دارالاسلام محسوس ہوتا ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ نبی ﷺ صبح صادق کے بعد حملہ کیا کرتے تھے یعنی شب خون نہیں مارا کرتے تھے۔ اور صبح کے بعد بھی اذان

سنا کرتے تھے، اگر اذان کان میں پڑتی تو حملہ کرنے سے رک جاتے یعنی مسلمانوں کو علحدہ ہونے کا موقعہ دیتے۔ ورنہ حملہ کرتے (مشکوۃ حدیث ۶۶۲ باب فضل الاذان) پس جو کام اس درجہ اہمیت کا حامل ہو، اس کے فضائل ہونے ہی چاہئیں۔

دوسری بنیاد: اذان نبوت کا ایک اہم شعبہ ہے۔ نبوت کا کام لوگوں کو دین کی دعوت دینا ہے، اور اذان کے ذریعہ لوگوں کو نماز کی دعوت دی جاتی ہے، جو اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے اور عبادات میں مرکزی عبادت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند اور شیطان کو سب سے زیادہ ناپسند دین کے وہ کام ہیں جن کا فائدہ دوسروں تک پہنچتا ہے، اور جن سے اللہ کا بول بالا ہوتا ہے۔ ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ: ''ایک فقیہ (دین کا ماہر) شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۱۷ کتاب العلم) کیونکہ فقیہ لوگوں کو دین بتلاتا ہے اور دین پر گامزن کرتا ہے اور عبادت گذار اپنے فائدہ میں لگا ہوا ہے۔ اور شیطان کے لئے اول کو بچانا آسان نہیں اور دوسرے کو چٹکی بجا کر رام کر سکتا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ: ''جب نماز کے لئے ندا دی جاتی ہے تو شیطان گوز کرتا ہوا پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے'' (یہ لمبی حدیث ہے اور متفق علیہ ہے مشکوۃ حدیث ۶۵۵) ان دونوں حدیثوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ خیر متعدی والے کام اور اُن کاموں کو کرنے والے اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہیں۔ اور شیطان کے لئے وہ سوہان روح ہیں۔

وفضائلُ الأذان: ترجع إلى:

[۱] أنه من شعائر الإسلام، وبه تصير الدارُ دارَ الإسلام، ولهذا كان النبى صلى الله عليه وسلم إن سمع الأذان أمسك، وإلا أغار.

[۲] وأنه شعبةٌ من شُعبِ النبوة، لأنه حثٌّ على أعظم الأركان وأُمّ القُرُباتِ، ولايَرْضى اللّٰه ولايغضب الشيطانُ مثلَ مايكون فى الخير المتعدّى وإعلاءِ كلمةِ الحق، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " فقيهٌ واحدٌ أشدُّ على الشيطان من ألف عابد" وقوله صلى الله عليه وسلم: " إذا نودى للصلاة أدبر الشيطانُ، له ضُرَاطٌ"

ترجمہ: اور اذان کے فضائل: اس بات کی طرف لوٹتے ہیں کہ اذان شعائر اسلام میں سے ہے، اور اس کی وجہ سے ملک دار الاسلام ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے نبی ﷺ اگر اذان سنتے تو رُک جاتے، ورنہ حملہ کرتے۔ اور یہ کہ اذان نبوت کے شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ ابھارتا ہے سب سے بڑے رکن پر اور بنیادی عبادت پر۔ اور نہیں خوش ہوتے اللہ تعالیٰ اور نہیں غضبناک ہوتا شیطان ویسا جیسا وہ خیر متعدی سے اور حق کا بول بالا کرنے سے ہوتا ہے اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد الخ (ترجمہ گذر چکا)

☆ ☆ ☆

مؤذن کی گردن فرازی اور آواز کی درازی تک بخشش اور گواہی کی وجہ

حدیث ——— حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اذان دینے والے لوگوں میں سب سے زیادہ لمبی گردن والے ہوں گے'' (مشکوۃ حدیث ۶۵۴)

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مؤذن کی بخشش کی جاتی ہے اس کی آواز کی درازی تک'' یعنی وہ جس قدر آواز بلند کرتا ہے مغفرت بھی اسی قدر ہوتی ہے۔ ''اور اس کے لئے ہر تر اور خشک چیز گواہی دیتی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۶۶۷)

حدیث ——— حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جہاں تک مؤذن کی آواز جنات، انسان اور ان کے علاوہ مخلوقات سنتی ہیں وہ سب قیامت کے دن اس کے لئے گواہی دیں گے'' (مشکوۃ حدیث ۶۵۶)

تشریح: مجازات کا مدار مشابہت پر ہے یعنی عمل اور اس کی حقیقت کے درمیان جو مناسبت ہے اور روح اور اس کے پیکر کے درمیان جو تعلق ہے اس کے لحاظ سے جزاؤ سزا ہوگی۔ پس اس ضابطہ سے ضروری ہے کہ مؤذن کی سربلندی اس کی گردن اور اس کی آواز کی جہت سے ظاہر ہو، چنانچہ مؤذن آخرت میں بلند گردن ہوگا اور اس کی آواز کی درازی تک جن وانس اور دیگر مخلوقات گواہی دیں گی۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ رحمتِ خداوندی اسی قدر وسیع ہو جس قدر اس کی دین کی دعوت میں وسعت ہے۔ چنانچہ اس کی آواز کی درازی کے بقدر اس کی بخشش کی جائے گی۔

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم: " المؤذنون أطولُ الناس أعناقًا" وقوله صلى الله عليه وسلم: " المؤذن يُغفَرُ له مَدىٰ صوتِه، ويشهد له الجنُّ والإنس"

أقول: أمر المجازاة مبنيٌّ على مناسبة المعانى بالصُّوَرِ، وعلاقةِ الأرواح بالأشباح، فوجب أن يَظْهر نباهةُ شأن المؤذن من جهةِ عنقِه وصوته، وتَتَّسِعُ رحمةُ اللهِ عليه، اتِّساعَ دعوتِه إلى الحق.

ترجمہ: (دو روایتیں ذکر فرمائی ہیں۔ ان میں سے دوسری روایت دو روایتیں ہیں) میں کہتا ہوں: مجازات کا معاملہ مبنی ہے معانی (حقائق) کی صورتوں کے ساتھ مناسبت اور ارواح کی پیکروں کے ساتھ تعلق پر (عطف تفسیری ہے۔ معانی، حقائق اور ارواح ایک ہی چیز ہیں اور صورتیں اور پیکر ایک چیز ہیں اور مناسبت اور تعلق تفنن ہے، ان کا مطلب بھی ایک ہے یعنی مجازات میں نہ عمل کی ظاہری صورت دیکھی جاتی ہے، نہ اس کی حقیقت، بلکہ دونوں میں جو مناسبت ہے اس کے لحاظ سے مجازات ہوتی ہے) پس ضروری ہوا کہ ظاہر ہو مؤذن کی شان کی بلندی اس کی گردن اور اس کی آواز کی جہت سے (یعنی گردن اور آواز کے ساتھ کوئی امتیازی معاملہ کیا جائے) اور کشادہ ہو اللہ کی مہربانی اس پر

اس کی حق کی طرف دعوت کے کشادہ ہونے کے بقدر۔

☆ ☆ ☆

سات سال اذان دینے پر پروانۂ براءت ملنے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سات سال بہ امید ثواب اذان دی اس کے لئے دوزخ سے خلاصی لکھی جائے گی'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۶۴[1])

تشریح: سات سال تک ثواب کی نیت سے اذان دینے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کر دیا جاتا ہے کہ اب دوزخ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عمل اس کے ایمان کی درستگی کو واضح کرنے والا ہے۔ اتنے لمبے عرصہ تک اذان دینے پر مداومت وہی شخص کر سکتا ہے جس نے اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دیا ہو، اور پوری طرح منقاد ہو گیا ہو۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے دل میں رحمتِ خداوندی پہاڑ کے بقدر جگہ بنا لیتی ہے۔ اور جو مہر الٰہی کا مورد بن جاتا ہے، دوزخ کی آگ اس کو نہیں چھو سکتی۔

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " من أذّنَ سبعَ سنين محتسبًا كُتب له براءةٌ من النار"
وذلك: لأنه مُبيّنٌ صحّة تصديقه، لا تُتصوَّرُ المواظبةُ عليه لله إلا ممن أسلم وجْهَهُ لله، ولأنه أمكن من نفسه عاشيةً عظيمةً من الرحمة الإلٰهية.

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) اور یہ بات: اس لئے ہے کہ وہ (سات سال تک اذان دینا) اس کی ایمان کی درستگی کو واضح کرنے والا ہے: تصور میں نہیں آتا اتنی مدت تک اذان دینے پر مداومت کرنا اللہ کی خوشنودی کے لئے، مگر اس شخص سے جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لئے منقاد کر لیا ہو۔ اور اس لئے کہ اتنی مدت تک اذان دینا اس کے دل میں رحمتِ الٰہی کے ایک بڑے پردہ کو جما دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اخلاص سے اذان دینا اور نماز کا اہتمام کرنا مغفرت کا سبب ہے

حدیث ـــــ حضرت عُقبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تعجب کرتے ہیں تیرے

[1] یہ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت ہے اور نہایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں جابر جُعفی ہے جو متروک ہے۔ مگر فضائل کے باب میں ضعیف حدیث معتبر ہے البتہ بارہ سال اذان دینے کی جو فضیلت وجت لہ الجنۃ آئی ہے۔ وہ روایت اس کی بہ نسبت ٹھیک ہے۔ یہ حدیث مشکوٰۃ (حدیث ۶۷۸) باب فصل الأذان کے آخر میں ہے ۱۲

پروردگار پہاڑ کی چوٹی میں بکریاں چرانے والے سے (یعنی لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے پہاڑ کی چوٹی پر جا بسا ہے) نماز کے لئے اذان دیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے۔ پس اللہ عزوجل فرماتے ہیں: میرے اس بندے کو دیکھو! اذان دیتا ہے اور نماز کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ مجھ سے ڈرتا ہے (یعنی میرے عذاب سے ڈر کر یہ کام کرتا ہے کیونکہ یہاں کسی کو دکھانے کا موقعہ نہیں ہے) یقیناً بخش دیا میں نے اس کو، اور داخل کیا میں نے اس کو جنت میں'' (مشکوۃ حدیث ۶۶۵)

تشریح: اللہ پاک کا ارشاد: ''وہ مجھ سے ڈرتا ہے'' اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں: ایک: یہ کہ جیسی نیت اور دل کا تقاضا ہوتا ہے ویسا عمل ہوتا ہے کیونکہ اعمال انہی تقاضوں سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ دوسری: یہ کہ اعمال ظاہری شکلیں ہیں، اور ان کی ارواح وہی دل کی نیتیں اور قلبی تقاضے ہیں ـــــ پس جب اس چرواہے نے اللہ کے ڈر سے اور اخلاص سے اذان دی اور نماز کا اہتمام کیا تو یہ چیز اس کی مغفرت کا سبب بن گئی۔

[٥] قولُ اللّٰه فی راعی غنمٍ فی رأس شَظِيَّةٍ: " انظروا إلى عبدی هذا! يؤذن ويقيم الصلاةَ، يخاف منی، قد غفرتُ له، وأدخلتُه الجنة"

قوله: " يخاف منی" دليل على أن الأعمال تُعتبر بدواعيها المنبعثة هی منها، وأن الأعمال أشباح، وتلك الدواعی أرواح لها؛ فكان خوفُه من الله وإخلاصُه له سبب مغفرته.

ترجمہ: (۵) اللہ پاک کا ارشاد: پہاڑ کی چوٹی کے بالا حصہ میں بکریاں چرانے والے کے حق میں الخ اللہ کا ارشاد: ''وہ مجھ سے ڈرتا ہے'' اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال موازنہ کئے جائیں گے اُن کے اُن دواعی کے ساتھ جن سے وہ برانگیختہ ہونے والے ہیں۔ اور اس بات کی کہ اعمال پیکر ہائے محسوس ہیں۔ اور وہ دواعی ان کی ارواح ہیں۔ پس چرواہے کا اللہ سے ڈرنا اور اس کا خالص اللہ کے لئے عمل کرنا اس کی مغفرت کا سبب ہے۔

لغت: شَظِيَّة: قطعة مرتفعة فی رأس الجبل: پہاڑ کی چوٹی کا بلند حصہ۔

☆ ☆ ☆

اذان کے جواب کی حکمت

اذان نماز کے لئے آنے کی لوگوں کو دعوت ہے۔ اس بُلاوے پر مسجد پہنچنا اجابتِ فعلی ہے۔ اور منہ سے اذان کا جواب دینا اجابتِ قولی ہے اور دونوں ہی مطلوب ہیں۔ اول کی تاکید زیادہ ہے، کیونکہ اذان سے وہی اصل مقصود ہے۔ اور ثانی سنت ہے۔ دونوں طرح سے جواب دینے کا الگ الگ حدیثوں میں حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اذان کی دو حیثیتیں ہیں: ایک: یہ کہ وہ جماعت میں آنے کا بُلاوا ہے دوسرے: یہ کہ وہ ایمان کی دعوت عام ہے۔ پہلی

حیثیت سے اذان سننے والے ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اذان سنتے ہی نماز میں شرکت کے لئے تیار ہو جائے۔ اور ایسے وقت مسجد میں پہنچ جائے کہ جماعت میں شریک ہو سکے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی بیان الجماعة کے عنوان سے آ رہا ہے۔ یہاں شاہ صاحب نے اس اجابت کا تذکرہ نہیں کیا۔

اور دوسری حیثیت سے ہر مسلمان کو حکم ہے کہ جب وہ اذان سنے تو اپنے ایمان کی تجدید کرے، اور اذان کے ہر کلمہ کا جواب دے اور اپنے دل اور زبان سے ان باتوں کی تصدیق کرے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اذان دین کا شعار اور اس کی امتیازی علامت ہے۔ اور یہ شعار اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ پتہ چلے کہ قوم نے ہدایت الٰہی یعنی دین اسلام کی دعوت قبول کی یا نہیں؟ جو اذان سن کر نماز کے لئے آئے گا اس نے دعوت قبول کی اور جس نے کان بہرے کر لئے اس کے کان پھوٹے۔ غرض اجابتِ قولی اس تسلیم کو واضح کرتی ہے جس کا حصول لوگوں سے مطلوب ہے۔

حیعلتین کا جواب حوقلہ کیوں ہے؟

اذان کے جواب میں وہی کلمات دُوہرائے جاتے ہیں جو مؤذن پکارتا ہے۔ مگر حیَّ علی الصلاۃ اور حیَّ علی الفلاح کا جواب لاحولَ ولاقوۃَ إلا باللّٰہ کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ مسلم شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی طریقہ مروی ہے (مشکوۃ حدیث ۶۵۸)

اذان کے شروع اور آخر میں جو ذکر ہے (تکبیرات اور لاإلٰہ إلا اللّٰہ) جواب میں انہی کو دُوہرانے کی حکمت تو ظاہر ہے کہ ذکر کے جواب میں ذکر ہی مناسب ہے۔ اور شہادتین کے جواب میں شہادتین اس لئے دُوہرائی جاتی ہیں کہ تجدید ایمان ہو جائے، جو اس خاص موقعہ پر مطلوب ہے۔ اور حیعلتین کا جواب حوقلہ سے اس لئے دیا جاتا ہے کہ حوقلہ میں توحید کا مضمون ہے۔ اس میں طاقت ومقدرت اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کی گئی ہے یعنی ایک ہی خدا کے لئے حول وقوت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اس خاص موقعہ پر یہ بات اس لئے یاد کی جاتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عبادت پر اقدام کرتے وقت واہمہ میں فخر چٹکی لینے لگے اور شیطان اس کی راہ مار دے۔ پس اس موقعہ پر اللہ کی قوت وطاقت کا تصور کرنا فخر وغرور کا علاج ہے۔ نماز کے لئے جانے والا یہ سوچ کر چلے کہ میں جو عبادت کرنے جا رہا ہوں وہ مولیٰ کی توفیق ہی سے ہے، میرا اس میں کچھ کمال نہیں۔

فائدہ: (۱) فجر کی اذان میں جب مؤذن الصلاۃ خیر من النوم کہے تو اس کے جواب میں صَدقتَ وبَرَرْتَ کہنا چاہئے۔ یعنی تو نے سچ کہا کہ نماز نیند سے بہتر ہے اور تو نے نیکی کا کام کیا کہ مجھے آگاہ کیا۔ اس سلسلہ میں کوئی حدیث تو نظر سے نہیں گذری۔ مگر تصدیق کرنے کے لئے عربی میں یہی جملہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسند احمد (۱ ۴۰۵) میں اس

سلسلہ کی روایت بھی ہے غالباً اس سے یہ جواب تجویز کیا گیا ہے۔

فائدہ:(۲) ابوداؤد کی ایک نہایت ضعیف حدیث میں اقامت کا جواب بھی اذان کی طرح آیا ہے۔ اور قد قامت الصلاۃ کے جواب میں آپ ﷺ کا أقامها الله و أدامها (اللہ نماز کو قائم ودائم رکھیں) کہنا مروی ہے (ابوداؤد حدیث ۵۲۸، مشکوٰۃ حدیث ۶۷۰) پس کوئی اس پر عمل کرے اور اقامت کا بھی جواب دے تو دے سکتا ہے۔

جوابِ اذان کی فضیلت اور اس کی وجہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے آیا ہے کہ جو اذان کا جواب تلقین کئے ہوئے طریقہ کے مطابق دل سے یعنی اخلاص سے دے گا وہ جنت میں جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا جواب دینا فرمانبرداری اور اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کرنے کا پیکر محسوس ہے۔ دخولِ جنت اسی تسلیم وانقیاد کا صلہ ہے۔

اذان کے بعد دعا کی حکمت

بخاری شریف میں روایت ہے کہ جو شخص اذان سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے لئے وسیلہ، فضیلہ اور مقام محمود کی دعا کرے گا، قیامت کے دن وہ شفاعتِ محمدی کا حقدار ہوگا (مشکوٰۃ حدیث ۶۵۹)

اذان کے بعد یہ دعا اس لئے مقرر کی گئی ہے کہ وہ اعتراف وانقیاد کا پیکر ہے اور زبانی اقرار مکنون جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے انسانیت کو اللہ کے دین سے آشنا کر کے لوگوں پر احسان عظیم فرمایا ہے اور محسن سے محبت کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ پس جب مؤمن اذان سننے کے بعد آنحضرت ﷺ کے لئے وسیلہ، فضیلہ اور مقام محمود کی دعا کرے گا تو اس سے آپؐ کے لائے ہوئے دین کو قبول کرنے کی اور دل میں آپؐ سے محبت کی حقیقت کامل طور پر متحقق ہوگی۔

[٦] ولما كان الأذانُ من شعائرِ الدين، جُعل لِيُعْرَف به قبولُ القوم للهداية الإلٰهية: أمر بالإجابة، لتكون مُصَرِّحَةً بما أريد منهم.

فَيُجِيب الذكرَ والشهادتين بهما، ويُجيب الدعوة بما فيه توحيدٌ في الحول والقوة، دفعًا لما عسى أن يُتَوَهَّمَ عند إقدامه على الطاعة من العُجْب.

من فعل ذلك خالصًا من قلبه دخل الجنة، لأنه شبَحُ الانقياد وإسلام الوجه لله.

وأُمر بالدعاء للنبي صلى الله عليه وسلم تكميلاً لمعنى قبولِ دينه واختيارِ حُبّه.

ترجمہ:(۶) جب اذان دین کے شعائر میں سے تھی۔ مقرر کیا گیا ہے یہ شعار تا کہ پہچانا جائے اس کے ذریعہ لوگوں کا ہدایت الٰہی کو قبول کرنا: تو حکم دیا گیا اذان کے جواب دینے کا تا کہ جواب واضح کرنے والا ہو اس چیز (قبولیت) کو جو

ان سے مراد لی گئی ہے (یعنی جس کا حصول لوگوں سے مطلوب ہے)

پس جواب دے ذکر کا اور شہادتین کا انہی دو کے ذریعہ۔ اور جواب دے (نماز کی) دعوت کا اس چیز کے ساتھ جس میں طاقت وقدرت میں توحید ہو (یعنی ایک ہی خدا کے لئے حول ومقدرت ثابت کی گئی ہو) ہٹانے کے لئے اس عُجب کو جو ہوسکتا ہے کہ اس کے واہمہ میں پیدا ہو عبادت پر پیش قدمی کرتے وقت۔

جس نے کیا یہ (یعنی مذکورہ طریقہ پر جواب دیا) اپنے دل کے اخلاص سے تو وہ جنت میں گیا، اس لئے کہ وہ (جواب دینا) فرمانبرداری اور اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کرنے کا پیکر محسوس ہے (یعنی وہ جنت میں گیا ہے اپنی فرمانبرداری اور اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کرنے کی وجہ سے۔ مگر یہ حکم اس کے پیکر محسوس پر لگایا گیا ہے)

اور حکم دیا گیا نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے لئے دعا کرنے کا۔ آپؐ کے دین کو قبول کرنے کی اور آپؐ کی محبت کو پسند کرنے کی حقیقت کی تکمیل کرنے کے لئے (یعنی جس قدر دعا کرے گا، ان دو چیزوں کی ماہیت کامل سے کامل تر ہوتی جائے گی)

☆ ☆ ☆

اذان واقامت کے درمیان دعا قبول ہونے کا راز

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''اذان واقامت کے درمیان دعا رد نہیں کی جاتی، پس دعا مانگو (رواہ ابوداؤد والترمذی واحمد، مشکوٰۃ حدیث ۶۷۱ اور آخری ٹکڑا مسند احمد ۳.۱۵۵ و ۲۲۵ میں ہے)

تشریح: اذان واقامت کے درمیان کا وقت شمولِ رحمت کا وقت ہے یعنی اس وقت رحمت کا فیضان عام ہوتا ہے۔ پس جو حکم نبوی پر عمل کرے گا اور اس وقت دعا مانگے گا وہ محروم نہیں رہے گا۔

سحری اور تہجد کے لئے مستقل اذان

حدیث ـــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''بلال رات میں اذان دیں گے، پس کھاتے پیتے رہو تا آنکہ ابن اُمّ مکتوم اذان دیں'' حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: ''ابن ام مکتوم نابینا آدمی تھے۔ وہ جب تک یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ صبح ہوگئی! صبح ہوگئی!! اذان نہیں دیتے تھے'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۸۰)

تشریح: نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پہلے سحری کے وقت اذان دینے کے لئے حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو تجویز فرمایا تھا۔ یہ آنکھ کے نابینا صحابی تھے۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ حسب معمول فجر کے لئے اذان دیتے تھے، جس پر سحری بند کی جاتی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں کچھ کمزوری تھی۔ ایک بار انھوں نے صبح صادق سے پہلے اذان دے دی۔ چونکہ اس سے سحری کھانے والوں کو غلط فہمی کا اندیشہ تھا، اس لئے آپؐ نے انہی سے اعلان کرایا کہ.

''اذان قبل از وقت ہوگئی ہے''۔ مگر جب یہ صورت پیش آئی تو احتیاط کے نقطہ نظر سے آپ نے ڈیوٹیاں بدل دیں۔ حضرت بلال کو سحری کی اذان کے لئے مقرر کیا اور حضرت ابن ام مکتوم کو فجر کی اذان کے لئے تجویز فرمایا۔ کیونکہ ابن ام مکتوم نابینا تھے۔ وہ اس وقت اذان دیتے تھے جب لوگ ان سے کہتے کہ صبح ہوئی! صبح ہوئی! اس لئے غلطی کا امکان کم تھا۔ غرض جب آپ نے ڈیوٹیاں تبدیل کیں اس وقت لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اس سلسلہ میں ایک مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ:

امیر المؤمنین کے لئے، اگر وہ ضرورت محسوس کرے، مستحب یہ ہے کہ سحری اور نماز فجر کے لئے دو الگ الگ مؤذن مقرر کرے، جن کی آوازیں لوگ پہچانتے ہوں۔ اور لوگوں کو اس کی اطلاع کردے کہ فلاں کی اذان سحری کے لئے ہوگی اور فلاں کی اذان فجر کے لئے۔ پہلی اذان پر تہجد میں مشغول حضرات گھر لوٹ جائیں تاکہ سحری کھائیں اور جو لوگ محو خواب ہیں وہ بیدار ہو جائیں۔ ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث (نمبر ۱۶۹۲) ہے کہ: ''بلال کی اذان ہرگز کسی کو سحری سے نہ روکے فانه يؤذن ليرجع قائمكم ولينبه نائمكم. ولرجع قائمكم وہ اذان دیتے ہیں تاکہ سویا ہوا بیدار ہو جائے اور نماز میں کھڑا لوٹ جائے۔

نماز میں ہولے ہولے آئے، بھاگتا ہوا نہ آئے

حدیث ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب نماز کھڑی کی جائے تو بھاگتے ہوئے نماز میں نہ آؤ، اور چلتے ہوئے آؤ، درانحالیکہ تم پر سکون ہو۔ پس جو پالو وہ پڑھ لو، اور جو فوت ہو جائے اس کو پورا کرلو'' (مشکوۃ حدیث ۶۹۶)

تشریح: جب نماز شروع ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس اندیشہ سے کہ نماز کا کچھ حصہ فوت نہ ہو جائے، بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ اس سے مسجد کا منظر خراب ہوتا ہے، اور کبھی سانس پھول جاتی ہے، اور نماز کا کچھ حصہ بے اطمینانی سے ادا ہوتا ہے۔ اور یہ عبادت میں ایک طرح کا تکلف بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ اس کا قلع قمع کیا ہے۔ ہاں لپک کر چلنے کی بعض علماء نے اجازت دی ہے۔

[۷] قوله صلى الله عليه وسلم. " لايرد الدعاء بين الأذان والإقامة"

أقول. ذلك لشمول الرحمة الإلهية. ووجود الانقياد من الداعي.

[۸] قوله صلى الله عليه وسلم. " إن بلالا ينادي بليل، فكلوا واشربوا حتى ينادي ابن أم مكتوم"

أقول. يستحب للإمام إذا رأى الحاجة: أن يتخذ مؤذنين، يعرفون أصواتهما. ويبين للناس: ان فلانا ينادي بليل، فكلوا واشربوا حتى ينادي فلان، ليكون الأول منهما للقائم والمتسحر

أن يرجعا، وللنائم أن يقوم إلى صلاته،ويتدارك ما فاته من سُحوره.

[۹] قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا أُقيمت الصلاةُ فلا تأتوها تَسْعَوْنَ، وأتوها تمشون"

أقول: هذا إشارةٌ إلى ردِّ التعمُّق فى التَّنَسُّكِ.

ترجمہ:(۷) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:(ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: یہ بات (یعنی دعا کا رد نہ کیا جانا) رحمتِ الٰہی کے شمول (عموم) اور دعا کرنے والے کی طرف سے فرمانبرداری کے پائے جانے کی وجہ سے ہے۔

(۸) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:(ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: امام (امیر المؤمنین) کے لئے مستحب ہے، جب وہ ضرورت محسوس کرے کہ وہ دو مؤذن مقرر کرے، جن کی آوازوں کو لوگ پہچانتے ہوں۔ اور لوگوں پر یہ بات واضح کردے کہ فلاں رات میں اذان دے گا، پس تم کھاؤ پیو یہاں تک کہ فلاں اذان دے۔ تاکہ ان میں سے پہلی اذان ہو نماز پڑھنے والے کے لئے۔ اور سحری کھانے والے کے لئے کہ وہ دونوں گھر لوٹیں اور سونے والے کے لئے کہ وہ اٹھ کر اپنی نماز میں لگے اور تلافی کرے اس چیز کی جو فوت ہوگئی ہے اس کی سحری میں سے۔

(۹) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:(ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے عبادت میں تعمق (آخری حد تک جانے کی کوشش کرنے) کو رد کرنے کی طرف۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۵

مساجد کا بیان

مسجد بنانے، اس سے لگے رہنے

اور

اس میں نماز کا انتظار کرنے کی فضیلت کی بنیادیں

مسجد بنانے، اس سے چمٹے رہنے اور اس میں ٹھیر کر نماز کا انتظار کرنے کی فضیلت چار وجوہ سے ہے:

پہلی وجہ: مسجد اسلام کا شعار (امتیازی علامت) ہے۔ حضرت عصام مُزنی فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک سَرِیّہ میں بھیجا تو فرمایا:"جب تم کوئی مسجد دیکھو یا کسی مؤذن کی اذان سنو، تو کسی کو قتل نہ کرو" (مشکوٰۃ حدیث ۳۹۳۵ کتاب الجہاد) یعنی مسلمانوں کو جدا ہونے کا موقعہ دو۔ اندھا دھند جنگ شروع نہ کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ

مسجد اور اذان اسلام کے شعائر ہیں۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہاں مسلمان بستے ہیں۔

دوسری وجہ: مسجد نماز کی جگہ، عبادت گزاروں کی قیام گاہ، رحمت کے نزول کی جگہ ہے۔ اور یک گونہ کعبہ کے مشابہ ہے۔ درج ذیل دو حدیثیں اس کی دلیل ہیں:

حدیث ـــــ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو گھر سے باوضو کسی فرض نماز کے لئے نکلا تو اس کا ثواب احرام باندھنے والے حاجی کی طرح ہے۔ اور جو شخص چاشت کی نماز کے لئے نکلا، نہیں زحمت میں ڈالا اس کو مگر اسی (نماز چاشت) نے تو اس کا ثواب عمرہ کرنے والے کے ثواب کی طرح ہے'' (مشکوۃ حدیث ۷۲۸) اس حدیث سے مسجد کی گونہ کعبہ سے مشابہت ثابت ہوتی ہے۔ اور اس حدیث میں نسبت کا بیان ہے، مقدار کا بیان نہیں یعنی فرض نماز کے لئے مسجد جانا اور نفل نماز کے لئے جانا ایسا ہے جیسا حج اور عمرہ۔ ایک بڑی عبادت ہے دوسری اس سے چھوٹی۔ اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نوافل اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد وغیرہ مسجد میں پڑھنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ باعثِ اجر ہے۔

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم بہشت کے باغوں کے پاس سے گذرو تو اس کے میوے کھاؤ'' دریافت کیا گیا: اے اللہ کے رسول! بہشت کے باغات کیا ہیں؟ فرمایا: ''مسجدیں'' (مشکوۃ حدیث ۷۲۹) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ''ذکر کی مجلسیں''

تیسری وجہ: نماز کے اوقات میں کاروبار اور گھر والوں کو چھوڑ کر نماز ہی کے ارادے سے مسجد کا رخ کرنا دین میں اخلاص اور دل کی تھاہ میں انقیاد خداوندی کا پتہ دیتا ہے۔ اور اسی وجہ سے مسجد میں نماز ادا کرنے کا بڑا ثواب ہے۔ جو درج ذیل حدیث میں بیان کیا گیا ہے:

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کی باجماعت نماز اس کی گھر کی اور اس کی دوکان کی نماز سے پچیس گنا بڑھائی جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی نے وضو کیا۔ پس اچھی طرح وضو کیا۔ پھر مسجد کے لئے نکلا، نہیں نکالا اس کو مگر نماز نے یعنی خاص نماز ہی کے لئے نکلا، تو وہ کوئی قدم نہیں چلتا مگر اس کا اس قدم کی وجہ سے ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے۔ اور اس سے اس قدم کی وجہ سے ایک برائی اتاری جاتی ہے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاتا ہے تو ملائکہ اس کیلئے برابر دعا میں لگے رہتے ہیں جب تک وہ اپنی نماز کی جگہ میں یعنی مسجد میں رہتا ہے (وہ یہ دعا کرتے ہیں:) الٰہی! اس بندہ پر رحمتِ خاص نازل فرما! الٰہی! اس پر مہربانی فرما! اور آدمی برابر نماز میں رہتا ہے جب تک وہ نماز کا انتظار کرتا رہتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۷۰۲) یہ آخری جز وقوع کے اعتبار سے مقدم ہے۔ اور حدیث کا حاصل یہ ہے کہ گھر میں اور دکان میں نماز پڑھنے سے وہ ذیلی فوائد حاصل نہیں ہوتے جو مسجد میں جا کر پڑھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

چوتھی وجہ: مسجد سے اللہ کا بول بالا ہوتا ہے اور اسلام کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ پس جو شخص مسجد بناتا ہے وہ اس عظیم

مقصد میں معاونت کرتا ہے، اس لئے مساجد بنانے کی فضیلت آئی ہے۔

۞ المساجد ۞

فصل بناء المسجد وملازمته وانتظار الصلاة فيه ترجع إلى:

[۱] أنه من شعائر الإسلام، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا رأيتم مسجدًا، او سمعتم مؤذنًا، فلا تقتلوا أحدًا"

[۲] وأنه محلُّ الصلاة، ومعتكف العابدين، ومطرح الرحمة، ويُشبه الكعبة من وجه. وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "من خرج من بيته مُتطهِّرًا إلى صلاة مكتوبة، فأجره كأجر الحاجّ المُحرم، ومن خرج إلى تسبيح الضُحى، لاينصبُه إلا إياه، فأجره كأجر المعتمر" وقوله صلى الله عليه وسلم: "إذا مررتم برياض الجنة فارتعُوا" قيل: وما رياض الجنة؟ قال: "المساجد"

[۳] وأن التوجه إليه في أوقات الصلاة، من بين شُغله وأهله، لايقصد إلا الصلاة، مُعرّف لإخلاصه في دينه. وانقياده لربه من جذر قلبه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "إذا توضأ فأحسن الوضوء، ثم خرج إلى المسجد، لا يُخرجه إلا الصلاة، لم يخطُ خطوة إلا رُفعت له بها درجة، وحُطَّ عنه بها خطيئة. فإذا صلّى، لم تزل الملائكة تصلّي عليه، ماداه في مصلاه: اللهم صل عليه، اللهم ارحمه، ولايزال احدكم في صلاة ما انتظر الصلاة"

[٤] وأن بناءه إعانةٌ لإعلاء كلمة الحق.

ترجمہ: مساجد کا بیان مسجد بنانے کی، اور اس سے چمٹے رہنے کی، اور اس میں نماز کے انتظار کی فضیلت اوپر ہے

(۱) اس طرف کہ مسجد اسلام کے شعار میں سے ہے۔ اور وہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا)

(۲) اور اس طرف کہ مسجد نماز کی جگہ، عبادت گذاروں کے جا پڑنے کی جگہ، رحمت کے نزول کی جگہ ہے۔ اور وہ من وجہ کعبہ کے مشابہ ہے (حدیثوں کا ترجمہ گذر گیا)

(۳) اور اس طرف کہ نماز کے اوقات میں مسجد کی طرف متوجہ ہونا، اپنے مشاغل اور اپنے گھر والوں کے درمیان میں سے نہیں ارادہ کرتا وہ مگر نماز کا، پہنچ جانے والا ہے اس کے دین میں اس کے اخلاص کو، اور اس کے دل کی جڑ سے اس کے پروردگار کی تابعداری کو (اس کے بعد حدیث ہے۔ جس کا ترجمہ گذر گیا)

(۴) اور اس طرف کہ مسجد کی تعمیر اللہ کا بول بالا کرنے میں تعاون ہے۔

☆ ☆ ☆

مسجد کی حاضری ملکیت کو بہیمیت پر غالب کرتی ہے

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو صبح یا شام مسجد گیا اللہ تعالیٰ اس کے لئے بہشت کی مہمانی تیار کرتے ہیں۔ جب بھی وہ صبح یا شام جاتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۹۸)

تشریح: جنت کی مہمانی سے مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔ اور کلما غدا او راح (جب بھی وہ صبح یا شام جاتا ہے) اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسجد کی ہر بار کی حاضری ملکیت کو بہیمیت پر غالب کرتی ہے یعنی ہر حاضری میں بہیمیت کا زور ٹوٹتا ہے اور ملکیت ابھرتی ہے اور بندہ جہنم سے دور اور جنت سے قریب ہوتا ہے۔ غرض جس طرح تنکا تنکا مل کر چٹائی بنتی ہے اسی طرح یہ بار بار کی حاضری مل کر بہیمیت و ملکیت کے قالب میں کرتی ہے۔

مسجد بنانے کا ثواب جنت کی حویلی!

حدیث ـــــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اللہ کے لئے ولی مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک حویلی بناتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۶۹۷)

تشریح: بندہ جب اپنی گنجائش یا لوگوں کی حاجت کے مطابق مسجد بناتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق اس کے لئے جنت میں حویلی بناتے ہیں۔ اور مسجد بنانے کا خاص یہی بدلہ اس لئے ہے کہ جزاء جنسِ عمل سے ہوتی ہے۔ جیسے روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھلانے والے کو اللہ تعالیٰ حوضِ کوثر سے سیراب کرتے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۶۵)

مسجد میں حدث کرنے سے نماز کے انتظار کا ثواب ختم ہو جاتا ہے

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لایزال العبد فی صلاۃ ما کان فی المسجد، ینتظر الصلاۃ، مالم یُحدث'' بندہ برابر نماز میں رہتا ہے جب تک وہ مسجد میں ٹھہر کر نماز کا انتظار کرتا ہے۔ جب تک وہ حدث نہ کردے یعنی ریح خارج نہ کرے (بخاری حدیث ۱۷۶)

تشریح: مسجد میں ٹھہر کر نماز کا انتظار کرنے والا حکماً نماز میں ہوتا ہے۔ یعنی اس کو بھی نماز پڑھنے والے کی طرح ثواب ملتا ہے لیکن اگر وہ مسجد میں ریح خارج کردے اور اس کی وضو نہ رہے تو انتظارِ نماز کا ثواب ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اب وہ حقیقۃً نماز پڑھنے کے قابل نہیں رہا، اس لئے حکماً بھی نہیں رہا۔

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " من غدا إلى المسجد أو راح، أعدّ الله له نُزُلَه من الجنة ، كلما غدا أوراح"

أقول: هذا إشارة إلى أن كل غُدوة ورَوحةٍ تُمكّنُ من انقياد البهيمية للملكية.

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "من بنى لله مسجدًا بنى الله له بيتًا فى الجنة"

أقول: سِرُّه: أن المجازاةَ تكون بصورة العمل.

[۳] وإنما انقضى ثوابُ الانتظار بالحدث: لأنه لايبقى مُتَهَيِّئًا للصلاة.

ترجمہ: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: (حدیث کا ترجمہ آچکا) میں کہتا ہوں: یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہر صبح کا جانا اور شام کا جانا قادر بناتا ہے بہیمیت کی تابعداری کو ملکیت کے لئے (مَکّن من الشیئ: قادر بنانا، غالب کرنا، بس میں کرنا)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: (ترجمہ گذر چکا) میں کہتا ہوں: اس کا راز: یہ ہے کہ مجازات بصورتِ عمل ہوتی ہے یعنی جو عمل کی صورت ہوتی ہے کبھی مجازات (بدلہ) کی بھی وہی صورت ہوتی ہے۔

(۳) اور حدث کرنے سے انتظار نماز کا ثواب اسی لئے ختم ہوتا ہے کہ اب وہ نماز کے لئے تیار کرنے والا باقی نہ رہا۔

☆ ☆ ☆

مسجد حرام اور مسجد نبوی میں ثواب کی زیادتی کی وجہ

متفق علیہ روایت ہے کہ: "مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا، دیگر مساجد میں ہزار نمازیں ادا کرنے سے بہتر ہے، مگر مسجد حرام مستثنیٰ ہے" یعنی اس میں اس سے بھی زیادہ ثواب ہے (مشکوٰۃ حدیث ۶۹۲) اور ایک نہایت ضعیف حدیث میں ہے کہ: "گھر میں نماز پڑھنے میں ایک نماز کا ثواب ہے اور محلّہ کی مسجد میں پچیس نمازوں کا، اور جامع مسجد میں پانچ سو نمازوں کا، اور مسجد اقصیٰ میں پچاس ہزار نمازوں کا، اور مسجد نبوی میں (بھی) پچاس ہزار نمازوں کا اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے (رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ حدیث ۷۵۲) اسی طرح مسجد قبا میں بھی نماز کی فضیلت آئی ہے۔ اس فضیلت کی چند وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: خاص ان مساجد میں ایسے فرشتے مقرر کئے گئے ہیں جو ان میں عبادت کرنے والوں کو گھیر لیتے ہیں۔ اور جو وہاں عبادت کے لئے پہنچتا ہے اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں یعنی ملائکہ کے وجود اور ان کی دعاؤں کی برکت سے فضیلت پیدا ہوئی ہے۔

دوسری وجہ: ان مساجد کو عبادت سے آباد کرنا شعائر اللہ کی تعظیم اور اللہ کا بول بالا کرنا ہے یعنی تعظیم اور اعلاء سے جو نہایت بلند مقاصد ہیں یہ فضیلت پیدا ہوئی ہے۔

تیسری وجہ: ان مساجد میں نماز کے لئے پہنچنا اکابرین ملت کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا ارشاد ہے یا حدیث ہے کہ: عند ذكر الصالحين تَنزِل الرحمة (کشف الخفاء ۲:۹۱) نیک لوگوں کو یاد کیا جائے تو

رحمتِ خداوندی نازل ہوتی ہے۔(یہ تین وجوہ شاہ صاحب نے بیان کی ہیں آگے شارح کا اضافہ ہے)

چوتھی وجہ: ان مساجد میں ثواب کی زیادتی بانیوں کی برکت سے ہے۔دنیا میں چار ہی مسجدیں ایسی ہیں جو بالیقین نبیوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ایک: مسجد حرام: جس کے بانی خلیل اللہ ہیں۔دوسری: مسجد نبوی: اس کے بانی حبیب اللہ ہیں۔ تیسری: مسجد اقصی: جس کے بانی سلیمان علیہ السلام ہیں۔چوتھی: مسجد قُبا: اس کے بانی بھی رسول اللہ ﷺ ہیں۔اور بانی کی برکت بناء میں اور منی میں ایک مسلمہ حقیقت ہے۔اسی وجہ سے نیک لوگوں سے مکان وغیرہ کا لوگ افتتاح کراتے ہیں)

پانچویں وجہ: نمازیوں کی کثرت وقلت اور نمازیوں کے احوال کی عمدگی بھی فضیلت کا باعث ہے۔مسجد حرام میں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے اور مسجد نبوی میں نمازی لاکھ دو لاکھ سے کم نہیں ہوتے اور مسجد اقصی میں بھی بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اور یہ سب نیک لوگ ہوتے ہیں یا ان کی اکثریت نیک لوگوں کی ہوتی ہے۔

چھٹی وجہ: کس مسجد میں کس پیغمبر نے کتنا عرصہ عبادت کی ہے اس کا بھی فضیلت میں اور اس کی کمی بیشی میں دخل ہے۔مسجد حرام میں تمام نبیوں اور رسولوں نے عبادت کی ہے۔اس لئے اس کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔اور مسجد نبوی میں دس سال تک مسلسل آنحضرت ﷺ نے قیام فرمایا ہے۔اور وہاں شب وروز عبادت کی ہے،اس لئے اس کا دوسرا نمبر ہے۔اور مسجد اقصی میں انبیائے بنی اسرائیل نے عبادتیں کی ہیں اس لئے اس کا بھی دوسرا نمبر (ضعیف روایت کے مطابق) یا تیسرا نمبر (ایک دوسری روایت کے مطابق) ہے۔اور قُبا میں آنحضرت ﷺ نے چودہ دن قیام فرمایا ہے۔ پھر گاہے گاہے تشریف لے جاتے تھے۔اس لئے اس کا چوتھا نمبر ہے۔اور جامع مسجد کی فضیلت نمازیوں کی کثرت کی بنا پر ہے۔اور محلّہ کی مسجد کی فضیلت جماعت کی بنا پر ہے۔

[٤] وإنما فُضِّلَ مسجدُ النبی صلی اللہ علیه وسلم والمسجدُ الحرامُ بمضاعفة الأجر لمعانٍ:
منها: أن هنالك ملائكةً موكلةً بتلك المواضع يَحُفُّوْن بأهلها، ويدعون لمن حَلَّها.
ومنها: أن عمارةَ تلك المواضع من تعظيم شعائر اللّٰه، وإعلاءِ كلمة اللّٰه.
ومنها: أن الحلول بها مُذَكِّرٌ لحالِ أئمةِ الملة.

ترجمہ: (۴) اور برتری بخشی ہے مسجد نبوی اور مسجد حرام کو ثواب دوچند کرنے کے ذریعہ۔بچند وجوہ: ان میں سے: یہ ہے کہ وہاں ایسے فرشتے ہیں جو ان جگہوں میں مقرر کئے گئے ہیں: گھیر لیتے ہیں وہ ان کے لوگوں کو اور دعا کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے لئے جو وہاں پہنچتے ہیں۔اور ان میں سے: یہ ہے کہ ان جگہوں کو آباد کرنا شعائر اللہ کی تعظیم اور اعلائے کلمۃ اللہ کے باب سے ہے۔اور ان میں سے: یہ ہے کہ ان جگہوں میں پہنچنا یاد دلانے والا ہے ملت کے اکابر کی حالت کو۔

☆ ☆ ☆

مساجدِ ثلاثہ کے علاوہ مقامات کے لئے سفر ممنوع ہونے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کجاوے مضبوط نہ باندھے جائیں یعنی لمبا سفر نہ کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف. مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۶۹۳)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کوہ طور پر اس جگہ کی زیارت کے لئے گئے، جہاں موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔ واپسی میں ان کی ملاقات حضرت بصرۃ بن ابی بصرۃ غفاری رضی اللہ عنہ سے ہوئی[1]۔ حضرت بصرہ نے پوچھا: کہاں سے آرہے ہو؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا: طور سے۔ حضرت بصرہ نے کہا: اگر طور پر جانے سے پہلے آپ سے میری ملاقات ہوتی تو میں آپ کو نہ جانے دیتا۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا ہے الخ (پھر آپ نے مذکورہ حدیث سنائی موطا مالک، ۱۰۸ باب فی الساعۃ التی فی یوم الجمعۃ)

تشریح: زمانۂ جاہلیت میں لوگ ایسے مقامات کی زیارت اور برکتیں حاصل کرنے کے لئے جاتے تھے، جو ان کے گمان میں معظم ومحترم تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ دین کی تحریف اور بگاڑ کا سبب ہے۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ فساد کا یہ دروازہ بند کردیا یعنی تین مساجد کے علاوہ حقیقی یا فرضی متبرک مقامات کے لئے سفر کرنا ممنوع قرار دیا، تاکہ غیر شعائر اللہ، شعائر کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اور یہ سلسلہ غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ نہ بن جائے۔

فائدہ: سفر کرکے اولیاء کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا مختلف فیہ ہے. بعض مباح کہتے ہیں بعض حرام۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اشعۃ اللمعات (۳۲۴/۱) میں لمبی گفتگو کے آخر میں اپنی رائے لکھی ہے[2]:

''مقصود بیانِ اہتمام شانِ ایں سہ بقعہ وسفر کردن بجانب آنہا است کہ متبرک ترین مقامات است یعنی اگر سفر کنند بایں سہ مسجد کنند، وبغیر آں گرانی مشقت کشیدن نمی کنند۔ نہ آنکہ سفر بجز ایں مواضع درست نباشد''

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ مقصد حدیث ان جگہوں کا مہتم بالشان ہونا بیان کرنا ہے۔ اور ان تین مساجد کی طرف سفر کرکے نماز پڑھنے کے لئے جانے کی ترغیب دی ہے کیونکہ یہ متبرک جگہیں ہیں۔ پس اگر لوگ سفر کی زحمت اٹھائیں تو ان تین مقامات میں حاضری دینے کے لئے اٹھائیں۔ ان کے علاوہ بار مشقت اٹھانا بے فائدہ ہے۔ اس

---

[1] حافظ صاحب نے تقریب میں لکھا ہے۔ باپ بیٹے دونوں صحابی ہیں۔ اور محفوظ یہ ہے کہ یہ واقعہ والد سے ملاقات کا ہے ۱۲

[2] محدث دہلوی رحمہ اللہ اس بات میں نے اس موقعہ پر اس لئے ذکر کی ہے کہ آپ کا زمانہ شاہ صاحب سے متقدم ہے آپ کی وفات ۱۰۵۲ھ میں ہوئی ہے یعنی شاہ صاحب کی ولادت سے ۶۲ سال پہلے محدث دہلوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ پس ان کی کتاب شاہ صاحب کے سامنے ضرور ہوگی۔ کیونکہ شاہ صاحب ان کے ہم وطن ہیں پس شاہ صاحب کی بات کا مَنصَب (گرنے کی جگہ) آسانی سے متعین کیا جاسکے گا ۱۲

حدیث کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ان مقامات کے علاوہ کہیں اور سفر کر کے جانا جائز نہیں۔

مگر شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ خواہ اولیاء کی قبریں ہوں یا کسی ولی کا تکیہ (بزرگ کی رہنے اور عبادت کرنے کی جگہ) یا کوہِ طور: ممنوع ہونے میں سب برابر ہیں۔

وضاحت: کوہِ طور کی وہ جگہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا ہے یقیناً ایک متبرک جگہ ہے۔ سورۃ طٰہٰ آیت ۱۲ میں اس کو وادی مقدس (پاک میدان) اور سورۃ القصص آیت ۳۰ میں اس کو بقعہ مبارکہ (مبارک مقام) کہا گیا ہے۔ پھر بھی اس کی زیارت کے لئے سفر کرنے کو حضرت ابو بصرہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کی رو سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اور اولیاء کے مزارات پر حاضری کا جو سلسلہ اہل بدعت میں جاری ہے، اور اس کے پیچھے جو فاسد عقائد پنہاں ہیں، وہ یقیناً دین کی تحریف کا باعث ہیں۔ پس شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات چونکہ فہم صحابی سے مؤید ہے اس لئے وہی برحق ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کا جواز یا عدم جواز ایک مستقل مسئلہ ہے۔ مگر چونکہ قبر اطہر مسجد نبوی کے اندر ہے اس لئے دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے پس یہ محض ایک مسئلہ ہے، اس کا ثمرہ کچھ نہیں۔ کیونکہ کوئی بھی شخص محض قبر پاک کی زیارت کے لئے سفر نہیں کرتا۔ بہر حال علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کے لئے بھی سفر کرنے کو ناجائز کہتے ہیں۔ اور وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حدیث میں استثناء مُفَرَّغ ہے یعنی اس کا مستثنیٰ منہ مذکور نہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ استثناء مفرغ میں مستثنیٰ منہ عام مقدر مانا جاتا ہے۔ پس تقدیر عبارت ہے: **لاتُشدُّ الرحالُ إلی مکان مّا** ہوگی یعنی کسی جگہ کا سفر نہ کیا جائے۔ اور عموم میں قبر اطہر بھی شامل ہے پس اس کی زیارت کے لئے بھی سفر کرنا جائز نہیں ـــــ مگر تجارت وغیرہ مقاصد کے لئے دور دراز کے اسفار جائز ہیں۔ پھر اس قدر عام مستثنیٰ منہ کیسے مقدر مانا جا سکتا ہے؟ اور قاعدہ بیشک صحیح ہے، مگر اس کو سمجھا نہیں گیا۔ استثناء مفرغ میں جو مستثنیٰ منہ عام مقدر مانا جاتا ہے وہ مستثنیٰ کی جنس سے عام ہوتا ہے۔ اور مسند احمد (۶۴:۳) میں وہ مصرح بھی ہے۔ شہر بن حَوشَب: ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہی روایت بایں الفاظ روایت کرتے ہیں: **لاینبغی للمطیِّ أن تُشدَّ رحالُه إلی مسجدٍ یبتغی فیه الصلاة غیر المسجد الحرام والمسجد الأقصی ومسجدی هذا**۔ اور شہر بن حوشب میں اگرچہ کلام ہے، مگر مجمع الزوائد (۳:۴) میں صراحت ہے کہ ان کی حدیث حَسَن کے درجہ کی ہوتی ہے۔

اور جمہور امت یہ کہتے ہیں کہ قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ اہم عبادتوں میں سے اور بڑا کار ثواب ہے۔ جمہور امت نے تعامل امت سے استدلال کیا ہے کہ امت کا اجماع ہے: ہر حاجی مکہ کا ایک لاکھ نمازوں کا ثواب چھوڑ کر چار سو میل کا طویل سفر کر کے جو مدینہ جاتا ہے وہ صرف مسجد نبوی کی زیارت کے لئے نہیں جاتا، بلکہ قبر اطہر پر حاضری بھی مقصود ہوتی ہے۔ راقم کی ناقص رائے میں جمہور کی رائے ہی صحیح ہے۔ اور قبر اطہر کا معاملہ ایک استثنائی

صورت ہے جیسے گھر میں تدفین حدیث کی رو سے ممنوع ہے مگر آپ کی تدفین اس سے مستثنیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

[٥] قوله صلى الله عليه وسلم: " لاتُشَدُّ الرحال إلا إلى ثلاثة مساجدَ: المسجدِ الحرام، والمسجد الأقصىٰ، ومسجدى هذا"

أقول: كان أهل الجاهلية يقصُدون مواضِعَ معظَّمةً بزعمهم، يزورونها ويتبركون بها، وفيه من التحريف والفساد مالايخفىٰ، فسدَّ النبيُّ صلى الله عليه وسلم الفسادَ، لئلا يلتحق غير الشعائر بالشعائر، ولئلا يصيرَ ذريعةً لعبادة غير الله والحقُّ عندى: أن القبر ومحلَّ عبادةِ ولىٍّ من أولياءِ الله والطورَ كلُّ ذلك سواءٌ فى النهى، والله أعلم.

ترجمہ: (۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (ترجمہ آ گیا) میں کہتا ہوں: زمانۂ جاہلیت کے لوگ ایسی جگہوں کا قصد کرتے تھے، جو ان کے گمان میں معظم تھیں۔ وہ ان کی زیارت کرتے تھے اور ان سے برکتیں حاصل کرتے تھے۔ اور اس میں دین کی وہ تحریف اور بگاڑ ہے جو مخفی نہیں ہے۔ پس نبی ﷺ نے اس فساد کو بند کیا، تاکہ غیر شعائر، شعائر کے ساتھ مل نہ جائیں، اور تاکہ نہ ہو جائے وہ غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ۔ اور برحق بات: میرے نزدیک یہ ہے کہ قبر اور اولیاء اللہ میں سے کسی ولی کی عبادت کی جگہ اور کوہ طور سب کے سب ممنوع ہونے میں برابر ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

فصل

آدابِ مسجد کی بنیادیں

آداب: ادب کی جمع ہے۔ ادب کے معنی ہیں: پسندیدہ کام۔ روایات میں مسجد کے جو آداب آئے ہیں ان کی تین بنیادیں ہیں:

پہلی بنیاد: مسجد کی تعظیم ضروری ہے۔ پس جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو اس کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ وہ کسی محترم جگہ میں داخل ہو رہا ہے۔ اس احساس کو بیدار کرنے کے لئے مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا تلقین کی گئی ہے. ''الٰہی! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے!'' پھر مسجد میں پہنچ کر اپنے خیالات جمع کر لینے چاہئیں۔ اب نفس پراگندہ خیالات میں بے لگام نہیں رہنا چاہئے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم دیا، تاکہ ذہن ایک طرف ہو جائے۔

دوسری بنیاد: مسجد کو کوڑے کرکٹ، گرد وغبار، میل کچیل اور قابل نفرت چیزوں سے صاف رکھنا چاہئے۔ اس سلسلہ کی تین حدیثیں ملاحظہ فرمائیں:

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (مدینہ کے) محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا۔ اور یہ حکم دیا کہ وہ صاف اور خوشبودار رکھی جائیں (مشکوٰۃ حدیث ۷۱۷)

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے ثواب میرے روبرو پیش کئے گئے۔ یہاں تک کہ وہ تنکا جسے آدمی مسجد سے نکالے'' یعنی اس کا ثواب بھی مجھے دکھلایا گیا (مشکوٰۃ حدیث ۷۲۰) اس روایت سے معلوم ہوا کہ کوڑا کرکٹ مسجد سے نکالدینا چاہئے، یہ کار ثواب ہے۔

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ اور اس کا کفارہ اس کو دفن کردینا یعنی صاف کردینا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۷۰۸)

تیسری بنیاد: مسجد میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے جس سے عبادت میں مشغول لوگوں کے دل پراگندہ ہوں اور مسجد میں بازاروں جیسا شور بھی نہیں کرنا چاہئے۔ پہلی بات کی دلیل درج ذیل حدیث ہے۔ اور دوسری بات کی دلیل اس لئے ذکر نہیں کی کہ حدیث کے الفاظ بھی بعینہٖ یہی ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۰۸۹)

حدیث ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص تیر لے کر مسجد میں گذرا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا: ''اس کا پیکان پکڑ لے'' (بخاری حدیث ۷۰۷۳) تاکہ کسی کو لگ نہ جائے۔ ظاہر ہے کہ کوئی کھلا چاقو، تیر تلوار سونت کر مسجد میں سے گذرے گا تو ہر عبادت میں مشغول آدمی پریشان ہوگا۔ وہ سوچے گا کہ کہیں اُسے لگ نہ جائے۔

وآداب المسجد: ترجع إلى معانٍ:

منها: تعظيمُ المسجد، ومؤاخذةُ نفسِه أن يَجمع الخاطِرَ ولايسترسل عند دخوله، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا دخل أحدكم المسجد فليقل: " اللّٰهم افتح لى أبوابَ رحمتك" و قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا دخل أحدكم المسجدَ فليركع ركعتين، قبل أن يجلس"

ومنها: تنظيفُه مما يُتَقَذَّرُ ويُتَنَفَّرُ منه، وهو قولُ الراوى: " أَمَرَ- يعنى النبى صلى الله عليه وسلم- ببناء المسجد، وأن يُنَظَّفَ ويُطَيَّبَ" وقوله صلى الله عليه وسلم: " عُرِضَتْ علىَّ اجورُ أمتى، حتى القَذَاةَ يخرجها الرجل من المسجد" وقوله صلى الله عليه وسلم: " البزاقُ فى المسجد خطيئةٌ، وكفارتُها دفنُها"

ومنها: الاحترازُ عن تشويش العُبَّادِ وهَيْشَاتِ الأسواق، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "أَمْسِكْ بِنِصَالِها"

ترجمہ اور مسجد کے آداب. چند باتوں کی طرف لوٹتے ہیں۔ ان میں سے: مسجد کی تعظیم ہے اور اپنے نفس کو پکڑنا ہے کہ وہ دل کو جمع کرے، اور بہتر نہ چلا جائے مسجد میں داخل ہونے کے وقت (اس کے بعد دو حدیثیں ہیں) اور ان میں سے: مسجد کو صاف رکھنا ہے اس چیز سے جو گندی ہونے کی وجہ سے مکروہ سمجھی جاتی ہے اور جس سے نفرت کی جاتی ہے (اس کے بعد تین حدیثیں ہیں) اور ان میں سے: باز رہنا ہے عبادت کرنے والوں کے دلوں کو پراگندہ کرنے سے اور بازاروں جیسا شور کرنے سے (اس کے بعد حدیث کا ایک ٹکڑا ہے)

تصحیح قوله صلى الله عليه وسلم: " إذا دخل أحدكم المسجد فليقل: اللهم افتح لي أبواب رحمتك" یہ عبارت مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے مخطوطہ کراچی و پٹنہ سے بڑھائی ہے۔

☆ ☆ ☆

چند امور جو مسجد میں ممنوع ہیں

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص کسی کو کہ وہ کسی گم شدہ چیز کا مسجد میں اعلان کر رہا ہے، تو چاہئے کہ کہے: "نہ پھیرے اللہ تعالیٰ اس کو تجھ پر" (اور اردو محاورہ میں ہے "خدا کرے نہ ملے!) پس بیشک مساجد اس کام کے لئے نہیں بنائی گئیں" (مشکوۃ حدیث ۷۰۶)

حدیث ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب دیکھو تم اس شخص کو جو بیچتا ہے یا خریدتا ہے مسجد میں، تو کہو "اللہ تعالیٰ تیرے سودے کو سودمند نہ بنائیں!" (مشکوۃ حدیث ۷۳۲)

حدیث ـــــ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا اس سے کہ قصاص لیا جائے مسجد میں یعنی قاتل کو قصاصاً مسجد میں قتل نہ کیا جائے اور اس بات سے کہ مسجد میں اشعار پڑھے جائیں اور اس بات سے کہ مسجد میں سزائیں جاری کی جائیں (مشکوۃ حدیث ۷۳۴ اس حدیث میں أن يُنشد فيه الأشعار ہے جس کا ترجمہ کیا گیا اور حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت میں عن تناشد الأشعار في المسجد ہے، جس کا ترجمہ: مسجد میں بیت بازی سے منع کیا۔ مشکوۃ حدیث ۷۳۲)

مذکورہ احادیث کی رو سے مساجد میں چار باتیں ممنوع ہیں:

(۱) ـــــ مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان ممنوع ہونے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مسجد میں شور و شغب ہوگا۔ اور شور نمازیوں کو اور معتکفین کو پریشان کرے گا۔ دوسری وجہ۔ حدیث میں یہ بیان کی گی ہے کہ مسجد اس مقصد سے نہیں بنائی گئی۔ مسجد ذکر الٰہی اور نماز ہی کے لئے بنائی گئی ہے (پس ہر وہ کام مسجد میں ممنوع ہے جو مسجد کے موضوع

کے خلاف ہے)

فائدہ. اگر کوئی مسجد میں اعلان کرے تو مستحب یہ ہے کہ اعلان کرنے والے کے مقصد کے خلاف دعا کرے، تاکہ وہ ناراض ہو۔ اور اپنی حرکت سے باز آئے (مگر اس سے چاہے کہ اس کی چیز اس کو مل جائے)

۲ ——— اور مسجد میں خرید و فروخت ممنوع ہونے کی دو وجہیں ہیں. ایک یہ کہ اس سے مسجد مارکیٹ بن جائے گی۔ اور جب لوگ مسجد میں کاروبار کرنے لگیں گے تو مسجد کا احترام ختم ہو جائے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے بھی نمازیوں کو اور معتکفین کو پریشانی لاحق ہوگی۔

۳ ——— اور ایک دوسرے کو اشعار سنانا دو وجہ سے ممنوع ہے. ایک. یہ کہ اس سے مسجد میں شور و شغب ہوگا۔ دوسری یہ کہ بیت بازی کرنے والے خود بھی ذکر سے اعراض کر رہے ہیں، اور دوسروں کو بھی اعراض کی دعوت دے رہے ہیں کہ ذکر و نماز کو رہنے دو، آؤ ہماری شاعری سنو!

فائدہ. مسجد میں ایک شخص کا زور سے اشعار پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ اس سے بھی شور ہوتا ہے اور اس میں بھی ذکر سے اعراض ہے اور اعراض کی دعوت ہے۔ ہاں کوئی حمد یا نعت پڑھے جس میں رسول اللہ ﷺ کی منقبت ہوتی ہے (یا تقریر میں اصلاحی شعر یا اشعار پڑھے) یا جب کفار سے معرکہ آرائی جاری ہو، اس وقت ایسے اشعار پڑھے جن سے کفار کو غیظ آئے تو یہ جائز ہے، کیونکہ یہ ایک شرعی مقصد ہے۔ پس یہ ممانعت سے مستثنیٰ ہے اور تخصیص کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں بلند جگہ پر کھڑے ہو کر ایسے اشعار سناتے تھے جن میں آنحضرت ﷺ کی منقبت، اسلام اور مسلمانوں کی تعریف اور کفار کی ہجو ہوتی تھی۔ اور آپ خود دعا فرماتے تھے اور دعا دیتے تھے کہ "الٰہی! حسان کی جبرئیل کے ذریعہ مدد فرما!" (بخاری حدیث ۴۵۳)

۴ ——— اور مسجد میں قصاص لینا اور سزائیں جاری کرنا دو وجہ سے ممنوع ہے. ایک. یہ کہ ممکن ہے مسجد خون پیشاب وغیرہ سے پلید ہو جائے یا مجرم جزع فزع کرے، روئے دھوئے اور شور مچائے۔ دوسری وجہ: مسجد والوں کی پریشانی ہے عبادت گذاروں کے کاموں میں اس سے خلل پڑے گا۔

ملحوظہ پہلے قاضی مسجد میں بیٹھ کر مقدمات فیصل کیا کرتے تھے۔ پس حدود و قصاص کے فیصلے تو مسجد میں ہو سکتے ہیں مگر ان پر عمل درآمد مسجد میں جائز نہیں۔ سزائیں مسجد سے باہر جاری کی جائیں گی۔

فائدہ: یہاں کوئی خیال کر سکتا ہے کہ معتکفین کا بار بار ذکر آ رہا ہے، حالانکہ اعتکاف کرنے والے تو صرف رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتے ہیں! تو یہ دور زوال کی صورت حال ہے۔ دور عروج میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ اس وقت رات دن مساجد میں مسجد والے اعمال جاری رہتے تھے۔ دینی تعلیم اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ لوگ ہر وقت نوافل میں مشغول رہتے تھے اور کوئی نہ کوئی اعتکاف میں بھی ہوتا تھا۔ اب دور زوال میں رات دن میں

صرف دو گھنٹے مسجد کھلتی ہے، پھر تالا پڑ جاتا ہے فإلى الله المشتكى!

[۱] قوله صلى الله عليه وسلم: " من سمع رجلاً يَنْشُدُ ضالةً في المسجد، فَلْيقل: لاردَّها اللّٰه عليك! فإن المساجد لم تُبْنَ لهذا" قوله: " إذا رأيتم من يبيع أو يبتاع في المسجد، فقولوا: لا أرْبَحَ اللّٰهُ تجارتَك!" ونهى عن تناشد الأشعار في المسجد، وأن يُسْتقادَ في المسجد، وأن تُقَامَ فيه الحدودُ

أقول:

[الف] أما نَشْدُ الضالّةِ، أي رفع الصوت بطلبها: فلأنه صَخَبٌ ولَغَطٌ يُشَوِّشُ على المصلين والمعتكفين؛ ويستحبُّ أن يُنكر عليه بالدعاء بخلافِ مايطلبه، إرغاماً له؛ وعَلَّلَهُ النبيُّ صلى الله عليه وسلم بأن المساجد لم تُبْنَ لهذا، أي إنما بُنيت للذكر والصلاة.

[ب] وأما الشراءُ والبيع: فلئلا يصير المسجدُ سوقًا يتعاملُ فيه الناسُ، فتذهبُ حرمتُه، ويحصل التشويشُ على المصلين والمعتكفين.

[ج] وأما تناشُدُ الأشعار: فلما ذكرنا، ولأن فيه إعراضاً عن الذكر، وحثًّا على الأعراض عنه.

[د] وأما القَودُ والحدود: فلأنها مَظِنَّةٌ للألواث والجَزَع والبكاء والصَّخَب والتشويش على أهل المسجد.

ويُخَصُّ من الأشعار ماكان فيه الذكرُ ومدحُ النبي صلى الله عليه وسلم وغيظُ الكفار، لأنه غرض شرعي، وهو قوله صلى الله عليه وسلم لحَسَّان: " اللّٰهم أيِّدْه بروح القدس!"

ترجمہ: (۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد: (تین حدیثیں ذکر فرمائی ہیں۔ جن کا ترجمہ آ گیا)

میں کہتا ہوں: (الف) رہا گم شدہ چیز کا ڈھونڈنا یعنی اس کی طلب میں آواز بلند کرنا۔ پس اس لئے کہ وہ شور وغل مچاتا ہے، جو نمازیوں اور معتکفین کو پریشان کرے گا۔ اور مستحب ہے کہ نکیر کی جائے اس پر اس مقصد کے برخلاف دعا کر کے جس کو وہ چاہ رہا ہے، اس کو ناراض کرنے کے لئے (یعنی حقیقت میں بددعا مقصود نہ ہو) اور وجہ بیان کی ہے اس کی نبی ﷺ نے کہ مسجدیں اس کام کے لئے نہیں بنائی گئیں یعنی وہ ذکر اور نماز ہی کے لئے بنائی گئی ہیں۔

(ب) اور رہی خرید وفروخت: پس اس لئے کہ مسجد ایسا بازار نہ بن جائے جس میں لوگ کاروبار کرنے لگیں، پس اس کا احترام ختم ہو جائے اور نمازیوں اور معتکفین کو پریشانی بھی لاحق ہوگی۔

(ج) اور رہا ایک دوسرے کو اشعار سنانا. پس اس کی ممانعت کی ایک وجہ تو وہ ہے جو ہم نے ذکر کی۔ اور اس لئے کہ

اس میں ذکر سے روگردانی ہے اور ذکر سے روگردانی پر ابھارتا ہے۔

(د) اور رہا قصاص اور سزائیں: پس اس لئے کہ پلیدیوں اور گھبراہٹ اور رونے اور شور مچانے اور اہل مسجد کی پریشانی کی احتمالی جگہ ہیں۔

اور خاص کیا گیا ہے اشعار میں سے ان کو جن میں ذکر الٰہی اور آنحضور ﷺ کی منقبت اور کفار کو غیظ دلانا ہو۔ اس لئے کہ وہ شرعی مقصد ہے۔ اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے حسانؓ کے حق میں: ''اے اللہ! قوی فرما اس کو پاکیزہ روح (جبرئیل) کے ذریعہ!''

لغات: نَشْدَ الضالَّةَ: گم شدہ کو ڈھونڈھنا، پوچھ پاچھ کرنا۔ یہی معنی أنشد (باب افعال) کے ہیں اور تَنَاشَدَ الأشعارَ (باب تفاعل) کے معنی ہیں: ایک دوسرے کے سامنے شعر پڑھنا۔

تصحیح: لاردها الله عليك اصل میں لارَدَّ اللهُ إليكَ تھا۔ تصحیح مشکوٰۃ شریف سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

جنبی اور حائضہ مسجد میں کیوں داخل نہیں ہو سکتے؟

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں مسجد کو حلال نہیں کرتا کسی بھی حائضہ کے لئے، اور نہ کسی بھی جنبی کے لئے'' (ابوداؤد حدیث ۲۳۲)

تشریح: جنبی اور حائضہ کو مسجد میں جانے کی ممانعت دو وجہ سے ہے: **ایک**: اس وجہ سے کہ یہ بات مسجد کی تعظیم کے خلاف ہے۔ مسجد کی سب سے بڑی تعظیم یہ ہے کہ آدمی پاکی کے ساتھ ہی اس کے قریب جائے۔ اور بے وضو جانا اس لئے منع نہیں کہ ایسا حکم دینے میں بڑی تنگی تھی۔ اور جنبی اور حائضہ کے لئے کوئی تنگی نہیں۔ اور **دوسری وجہ**: یہ ہے کہ مسجد صرف نماز کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور حائضہ اور جنبی کا نماز سے دور کا بھی واسطہ نہیں، فی الحال دونوں نماز کے نا اہل ہیں۔ پھر وہ مسجد میں کیوں جائیں؟!

بدبودار چیزوں سے مسجد کو بچانے کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اس بدبودار درخت میں سے کھایا، پس وہ ہرگز ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔ پس بیشک فرشتے تکلیف اٹھاتے ہیں اس چیز سے جس سے انسان تکلیف اٹھاتے ہیں'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۷۰۷)

تشریح: اس بدبودار درخت سے مراد یا تو پیاز ہے یا لہسن۔ اور انہی کے حکم میں ہر بدبودار چیز ہے۔ اور فرشتوں

کے تکلیف اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ عمدہ اخلاق کو اور ستھری چیزوں کو پسند کرتے ہیں اور برے اخلاق اور گندی اور بدبودار چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

فائدہ: اس حدیث سے بدبودار چیزوں سے مسجد کو بچانے کی یہ حکمت واضح ہوئی کہ بدبودار چیزوں کو مسجد میں جانا یا خود بدبودار ہو کر مسجد میں جانا جہاں احترام مسجد کے منافی ہے، وہاں اللہ کے نیک بندوں (فرشتوں اور نمازیوں) کو تکلیف پہنچانا بھی ہے۔ اور ایذا مسلم حرام ہے پس اس سے احتراز ضروری ہے۔

[۲] قوله صلى الله عليه وسلم "إني لا أُحل المسجد لحائض ولا جنب"

أقول: السرُّ في ذلك تعظيم المسجد، فإن أعظم التعظيم أن لا يقربه إنسانٌ إلا بطهارة، وكان في منع دخول المحدث حرجٌ عظيم، ولا حرج في الجنب والحائض، ولأنهما أبعد الناس عن الصلاة، والمسجدُ إنما بُني لها.

[۳] قوله صلى الله عليه وسلم "من أكل من هذه الشجرة المُنتنة فلا يقربنّ مسجدنا، فإن الملائكة تتأذّى مما يتأذى منه الإنسُ"

أقول: هي البصلُ أو الثوم، وفي معناه كلُّ مُنتن؛ ومعنى تتأذى: تكرهُ وتنفر، لأنه تحث محاسنَ الأخلاق والطيبات، وتكرهُ أضدادها.

ترجمہ: (۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں اس کی سبب مسجد کی تعظیم ہے۔ پس بیشک سب سے بڑی تعظیم یہ ہے کہ نہ داخل ہو جائے مسجد سے کوئی انسان مگر پاکی کے ساتھ۔ اور جب داخل ہونے سے منع کرنے میں بڑی تنگی تھی، اور کوئی تنگی نہیں جنبی اور حائضہ (کو منع کرنے) میں۔ اور اس لئے کہ وہ دونوں لوگوں میں سب سے زیادہ دور ہیں نماز سے۔ اور مسجد بنائی گئی ہے صرف نماز کے لئے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں بدبودار درخت پیاز ہے یا لہسن۔ اور اس کے معنی میں ہے ہر بدبودار چیز۔ اور "تکلیف اٹھانے" کے معنی ہیں ناپسند کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ فرشتے عمدہ اخلاق اور ستھری چیزوں کو دوست رکھتے ہیں اور ان کی اضداد کو ناپسند کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مسجد میں داخلے کے وقت دعا میں رحمت اور نکلتے وقت فضل کی تخصیص کی وجہ

حدیث ——— حضرت ابواُسید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی

شخص مسجد میں داخل ہوتو چاہئے کہ کہے: ''اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے!'' اور جب باہر نکلے تو چاہئے کہ کہے: ''اے اللہ! بیشک میں آپ سے آپ کا فضل چاہتا ہوں'' (مشکوۃ حدیث ۷۰۳)

تشریح: مسجد میں جاتے وقت رحمت اور باہر آتے وقت فضل طلب کرنے کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں رحمت کا لفظ روحانی اور اخروی نعمتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ روحانی اور اخروی نعمتیں. جیسے ولایت (قرب خداوندی) نبوت، جنت اور دیدار الٰہی وغیرہ۔ سورۃ الزخرف آیت ۳۲ ہے: ''تیرے رب کی رحمت اس (دنیوی مال ومنال) سے بہتر ہے، جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں'' سورۂ یونس آیت ۵۸ میں بھی یہ مضمون ہے۔ اور فضل کا اطلاق دنیوی نعمتوں پر کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۸ ہے: ''تم پر اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) اس معاش کو تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے'' اور سورۃ الجمعہ آیت ۱۰ ہے: ''پھر جب تم نماز جمعہ پوری کرلو تو زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو'' ——— اور مسجد اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے ہی کی جگہ ہے اس لئے فتح باب رحمت کی دعا تعلیم فرمائی۔ اور مسجد سے نکل کر عام طور پر آدمی معاش کی تلاش میں لگتا ہے۔ اس لئے فضل خداوندی یعنی دنیوی نعمتیں طلب کرنے کی تلقین فرمائی۔

تحیۃ المسجد کی حکمت

حدیث ——— حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہوتو چاہئے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھے'' (مشکوۃ حدیث ۷۰۰)

تشریح: مستحب یہ ہے کہ جب آدمی مسجد میں پہنچے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھے۔ یہ نماز تین وجوہ سے مقرر کی گئی ہے:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ مسجد میں پہنچ کر بھی ——— جو کہ خاص نماز ہی کے لئے تیار کی گئی ہے ——— نماز میں مشغول نہ ہونا محرومی اور افسوس کی بات ہے۔

دوسری وجہ: مسجد میں آدمی فرض نماز ادا کرنے کے لئے پہنچتا ہے۔ اور تحیۃ المسجد ایک محسوس چیز کے ذریعہ فرض کی رغبت متعین کرنے کے لئے مشروع کی گئی ہے۔ یعنی دو رکعتیں پڑھنے سے فرض کی رغبت محسوس ہوکر سامنے آجائے گی ——— اس کی نظیر[1] وہ سنن مؤکدہ ہیں جو فرائض سے پہلے رکھے گئے ہیں۔ یہ صرف فجر اور ظہر میں ہیں۔ کیونکہ یہ دو نمازیں نیند سے بیدار ہوکر پڑھی جاتی ہیں، جو سستی اور کاہلی کا وقت ہے۔ اور اس حالت میں فرض پڑھنا منافقوں کا شیوہ ہے۔ اور جب آدمی سنتیں ادا کرے گا تو طبیعت میں نشاط پیدا ہوگا اور سستی دور ہوگی اور آدمی رغبت کے ساتھ فرض ادا

[1] نظیر اور مثال میں یہ فرق ہے کہ مثال ہمثل کا فرد ہوتی ہے۔ اور نظیر اس کا فرد نہیں ہوتی۔ ایک متماثل (ملتی جلتی) چیز ہوتی ہے، جو مسئلہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے ۱۲

کرے گا۔اور فجر میں کاہلی کا احتمال زیادہ تھا،اس لئے اس کی سنتوں کی تاکید زیادہ آئی ہے۔اور دوسری تین نمازوں میں کاہلی کا تو کوئی موقع نہیں۔البتہ کاروباری مشغولیت کی وجہ سے رغبتیں پراگندہ ہوتی ہیں۔ان میں نماز کی رغبت کو کسی محسوس چیز کے ذریعہ متعین کرنے کے لئے تحیۃ المسجد مشروع کی گئی۔

تیسری وجہ: یہ ہے کہ یہ مسجد کے احترام کے لئے ہے مسجد کو اللہ تعالیٰ سے ایک خاص نسبت ہے۔اور اسی وجہ سے اس کو خانۂ خدا کہتے ہیں۔پس اس کا یہ حق ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔اور تحیۃ المسجد اسی حق کی ادائیگی کے لئے ہے۔

[٤] قوله صلى الله عليه وسلم: إذا دخل أحدُكم المسجد فليقل:" اللهم افتح لى أبواب رحمتك" فإذا خرج فليقل: "اللهم إنى اسألك من فضلك"

أقول: الحكمةُ فى تخصيص الداخل بالرحمة والخارج بالفضل: أن الرحمة فى كتاب اللّٰه أريدبها النِّعَمُ النفسانيةُ والأخرويةُ، كالولاية والنبوة، قال تعالى: ﴿ورَحْمَةُ ربِّك خيرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ والفضلَ على النعم الدنيوية، قال تعالى: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فضلاً مِّن رَّبِّكُمْ﴾ وقال تعالى: ﴿فإذا قُضِيت الصَّلاةُ فانتَشِرُوْا فِى الأَرْض وابْتَغُوْا مِنْ فضْل اللّٰه﴾ ومن دخل المسجد إنما يطلب القُرْبَ من اللّٰه، والخروجُ وقتُ ابتغاء الرزق.

[٥] قوله صلى الله عليه وسلم: إذا دخل أحدكم المسجد فليركع ركعتين قبل أن يجلس"

أقول: إنما شرع ذلك: لأن ترك الصلاة ـــ إذا حلّ بالمكان المُعدّ لها ـــ ترةٌ وحسرةٌ، وفيه ضبطُ الرعية فى الصلاة بأمر محسوس، وفيه تعظيم المسجد

ترجمہ:(۴)(حدیث شریف کا ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں داخل ہونے والے کو رحمت کے ساتھ اور باہر آنے والے کو فضل کے ساتھ خاص کرنے میں حکمت یہ ہے کہ قرآن کریم میں رحمت کے لفظ سے روحانی اور اخروی نعمتیں مراد لی گئی ہیں۔جیسے ولایت اور نبوت (اس کے بعد آیت ہے) اور لفظ فضل کا اطلاق دنیوی نعمتوں پر کیا گیا ہے (اس کے بعد دو آیتیں ہیں) اور جو مسجد میں داخل ہوتا ہے وہ اللہ کی نزدیکی ہی طلب کرتا ہے۔اور باہر نکلنا روزی تلاش کرنے کا وقت ہے۔

(۵)(حدیث کا ترجمہ آگیا) میں کہتا ہوں تحیۃ المسجد مشروع کی گئی ہے اس لئے کہ نماز کا چھوڑنا ـــ جب اترے آدمی ایسی جگہ میں جو نماز کے لئے تیار کی گئی ہے ـــ محرومی اور پچھتاوا ہے۔اور اس میں نماز کی رغبت کو ایک محسوس چیز کے ذریعہ متعین کرنا ہے۔اور اس میں مسجد کی تعظیم ہے۔

☆ ☆ ☆

سات جگہوں میں نماز ممنوع ہونے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ساری زمین مسجد ہے بجز قبرستان اور حمام کے'' (رواہ ابوداؤد والترمذی والدارمی، مشکوۃ حدیث ۷۳۷)

فائدہ: اس حدیث کی سند تو صحیح ہے۔ مگر مضمون صحیح نہیں۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے جو چند امتیازات ہیں ان میں سے ایک امتیاز یہ ہے کہ آپؐ کے لئے ساری زمین نماز پڑھنے کی جگہ بنائی گئی ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں۔ اور آئندہ روایت میں جو چند جگہوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے وہ نہی لغیرہ ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اس حدیث پر جو کلام فرمایا ہے، اس کا حاصل یہی ہے۔

حدیث ـــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سات جگہوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے: گوبر وغیرہ ڈالنے کی جگہ میں، قبرستان میں، مذبح میں، راستہ کے بیچ میں، نہانے کی جگہ میں، اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ میں اور بیت اللہ کی چھت پر'' (مشکوۃ حدیث ۷۳۸)

حدیث ـــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ''میرے حبیب ﷺ نے مجھے قبرستان میں نماز پڑھنے سے منع کیا اور مجھے اس بات سے بھی منع کیا کہ بابل کی سرزمین میں نماز پڑھوں، کیونکہ وہ ملعون ہے'' (ابوداؤد حدیث ۴۹۰)

گوبر وغیرہ ڈالنے کی جگہ میں اور مذبح میں نماز کی ممانعت کی وجہ: جگہ کی ناپاکی ہے۔ اور مصلی کی جگہ کا پاک ہونا نماز کے لئے شرط ہے۔ اور کوئی کپڑا وغیرہ بچھا کر نماز پڑھے تو بھی نجاست کے قرب کی وجہ سے، مجبوری کے بغیر، مناسب نہیں۔ گو نماز ہو جائے گی۔ نماز کے لئے مناسب نہایت پاکیزگی اور خوب صفائی ہے۔ پس ناپاکی کے قریب بھی نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔

قبرستان میں نماز کی ممانعت کی وجہ: شرک کا چور دروازہ بند کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ جس طرح مورتیوں کو سامنے رکھ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے، اسی طرح علماء اور بزرگوں کی قبروں کو بھی قبلۂ توجہ بنا کر اگر نماز پڑھی جائے گی یا صرف سجدہ کیا جائے گا تو یہ شرک جلی (خالص شرک) ہے۔ اور اگر تبرک کے لئے قبروں کے قریب نماز پڑھی جائے گی تو یہ شرکِ خفی ہے یعنی اس میں بھی شرک کا شائبہ ہے۔ درج ذیل حدیث کا یہی مفہوم ہے:

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض وفات میں ارشاد فرمایا: ''اللہ نے لعنت فرمائی یہود و نصاریٰ پر۔ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنالیا'' (مشکوۃ حدیث ۷۱۲) یعنی ان لوگوں میں قبر پرستی کا رواج ہو گیا، تو اللہ پاک نے ان کو دھتکار دیا ـــــ اور اس کی نظیر اوقات ثلاثہ میں نماز کی ممانعت ہے۔ یہ ممانعت کفار کی مشابہت سے بچنے کے لئے ہے۔ اسی طرح قبرستان میں نماز کی ممانعت یہود و نصاریٰ کی

مشابہت اوران میں پیدہ شدہ بیماری (قبر پرستی) سے بچنے کے لئے ہے۔

حمام میں نماز کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کسی کا ستر بھی کھل سکتا ہے۔اور بہت لوگ ایک ساتھ نہانے آجائیں تو بھیڑ بھی ہوسکتی ہے پس یہ چیزیں نماز میں دل کی حضوری میں خلل انداز ہوں گی۔

فائدہ: حمام: نہانے کے ہوٹل ہوتے ہیں۔جن ملکوں میں پانی کی قلت ہوتی ہے، وہاں لوگ گھروں میں پانی کی وافر مقدار نہیں رکھتے۔جب نہانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو حمام میں چلے جاتے ہیں اور پیسے دیکر نہا آتے ہیں۔

اونٹوں کو بٹھانے کی جگہ میں نماز کی ممانعت کی وجہ: یہ ہے کہ اونٹ بڑے ڈیل ڈول کا جانور ہے، اس کا حملہ بھی سخت ہوتا ہے اوراس میں جرأت بھی بہت ہوتی ہے، اس لئے ممکن ہے کہ وہ نماز میں پریشان کرے۔اور یہ اندیشہ جمعیت خاطر میں خلل ڈالے گا۔اور بکریوں کا حال اونٹوں سے مختلف ہے، وہ بیچاری کیا ستائے گی؟! اس لئے حدیث میں مرابض غنم (بکریوں کو بٹھانے کی جگہ) میں نماز کی اجازت دی گئی (مشکوۃ حدیث ۷۳۹)

بیچ راستہ میں نماز ممنوع ہونے کی تین وجوہ ہیں: ایک: یہ کہ وہاں نماز میں اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔بار بار گذرنے والوں کی طرف توجہ منعطف ہوگی۔دوسری وجہ: یہ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے سے گذرنے والوں پر راستہ تنگ ہوگا، جوان کے لئے باعث اذیت ہوگا۔اور تیسری وجہ: یہ ہے کہ راستے درندوں اور زہریلے جانوروں کی بھی گذرگاہ ہیں۔پس وہ گزند پہنچائیں گے۔یہ وجہ ایک روایت میں صراحۃً آئی ہے۔ابن ماجہ (حدیث ۷۴۵) میں ایک ضعیف روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: إياكم والتعريس في جوادّ الطريق، والصلاة عليها، فإنها مأوى الحيّات والسّباع بچوتم راستہ کے بیچ میں آخری رات میں آرام کے لئے پڑاؤ ڈالنے سے، اور راستہ پر نماز پڑھنے سے، پس راستے سانپوں اور درندوں کا ٹھکانہ ہیں۔یعنی رات میں درندے راستوں پر آبیٹھتے ہیں اور زہریلے جانور بھی آپڑتے ہیں۔

بیت اللہ کی چھت پر نماز کی ممانعت دو وجہ سے ہے: ایک: اس وجہ سے کہ بے ضرورت بیت اللہ کی چھت پر چڑھنا مکروہ ہے۔اس سے بیت اللہ کی عظمت پامال ہوتی ہے۔دوسری وجہ: یہ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے میں شک رہے گا کہ استقبالِ قبلہ ہوا یا نہیں؟ کیونکہ وہاں نظر روکنے والی کوئی چیز نہیں۔

ملعون زمینوں میں نماز کی ممانعت دو وجہ سے ہے: ایک: اس وجہ سے کہ کسی جگہ میں نماز پڑھنا اس جگہ کی عزت بڑھانا ہے۔اور ملعون زمین عزت کی حقدار نہیں بلکہ اس کی اہانت ضروری ہے۔پس وہاں نماز ممنوع قرار دینے سے اہانت مقصود ہے۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ اللہ کی ناراضی خواہ مخواہ مول نہیں لینی چاہئے۔ملعون جگہ میں نماز پڑھنے میں احتمال ہے کہ اللہ پاک ناراض ہوجائیں۔پس اللہ کی ناراضگی کے اندیشہ سے ایسی جگہوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔تبوک جاتے ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجر (ثمود کی بستیوں) سے گذرے تو فرمایا: لاتدخلوا مساكن الذين ظلموا أنفسهم، إلا

أن تكونوا باكينَ، أن يصيبكم ما أصابهم: تباہ شدہ کافروں کی بستیوں میں داخل نہ ہو مگر روتے ہوئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کو بھی وہ عذاب پہنچے جو ان کو پہنچا تھا! پھر آپؐ نے سر پر کپڑا ڈالا اور سواری کو تیز ہانکا یہاں تک کہ اس میدان سے نکل گئے (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۲۵ باب الظلم، کتاب الآداب)

فائدہ: ملعون زمین وہ ہے جہاں کفار پر عذاب نازل ہوا ہو۔ زمین دھنسا دی گئی ہو یا پتھروں کی بارش برسائی گئی ہو۔

[٦] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: " الأرضُ كلُّها مسجدٌ، إلا المَقْبُرَةَ والحَمَّامَ" ونهى أن يصلّى فى سبعةِ مواطنَ: فى المَزْبَلَةِ،والمقبرة، والمَجْزَرَةِ، وقارعةِ الطريق، وفى الحمام، وفى معاطنِ الإبل، وفوقَ ظهرِ بيت اللّٰه؛ ونهى عن الصلاة فى أرض بابلَ، فإنها ملعونة.

أقول:

[الف] الحكمةُ فى النهى عن المزبلة والمجزرة: أنهما موضِعا النجاسة ، والمناسبُ للصلاة هو التَطَهُّر والتنظُّف.

[ب] وفى المقبرة: الاحترازُ عن أن يُتَّخذَ قبورُ الأحبار والرهبان مساجدَ، بأن يُسْجَدَ لها، كالأوثان، وهو الشرك الجلىُّ، أو يُتقرب إلى اللّٰه بالصلاة فى تلك المقابر، وهو الشرك الخفىّ؛ وهذا مفهومُ قوله صلى اللہ علیہ وسلم:" لعن اللہ اليهودَ والنصارى اتَّخذُوا قبورَ أنبيائهم مساجدَ" ونظيره: نهيُه صلى اللہ علیہ وسلم عن الصلاة فى وقت الطلوع والاستواء والغروب، لأن الكفار يسجدون للشمس حينئذ.

[ج] وفى الحمام: أنه محلُّ انكشاف العوراتِ، ومَظِنَّةُ الازدحام، فَيُشغله ذلك عن المناجاة بحضور القلب.

[د] وفى معاطن الإبل: أن الإبلَ لِعِظَمِ جُثَّتِهَا وشدَّةِ بطشها وكثرةِ جُرْأَتِها كادت تُؤذى الإنسانَ، فَيُشعله ذلك عن الحضور، بخلاف الغنم.

[ه] وفى قارعة الطريق: اشتغالُ القلب بالمارّين،وتضييق الطريق عليهم، ولأنها مَمَرُّ السباع، كما ورد صريحًا فى النهى عن النزول فيها.

[و] وفوق بيت اللہ: أن الترقّىَ على سطح البيت، من غير حاجة ضرورية، مكروهٌ، هَاتِكٌ لحرمتِه، وللشكِّ فى الاستقبال حالتئذٍ.

[ز] وفى الأرض الملعونة بنحوِ خسفٍ أو مطرِ الحجارة: إها نتُها، والبُعْدُ عن مظانِّ الغضب هيبةً منه، وهو قوله صلى اللہ علیہ وسلم:" ولاتدخلوه إلا باكين"

نہیں رکھتے تو نہیں جائز ہے کہ لوگ مکلف کئے جائیں اس کو چھوڑنے کے۔ کیسے مکلف کئے جا سکتے ہیں؟ درانحالیکہ وہ بات پیدا ہونے والی ہے ابنائے جنس پر دل کے پسیجنے سے، اور وہ ستودہ ہے، اہل شہر کی باہمی الفت موقوف ہونے کی وجہ سے اس رقت پر۔ اور اس لئے کہ وہ رقت انسان کے مزاج کی درستگی کا تقاضا ہے۔ اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے مہربانی کرنے والوں ہی پر رحم کرتے ہیں''

(۳۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشادات۔ میں کہتا ہوں۔ راز ممانعت میں یہ ہے کہ یہ چیز (نوحہ ماتم) غم کے ہیجان کا سبب ہے۔ اور کسی کی موت کی مصیبت پہنچایا ہوا شخص مریض جیسا ہی ہے۔ اس کا علاج کیا جاتا ہے تاکہ اس کی بیماری میں تخفیف ہو۔ اور نہیں مناسب ہے کہ کوشش کی جائے اس کے درد کو دوچند کرنے میں، اور اسی طرح مصیبت زدہ غافل ہو جاتا ہے اس غم سے جس کو وہ پاتا ہے۔ اور نہیں مناسب ہے کہ گھسے وہ (اس غم میں) بالارادہ ـــــ اور نیز: پس شاید بے چینی کا جوش سبب بن جائے فیصلۂ خداوندی پر راضی نہ ہونے کا ـــــ اور نیز پس زمانہ جاہلیت والے نمائش کرتے تھے لوگوں کے سامنے دردمندی کا اظہار کر کے۔ اور یہ بری نقصان دہ عادت ہے، پس لوگ اس سے روکے گئے۔

☆ ☆ ☆

نوحہ کرنے والی عورت کی سزا اور اس کا راز

نوحہ خوانی ایک پیشہ ہے۔ عام طور پر یہ ہندا عورتیں کرتی ہیں۔ ان کا کام مرنے والے کے جھوٹے فضائل بیان کر کے رونا رلانا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ نوحہ گری کرنے والی عورت نے اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کی تو اسے قیامت کے دن اس حال میں کھڑا کیا جائے گا کہ اس پر قطران کا کرتا اور خارش کی قمیص ہوگی (مشکوۃ حدیث ۱۷۲۷)

تشریح. قطران. تارکول جیسا ایک سیاہ بدبودار مادہ ہے، جو درخت ابہل (ہوبیر) سے نکلتا ہے۔ اور خارشتی اونٹوں پر ملا جاتا ہے۔ اور وہ آگ بہت جلدی پکڑتا ہے اور حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اس پر خارش مسلط ہوگی اور اوپر سے قطران ملا جائے گا۔ یہ سزا جنس عمل سے ہے۔ کیونکہ بین کرنے والی عورت کا اس کے گناہ نے احاطہ کر لیا ہے۔ پس اس کا گناہ جسم کا احاطہ کرنے والے بدبودار مادہ کی صورت میں متمثل ہوگا۔ اور کھڑا کرنا یا تو تشہیر کے لئے ہے یا یہ بھی جنس عمل سے سزا ہے، کیونکہ نوحہ کرنے والی عورت مجمع میں کھڑی ہو کر گریہ وزاری کرتی ہے، اس لئے اس کی سزا بھی ویسی ہی ہونی چاہئے۔

جاہلیت کی چار باتوں سے پیچھا چھڑانا مشکل کیوں ہے؟

حدیث ـــــ میں ہے کہ جاہلیت کی چار باتیں میری امت میں رہیں گی۔ لوگ ان کو بالکلیہ نہیں چھوڑیں گے:

ایک: حَسَب (خاندانی خوبیوں) پر فخر کرنا یعنی اپنی بڑائی جتلانا دوم: نَسَب میں طعن کرنا یعنی دوسروں کے نسب میں کیڑے نکالنا۔ سوم: ستاروں سے بارش کی توقع رکھنا یعنی یہ امید باندھنا کہ فلاں ستارہ فلاں منزل میں آئے گا یا فلاں مہینہ شروع ہوگا تو بارش ہوگی۔ چہارم: نوحہ کرنا یعنی میت پر واویلا کرنا (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۲۷)

تشریح: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فراستِ نبوت سے یہ بات سمجھ لی کہ لوگ مذکورہ باتوں سے کنارہ کش نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہ باتیں بشری طبیعت کے حد اعتدال سے نکل جانے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور یہ ایسا ہی تقاضا ہے جیسا شدت شہوت کا تقاضا۔ جس سے شہوت پرست جدا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح بعض لوگ ڈینگ ہانکنے اور لاف زنی کے خوگر ہوتے ہیں۔ جس سے پہلی دو برائیاں جنم لیتی ہیں۔ ڈینگیا اپنی خاندانی خوبیوں پر اتراتا ہے، اور دوسرے کی خوبیاں اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتیں اور وہ اس کے حَسَب ونسب میں کیڑے نکالتا ہے۔ اسی طرح لوگوں میں مُردوں کی الفت ومحبت پائی جاتی ہے، جو ان کو نوحہ گری پر ابھارتی ہے۔ اور رصد بندی یعنی سیاروں کا مشاہدہ کرنے کا سلسلہ بھی ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ جو ستاروں سے بارش کی امید باندھنے تک مُفضی ہوتا ہے۔ چنانچہ آج بھی دنیا کے سبھی لوگوں میں خواہ عرب ہوں یا عجم، یہ سلسلہ جاری ہے۔

فائدہ: حدیث کا منشا یہ ہے کہ ان چار برائیوں کا ازالہ چونکہ مشکل ہی سے ہوتا ہے، اس لئے لوگ ان سے پیچھا چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ جیسے کپڑے پر کوئی ایسی چیز لگ جائے جس کا ازالہ دشوار ہو تو لوگ مختلف تدبیروں سے داغ چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگ اپنی خاندانی خوبیوں پر شیخی نہ بگھاریں، بلکہ خدا کا تشکر بجالائیں۔ اور دوسروں کی خاندانی خوبیوں کے سلسلہ میں لوگ عالی ظرفی اور سیر چشمی کا مظاہرہ کریں۔ اور مُردوں کی محبت میں اعتدال قائم رکھیں۔ اور نمائشی طور پر ہا ہو کرنے سے احتراز کریں۔ اور فضل الٰہی سے بارش کی امید باندھیں۔

عورتوں کا جنازہ کے ساتھ جانا ممنوع کیوں ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں تشریف لے جارہے تھے آپؐ نے چند عورتوں کو ایک جگہ بیٹھا ہوا دیکھا۔ پوچھا: ''یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' جواب دیا: ہم جنازہ کا انتظار کررہی ہیں۔ پوچھا: ''تم نے جنازہ کو نہلایا؟'' جواب دیا: نہیں! پوچھا: ''تم جنازہ کو کندھا دوگی؟'' جواب دیا: نہیں! پوچھا: ''تم جنازہ کو قبر میں اُتاروگی؟'' جواب دیا: نہیں! آپؐ نے فرمایا: ''تو واپس جاؤ گناہوں کا بوجھ لیکر، ثواب سے خالی ہاتھ!'' (ابن ماجہ حدیث ۱۵۷۸)

تشریح: مذکورہ سوال وجواب سے واضح ہوا کہ عورتوں کا جنازہ میں کوئی کام نہیں۔ پس ان کی شرکت بے معنی ہے۔ اور ان کی شرکت میں مفاسد کا اندیشہ ہے: وہ شور وشغب کریں گی، واویلا مچائیں گی، بے صبری دکھلائیں گی اور بے

پردگی بھی ہوگی، اس لئے عورتوں کو جنازہ کے ساتھ جانے سے روک دیا گیا۔

[۳۱] قوله صلى الله عليه وسلم في النائحة: "تُقام يوم القيامة وعليها سِرْبال من قطران، ودِرْعٌ من جَرَب.

أقول: إنما كان كذلك؛ لأنها أحاطت بها الخطيئة، فجوزيت بتمثُّل الخطيئة نتنًا محيطًا بجسدها، وإنما تقام تشهيرًا، أو لأنها كانت قائمةً عند النوحة.

[۳۲] قوله صلى الله عليه وسلم: "أربع في أمتي من أمر الجاهلية، لايتركونهن" الحديث.

أقول: إنما تفطَّن النبيُّ صلى الله عليه وسلم أنهم لايتركون: لأن ذلك مقتضى إفراط الطبيعة البشرية بمنزلة الشبق، فإن النفوس لها تيةٌ يظهر في الأنساب، وألفةٌ بالأموات تستدعي النياحة، ورصدٌ يُؤدِّي إلى الاستسقاء بالنجوم، ولذلك لن ترى أمة من البشر، من عربهم وعجمهم، إلا وهذه سُنَّةٌ فيهم.

[۳۳] قوله صلى الله عليه وسلم: في النساء يتبعْن الجنازة: "ارجعْن مأزوراتٍ، غير مأجوراتٍ"

أقول: إنما نُهِين عن ذلك: لأن حضورهن مظنة الصخب والنياحة، وعدم الصبر، وانكشاف العورات

ترجمہ۔ (۳۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: نوحہ گری کرنے والی عورت کے بارے میں۔ کھڑی کی جائے گی وہ قیامت کے دن: درانحالیکہ اس پر قطران کا کرتا اور خارش کی قمیص ہوگی" میں کہتا ہوں۔ تھا ویسا ہی (یعنی اس کی یہی سزا ہے) اس لئے کہ گناہ نے اس کا احاطہ کرلیا ہے۔ پس بدلہ دی گئی گناہ کے متمثل ہونے کے ذریعہ: اس کے جسم کو گھیرنے والی بدبودار چیز کے ذریعہ۔ اور کھڑی کی جائے گی۔ رسوائی کے طور پر ہی یا اس لئے کہ وہ نوحہ گری کے وقت کھڑی رہا کرتی تھی۔

(۳۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "چار باتیں میری امت میں جاہلیت کی چیزوں میں سے، لوگ ان کو نہیں چھوڑیں گے" آخر حدیث تک۔ میں کہتا ہوں۔ سمجھ لیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لوگ نہیں چھوڑیں گے: اسی لئے کہ یہ باتیں بشری فطرت کے: حد سے باہر ہوجانے کا تقاضا ہیں۔ جیسے شدت شہوت۔ پس بیشک نفوس کے لئے ایک ڈھنگ ہے جو نسبوں میں ظاہر ہوتی ہے، اور مُردوں کے ساتھ الفت ہے جو نوحہ کو چاہتی ہے۔ اور رصد بندی ہے، جو ستاروں سے بارش کی امید باندھنے تک پہنچاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے نہیں دیکھے گا تو انسانوں کے کسی گروہ کو، ان کے عربوں اور عجمیوں میں سے مگر یہ طریقہ (رصد بندی کا) ان میں رائج ہوگا۔

(۳۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان عورتوں کے بارے میں جو جنازہ کے ساتھ جارہی تھیں: "لوٹ جاؤ تم

درانحالیکہ گناہ گار ہونے والی ہو، ثواب پانے والی نہیں ہو!'' میں کہتا ہوں: وہ اس سے اسی لئے روکی گئی ہیں کہ ان کی جنازہ میں شرکت: شوروشغب، واویلا، بے صبری اور بے پردگی کی احتمالی جگہ ہے۔

☆ ☆ ☆

تین بچے فوت ہونے کا ثواب اور اس کی وجہ

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ''کسی مسلمان کے تین بچے نہیں مرتے، پھر وہ جہنم میں داخل ہو جائے (یعنی ایسا نہیں ہوسکتا) مگر قسم کھولنے کے طور پر'' (مشکوۃ حدیث ۱۷۲۹)

تشریح: جس کے تین بچے فوت ہو گئے ہوں، اس کے جہنم میں نہ جانے کی چند وجوہ ہیں: ایک یہ کہ اس نے بامید ثواب صبر کر کے اپنے نفس سے جہاد کیا ہے۔ اس کا یہ صلہ ملا ہے باقی وجوہ مبحث ۵ باب ۱۳ میں گذر چکی ہیں۔ دیکھیں رحمۃ اللہ (۱:۷۷۵) عنوان: ''آفات وبلیات کی حکمتیں''

تسلی دینے والے کو مصیبت زدہ کے مانند اجر ملنے کی وجہ

حدیث ـــــ میں ہے کہ: ''جو شخص کسی مصیبت زدہ کو تسلی دے، اس کے لئے اُس مصیبت زدہ کے ثواب کے مانند ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۷۳۷)

تشریح: مصیبت عام ہے: خواہ کسی کے مرنے کی مصیبت ہو یا کوئی مالی یا غیر مالی آفت ٹوٹ پڑی ہو۔ اور تسلی دینا بھی عام ہے: خواہ مصیبت زدہ کے پاس جا کر تسلی دے، یا خط وغیرہ کے ذریعہ تسلی دے۔ ہر صورت میں تسلی دینے والے کو بھی ویسا ہی اجر ملے گا، جیسا مصیبت زدہ کو صبر کرنے پر ملتا ہے (مگر دونوں کے اجر میں برابری ضروری نہیں) اور ان کی تین وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: تسلی دینے والا مصیبت زدہ کے صبر کا باعث بنا ہے یعنی اس کے تسلی دینے سے مصیبت زدہ کو صبر آیا ہے۔ اور حدیث میں ہے: الدالُّ علی الخیر کفاعلہ یعنی جو اچھی بات کا راستہ بتاتا ہے اس کو بھی اس اچھی بات پر عمل کرنے والے کی طرح ثواب ملتا ہے (مجمع الزوائد ۱:۱۶۶) (یہ وجہ شارح نے مظاہر حق سے بڑھائی ہے)

دوسری وجہ: جو مصیبت زدہ کے پاس حاضر ہوتا ہے، وہ بھی مصیبت زدہ کی طرح بے قرار ہوتا ہے۔ اور وہ بھی صبر کرتا ہے۔ پس ہر ایک کو اس کے صبر کا اجر ملتا ہے۔

تیسری وجہ: جس کا کوئی آدمی فوت ہو گیا ہے: اس کی صورت، اور اس کو تسلی دینے کی صورت ایک جیسی ہے۔ کیونکہ تسلی دینے والا اس صدمہ کو اپنا صدمہ تصور کرتا ہے۔ اور عالم مثال (آخرت) کا مدار مماثلت پر ہے یعنی عمل کی جزا عمل

کے مشابہ ہوتی ہے۔اس لئے جوثواب میت کے پسماندگان کوملتا ہے، وہی تسلی دینے والے کوبھی ملتا ہے۔ کیونکہ دونوں کا عمل ایک جیسا ہے، پس دونوں کی جزا بھی ایک جیسی ہوگی۔

پسماندگان کے لئے یک شبانہ روز کھانا تیار کرنے کی حکمت

حدیث ـــــ میں ہے کہ جب غزوۂ موتہ میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔اوراس کی اطلاع مدینہ پہنچی، توان کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے گھر والوں کوحکم دیا کہ: ''جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو، اس لئے کہ ان کے یہاں ایسی خبر آئی ہے کہ انہیں کھانا پکانے کا ہوش نہیں!'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۳۹)

تشریح: میت کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرنا ان پر انتہائی درجہ کی شفقت ہے۔اوران کو بھوک کی تکلیف سے بچانا ہے۔یعنی یہ حکم اظہارِ شفقت اوراعانت کے لئے ہے۔

[۳٤] قوله صلى الله عليه وسلم: " لايموت لمسلم ثلاثة من الولد فيلج النار"

أقول: ذلك: لجهاده نفسَه بالاحتساب، ولمعانٍ ذكرناها.

[۳٥] قوله صلى الله عليه وسلم: " من عَزّى مُصابا فله مثلُ أجرِه"

أقول: ذلك لسببين: أحدهما: أن الحاضر يَرِقُّ رِقَّةَ المصاب، وثانيهما: أن عالَم المثال مبناه على ظهور المعانى التضايفية، ففى تعزية الثُّكلٰى صورةُ الثُّكلِ، فجوزى شِبْهَ جزائه.

[۳٦] قوله صلى الله عليه وسلم: " اصنعوا لآل جعفر طعامًا، فقد أتاهم ما يُشغلهم"

أقول: هذا نهاية الشفقة بأهل المصيبة، وحفظهم من أن يتضروا بالجوع.

ترجمہ: (۳۴) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:.....میں کہتا ہوں: وہ بات (یعنی جہنم میں نہ جانا) اس کے ٹکر لینے کی وجہ سے ہے اپنے نفس کے ساتھ بامید ثواب اوران وجوہ سے جن کوہم نے ذکر کیا ہے۔

(۳۵) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:.....میں کہتا ہوں: وہ بات (یعنی مصیبت زدہ کے مانند ثواب ملنا) دو وجہ سے ہے: ان میں سے ایک: یہ ہے کہ موجود بھی بے قرار ہوتا ہے مصیبت زدہ کے بے قرار ہونے کی طرح۔ اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ عالَم مثال کا مدار معانی تضایفیہ (باہم دیگر مناسبت رکھنے والی باتیں) کے ظاہر ہونے پر ہے۔ پس جس کا کوئی آدمی فوت ہوگیا، اس کوتسلی دینے میں بھی آدمی فوت ہونے کی صورت ہے، پس وہ مصیبت زدہ کے بدلے کے مشابہ بدلہ دیا گیا۔

(۳۶) آنحضرت ﷺ کا ارشاد:.....میں کہتا ہوں: یہ مصیبت زدوں کے ساتھ انتہائی درجہ کی شفقت ہے۔اور ان کو بچانا ہے اس سے کہ وہ بھوک سے ضرر اٹھائیں۔

لغت: تضایُف (مصدر باب تفاعل) ضَاف إلیه: مائل ہونا أضافه: مائل کرنا، منسوب کرنا، مضاف مضاف الیہ اسی سے بنے ہیں اس دنیا کی چیزیں: عالم مثال کی شبیہ ہیں۔ اور عالَم مثال کی چیزیں اس دنیا کی چیزوں کے مانند ہیں۔ یہی تضایف (باہم دیگر مناسبت رکھنا) ہے۔ اور اعمال کی جزائیں بھی چونکہ عمل کے مشابہ ہوتی ہیں، اس لئے اعمال اور ان کی جزائیں تضایفی امور ہیں۔ غرض یہ فلسفہ کی اصطلاح ہے۔ جن دو چیزوں میں نسبتِ اضافت ہوتی ہے وہ تضایُفی امور کہلاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

پہلے زیارتِ قبور کی ممانعت پھر اجازت کی وجہ

حدیث—— حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ''میں نے آپ لوگوں کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا۔ پس ان کی زیارت کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۶۲) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ: ''میں نے آپ لوگوں کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا، پس ان کی زیارت کرو۔ کیونکہ قبرستان جانا دنیا سے بے رغبت کرتا ہے۔ اور آخرت کی یاد دلاتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۶۹)

تشریح: شروع میں جب عام مسلمانوں کے دلوں میں توحید کا بیج پوری طرح جما نہیں تھا۔ اندیشہ تھا کہ قبرستان جانے سے قبور پرستی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اس لئے قبروں پر جانے سے منع کیا گیا تھا۔ پھر جب امت کا توحیدی مزاج پختہ ہو گیا۔ اور اسلام کی بنیادی تعلیمات دلوں میں جڑ پکڑ گئیں۔ اور شرک سے دلوں میں نفرت بیٹھ گئی۔ اور قبور پر جانے سے شرک کا اندیشہ نہ رہا، تو آپؐ نے قبور پر جانے کی اجازت دیدی۔ اور جواز کی وجہ یہ بیان کی کہ زیارتِ قبور میں بڑا فائدہ ہے۔ اس سے آدمی کو اپنی موت یاد آتی ہے۔ اور وہ انقلابات دہر سے عبرت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

زیارتِ قبور کی دعائیں

پہلی دعا: رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم دیا کرتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو اس طرح دعا کریں: أَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ، نَسْئَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ (سلام ہو تم پر اے گھر والو! مؤمنین اور مسلمین میں سے۔ اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو تم سے ضرور ملنے والے ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے سلامتی کی) (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۶۴)

دوسری دعا: رسول اللہ ﷺ کا گذر مدینہ میں چند قبروں پر ہوا۔ آپؐ نے ان کی طرف رخ کیا، اور کہا: أَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ (سلام ہو تم پر، اے قبر والو!

اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائیں، تم ہمارے پیش رَو ہو، اور ہم نشانِ قدم پر ہیں یعنی تمہارے پیچھے آرہے ہیں) (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۶۵)

تشریح: اموات کی زیارت پر احیاء کی زیارت کے احکام جاری کئے گئے ہیں۔ پس جس طرح زندوں سے ملاقات ہوتی ہے تو ان کی طرف منہ کر کے سب سے پہلے سلام کیا جاتا ہے، اسی طرح اموات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی اموات کے لئے دعائے مغفرت کی جاتی ہے اور اپنی موت کو یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ زیارتِ قبور سے اصل مقصود یہی دو باتیں ہیں۔

[۳۷] قوله صلى الله عليه وسلم: " نهيتكم عن زيارة القبور، فزوروها"

أقول: كان نهى عنها لأنها تفتح باب العبادة لها، فلما استقرت الأصول الإسلامية، واطمأنت نفوسهم على تحريم العبادة لغير الله: أذِنَ فيها، وَعَلَّلَ التجويز: بأن فائدته عظيمة، هي: أنها تذكر الموتَ، وأنها سبب صالح للاعتبار بتقلب الدنيا.

[۳۸] ومن دعاء الزائر لأهل القبور: " السلام عليكم أهلَ الديار من المؤمنين والمسلمين وإنا إن شاء الله بكم لَلاَحِقون، نسأل الله لنا ولكم العافية" وفي رواية: " السلام عليكم يا أهلَ القبور، يغفر الله لنا ولكم، أنتم سَلَفُنا ونحن بالأثر" والله أعلم.

ترجمہ: (۳۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ..... میں کہتا ہوں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا تھا زیارت قبور سے۔ اس لئے کہ زیارتِ قبور: قبور کی پرستش کا دروازہ کھولتی ہے۔ پھر جب اسلامی عقائد جم گئے اور لوگوں کے اذہان غیر اللہ کی عبادت کی تحریم پر مطمئن ہو گئے، تو زیارت قبور کی اجازت دیدی۔ اور جائز کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ اس کا فائدہ بڑا ہے۔ اور وہ فائدہ یہ ہے کہ قبروں کی زیارت موت کو یاد دلاتی ہے۔ اور یہ کہ وہ بہترین ذریعہ ہے انقلابات دہر سے عبرت پذیری کا۔

(۳۸) اور قبور والوں کی زیارت کی دعا ہے: السلام إلخ ـــــ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(بہ توفیق الٰہی آج بروز جمعرات ۱۳ محرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۸ مارچ ۲۰۰۲ء
کتاب الصلاۃ کی شرح مکمل ہوئی فللّٰہ الحمد والمِنّۃ)